JANUARY 2000

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

سالِ نو مبارک

انٹرویو

ناول

ناولٹ

مکمل ناول

افسانے

نظمیں غزلیں

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ---- 500 روپے

ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 3500 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---- 4500 روپے

مستقل سلسلے

جنوری 2008

جلد 22 شمارہ 5

قیمت 35 روپے

رفعت جبیں

پہلی شعاع

شعاع کا جنوری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
ایک بار پھر خوش آئند امیدوں کے نئے چراغ جلائے نئے سال کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔
ادارہ شعاع کی جانب سے آپ سب کو نیا سال مبارک ہو۔
اس دعا کے ساتھ کہ نیا سال آپ کے لیے، ہم سب کے لیے خوشیوں کی نوید لے کر آئے۔ وطن عزیز کو ترقی اور استحکام نصیب ہو۔ دنیا میں امن اور خوش حالی ہو۔ ہمیں ان سانحات کا سامنا کبھی نہ کرنا پڑے جن سے پچھلے سال دوچار ہوئے۔ جانے والا سال پاکستان کی تاریخ میں کچھ ایسے المناک واقعات رقم کر گیا جن کی یاد ہمیشہ خون کے آنسو رلاتی رہے گی۔ آئین کی پامالی، بے گناہ اور معصوم شہریوں کا خون، مہنگائی کا سیلاب، آٹے کی نایابی جس حوالے سے بھی دیکھیں مایوس کن ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سمت کا اتحاد عطا فرمائے۔

ہجری سال کا آغاز بھی اسی مہینے میں ہو رہا ہے۔ محرم الحرام ہجری سال کا پہلا مہینہ جس سے شہادت کے ایک عظیم واقعے کی یاد وابستہ ہے۔ حضرت امام حسینؓ کی شہادت ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ظلم اور آمریت کے خلاف جدوجہد کا پیغام ہے۔

رنگِ زارِ تمنا (آخری قسط)

سال رواں کا آخری مہینہ بہن ماہا ملک اور ان کے گھر والوں کے لیے ایک بڑی خوشی لے کر آیا۔ ماہا ملک کے بھائی ضمیر ارشد نے اپنی ہم سفر کے ساتھ نئی زندگی کا آغاز کیا۔ اس خوشی کے موقع پر ہماری جانب سے دلی مبارک باد اور دعائیں۔

بھائی کی شادی کی مصروفیات کی بنا پر ماہا ناول کی قسط نہ لکھ سکیں۔ اس لیے اس ماہ ان کے ناول کی قسط شاملِ اشاعت نہیں ہے۔
آئندہ ماہ ان شاء اللہ ناول رنگِ زارِ تمنا کی آخری قسط شائع ہوگی۔

اس شمارے میں،

- ثمرہ بخاری اور عمیرہ خورشید علی کے مکمل ناول،
- رخسانہ نگار عدنان، زہرہ ممتاز، سدرہ سحر عمران اور نادیہ کنول نازی کے ناولٹ،
- نعیمہ ناز، ثمینہ عظمت علی، آمنہ مفتی، ثروت نذیر اور تحسین اختر کے افسانے،
- رفعت جبیں کا سلسلے وار ناول،
- کچھ یادیں کچھ باتیں ۔ پی ٹی وی کے مشہور فنکار بابر علی کی یادیں،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا ۔ مستنصر حسین تارڑ کی کتاب پر تبصرہ،
- صحابیات، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کے بارے میں جاننے کے لیے آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔ خط ضرور لکھیے گا۔

حمد باری تعالیٰ

تیری یاد کا جب پڑا دل پہ سایا
قلم میں نے تیری ثنا کا اٹھایا

تو گل میں گلستاں میں جلوہ نما ہے
یہ سچ ہے تو دونوں جہاں کا خدا ہے

تیرا روپ تاروں میں ہر سو عیاں ہے
تیرا نور خورشید میں ضو فشاں ہے

تو دشت و جبل میں تو کوہ و دمن میں
معطر معطر کلی میں، چمن میں

عیاں ہر طرف ہے تیری کبریائی
ازل سے ہے قائم تیری بادشاہی

میرے سارے رنج و الم دور کر دے
میرا دل مسرت سے بھرپور کر دے

کہ سہراب رہتا ہے تیری لگن میں
تیرا ذکر ہے اس کے کام و دہن میں

آغا سہراب لدھیانوی

نعت رسول مقبول ﷺ

ارفع ہیں بے مثال ہیں یکتا حضورؐ ہیں
پُر نور و مستنیر و اُجالا حضورؐ ہیں

دونوں جہاں کی رونقیں بس آپ ہی سے ہیں
کچھ شک نہیں ہے عزت والا حضورؐ ہیں

جو تھے فقیر ان کو تونگر بنا دیا
ہر ایک بے نوا کا وسیلہ حضورؐ ہیں

میرا تو ورد صبح و مسا ان کا نام ہے
گویا صداقتوں کا خزینہ حضورؐ ہیں

صحرا بنے ہیں آپ کی آمد پہ مرغزار
ہر گل میں ہر شجر میں ہویدا حضورؐ ہیں

میں ہوں زہیر ان کے غلاموں کا بھی غلام
سب ہیں غلام اور شہنشاہ حضورؐ ہیں

زہیر کنجاہی

پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں

میاں عابد احمد

عرب دورِ جاہلیت میں

دورِ جاہلیت میں عرب اپنی فطری صلاحیتوں اور بعض عادات و اخلاق میں تمام دنیا میں ممتاز تھے۔ فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا۔ آزادی و خودداری ان کو جان سے زیادہ عزیز تھی۔ شہسواری و شجاعت میں وہ بے بدل تھے۔ عقیدہ کے پُرجوش' صاف گو اور جری' حافظے کے قوی' مساوات' بے تکلفی اور جفاکشی کے عادی' ارادہ کے پکے' زبان کے سچے' وفاداری اور امانت داری میں ضرب المثل تھے۔

لیکن انبیاء اور ان کی تعلیمات سے دوری اور ایک جزیرہ نما میں صدیوں سے مقید رہنے کی وجہ سے اور باپ دادا کے دین اور قومی روایات پر سختی سے قائم ہونے کا سبب دو دینی و اخلاقی حیثیت سے پست کر چکے تھے۔ چھٹی صدی میں زوال اور انحطاط کے آخری نقطہ پر تھے۔ کھلی ہوئی بت پرستی میں مبتلا اور اس میں دنیا کے امام تھے۔ اخلاقی و اجتماعی امراض" ان کے معاشرے کو گھن کی طرح کھا رہے تھے۔ مذہب کی اکثر خوبیوں سے وہ محروم اور جاہلیت کی زندگی کی بدترین خصوصیتوں میں مبتلا تھے۔

عرب میں ہر گھر کا بت جدا تھا جس کی گھر والے پرستش کرتے تھے۔ جب کوئی شخص سفر کا ارادہ کرتا تو روانگی کے وقت گھر پر اس کا آخری کام یہ ہوتا کہ اپنے بت کو حصولِ برکت کے لیے چھوتا اور جب سفر سے واپس آتا تو گھر پہنچ کر پہلا کام یہ کرتا کہ اپنے بت کو تبرکاً ہاتھ لگاتا۔

کسی نے تو ایک بت خانہ بنا رکھا تھا' کسی نے بت تیار کر لیا تھا' جو بت خانہ نہیں بنا سکتا تھا یا بت نہیں تیار کر سکتا تھا وہ حرم کے سامنے ایک پتھر گاڑ دیتا یا حرم کے علاوہ جہاں بہتر سمجھتا پتھر گاڑ کر اس کے گرد اس شان سے طواف کرتا جس طرح بیت اللہ کے گرد طواف کیا جاتا ہے۔ ان پتھروں کو وہ انصاب کہا کرتے تھے اور اگر اچھی قسم کا پتھر مل جاتا تو وہ پہلے پتھر کو پھینک کر اس نئے پتھر کو لے لیتے اور اگر پتھر نہ پاتے تو مٹی کا ایک ڈھیر بناتے اور اس پر بکری کو لا کر دوہتے پھر اسی کا طواف کرتے۔

مشرکوں کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں جو حال رہا ہے' وہی حال عرب کا تھا۔ ان کے متعدد اور مختلف معبود تھے جن میں [illegible] ستارے سب شامل تھے۔ فرشتوں کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ کی بیٹیاں ہیں' اس لیے ان سے شفاعت کے طلب گار ہوتے' ان کی پرستش کرتے اور ان کو وسیلہ بناتے' جنوں کو اللہ کا شریک کار سمجھتے' ان کی قدرت اور اثراندازی پر ایمان رکھتے اور ان کی پرستش کرتے۔

اجتماعی اعتبار سے ان کے اندر بہت سی بیماریاں پائی جاتی تھیں۔ شراب عام طور سے پی جاتی تھی اور ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ شراب کی دکانیں عام تھیں اور علامت کے طور پر ان دکانوں پر جھنڈا لہراتا' جوا بہت بڑائی اور فخر کی بات تھی اور اس میں شرکت نہ کرنا بزدلی کی علامت تھی۔ زمانہ جاہلیت میں ایک شخص اپنے گھر بار کو داؤ پر رکھ دیتا۔ پھر حسرت سے اپنے گئے ہوئے مال کو دوسروں کے ہاتھ میں دیکھتا۔ اس سے نفرت اور دشمنی کی آگ بھڑکتی اور جنگوں کی نوبت آتی۔ حجاز کے عرب اور یہودی سودی لین دین اور سود در سود کا معاملہ کرتے۔ اس سلسلے میں بڑی بے رحمی اور سخت دلی کے مظاہرے ہوتے۔

عورت کے ساتھ ظلم و بدسلوکی عام طور سے روا سمجھی جاتی تھی۔ اس کے حقوق پامال کیے جاتے۔ اس کا مال مرد اپنا مال سمجھتے۔ وہ ترکہ اور میراث میں کچھ حصہ نہ پاتی۔ شوہر کے مرنے یا طلاق دینے کے بعد اس کو اجازت نہیں تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کر سکے۔ دوسرے سامان اور حیوانات کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ مرد تو اپنا پورا پورا حق وصول کرتا لیکن عورت اپنے حقوق سے مستفید نہیں ہو سکتی تھی۔ کھانے میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو مردوں کے لیے خاص تھیں اور عورتیں ان سے محروم تھیں۔ لڑکیوں سے نفرت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ انہیں زندہ دفن کرنے کا بھی رواج تھا' بعض ننگ و عار کی بنا پر' بعض خرچ و مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرتے۔ عرب کے بعض شرفا اور روسا ایسے موقعوں پر بچیوں کو خرید لیتے اور ان کی جان بچاتے' [illegible] ظہور کے وقت میں تین سو زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو فدیہ دے کر بچا رکھا تھا۔ بعض اوقات کسی سفر یا مشغولیت کی وجہ سے لڑکی سیانی ہو جاتی اور دفن کرنے کی نوبت نہ آتی۔ تو ظالم باپ دھوکہ دے کر اس کو لے جاتا اور بڑی بے دردی سے زندہ دفن کر دیتا۔ اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلے میں بڑے اندوہناک اور رقت انگیز واقعات بیان کیے ہیں۔

عرب کے سفاکانہ اعمال میں سب سے زیادہ بے رحمی و سنگ دلی کا کام معصوم بچوں کو مار ڈالنا اور لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینا تھا کیونکہ لڑکیاں شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھیں۔

اہم خصوصیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کتاب (قرآن پاک) اس علانیہ دعوے کے ساتھ پیش کی کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو مجھ پر نازل ہوا ہے۔ اس کتاب کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو یقینی طور پر محسوس ہوتا ہے کہ اس میں کوئی آمیزش نہیں ہوئی ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا کوئی قول بھی اس میں شامل نہیں ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کو اس سے بالکل الگ رکھا گیا ہے۔ بائبل کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات اور عربوں کی تاریخ اور زمانہ نزولِ قرآن میں پیش آنے والے واقعات کو اس میں کلام الٰہی کے ساتھ غلط ملط نہیں کر دیا گیا۔ یہ خالص کلام اللہ (WORD OF GOD) ہے۔ اس کے اندر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا ایک لفظ بھی شامل نہیں ہوا ہے۔ اس کے الفاظ میں سے ایک لفظ بھی کم نہیں ہوا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے جوں کا توں یہ ہمارے زمانے تک منتقل ہوا ہے۔ یہ کتاب جس وقت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونی شروع ہوئی تھی' اسی وقت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لکھوانا شروع کر دیا تھا۔ جب کوئی وحی آتی اسی وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی کاتب کو بلاتے اور اسے لکھوا دیتے تھے۔ لکھنے کے بعد وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا جاتا تھا اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اطمینان کر لیتے تھے کہ کاتب نے اسے صحیح لکھا ہے تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے محفوظ جگہ رکھ دیتے تھے۔ ہر نازل شدہ وحی کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم کاتب کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے کس سورہ میں کس آیت سے پہلے اور کس کے بعد درج کیا جائے۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کو ترتیب بھی دیتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ تکمیل کو پہنچ گیا۔

پھر نماز کے متعلق آغاز اسلام ہی سے یہ ہدایت تھی کہ اس میں قرآن مجید پڑھا جائے' اس لیے صحابہؓ کرام اس کے نزول کے ساتھ ساتھ اس کو یاد کرتے جاتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے اسے پورا یاد کر لیا اور ان سے بہت زیادہ بڑی تعداد ایسے صحابہ کی تھی'

جنھوں نے کم و بیش اس کے مختلف حصے اپنے حافظے میں محفوظ کرلیے تھے۔ ان کے علاوہ وہ متعدد صحابہؓ جو پڑھے لکھے تھے' قرآن کے مختلف حصوں کو بطور خود لکھ بھی رہے تھے۔ اس طرح قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں محفوظ ہوچکا تھا۔

پس یہ ایک ناقابل انکار تاریخی حقیقت ہے کہ آج جو قرآن ہمارے پاس موجود ہے' یہ لفظ بہ لفظ وہی ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام اللہ کی حیثیت سے پیش فرمایا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تمام حافظوں اور تمام تحریری نسخوں کو جمع کرکے اس کا ایک مکمل نسخہ کتابی صورت میں لکھوایا۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسی کی نقلیں سرکاری طور پر دنیائے اسلام کے مرکزی مقامات کو بھیجی گئیں۔ ان میں سے دو نقلیں آج بھی دنیا میں موجود ہیں۔ ایک استنبول میں دوسری تاشقند میں۔ جس کا جی چاہے قرآن مجید کا کوئی مطبوعہ نسخہ لے جاکر ان سے ملالے۔ کوئی فرق نہ پائے گا اور فرق ہو کیسے سکتا ہے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک ہر پشت میں لاکھوں اور کروڑوں حافظ موجود رہے ہیں۔ ایک لفظ بھی اگر کوئی شخص بدلے تو یہ حفاظ اس کی غلطی پکڑلیں گے۔ پچھلی صدی کے آخر میں جرمنی کی میونخ یونیورسٹی کے ایک انسٹی ٹیوٹ نے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں سے ہر زمانے کے لکھے ہوئے قرآن مجید کے قلمی اور مطبوعہ بیالیس ہزار نسخے جمع کیے تھے۔ پچاس سال تک ان پر تحقیقی کام کیا گیا۔ آخر میں جو رپورٹ پیش کی گئی وہ یہ تھی کہ ان نسخوں میں کتابت کی غلطیوں کے سوا کوئی فرق نہیں ہے۔ حالانکہ یہ پہلی صدی ہجری سے چودھویں صدی تک کے نسخے تھے اور دنیا کے ہر حصے سے فراہم کیے گئے تھے۔ افسوس کہ دوسری جنگ عظیم میں جب جرمنی پر بمباری کی گئی تو وہ انسٹی ٹیوٹ تباہ ہوگیا لیکن اس کی تحقیقات کے نتائج دنیا سے ناپید نہیں ہوئے۔

ایک اور بات قرآن کے متعلق یہ بھی نگاہ میں رکھیے کہ جس زبان میں یہ نازل ہوا تھا' وہ ایک زندہ زبان ہے۔ عراق سے مراکو تک کروڑوں انسان آج بھی اسے مادری زبان کی حیثیت سے بولتے ہیں اور غیر عرب دنیا میں بھی کروڑوں افراد اسے پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ عربی زبان کی گرامر' اس کی لغت' اس کے الفاظ کے تلفظ اور اس کے محاورے چودہ سو برس سے جوں کے توں قائم ہیں۔ آج ہر عربی داں اسے پڑھ کر اسی طرح سمجھ سکتا ہے جس طرح چودہ سو برس پہلے کے عرب سمجھتے تھے۔

یہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم خصوصیت جو ان کے سوا کسی نبی اور کسی پیشوائے مذہب کو حاصل نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوع انسانی کی ہدایت کے لیے جو کتاب ان پر نازل ہوئی تھی' وہ اپنی زبان میں اپنے اصل الفاظ کے ساتھ بلا تغیر و تبدل موجود ہے۔

ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اللہ کا ہاتھ جماعت کے اوپر ہوتا ہے جو جماعت سے الگ ہوگا وہ آگ میں جا پڑے گا۔

بھائی سے مراد مسلمان بھائی ہے۔ ظالم کی مدد اس طرح کہ اسے ظلم سے روکا جائے۔

مظلوم کی بددعا سے ڈرو' اس لیے کہ اس کی بددعا اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے۔

انسان اپنے بھائی کے سبب بہت کچھ بن جاتا ہے۔ یعنی زیادہ لگتا ہے۔

اوپر والا (دینے والا) ہاتھ نیچے والے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے اور سب سے پہلے اسے دو جس کی تم پر ذمہ داری آتی ہے۔

بہترین کمائی کرنے والا وہ مزدور ہے جو نیک نیتی سے محنت کرے۔

جب تم میں سے کوئی کام کرے تو اسے پختہ طریقے سے انجام دے۔

اللہ کے نزدیک بہترین کام وہ ہے جس میں باقاعدگی ہو۔

کسی قوم کی زبان سیکھ لو اس کے شر سے محفوظ ہوجاؤ گے۔

مومن وہ ہے جسے اپنی برائی سے افسوس ہو اور اپنی نیکی سے مسرت حاصل ہو۔

دو آدمیوں کا کھانا تین کے لیے اور تین کا کھانا چار کے لیے کافی ہوتا ہے۔

فراخی و خوش حالی کی امید رکھنا بھی عبادت ہے۔

انسان کے اسلام کا حسن یہ بھی ہے کہ وہ فضول باتوں کو چھوڑ دے۔

لوگوں کو تم دولت سے اپنا گرویدہ نہیں کرسکو گے' اس لیے انھیں اپنے اخلاق سے گرویدہ کرو۔

دو نعمتیں ایسی ہیں جن سے بہت سے لوگ محروم ہیں: صحت اور فراغت۔

اگر تم بولنے کی بہترین صلاحیت کے مالک ہو تو ان صلاحیتوں کو اپنے اس بھائی کی ترجمانی میں صرف کرو جو گفتگو پر قادر نہیں تو یہ بھی صدقہ ہے۔

بھلائی تو بہت ہے مگر اسے کرنے والے بہت تھوڑے ہیں۔

نیک بخت وہ ہے جو دوسروں سے عبرت حاصل کرے۔

دل کا اندھا پن سب سے بڑا اندھا پن ہے۔

راستوں میں مت بیٹھو۔ اگر بیٹھنا ہی ہو تو پھر نظریں جھکا کر رکھو' سلام کا جواب دو' بھٹکے ہوئے کو راستہ دکھاؤ اور کمزور کی مدد کرو۔

اگر انسان کے پاس دو جنگل کی وادیاں بھی ہوں تو وہ تیسری وادی کا طلب گار بن جائے گا۔

جس کا کھانا بہت ہو' اس کی بیماری بہت ہو اور جس کی غذا کم ہو اس کی دوا کم ہو۔

دو چہروں والا (منافق) اللہ کے نزدیک کبھی معزز نہیں ہوسکتا۔

ایمان میں وہی کامل ترین ہے مومن' جو اخلاق میں سب سے بہتر ہے۔

مومن تو اپنے حسن اخلاق سے' روزہ دار اور نماز گزار کا درجہ حاصل کرلیتا ہے۔

زبان کی تیزی سے بڑھ کر انسان کو کوئی بری چیز نہیں دی گئی۔

دنیا اور اس کی زینت کے بارے میں فرمایا۔ موسم بہار جو کچھ اگاتا ہے' اس میں ایسے پودے بھی ہوتے ہیں جن کے کھانے سے جانوروں کے پیٹ پھول جاتے ہیں اور وہ مرجاتے ہیں۔

بحران کا شدت اختیار کرنا اس کا حل ہوتا ہے۔

مومن کی مثال شہد کی مکھی کی ہے جو پاکیزہ کھاتی ہے اور شہد کی شکل میں پاکیزہ کھلاتی ہے۔

عمل کا مدار نیت پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی۔

جھوٹ کے ثبوت کے لیے یہ کافی ہے کہ انسان جو کچھ سنے اس کو بیان کرتا پھرے۔

جس نے لوگوں کو شکریہ ادا نہ کیا اس نے اللہ کا شکریہ بھی ادا نہ کیا۔

فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم

مشورہ کرلینے کے بعد کوئی انسان تباہ نہیں ہوگا۔

مجھے بلند اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا۔

متکبر کے ساتھ تکبر کرنا صدقہ ہے۔

چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

ہر نیکی صدقہ ہوتی ہے۔

انسان کا حسن اس کی زبان میں پوشیدہ ہے۔

دین اخلاص و خیرخواہی کا نام ہے۔

بھلائی کا راستہ بتانے والا اس کے کرنے والے کی طرح ہے۔

امیری دل کی امیری ہے۔

اور حیا بھی ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

مانگنا ذلت ہے۔
اپنے بھائی کی مدد کرو وہ ظالم ہو یا مظلوم۔
ظلم قیامت کے دن تاریکی ہی تاریکی ہوگا۔
جس سے مشورہ لیا جاتا ہے' وہ امین ہوتا ہے۔
مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا۔
طاقتور مومن' کمزور مومن سے بہتر ہے۔
آدمی کی جنت اس کا گھر ہوتا ہے۔
ندامت بھی توبہ ہے۔
شر کا دامن چھوڑ دینا بھی صدقہ ہے۔

ایک اور امتحان سامنے آیا

بدر کا معرکہ ایثار اور جانبازی کا سب سے بڑا حیرت انگیز منظر اور ایک نیا امتحان بن کر سامنے آگیا تھا کیونکہ اس سے پہلے تک کا شاید ہی کوئی مسلمان ہوگا جو رضائے الٰہی کی خاطر ظلم و ستم کے دو پاٹوں کے درمیان گندم کی طرح پیسا نہ گیا ہو۔

اس جسمانی تشدد کے بعد ان پر دوسرا امتحان آیا اور یہ مال' کاروبار' تجارت' گھربار' اعزہ و اقرباء اور وطن کی محبت سے دستبرداری اور سب علائق سے دامن جھاڑ کر مکہ کی سرزمین کو خیرباد کہنا اور مدینہ کی جانب ہجرت کرنا تھا۔

اور اب معرکہ بدر کی صورت میں ایک اور امتحان سامنے آیا۔

جو لوگ سچے مومن تھے' انہوں نے فی الواقع سب کی آنکھوں کے سامنے ان تمام رشتوں کو کاٹ پھینکا جو اللہ کے دین کے ساتھ ان کے تعلق میں حائل ہوئے۔

بھائی کے سامنے بھائی اور باپ کے سامنے اس کا بیٹا سینہ تان کر کھڑا تھا۔ جب دونوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی ہوئیں تو لوگوں کو نظر آیا کہ خود ان کے جگر کے ٹکڑے ان کے سامنے ہیں۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے بیٹے (جو ابھی تک ایمان نہ لائے تھے) میدان جنگ میں بڑھے تو حضرت ابو بکرؓ ان کے مقابلے میں تلوار کھینچ کر نکلے۔ حضرت ابو عبیدہ نے اپنے باپ عبداللہ بن جراح کو قتل کیا۔ حضرت مصعب بن عمیر نے اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کیا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام بن مغیرہ کو قتل کیا۔

حضرت عمرؓ نے اسیران جنگ کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے اور ہم میں سے ہر ایک اپنے رشتہ دار کو قتل کرے۔

قیامت کے دن

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا۔ اے آدم کے بیٹے! میں بیمار تھا تو نے میری عیادت نہیں کی۔ وہ کہے گا۔ اے پروردگار! میں تیری کیسے عیادت کرتا تو تو رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا' تو نے اس کی عیادت نہیں کی' کیا تو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے کھانا نہیں دیا۔ وہ کہے گا۔ اے پروردگار! میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا تو تو خود رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ جواب میں فرمائے گا۔ کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔

اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ وہ کہے گا۔ اے پروردگار! میں تجھے کیسے پانی پلاتا تو تو خود رب العالمین ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا تو نے اس کو پانی نہیں پلایا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اس کو پانی پلاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔

ماڈل	عینی
ٹرانسپیرنسی	موسیٰ رضا
میک اپ	روز بیوٹی پالر

صحابیات

سلیمان ندوی

حضرت خولہؓ بنت حکیم

نام و نسب : خولہ نام' ام شریک کنیت' قبیلہ سلیم سے تھیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خالہ ہوتی ہیں۔ نسب نامہ یہ ہے' خولہ بنت حکیم بن امیہ بن حارثہ بن الاوقص بن مرہ بن ہلال بن فالج بن ذکوان بن ثعلبہ بن بہثہ بن سلیم۔

نکاح : حضرت عثمانؓ بن مظعون سے جو بڑے رتبہ کے صحابی تھے نکاح ہوا۔

عام حالات : مسلمان ہو کر مدینہ کو ہجرت کی' 2 ہجری کے بعد حضرت عثمانؓ بن مظعون نے وفات پائی تو حضرت خولہؓ نے دوسرا نکاح نہیں کیا' اکثر پریشان رہتی تھیں۔ صحیح بخاری میں روایت آئی ہے کہ انہوں نے اپنے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

فضل و کمال : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پندرہ حدیثیں روایت کیں' راویان حدیث میں حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص' سعید بن مسیب' بشیر بن سعید' عروہ اور ربیع بن مالک داخل ہیں۔

اخلاق : اسد الغابہ میں ہے۔ ترجمہ "وہ ایک نیک بی بی تھیں۔" مسند میں ہے۔ ترجمہ : "یعنی وہ دن کو روزہ رکھتی تھیں اور رات کو عبادت کرتی تھیں۔"

ابتدا میں زیور کا بڑا شوق تھا' چنانچہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ اگر طائف فتح ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو فلاں عورت کا زیور دے دیجیے گا۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اگر خدا اس کی اجازت نہ دے تو پھر میں کیا کر سکتا ہوں۔"

حضرت حمنہؓ بنت جحش

نام و نسب' حمنہ نام' حضرت زینبؓ کی ہمشیرہ ہیں۔ سلسلہ نسب اوپر گزر چکا ہے'

نکاح' حضرت مصعبؓ بن عمیر سے نکاح ہوا۔

اسلام' اور ان ہی کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہوئیں۔

"عام حالات' مدینہ کی ہجرت کا شرف حاصل کیا' اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کی عورتوں سے بیعت لی تو اس میں یہ بھی شامل ہوئیں۔ مسند ابن حنبل اور ابن سعد وغیرہ میں اکثر عورتوں کے تذکرہ میں لکھا ہے کانت من المبایعات' اس سے یہی بیعت مراد ہے' چنانچہ حضرت اسماء بنتؓ یزید کے حالات میں ہم اس کا ذکر کر آئے ہیں۔

غزوات میں سے احد میں نہایت نمایاں شرکت کی' وہ پانی پلاتیں' اور زخمیوں کا علاج کرتی تھیں' ان کے علاوہ اور عورتیں بھی یہ خدمت انجام دے رہی تھیں۔ چنانچہ رفیدہؓ اور ام کبشہؓ وغیرہ کی نسبت بھی اس قسم کی تصریحات موجود ہیں۔

اس واقعہ میں حضرت حمنہؓ کے شوہر حضرت مصعبؓ بن عمیر نے شہادت پائی جن کے بعد انہوں نے حضرت طلحہؓ سے جو کہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے نکاح کیا۔

افک کے واقعہ میں منافقین کے ساتھ غلطی سے

جو مسلمان شریک ہوگئے تھے' ان میں حضرت حسانؓ اور حضرت مسطحؓ کے ساتھ حضرت حمنہؓ بھی تھیں' چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے منقول ہے۔
ترجمہ' یعنی حضرت زینبؓ کی بہن حمنہ برابر میرے خلاف رہیں' یہاں تک کہ اور اصحاب افک کی طرح برباد ہوگئیں۔"
فتح الباری میں ہے کہ حضرت حمنہؓ کے شریک ہونے کی وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت عائشہؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں سے گرا کر حضرت زینبؓ (اپنی بہن) کو بلند کریں۔ لیکن تعجب ہے کہ خود حضرت زینبؓ نے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا' چنانچہ اس کا تذکرہ ان کے حالات میں آچکا ہے۔
وفات' وفات کا سنہ صحیح طور پر معلوم نہیں' تاہم یہ معلوم ہے کہ حضرت زینبؓ کی وفات تک زندہ تھیں' حضرت زینبؓ نے 20 ہجری میں وفات پائی ہے۔
اولاد' حضرت طلحہؓ سے حضرت حمنہؓ کے دو لڑکے پیدا ہوئے' محمد اور عمران' محمد کو سجاد کے لقب سے شہرت تھی۔

حضرت ام حرامؓ

نام و نسب : نام معلوم نہیں' ام حرام کنیت تھی' قبیلہ خزرج کے خاندان بنو نجار سے تھیں' سلسلۂ نسب یہ ہے' ام حرام بنت ملحان بن خالد بن زید بن حرام بن جندب بن عامر بن غنم بن عدی بن نجار' والدہ کا نام ملیکہ تھا جو مالک بن عدی بن عمرو بن مالک بن نجار کی دختر تھیں' اس بنا پر ام حرام حضرت ام سلیمؓ کی بہن اور حضرت انسؓ کی خالہ ہوتی ہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ان کا کوئی رشتہ تھا۔
نکاح : عمرو بن قیس انصاریؓ سے نکاح ہوا' لیکن جب انہوں نے احد میں شہادت پائی تو حضرت عبادہؓ بن صامت کے عقد نکاح میں آئیں' جو بڑے رتبہ کے صحابی تھے۔
عام حالات اور وفات : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی قبا کی طرف تشریف لے جاتے تو حضرت ام حرامؓ کے گھر آتے اور کھانا نوش فرماتے تھے' حجۃ الوداع کے بعد ایک روز آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور کھانا کھا کر آرام فرمایا چند لمحوں بعد آپ کو نیند آگئی' لیکن تھوڑی دیر کے بعد مسکراتے ہوئے اٹھے اور فرمایا۔
"میں نے ایک خواب دیکھا ہے' اور وہ یہ کہ میری امت کے کچھ لوگ سمندر میں غزوہ کے ارادے سے سوار ہیں" حضرت ام حرامؓ نے کہا۔
"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کیجیے کہ میں بھی ان میں شامل ہوں۔" آپؐ نے دعا کی اور پھر آرام فرمایا' کچھ دیر کے بعد پھر مسکراتے ہوئے اٹھے اور اسی خواب کا اعادہ کیا' حضرت ام حرامؓ نے پھر اپنی شرکت کی درخواست کی دعا فرمانے کے لیے کہا۔
فرمایا۔ "تم پہلی جماعت کے ساتھ ہو۔" اس خواب کی تعبیر 28ھ میں پوری ہوئی۔
حضرت امیر معاویہؓ حضرت عمرؓ کی طرف سے شام کے حاکم تھے' انہوں نے متعدد بار جزائر پر حملہ کرنے کی خواہش ظاہر کی' لیکن حضرت عمرؓ نے اجازت نہیں دی' حضرت عثمانؓ کے زمانۂ خلافت میں انہوں نے اپنا ارادہ ظاہر [illegible] حملہ کرنے کے لیے ایک بیڑا تیار کیا' اس حملہ میں بہت سے صحابہ شریک تھے' حضرت ابوذرؓ' حضرت ابو درداؓ' حضرت عبادہؓ بن صامت' حضرت ام حرامؓ بھی ان ہی میں داخل تھیں۔ بیڑا حمص کے ساحل سے روانہ ہوا' اور قبرص پر فتح ہوگیا' واپسی میں حضرت ام حرامؓ سواری پر چڑھ رہی تھیں کہ نیچے گریں اور جاں بحق تسلیم ہوگئیں' لوگوں نے وہیں ان کو دفن کر دیا۔
اولاد : حضرت ام حرامؓ سے تین لڑکے پیدا ہوئے' پہلے شوہر سے قیس اور عبداللہ اور حضرت عبادہؓ سے محمد۔
فضل و کمال : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چند حدیثیں روایت کیں' راویوں میں حضرت عبادہؓ' حضرت انسؓ' عمرو بن اسود' عطاء بن یسار اور یعلی بن شداد بن اوس ہیں۔

بیٹھ کر سیرِ دو جہاں کرنا
غارِ حرا میں ایک رات

مصنف: مستنصر حسین تارڑ
تبصرہ: سائرہ غلام نبی

معروف سیاح و مصنف مستنصر حسین تارڑ نے یوں تو کئی سفر کیے اور انہیں قلم بند کیا۔ تارڑ نے اب کے جو سفر کیا۔ وہ غار حرا کے مقام تک تھا۔ اس مقدس مقام پر شب بسر کرنے کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ عازم سفر ہوئے۔ اور وہ ایک رات جو وہاں انہوں نے گزاری۔ اس رات کی کیفیات و احساسات کو انہوں نے "غار حرا میں ایک رات" کے عنوان سے محفوظ کر دیا ہے الف لیلوی حسن بیان تارڑ کی [illegible] ایک رات کو جادو اثر طرز بیاں سے ایک داستان بنا دیا کہ قاری کسی مقام پر کتاب سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اور پھر وہ مقدس مقام اور اس کی فیوض و برکات کہ اس کی چاہ میں دنیا ایک طرف رہ جائے۔
اس کتاب میں اپنے سیاحتی دوروں اور پھر زیر تبصرہ کتاب کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں۔
"کئی لوگ پوچھتے ہیں' جاننا چاہتے ہیں کہ کیا میں سفر محض اس لیے اختیار کرتا ہوں کہ واپسی پر سفرنامہ لکھ سکوں... ایسا ہرگز نہیں ہے... میں نے زندگی کے بیشتر سفر ان زمانوں میں کیے جب میں واپسی پر کچھ بھی نہ لکھتا تھا... میں ایک ادیب نہ بھی ہوتا تو بھی اتنے ہی سفر کرتا چنانچہ میں نے کیے کہ میرے لیے آوارگی جذبہ اول ہے اور اس کی روداد قلم بند کرتا ہوں تو لوگوں کو اپنے سفر میں شریک کرنے کے لیے اور اس سفر کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے۔ گویا میں ایک اور سفر پر نکل جاتا ہوں اور یہاں ایک سفرنامہ نگار دوسرے مسافروں سے کہیں زیادہ بخت والا ہو جاتا ہے کہ وہ دوبارہ ان ہی کیفیتوں' مسرتوں' اذیتوں اور مشقتوں اور خوب صورتیوں میں سے گزرتا ہے۔ کچھ طور میں نے غار حرا میں تو صرف ایک شب بسر کی۔ جو سرسری دیکھا تھا اس کی تفصیل میں گیا جو ان دیکھا تھا وہ بھی اسی کی تنہائی میں نظر آنے لگا۔ ایک شب کا ہیجان اور کیفیت سینکڑوں شبوں پر محیط ہو گئی تو گویا اب بھی۔ اس لمحے جب کہ اس شب کو گزرے ہوئے ایک برس ہو چکا ہے۔ میں ہنوز غار حرا کی رات میں ہوں۔"
تارڑ صاحب نے بے شمار سفر کیے بے جواز بھی' بے ارادہ بھی' اور جو تازہ سفر درپیش تھا۔ اس کے حوالے سے ان کے احساسات عجیب ہو رہے تھے وہ ان کیفیات کو سمجھنے کی تگ و دو میں تھے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں۔
"میں مخمصے میں پڑ گیا۔ بہت الجھ گیا۔ ہزاروں خواہشیں بے جواز ہو سکتی تھیں لیکن غار حرا میں رات بسر کرنے کی خواہش ہرگز بے جواز نہیں ہو سکتی تھی۔ جواز اگر میرے پاس نہ تھا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ جواز نہ تھا۔ وہ مقام بذات خود ایک جواز تھا اور اس نے میرے اندر یہ خواہش بھری تھی۔"
اور یہ خواہش ذرا سوتے سے جاگ اٹھی۔
اور اب میں آپ کو دل کی اس بات میں شریک کرتا ہوں۔ جوں ہی جدہ ایئرپورٹ پر اترا ہوں۔ پہلا قدم رکھا ہے تو گویا سو کلومیٹر دور جبل نور کے دامن میں جا قدم رکھا ہے تو میرے پاؤں میں شدید خوف ایک

آکاس بیل کی مانند لپٹ گیا ہے۔ ان میں ڈر بھر گیا ہے۔ ایسا ڈر جو رینگتا ہوا میرے پاؤں سے سر تا ٹانگوں کے راستے میرے دل کے گرد پہنچ کر ایک آسیب کی مانند مسلط ہو جاتا ہے اور پھر اس ڈر سے سیاہ کونپلیں پھوٹتی ہیں اور بڑھتی جاتی دماغ کے ان خلیوں کے گرد لپٹتی جاتی ہیں، جن میں غار حرا میں ایک رات بسر کرنے کا خبط مقیم ہے۔"

☼ ☼ ☼

ایک مہم جو، ڈر خوف، وسوسہ پس پشت ڈال دیتا ہے اور ارادے کی تکمیل کے لیے کمربستہ ہو جاتا ہے۔ گو میں سیاح، در حقیقت ایک روحانی سفر کی جستجو رکھتا تھا اور روح کی مسافرت اتنی آسان نہ ہو سکتی تھی۔

"بس یوں سمجھ لیجیے کہ جادہ میں قدم رکھتے ہی میں یکدم شدید طور پر یوں خوف زدہ ہو گیا کہ یہ میں کیا سوچتا رہا ہوں۔ یہ میں کیسے سوچ سکتا تھا کہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم راتیں بسر کرتے تھے۔ میں؟ وہاں رات بسر کروں۔ جہاں جبریل امین بہ نفس نفیس اترے اور ہم کلام ہوئے..... وہاں میں؟ جو غریب با انسان گزر چکے کہ جو اربہا انسان اس روئے زمین پر موجود ہیں۔ ان سب نے جس کتاب میں شک نہیں اس پر سر جھکائے اور اس کتاب کا پہلا نازل ہونے والا حکم "اقرا" پڑھا اور پڑھتے ہیں تو جہاں وہ نازل ہوا اس مقام پر..... جہاں جن پتھروں پر حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ہاتھوں کا مس ہوا۔ ان کے سانس ان پر تھم ہوئے۔ جہاں وہ سوال کرتے تھے۔ ان کے ذہن میں جو سوال جنم لیتے تھے ان کے جواب چاہتے تھے۔ بیٹھتے تھے۔ سوتے تھے اور جاگتے تھے تو میں وہاں؟..... انسان بے شک دیوانگی کی ہر سرحد عبور کر جائے لیکن اس سرحد کے پار اگر یہ مقام ہو تو اس کی دیوانگی میں بھی خلل آ جائے گا۔ وہ رک جائے گا..... ڈر جائے گا۔"

☼ ☼ ☼

اور پھر یہ سفر شروع ہوا جس کی تیاری کچھ آسان نہ تھی۔ دل و روح کی تازگی کے ساتھ ساتھ 'اپنی توانائیاں مجتمع کرنا تھیں۔ اور بار بار اس سفر کی راہ پر اپنا قدم رکھ کر پیچھے ہٹنے کے لیے۔

"دکار کی کشتی واپس جا چکی تھی۔ واپسی کے راستے مسدود ہو چکے تھے اور اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ آگے جایا جائے اور آگے جبل نور تھا۔ جس پر سائے طویل ہو رہے تھے، دامن کی دکانوں سے آگے ایک پکی سی سڑک اوپر اٹھتی بلند ہوتی تھی، کہیں وہ ادھر جاتی تھی..... کہیں سیمنٹ شدہ کچھ سے پاؤں میں آتے تھے اور کہیں سنگ ریزے..... چھوٹے پتھر اور روڑے..... میں آہستہ آہستہ سانس سنبھالتا چڑھتا جاتا تھا۔

یہ تو میں نے پہلے قدم سے ہی طے کر لیا تھا کہ میں بہت دھیرج اور اطمینان سے آہستہ آہستہ بڑھوں گا۔"

☼ ☼ ☼

اور یہ کشمکش کہ لوٹ جائے یا اوپر بلندی کا سفر کیا جائے۔ اپنے اندر کی دنیا، تخیل تھا۔ بلندی پر ایک مقام پر اگر آنکھوں کے آگے اندھیرے آ جائے

"میرے تن بدن میں ایک تھماؤ سا ہوم کیا تھا۔ ایک چکر آیا۔ ایک جنون سا اٹھا کہ آنکھوں کے سامنے دھند یوں پھیلی کہ میں اس چٹان کو فوراً" نہ تھام لیتا تو یقیناً" گر جاتا یہ کیا ہے؟ میں نے شدید خوف زدگی کا شکار ہو کر اپنے آپ سے پوچھا۔ ایسا پہلے تو کبھی نہ ہوا تھا۔ کسی بھی بلندی پر شدید ترین حالت میں بھی یوں بے اختیار نہ ہوا تھا یہ کیا ہے؟۔ بلندی ہے۔ تمہاری عمر ہے اور تمہاری حماقت ہے۔ مجھے واقعی آج تک اس قسم کا بے جان کر دینے والا چکر نہیں آیا تھا۔

میں نے بہت سنجیدگی سے نہت ٹھنڈے دل سے غور کیا کہ اگر بدن کی یہی کیفیت رہی تو کیا لوٹ جانا مناسب نہ ہو گا۔ ابھی تو فرش نگاہ میں تھا اور عرش کہیں بلندی پر فائز تھا۔ میں نے سوچا، چند قدم اور سہی۔ اتنا تردد کر کے آیا ہوں۔ اتنی تمنا لے کر آیا ہوں۔ ایک دھچکا لگا ہے تو فرار کے راستے سوچنے لگا ہوں تو ایک آخری کوشش تو کر دیکھوں۔ جیسے کہ کوئی چیونٹی بالکل قریب پا کر ایک مکمل طور پر ڈھے چکا کوہ نورد ایک اور قدم بھر طور کوشش کر کے اٹھا لیتا ہے..... میں حوصلہ ہارنے کو تھا کہ ایک اپاہج فقیر نے مجھے حوصلہ دے دیا۔"

☼ ☼ ☼

ہمت کی تھی، ارادہ باندھا تھا۔ حوصلہ، لگن، شوق، جستجو ساتھ ساتھ تھی۔ مگر منزل۔ اس بارے میں دیکھیے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔

"ویسے میں چڑھتا تو جاتا تھا لیکن سراسیمگی کے عالم میں پھونک پھونک کر قدم دھرتا تھا کہ کہیں میں عمر کے تابع ہو کر چکرا نہ جاؤں۔ لاچار نہ ہو جاؤں اور وہ مقام آ ہی گیا جو جبل نور کے دامن سے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے یہی منزل ہو۔ یہی آخری بلندی ہو۔ وہاں پہنچ کر کھلتا ہے کہ نہیں۔ ابھی تو منزل بہت دور ہے۔

اور منزل قریب تھی.....

آخری پتھریلا آخری قدم۔ اور میں جبل نور کی چوٹی پر ایستادہ چھپر تلے تھا۔ جوں ہی چھپر تلے گیا تاریکی بڑھ گئی، وہاں گھپ اندھیرا تھا، آسمان دکھائی نہ دیتا تھا کہ راستے میں چھپر حائل تھا۔"

☼ ☼ ☼

اور پھر وہ منزل آ گئی۔ جس کی جستجو تھی۔

"دوسری جانب سرنگ کے اختتام پر ایک ہلکی ملائم روشنی ظاہر ہو رہی تھی۔ جیسے سویر ہونے کو ہے اور دو چار قدموں کے بعد میں سویر میں آ گیا۔ اور جب میں اس سویر میں آیا تو گویا آج تک کائنات بھر میں جتنی بھی سویریں آ چکی تھیں ان سب میں سے ممتاز ایک ایسی انوکھی سویر میں آیا کہ میرا اگلا قدم ایک صحن میں تھا۔ جو کہ غار حرا کا صحن تھا۔

غار حرا در اصل۔ لغوی معنوں میں ایک غار نہیں ہے۔

غاریں تو ایک خاص ہیئت ایک مخصوص شکل رکھتی ہیں اور صدیوں سے غاروں کے طور پر پہچانی جاتی ہیں۔ جیسے موہڑا مرادو کی خانقاہ کے کھنڈروں کے عین اوپر پہاڑوں میں ٹیکسلا کی وادی میں ایک واضح غار ہے جس میں ہزاروں چمگادڑیں قیام کرتی ہیں اور وہ غار جانے کہاں اختتام پذیر ہوتی ہے۔

یا فرانس اور اسپین کی غاریں ہیں، جن میں قدیم عہد کے انسان کے مصوری کے نمونے محفوظ ہیں۔

اصحاب کہف کی غار تھی۔

یہ غار ویسی نہ تھی۔ پچھلے زمانوں میں۔ شاید لاکھوں برس پہلے کے زمانوں میں کسی زلزلے کے نتیجے میں۔ کسی قدرتی آفت کے اتھل پتھل کے باعث جیسے یہاں تک آنے والی سرنگ وجود میں آئی تھی۔ تقریباً" ایسی چند بہت بڑی بڑی چٹانیں گریں۔ یا انہوں نے مقام چھوڑا اور جب وہ ساکت ہوئیں تو ان کے درمیان میں کچھ جگہ بن گئی۔ ایک کھوہ وجود میں آ گئی..... بے ترتیبی سے اوندھے سیدھے پڑے پتھروں اور چٹانوں میں ایک خلا سا پیدا ہوا۔ چنانچہ حرا کی پہاڑی کی ڈھلوان پر اس کھوہ نے جنم لیا۔ جسے ایک باقاعدہ غار نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے اندر اتھاہ تاریکی تھی۔

تو میں اس غار میں تھا جسے ایک شمع نے اجالا تھا۔

میں شعوری طور پر کوئی بھی کیفیت اپنے آپ پر طاری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ جو کچھ ہوتا ہے، خود ہو اس میں میرا کچھ عمل دخل نہ ہو۔

میں اگرچہ ایک حالت سکون میں تھا۔ گہرے اطمینان میں تھا اور مسکراہٹ ابھی تک میرے لبوں سے رخصت نہ ہوئی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ عارضی ثابت ہوا۔ ایک دم مجھے اس ویران اور تاریک چٹانی آماجگاہ کے اندر پوری رات بسر کرنے کے خیال سے وحشت ہونے لگی۔ وہ ڈر پھر سے میرے اندر جڑیں پکڑنے لگا کہ اس مقام پر..... جہاں حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کھڑے ہوا کرتے تھے۔ میں کھڑا ہوں۔ جہاں جبرئیل امین آتے تھے۔ تو میں کیسے ایک رات یہاں "سہہ" سکوں گا۔ میں ایک ڈرپوک شخص ہوں۔ مجھ

میں نہ وہ وابستگی ہے اور نہ اجالا، جس کی روشنی میں مجھے یہاں سب کچھ دکھائی دیتا رہتا ہیں تو اندھیروں میں بھٹکنے والا تھا، مجھے یہاں کچھ دکھائی نہ دے گا۔ یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔۔۔؟"

☼ ☼ ☼

غار حرا کی بناوٹ کے حوالے سے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں۔

حرا کی غار کمال کی پوشیدگی تھی۔
حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے زمانوں سے بھی پہلے جو "حنیف" تھے۔۔۔۔ جو تلاش میں تھے۔ جستجو میں تھے۔ معاشرتی اور مروّج مذہبی اقدار سے مطمئن نہ تھے ایک بڑے آورش کے تمنائی تھے تو وہ سب سے الگ ہو کر غور و فکر کی دنیا میں غرق ہونے کے لیے اگر اس بلند مقام میں پناہ لیتے ہیں تو یہ قابل فہم تھا۔ جبل نور کی چوٹی سے ذرا نیچے ایک عمیق ڈھلوان میں تھوڑی سی جگہ ہموار اور چند آڑی ترچھی چٹانیں منہدم حالت میں ایک دوسرے کے سہارے قائم اور ان میں ایک کھوہ۔ اس میں صرف اتنی گنجائش کہ ایک شخص اطمینان سے لیٹ سکے۔۔۔ بیٹھ سکے یا عبادت کر سکے۔۔۔؟"

☼ ☼ ☼

تارڑ وہاں جا کر اپنی آنکھ ماضی کے دریچوں پر رکھ دیتے ہیں، جہاں تخیل کیا کچھ دیکھ رہا ہے اس کا بیان دیکھیے۔

"حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو چوٹی پر نہیں۔ غار حرا تک پہنچنا ہوتا تھا۔ اس لیے غالب امکان یہی ہے کہ وہ اس مقام سے جہاں زائر دائیں جانب مڑتے ہیں، وہ وہاں سے سیدھے بلندی کی جانب چڑھتے جاتے ہوں گے اور عین اس مقام پر جہاں میں بیٹھا تھا۔ اس تنگ سرنگ کے دہانے پر آجاتے ہوں گے۔ چوٹی سے انہیں کچھ غرض نہ تھی۔

یہ محض حساب کتاب ہے کہ کوہ نوردی کے حساب سے۔۔۔ شاید یہ سراسر غلط ہے اور وہ کسی اور رخ سے آتے تھے لیکن سب اشارے، سب گمان یہی گواہی دیتے ہیں کہ ادھر سے ہی آتے تھے اور اس سرنگ تک پہنچ کر جان لیتے تھے کہ غار اس کے پار ہے۔

یہاں پہنچ کر وہ اپنا سانس بھی درست کرتے ہوں گے۔۔۔ فوری طور پر سرنگ میں داخل نہیں ہو جاتے ہوں گے اور سانس درست کرنے کے لیے بھی یہی جگہ تھی۔ کھائی کے کنارے جہاں بنگالی کا چھپر تھا اور میں تھا۔

تو ان زمانوں میں نہ یہ چھپر تھا اور نہ میں تھا۔
اگر میں ہوتا۔۔۔ تو کیا ہوتا۔
اگرچہ میں کیسے ہو سکتا تھا۔ لیکن ہوتا تو کیا ہوتا۔"

☼ ☼ ☼

اس مقدس ترین مقام پر آنے کے بعد میں انہوں نے کیا کیا۔ اس کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

"غار میں داخل ہو گیا تو کچھ دیر کھڑا رہا۔ سر جھکا رہا۔ کیا کروں۔

ہونے کی تیخ کر رہا ہے۔ موقعا کبریت بجا تھا تو اب کیا کروں۔ حرا کی غار کے ہر پتھر ہر مسام اور ہر ابھار کو چوموں کہ وہاں تو ان کے لمس تھے۔ ان کے مس سرایت ہو چکے تھے اور ان سانسوں کی پھوار اپنے گالوں پر نمی چھڑکتے محسوس کروں۔ کیا کروں۔۔۔ بہت سے لوگ ہاتھوں میں کیلکولیٹر لیے پھرتے ہیں۔۔۔ اس مقام پر ایک نماز پڑھنے سے چالیس ہزار نمازوں کا ثواب ہو گا۔ یہاں دو نفل پڑھ لینے سے جنت کے محلوں میں جگہ مل جائے گی۔ ایسے لوگ جو مجھ سے برتر۔۔۔ عقیدے میں مجھ سے بڑھ کر پختگی رکھتے ہیں۔ کہیں ذرہ بھر گنجائش شک کی نہیں رکھتے، جن کا روز حشر کچھ حساب کتاب نہ ہو گا اور میرے تو رجسٹر کے رجسٹر کھل جائیں گے اور کوئی بھی بڑے سے بڑا چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ان میں سے میری بخشش کا کوئی ایک جواز بھی تلاش نہ کر پائے گا۔ میں تو شروع سے ہی حساب کے پرچے میں رعایتی نمبروں سے پاس ہونے والا تھا تو یہاں بھی کچھ حساب کرتا اسے کتاب کرتا میرے بس میں نہ تھا کہ میں بابا کے گھر میں پہنچ کر اپنے نامۂ اعمال میں نوافل اور نمازوں کے طویل اندراج کر لیتا۔ چنانچہ میں نے یہ پرچہ جو میرے بس میں نہ تھا خالی چھوڑ دیا۔ غار میں داخل ہوا تو مصلّے پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ دو نفل اور ادا کر لوں۔ وہ بھی کر لیے۔ تو اب کیا کروں۔ اب میں لیٹ گیا۔"

☼ ☼ ☼

غار حرا وہ مقدس مقام ہے۔ جہاں حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم خدا کی یاد میں، عبادت میں وقت گزارتے تھے۔ تارڑ نے وہ ایک رات وہاں گزاری اور رات کے ایک حصے میں کیا کچھ سوچا۔

"یہ جو رابطہ ہے میری تنہا ذات کا اس غار سے، اس کے صحن سے۔ ہر ایک پتھر سے اس میں دراڑ آجائے گی۔ اس لیے کیا ہے کار چاندنی کے تماشائی بنے لیٹے ہو۔ اگر کوئی عرضی پیش کرنی ہے تو ابھی کر دو۔ کچھ مانگنا ہے تو بس یہی وقت ہے۔ اگر کچھ پڑھنا ہے تو تنہائی ہے۔ اگرچہ کوئی تنہائی کا یہ سحر زائل ہو جائے گا۔ یکسوئی بکھر جائے گی۔ اگر کوئی آجاتا ہے تو تم اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ تم یہاں نہیں آسکتے بھائی صاحب۔ یہ میری غار ہے۔ اسے میں نے اپنا گھر بنا رکھا ہے۔ میں یہاں رہتا ہوں، تم نہیں آسکتے۔ یہ نہیں کہہ سکتے۔"

☼ ☼ ☼

ان لمحات میں ان کے دل کی کیا کیفیات تھیں؟ اس کے بارے میں وہ کہتے ہیں۔

"مسلسل نوافل، دعاؤں اور التجاؤں کے ساتھ میں باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ جی ہاں میں غار حرا میں بہت مؤدب ہو کر اپنی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں کو سنبھالتا نہ تھا بلکہ بڑے اطمینان سے زیر لب بڑبڑاتا باتیں بھی کرتا چلا جاتا تھا۔ مجھے عربی میں تو بہت کچھ یاد نہ تھا۔ تو کبھی اردو میں اہل دلی کی مانند لب و لہجے کا خیال کرتا کہ میاں ہم بھولے گا نہیں۔۔۔ اپنی نظر کو ٹھہرائے رکھنا ہاں اور کبھی انگریزی میں جو کچھ سوجھتا اور اکثر پنجابی میں کہ اس نے جتنے بھی پیغمبر اتارے، انہوں نے اپنی مادری زبان میں ہی اس کے پیغام دیے۔ چنانچہ جو کچھ بھی۔۔۔ اور جس زبان میں بھی مجھے سوجھتا تھا کہے چلا جاتا تھا۔۔۔ باتیں کیے جاتا تھا۔"

☼ ☼ ☼

اور پھر اس مقدس مقام سے واپسی کا سفر شروع ہوا۔

"مجھے یوں نفل ادا کرنے کی عادت ہی نہ تھی کہ پشت پر آوازوں کا شور ہو۔ منتظر لوگ ہوں جن کی بے چین آنکھیں میرے کندھوں کو جلاتی ہوں۔۔ ایک ہجوم ہو۔۔ میں نے اس مقام پر ٹھہرنے کے بہت بہانے بنائے۔ آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ الگ الگ کر کے پڑھتا کہ کچھ وقت لگے۔۔۔ سجدے میں گیا تو گیا ہی رہا، سلام پھیرنے کے بعد ہاتھ دعا میں اٹھائے تو غار حرا کے آخر میں جو شگاف تھا، جس میں سے ہلکی نامعلوم سی روشنی آرہی تھی اسے تکتا رہا۔ دعا کے بعد میں نے آس پاس کے پتھروں پر ہاتھ پھیرے۔ انہیں الوداع کہا۔"

☼ ☼ ☼

اس کتاب کا آخری پیراگراف جو اس سفر کا اختتامیہ بھی ہے۔

"نور کے پہاڑ سے اترتے ہوئے۔۔۔ میرا قیمتی تھیلا ہلکا ہو چکا تھا۔ بابا کی مانند میری پوٹلی میں جو خوراک تھی وہ میرے کام آچکی تھی۔۔ کھجوریں، پانی، دودھ، سینڈوچ اور ایک سیب اور میں بھی ہلکا، لطیف اور پر سکون ہو چکا تھا۔ کوئی تھکاوٹ نہ تھی جیسے ایک موسیٰ کوہ طور سے اترتے ہوئے سکون اور سرخوشی میں ہوتا ہے۔ ایسے میں جبل نور سے اس سویر اترتا تھا۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

عثمان وڑائچ (ایف ایم 103 کے پریزینٹر)

"کیسے ہیں عثمان! کیا مصروفیات ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ ایف ایم 103 کا پریزینٹر ہوں اور جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا تھا کہ ایک انٹرنیشنل کال سینٹر میں سپروائزر ہوں۔"

"پریزینٹر بننے کا خیال کیسے آیا؟"

"ہمارے کالج میں ایک نوٹس لگا تھا کہ پریزینٹر کی ضرورت ہے اس نوٹس کو پڑھ کر ہی ریڈیو اسٹیشن گیا تو معلوم ہوا کہ اس کام کے لیے ایک عدد آڈیشن کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے آڈیشن دیا اور اس کے بعد اپنا "سی وی" دیا لیکن وہاں پر اسٹیشن ڈائریکٹر "نوید وڑائچ" صاحب سے ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ ان سے تو ہمارے بہت اچھے فیملی تعلقات ہیں کیونکہ وہ بھی وڑائچ تھے اور میں بھی تو انھوں نے میری بہت مدد کی ایف ایم 103 میں آنے کے لیے۔ یوں سمجھیے کہ نوید وڑائچ کی وجہ سے ہی اس فیلڈ میں آیا۔"

"پہلے پروگرام کے وقت کیا محسوس کر رہے تھے اور کیا اسکرپٹ لکھ کر گیا تھا؟"

"میرا پہلا شو کمبائنڈ شو تھا اور میرے ساتھ لاہور کا ایک منفرد [illegible] تھا اور اس وقت [illegible] قسم کا کوئی اسکرپٹ نہیں تھا بلکہ لائیو [illegible] اور ایک بات آپ کو بتاؤں احساسات کیا ہونے تھے کیونکہ اس شو میں کچھ بھی نہیں تھا اور اس شو کے بعد مجھے دوسرا شو ملنے کی کوئی امید بھی نہیں تھی۔ لیکن مجھے دوبارہ چانس ملا اور پھر میں نے اپنے آپ کو منوایا بھی۔"

"کتنے سال ہو گئے آپ کو اس فیلڈ میں۔ اور کتنے دن چلتا ہے آپ کا پروگرام؟"

"تقریباً" تین سال سے میں اس فیلڈ میں ہوں۔ پہلے تو میں 103 میں سات دن مسلسل کرتا تھا لیکن میری مصروفیات کچھ اس طرح کی تھیں کہ پھر مجھے ویک اینڈ پہ شو کرنا پڑے۔ تو میں سنڈے نائیٹ کو شو کرتا ہوں رات بارہ سے دو بجے تک۔ "مڈنائٹ چیٹ" کے نام سے۔

"تو کن مصروفیات کی وجہ سے آپ نے ایسا کیا۔"

"مصروفیات کچھ یوں تھیں کہ لاہور میں جاب کرتا تھا اور مجھے فیصل آباد سے لاہور جانا پڑتا تھا اس لیے میں سنڈے نائٹ کو ہی شو کر سکتا تھا اس لیے فی الحال ایک ہی شو کر رہا ہوں۔"

"فیصل آباد سے لاہور اور لاہور سے فیصل آباد خاصا فاصلہ ہے۔ اور راستے میں اور کوئی تنگ کرے نہ کرے۔ پولیس ضرور تنگ کرتی ہے۔ آپ کے ساتھ ایسا کچھ ہوا۔؟"

"ایسا بہت دفعہ ہو چکا ہے۔ پولیس سے پالا پڑتا رہتا ہے اور میں اپنے پروگرام میں بھی اس کا ذکر کرتا رہتا ہوں۔ پولیس بہت اچھی ہوا کرتی تھی لیکن اب پولیس کو دیکھ کر غصہ آتا ہے کیونکہ پولیس کا رویہ اس طرح ہوتا ہے کہ جب تک انہیں کچھ دیں گے نہیں وہ ہماری جان نہیں چھوڑیں گے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ پورے ملک کی پولیس ہی کرپٹ ہے۔"

"جی ہاں بالکل اور میں نے اپنے پروگرام میں خاص طور پر کراچی کا ذکر کیا تھا کہ میرے ایک دوست کراچی [illegible] بتایا کہ کراچی کی پولیس اتنی ایمان دار ہے کہ اگر انہیں 100 روپے دو تو انھوں نے 90 روپے فولڈ کر کے رکھے ہوئے ہوتے ہیں جو وہ آپ کو واپس کر دیتے ہیں۔"

"آپ کے دوست نے غلط کہا ہے' کراچی کی پولیس اب اتنی بھی ایمان دار نہیں ہے۔ خیر اتنا کماتے ہیں خرچ بھی اسی طرح کرتے ہیں کیا؟"

"ہر گز نہیں۔ میں بہت سوچ سمجھ کر خرچ کرتا ہوں۔ اپنی کمائی کو فضول خرچی میں نہیں اڑا دیتا۔"

"سفر کے دوران کوفت کب ہوتی ہے؟"

"جب سگنل پہ کھڑے ہونا پڑتا ہے۔ بندہ ردھم میں جا رہا ہوتا ہے کہ ایک دم ریڈ لائٹ آن ہو جاتی ہے۔ پھر انتظار کا یہ لمحہ بڑا بھاری ہوتا ہے جب لائٹ یلو سے گرین ہوتی ہے تو سکون ملتا ہے۔"

"آپ رات کو پروگرام کر کے گھر آئیں اور پھر آپ کو کوئی کہے کہ فلاں چیز لا دو تو؟"

"یہ چیز کی نوعیت پر منحصر ہے کہ کیا چیز منگوائی جا رہی ہے اگر میری پسند کی چیز بھی شامل ہوگی تو میں بھاگا بھاگا جاؤں گا۔ اور چیز لاؤں گا ورنہ سوری کر کے سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا جاؤں گا۔"

"آپ کافی عرصے سے ہیں اس فیلڈ میں کوئی یاد وابستہ ہو تو بتایئے۔"

"ہاں جی۔ ایک یاد آپ کو بتاؤں کہ آٹھ نومبر 2004ء کا دن میرے لیے بہت یادگار ہے۔ اس دن میری سالگرہ تھی اور میں پروگرام کر رہا تھا۔ بارہ بجے کے بعد ایک نہ رکنے والا فون کا سلسلہ شروع ہوا اور بے شمار لوگوں نے مجھے میری سالگرہ کی مبارک باد دی۔ اور میں چار گھنٹے تک آن ایئر لوگوں سے مبارکیں وصول کرتا رہا۔"

"آپ گھر میں بڑے ہیں۔ رعب کس پہ چلتا ہے آپ کا؟"

"بہنوں پہ...... میری تین بہنیں ہیں اور بہنیں ہی ایک ایسی ہستی ہوتی ہیں جن پر آسانی سے چیخا چلایا اور رعب جمایا جا سکتا ہے۔ ویسے ایسا نہیں کہ میں ہر وقت ہی چیختوں چلاؤں۔ مجھے اپنی بہنوں سے بہت پیار ہے۔"

"آپ کی اس بات سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ غصے کے تیز ہیں؟"

"جی ہاں۔ میں غصے کا تیز ہوں۔ اور اپنی یہ عادت مجھے خود بھی پسند نہیں ہے لیکن غصہ میرے اختیار میں بھی نہیں ہے۔"

"شوبز کے اسکینڈلز تو بہت مشہور ہیں۔ آپ کی آواز کی دنیا میں بھی اسکینڈلز بنتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ اس فیلڈ میں بھی اسکینڈلز بنتے ہیں اور بعض اوقات تو بندہ اسکینڈلز کو انجوائے کرتا ہے۔ اکثر لڑکیاں کہتی ہیں کہ آپ نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ یا اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا مگر اب وہ میری بات نہیں سنتا۔ تو بھئی میں تو ان کو جانتا بھی نہیں ہوں۔ میں شادی کا وعدہ کیسے کر سکتا ہوں۔"

"سارا دن کی مشقت کے بعد گھر آتے ہیں تو کیا خواہش ہوتی ہے۔؟"

"یہی کہ کوئی مجھ سے زیادہ بات نہ کرے بلکہ میں جو نیند کو ترسا ہوا ہوتا ہوں تو مجھے سونے دیا جائے۔"

"کبھی ڈپریشن ہوا؟"

"بہت مرتبہ۔ ایسی حالت میں میں گھر سے چلا جاتا ہوں اور مجھے بھوک بہت زیادہ لگنے لگتی ہے یعنی میں کھاتا بہت ہوں۔"

"لوگ تعریف کرتے ہیں یا تنقید؟"

"یہ سچ ہے کہ لوگ میری تعریف ہی کرتے ہیں۔ میری آواز کی بھی بہت تعریف کرتے ہیں اور میرے بولنے کے انداز کو بھی لوگ بہت پسند کرتے ہیں۔"

"اور کوئی خاص بات جو آپ بتانا چاہتے ہوں۔"

"ہاں جی۔ ایک خاص بات کہ نومبر کے مہینے میں ہی میری بہنوں کی سالگرہ ہوتی ہے اور نومبر کے مہینے میں ہی میری بھی سالگرہ ہوتی ہے۔ جبکہ ایسا شاذونادر ہوتا ہے کہ سب بہن بھائی ایک ہی مہینے کی پیدائش ہوں۔"

"واقعی ایسا بہت کم ہوتا ہے اور ایسا تب ہوتا ہے جب سب بہن بھائی ایک ساتھ دنیا میں آئیں۔"

مائرہ خان

"کیسی ہو مائرہ؟"

"اللہ کا شکر ہے بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

"بہت دبلی ہوتی جا رہی ہو۔ کیا کھاتی پیتی نہیں ہو۔"

"آپ مجھے اسمارٹ کہہ سکتی ہیں۔ دبلی نہیں کہہ سکتیں۔ کھاتی پیتی تو میں ہوں۔ مگر مصروفیات کی وجہ سے کبھی کبھی افراتفری میں کھانا پڑتا ہے۔ تو کبھی کم کھایا کبھی زیادہ۔ ویسے آپ کہہ رہی ہیں کہ مجھے خیال رکھنا چاہیے تو اوکے۔ اپنا خیال رکھوں گی۔"

"لگتا ہے کام بھی بہت زیادہ کرنے لگی ہو۔ تب ہی تو ہر ڈرامے میں نظر آ رہی ہوتی ہو۔"

"اس کا احساس تو مجھے بھی ہو رہا ہے کہ میں ہر وقت اسکرین پر ہوتی ہوں۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ ہر چینل سے سیریل چلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ سارا ریکارڈ کیا ہوا مال باہر آ جاتا ہے اور پھر جب وہ ختم ہو جاتا ہے۔ تو گیپ آ جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ جب میں غائب ہوتی ہوں تب کوئی نہیں پوچھتا۔ مگر جب آ رہی ہوتی ہوں تو سب ہی کہتے ہیں کہ کیا بات ہے بہت نظر آ رہی ہیں۔"

"گزرے زمانے میں بارہ پندرہ اقساط کے سیریل اور طویل دورانیہ کے کھیل ہوا کرتے تھے اب "سوپ" کا رواج چل پڑا ہے۔ تمہیں کیا پسند ہے؟"

"پسند تو مجھے تینوں چیزیں ہیں لیکن سوپ سے مجھے اب چڑ سی ہو گئی ہے کیونکہ اس میں تو کام بہت لگتا ہے کئی کئی سو اقساط پر مبنی سوپ ہوتے ہیں۔ سیریل اور طویل دورانیہ کے کھیل جنہیں اب ہم ٹیلی فلم کہتے ہیں مجھے اچھے لگتے ہیں اس لیے اب میں نے سوچا ہے کہ زیادہ تر ٹیلی فلمز اور سیریلز میں کام کروں گی۔"

"ٹیلی فلمز [illegible] ڈرامے [illegible] ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ اس لیے آج کل میری توجہ اس طرف ہے۔ عنقریب میری دو ٹیلی فلمز آن ایئر آنے والی ہیں۔ "بھید بھاؤ" کے نام سے اور "حسینہ" کے نام سے۔ دونوں میں میرے کردار بہت عمدہ ہیں اور بالکل نئے ہیں۔ یعنی ایسے ہیں جو بہت ہی کم لوگوں نے کیے ہوں گے۔"

"اچھا... کچھ بتاؤ ان کے بارے میں۔"

"بھید بھاؤ۔ میں لڑکی نما لڑکے کا کردار ہے۔ اس میں لڑکی کو اپنے لڑکی ہونے پر شرمندگی ہوتی ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ لڑکا بن جائے اور لڑکا بن کر عیش و عشرت کی زندگی گزارے اور حسینہ میں بنگال کی حسین لڑکی کا کردار ہے۔ دونوں ہی بہترین ہیں۔"

"تم خوبصورت اور اسمارٹ ہو۔ فلم کی ڈیمانڈ پر پوری اترتی ہو۔ جانے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں جی۔ فی الحال تو ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

مجھے ٹی وی کے ڈراموں سے ہی فرصت نہیں ہے تو فلم میں بھلا کیسے جا سکتی ہوں۔"

"اور فرصت مل جائے تو؟"

"تو بھی نہیں۔ ہاں شعیب منصور کہیں گے تو ان کی فلم میں ضرور کام کروں گی۔ ورنہ نہیں۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے اوٹ پٹانگ فلموں میں کام کرنے کا۔ میں تو کمرشلز میں کام نہیں کرتی حالانکہ کمرشلز میں ٹھیک ٹھاک پیسے ملتے ہیں۔ کمرشلز میں کام کرنا مجھے کچھ زیادہ پسند نہیں ہے۔"

"لوگ کہتے ہیں تم میں کچھ غرور آ گیا ہے۔ بات ہی نہیں کرتیں۔"

"غرور...؟ نہیں اللہ نہ کرے۔ غرور کس بات کا۔ شہرت تو آنی جانی چیز ہے اور یہ کام بھی ایک طرح جاب ہے اور میں بھی جاب ہی کر رہی ہوں۔ اور یہ کس نے کہا کہ میں بات نہیں کرتی۔ آپ بتائیں کہ کبھی ایسا ہوا کہ آپ کا فون آیا ہو اور میں نے بات نہ کی ہو۔"

"[illegible] ہیں اور تمہارے میاں نعیم کیسے ہیں۔"

"امی بھی ٹھیک ہیں اور نعیم بھی فٹ فاٹ۔"

"اب اجازت دو۔ تمہاری نئی ٹیلی فلمز دیکھ کر کال کروں گی۔"

"اوکے ڈیئر۔"

عائشہ خان

عائشہ خان جب اس فیلڈ میں نئی نئی آئی تھیں تو ہم نے ان کا انٹرویو کیا تھا پھر ہوا یوں کہ یہ منظر سے غائب ہو گئیں۔ پتہ یہ چلا کہ عائشہ نے یہ فیلڈ چھوڑ دی ہے۔ اب کچھ عرصے سے یہ تواتر کے ساتھ ڈراموں میں نظر آ رہی ہیں۔ سوچا کہ کچھ تازہ باتیں ہو جائیں۔

"کیسی ہیں عائشہ؟ اور فیلڈ میں دوبارہ آمد کو سب نے ویلکم کہا ہے۔ آپ کو خود کیا رسپانس ملا ہے؟"

"مجھے بھی بہت اچھا رسپانس ملا ہے۔ لوگوں نے میری آمد کو پسند کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اب آجکل میرے پاس بہت کام ہے۔ کئی سیریلز انڈر پروڈکشن ہیں تو کئی سیریلز آن ایئر ہیں آپ تو دیکھ ہی رہی ہوں گی۔"

"ہاں۔ میں دیکھ رہی ہوں۔ "مانے نہ یہ دل" ہم ٹی وی سے آن ایئر ہے اور بہت مختلف رول ہے تمہارا دیگر کیے گئے کرداروں سے اور من و سلویٰ میں بھی تمہارا رول اچھا تھا مگر یہ بتاؤ کہ تم غائب کہاں ہو گئی تھیں؟"

"میں ڈرامہ سیریل مہندی کرنے کے بعد بیرون ملک چلی گئی تھی اور بیرون ملک جانے کا مقصد اپنی تعلیم کو مکمل کرنا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد میں پاکستان آئی اور جب میری آمد کی خبر سب کو ہوئی تو یقین کریں کہ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔"

"آپ نے پاکستان آ کر سب سے خود رابطہ کیا یا ویسے ہی سب آپ کی آمد کے منتظر تھے؟"

"جب میں پاکستان آئی تو شوبز کے لوگوں سے جن کے ساتھ میری اچھی خاصی دوستی ہے" ملاقات ہوئی تو سب کو پتہ چل گیا کہ میں پاکستان آ چکی ہوں تب پھر ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز نے مجھ سے رابطہ کیا اور پوچھا کہ آپ کام کریں گی۔ میں نے کہا Why not بس تو پھر یہ خبر پھیلتی چلی گئی کہ عائشہ خان آ گئی ہیں اور

وہ کام کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔"

"پاکستان آنے کے بعد کون کون سے سیریل آن ایئر آچکے ہیں اور کن پر مزید کام ہو رہا ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ پہلا سیریل "مقدس" چلا تھا جو میں نے زیبا بختیار کے ساتھ کیا تھا۔ اس کو زیبا بختیار نے ڈائریکٹ کیا تھا اور ہمایوں محبوب نے پروڈیوس کیا تھا اس کے بعد من و سلویٰ چلا اور اب ماننے نہ دل آن ایئر ہے۔ اور مزید جو کام ہو رہا ہے اس میں یاسر نواز کا سیریل ہے جاوید فاضل صاحب کا سیریل ہے۔ کچھ کے لیے بات چل رہی ہے۔"

"اچھا خاصا کام آپ کر رہی ہیں۔ گھر والوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوتا ۔۔۔ گھر والوں کو ٹائم دے پاتی ہیں۔"

"اچھا خاصا کام نہیں ہے بس کام ہے۔ ورنہ تو لوگ مجھ سے زیادہ کام کر رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اس فیلڈ میں جو لڑکیاں ہیں۔ وہ تو بہت زیادہ کام کر رہی ہیں۔ جہاں تک گھر والوں کی بات ہے تو میرے والدین نے مجھے اجازت دی ہوئی ہے۔ ہاں وہ اگر کہیں گے کہ کام نہیں کرو یا کم کرو تو پھر یقیناً میں ایسا ہی کروں گی۔"

"آپ تھک نہیں جاتیں کیا؟"

"کام کوئی بھی ہو خواہ جاب ہو یا کچھ اور جس میں محنت ہوگی تھکن تو ہوگی۔ اور محنت کا جو ریٹرن ملتا ہے وہ بھی دیکھیں کہ کتنا مزہ آتا ہے گھر میں فضول وقت گزار کر تھکنے سے تو بہتر ہے کہ بندہ کام کر کے تھکے تاکہ کچھ حاصل تو ہو۔"

"آپ نے بتایا کہ آپ پڑھنے کے لیے ملک سے باہر گئی تھیں۔ آپ کیا پڑھ کر آئی ہیں؟"

"میں نے آرکیٹکچر اور انٹیریر ڈیکوریشن میں ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ اور اس کو ان شاء اللہ پریکٹیکل لائف میں بھی استعمال کروں گی۔"

"اس فیلڈ میں آنے کے لیے خوبصورتی کا حصہ کتنا ہے؟"

"خوبصورتی ایکسٹرا کوالٹی ہے۔ اصل خوبصورتی تو آپ کی صلاحیت ہے۔ اگر آپ کے اندر اداکاری کے جراثیم نہیں ہیں تو خوبصورتی کتنی دیر چلے گی۔ آخر آپ کو لوٹ کر گھر واپس جانا پڑے گا۔"

"شہرت کیسی لگتی ہے' پہچانے جانے پر کیا احساسات ہوتے ہیں؟"

"شہرت کا اپنا مزہ اور اپنا ہی نشہ ہے مگر اس وقت حاصل ہوتی ہے جب آپ اپنی [illegible] آپ کو منوا لیتے ہیں لوگ پہچانتے ہیں عزت کے ساتھ بلاتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے اور آپ یقین کریں کہ اتنے سال گزرنے کے باوجود میری پہچان "معندی" سیریل ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سیریل مقبول بھی بے انتہا ہوا تھا۔"

"ماڈلنگ چل رہی ہے؟"

"ہاں۔ مگر کم کم۔ کیونکہ یہ میرا ایم نہیں ہے۔ مجھے اداکاری کا جنون ہے اور جتنا جنون ہوگا اتنا ہی زیادہ اچھا میں پرفارم کر سکوں گی۔"

"باہر کے خوبصورت ملکوں میں جا کر پاکستان آنے کے لیے دل مچلتا ہے یا وہیں رہنے کو دل چاہتا ہے؟"

"اگر وہیں رہنے کو دل چاہتا تو شاید میں اپنی تعلیم مکمل کر کے باہر اچھی سی جاب کر رہی ہوتی اور مزے کی زندگی گزار رہی ہوتی لیکن پاکستان ہمارا اپنا ملک ہے اس لیے باہر کی خوبصورتی نہیں اپنے ملک کی آزادی کے لیے دل مچلتا ہے اس لیے ہی واپس آگئی ہوں۔"

کچھ یادیں کچھ باتیں

بابر علی

شاہین رشید

بابر علی فلم اور ٹی وی کا وہ فنکار ہے کہ جس کے کریڈٹ میں بہت سی کامیابیاں ہیں۔ اس نے جب اس فیلڈ میں قدم رکھا تو کامیابیوں نے اسے ویلکم کہا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شہرت، دولت نے اس کے قدم چومے۔ نئی زندگی کا آغاز اس نے ٹی وی سے کیا۔ اور قاسم جلالی نے تاریخی سیریل "لبیک" میں محمد بن قاسم کا رول کر کے اسے امر کر دیا۔ اس کے بعد بابر علی نے چند ڈراموں میں کام کیا اور فلم کی راہ لے لی۔ ہمیں یاد ہے کہ جب بابر علی اس فیلڈ میں آئے تھے تو ان کا سب سے پہلا انٹرویو ہم نے ہی کیا تھا، جب انہوں نے محمود خاور (مرحوم) کے سیریل "کنول" میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ پھر یہ فلموں میں چلے گئے تو ہمارا ان سے رابطہ نہیں ہوا۔ اتنے اچھے فنکار کا فلم میں چلے جانا۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے لیے اچھا ثابت ہوا ہو لیکن صرف ٹی وی کو پسند کرنے والوں کو افسوس ہوا۔ ان میں ایک ہم بھی شامل تھے۔ ہمارے خیال میں۔ خیر اب بابر علی کی ٹی وی میں واپسی ہو چکی ہے اور یہ کئی ڈراموں میں کام کر رہے ہیں بابر علی کی شخصیت میں ٹھہراؤ اور بردباری ہے جو ان کو دوسرے فنکاروں سے ممتاز کرتی ہے۔

"کیا بچپن سے ہی اداکار بننے کی خواہش تھی جیسا کہ عموماً فنکاروں کو ہوتی ہے؟" ہم نے پہلا سوال کیا۔

"جی ہاں، عموماً فنکار لوگ یہی کہتے ہیں کہ ہمیں تو بچپن سے ہی شوق تھا اداکار بننے کا۔ اور اسی لیے ہم اداکار بن گئے۔ جبکہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہے میں نے تو بچپن میں کچھ بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے کیا بننا ہے۔"

"تو کیا چلتے چلتے یونہی اداکاری کے میدان میں گئے؟"

"سچ تو یہی ہے کہ اچانک ہی اس میدان میں آ گیا۔ میدان کی بات کی تو آپ کو بتاؤں کہ مجھے بچپن میں کرکٹ سے بہت لگاؤ تھا اور اگر اداکار نہ بنتا تو یقیناً ایک اچھا کرکٹر بنتا کیونکہ میرے ٹیم کی سب ہی تعریف کرتے تھے۔"

"کرکٹ میں کیا رجحان تھا آپ کا؟ بیٹنگ یا باؤلنگ؟"

"میں بیٹنگ بہت اچھی کرتا تھا اور وکٹ کیپنگ کا بہت شوق تھا۔ اگر کرکٹر بنتا تو ان دونوں خوبیوں کے ساتھ بنتا۔"

"جس فیلڈ میں آپ جا نہ سکے اور جس میں آپ چلے گئے ہیں۔ دونوں میں ہی بہت پیسہ ہے۔ اس لحاظ سے تو آپ کی ہیں۔"

"جی ہاں۔ بالکل۔ اللہ نے دولت، شہرت سب کچھ ہی عطا کر دیا ہے۔"

"آپ اداکار بننا نہیں چاہتے تھے مگر بن گئے۔ کیسے؟"

"بہت سمپل سی کہانی ہے۔ کراچی کے ایک بڑے ہوٹل میں ورائٹی پروگرام ہو رہا تھا جس میں ٹی وی کے نامور فنکار اور ڈائریکٹر بھی آئے ہوئے تھے۔ معین اختر کمپیئر تھے۔ میں اس زمانے میں ایک خوبرو نوجوان تھا۔ جب معین اختر کمپیئرنگ کر رہے تھے تو ان سے ملنے کی خاطر میں اسٹیج پہ چلا گیا۔ مگر مجھ سے کچھ زیادہ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ اب اتفاق دیکھیں کہ کیمرے نے یہ سب کچھ نوٹ کر لیا، اس پروگرام کا جب پرومو چلا تو مجھے بھی دکھایا گیا۔ اب پتہ نہیں کہ قاسم جلالی اور حیدر امام رضوی کو مجھ میں کیا نظر آیا کہ انہوں نے اس پروگرام کے حوالے سے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ اور اس طرح میں اس فیلڈ میں بغیر کسی منصوبے کے آ گیا۔"

"جب آپ سے رابطہ قائم کیا گیا تو آپ نے کیا سوچا؟"

"یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ قاسم جلالی صاحب نے بلایا باتیں کیں پھر آڈیشن لیا اور کہا کہ ہم ایک تاریخی سیریل کر رہے ہیں۔ اس کے ایک اہم کردار "محمد بن قاسم" کا رول آپ سے کروائیں گے۔ میری تو خوشی کی انتہا نہیں تھی۔"

"آپ نے کہا نہیں کہ آپ کو اداکاری نہیں آتی؟"

"کہا مگر انہوں نے کہا کہ یہ ہمارا کام ہے۔ اس زمانے میں میرے بال بھی لمبے تھے اور اس زمانے کے لوگوں میں بال لمبے کرنے کا فیشن تھا۔ اس لیے شاید میں ان کو اس کردار کے لیے فٹ نظر آیا۔ "لبیک" سیریل بہت کامیاب رہا۔ اس کے بعد محمود خاور مرحوم کا سیریل "کنول" کیا اور پہلے ہی سیریل نے میرے لیے راستے ہموار کر دیے۔ اس کے بعد حیدر امام رضوی کا سیریل "ننگے پاؤں" کیا اور بس۔"

"پھر چل سو چل والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ گھر والوں نے مخالفت کی؟"

"جب تک میں ڈراموں میں کام کرتا رہا کوئی مسئلہ نہیں ہوا کیونکہ میں نے ڈراموں میں بہت اچھے رول کیے تھے ہاں جب فلم کی طرف قدم بڑھایا تو والد صاحب نے اعتراض کیا۔ اور ناراض بھی ہوئے مگر پھر مان گئے اور کچھ نہیں کہا۔ بس ایک بات کی شرط رکھی کہ رات نو بجے کے بعد گھر سے نہیں نکلنا اور نو بجے تک گھر پہنچ جانا ہو گا۔ اور میں نے ایسا ہی کیا۔"

"پہلی فلم کون سی تھی کیا رسپانس ملا تھا؟"

"پہلی فلم "جیوا" تھی جو کہ سید نور صاحب نے بنائی تھی اور میں پہلی ہی فلم میں ہیرو تھا۔ فلم بے حد کامیاب ہوئی تھی اور بہت ہی اچھا رسپانس ملا تھا۔ یہ فلم میں پہلی کامیابی تھی، پہلی سیڑھی تھی اور پھر اس کے بعد ایک کے بعد ایک فلمیں ملتی رہیں۔"

"پہلی فلم کس سال ریلیز ہوئی اور اب تک کتنی فلموں میں کام کر چکے ہیں؟"

"پہلی فلم 3 مارچ 1995ء میں ریلیز ہوئی اور تب سے اب تک میں تقریباً ساڑھے تین یا پونے چار سو کے قریب فلموں میں کام کر چکا ہوں۔"

"ٹی وی چھوڑا، فلم میں آئے۔ فلم چھوڑی ٹی وی میں آئے اس کے پیچھے کیا کہانی ہے؟"

"ٹی وی سے فلم کی طرف آیا کہ میں فن اداکاری میں بہت آگے تک جانا چاہتا تھا اور ویسے بھی ہر ٹی وی فنکار کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ترقی کرے اور سلور اسکرین تک آئے۔ چنانچہ میں بھی فلم کی طرف آ گیا اور ٹی وی میں نے چھوڑا نہیں تھا، مصروفیت کی وجہ سے وقت نہیں دے پاتا تھا۔ اور فلم چھوڑ کر ٹی وی کی طرف اس لیے آیا کہ میں دیکھ رہا تھا کہ اب معیاری فلمیں نہیں بن رہی ہیں، اس لیے میں نے گیپ دیا۔ چھوڑا اسے بھی نہیں۔ جب فلمی مصروفیات کم ہوئیں تو ٹی وی سے آفرز آنا شروع ہو گئیں اور اب تو آپ کو پتا ہی ہے کہ کتنا کام کر رہا ہوں۔"

"دو تین سال آپ فلم انڈسٹری سے غائب رہے۔

اب دوبارہ آپ نے اس طرف قدم رکھا ہے۔ اب کیا تبدیلیاں آگئی ہیں؟"

"میں ٹی وی اور فلم دونوں کا فنکار ہوں۔ میں پھر فلم کی طرف واپس آیا ہوں اس لیے کہ میں اچھے لوگوں کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں تاکہ اس کی ساکھ بحال ہو سکے ویسے بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ اب پہلے کے مقابلے میں فلموں کا معیار کچھ بہتر ہو گیا ہے۔"

"آپ نے اردو اور پنجابی فلموں میں کام کیا۔ کہاں زیادہ مزہ آیا؟"

"مزہ کی تو بات چھوڑیں۔ پنجابی فلموں میں بھی کام کر کے اچھا لگا اور اردو میں بھی۔ مگر اردو میں زیادہ اچھا لگا کیونکہ پنجابی فلمیں حقیقت سے دور ہوتی ہیں۔"

"آپ اس فیلڈ میں کافی کام کر چکے ہیں اور کافی تجربہ بھی حاصل کر لیا ہوگا۔ ہمارے کئی فنکار ریٹائرمنٹ کے بعد یا اس فیلڈ کو اپنا پروفیشن سمجھ کر ڈائریکشن کی طرف آجاتے ہیں۔ آپ کا بھی ایسا کچھ ارادہ ہے کیا؟"

"جی ہاں۔ بالکل میرا بھی ایسا ہی ارادہ ہے لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد نہیں کیونکہ ابھی ریٹائرمنٹ میں بہت وقت باقی ہے میں تو عنقریب اس فیلڈ میں آنے والا ہوں۔ بحیثیت پروڈیوسر کے نہیں بحیثیت ڈائریکٹر کے اور ایک اچھی سی فلم بنانے کا ارادہ ہے جس کی ڈائریکشن میں خود دوں گا۔"

"کبھی نگیٹو رول بھی کیے آپ نے؟"

"کبھی؟ ...کیا مطلب ہے؟ میں تو نگیٹو رول کر چکا ہوں مگر فلموں میں۔ اب ٹی وی میں بھی نگیٹو رول کرنے کا ارادہ ہے اور مجھے شوق ہے کہ میں نگیٹو رول کروں کیونکہ اس میں کافی چیلنج ہوتا ہے پرفارمنس کا مارجن کافی ہوتا ہے۔"

"آپ کہہ رہے کہ آپ نے فلموں میں نگیٹو رول کیے ہیں۔ کن فلموں میں کیے اور کیا فیڈ بیک ملا آپ کو؟"

"میں نے جاوید شیخ کی فلم "یہ دل آپ کا ہوا" میں اور "مہندی والے ہاتھ" میں نگیٹو رول کیا اور مجھے اچھا فیڈ بیک ملا۔ اصل میں شائقین بھی اپنے پسندیدہ فنکاروں کو مختلف روپ میں دیکھنا پسند کرتے ہیں اس لیے میں نہیں چاہتا کہ لوگ کہیں کہ بابر علی ایک جیسے رول کرتا ہے بلکہ یہ کہیں کہ بابر علی کے کرداروں میں ورائٹی ہوتی ہے۔"

"انڈین فلموں میں کام کرنے کی پیشکش ہوئی؟"

"نہیں جی۔"

"ارے آپ جیسے ٹاپ کلاس ہیرو کو آفر نہیں آئی؟"

"سچ کہہ رہا ہوں کہ پیشکش نہیں ہوئی۔ اور اگر ہو بھی تو میں جانا پسند نہیں کروں گا' اس کا مطلب یہ نہیں کہ چونکہ مجھے آفر نہیں ہوئی' اس لیے میں ایسا کہہ رہا ہوں بلکہ میں تو کام کرنا ہی نہیں چاہوں گا۔ کیونکہ مجھے یہاں اپنے ملک میں بہت کام ہے۔"

"انڈیا میں بھی کبھار آرٹ فلمیں بھی بن جاتی ہیں۔ آرٹ فلموں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟"

"ہاں ایسا بندہ ہو گا جو آرٹ فلموں کو پسند نہ کرتا ہو گا۔ آرٹ فلموں کی اپنی ہی کلاس ہوتی ہے اگر مجھے کبھی کسی آرٹ فلم میں کام کرنے کا موقع ملا تو ضرور کروں گا۔"

"ہندوستان اور پاکستان میں آپ کے پسندیدہ فنکار کون ہیں؟"

"ہندوستان میں ایک ہی فنکار ہے نصیر الدین شاہ جو آرٹ فلموں کا بہترین فنکار ہے ویسے بھی مجھے اس کی پرفارمنس بہت اچھی لگتی ہے۔ شبانہ اعظمی بہت اچھی فنکارہ ہیں۔ اور پاکستان میں کسی ایک کا نام لینا دوسرے کو ناراض کرنا ہے۔"

"اب تو آپ بہت زیادہ جانی پہچانی شخصیت ہیں' ملک سے باہر کیا صورت حال ہے؟"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ اپنے ملک میں تو کسی بھی حلیے میں چلے جاؤ لوگ پہچان لیتے ہیں جبکہ باہر پہچان کا تناسب ذرا کم ہے لوگ پہچان لیتے ہیں مگر

انہیں کنفرم نہیں ہوتا کہ یہ میں ہی ہوں۔ ٹی وی کے حوالے فنکار زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ کیونکہ اب وہ پاکستانی چینل جو یہاں ہم دیکھتے ہیں باہر بھی دیکھے جاتے ہیں اور ہمارے ڈرامے بھی چلتے ہیں تو لوگ ڈراموں کے حوالے سے پہچان لیتے ہیں۔"

"ملک سے باہر ہمارا ڈرامہ کیا اب بھی مقبول ہے؟"

"میں نے دیکھا ہے کہ لوگ ہمارے ڈرامے اب بھی شوق سے دیکھتے ہیں' بے شک وہ پہلے والی بات نہیں رہی لیکن اب بھی ہمارا ڈرامہ شوق سے دیکھا جاتا ہے۔ اور لوگ ڈرامے دیکھتے ہیں تو ہمیں پہچانتے ہیں اگر نہ دیکھتے ہوتے تو کون ہمیں پہچانتا۔"

"اس مقام تک پہنچنے کے لیے کتنی محنت کرنا پڑی؟"

"آج جو مقام اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے' اس تک پہنچنے کے لیے لوگوں کو بہت محنت کرنی پڑتی ہے لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مجھے اس مقام تک پہنچنے کے لیے کوئی خاص محنت نہیں کرنا پڑی۔ میں نے جو چاہا حاصل کیا۔ میں جب کھیلتا تھا تب بھی کامیاب تھا۔ ڈراموں میں آیا تو کامیابی ملی۔ فلموں میں گیا تو اللہ نے وہاں بھی کامیابی دی۔ تو میں اپنے رب کا بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے مسلسل کامیابیاں دیں اور دے رہا ہے۔"

"عموماً" خاندان کا ایک بندہ اس فیلڈ میں آجائے تو پھر وہ اپنے خاندان کے سب ہی بندوں کو لے آتا ہے۔ آپ کے علاوہ کون ہے اس فیلڈ میں؟"

"کوئی نہیں۔ کیونکہ جب میں اس فیلڈ میں آیا تو مجھے تھوڑی سی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا مگر پھر سب سیٹ ہو گیا اور اگر کسی کو شوق ہوتا اور وہ آتا تو جس طرح مجھے تھوڑی سی مخالفت کے بعد سپورٹ ملی اسے بھی ملتی۔"

"اس فیلڈ میں خوبصورتی چلتی ہے یا سفارش؟"

"خوبصورتی ایکسٹرا پوائنٹ ہے۔ ٹیلنٹ ہمیشہ چلتا ہے اور سفارش ایک مرتبہ چلتی ہے۔ سفارش سے ایک مرتبہ تو اس فیلڈ میں آجائیں گے مگر جب آپ میں ٹیلنٹ ہی نہیں ہوگا تو کون آپ کو بار بار موقع دے گا اس لیے انسان کا باصلاحیت ہونا ضروری ہے۔"

"اب تھوڑا سا ذاتی زندگی کے بارے میں بتائیے کہ کب کہاں جنم لیا۔ کہاں سے تعلیم حاصل کی؟"

"میں یکم مئی کو کراچی میں پیدا ہوا۔ ویسے ہمارا تعلق سیالکوٹ سے ہے۔ میں نے گلستان شاہ عبداللطیف بھٹائی اسکول سے میٹرک کیا اور پھر نیشنل کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا اور اس کے بعد کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔"

"آپ پڑھائی میں کیسے تھے اور بہن بھائی آپ کے کتنے ہیں آپ کا نمبر کون سا ہے؟"

"پڑھائی میں اچھا تھا۔ اس لیے جب بچپن میں شرارتیں کرتا تھا تو زیادہ ڈانٹ مار نہیں پڑتی تھی اور بہنوں بھائیوں میں میرا نمبر آخری ہے' ویسے ہم پانچ بہن بھائی ہیں اور سب شادی شدہ ہیں۔"

"چلیں اور بتائیں کہ غصے کے تیز ہیں یا نرم؟"

"غصہ ایک فطری عمل ہے لہٰذا مجھے بھی غصہ آتا ہے۔ مگر ہر بات پر نہیں۔ اس وقت بہت غصہ آتا ہے جب کوئی بلاوجہ جھوٹ بولتا ہے۔ مجھے جھوٹ سے سخت نفرت ہے۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"

"فارغ اوقات ملتے ہی کہاں ہیں اور اگر قسمت سے کبھی وقت مل جائے تو پھر میری کوشش ہوتی ہے کہ وہ وقت میں اپنے گھر والوں کے ساتھ گزاروں۔"

"اور اب آخری سوال کہ اس ساری کامیابی کا کریڈٹ کس کو دیں گے؟"

"صرف اور صرف والدین کو۔ کیونکہ وہ اگر مجھے سپورٹ نہ کرتے تو شاید میں آج اس مقام پر نہ ہوتا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

نگہت جبیں

ڈاکٹر شہروز اور حرا کے جوڑے کو پورے خاندان میں آئیڈیل حیثیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر شہروز ایک نیک دل اور منجھے ہوئے سائیکاٹرسٹ ہیں جبکہ حرا اتفاقی کالج میں اکنامکس کی لیکچرار ہے۔ عمر اور عادل کی خوبصورت کلقاریاں ان کے گھر کی رونق ہیں۔ ڈاکٹر شہروز کے پاس ایک مشکل لیکن دلچسپ کیس آتا ہے۔ وہ اس عورت کو پہچان جاتے ہیں۔ انہوں نے اسے ایک بار پارک میں دیکھا تھا اور اس کی عجیب و غریب حرکتوں نے انہیں چونکایا تھا۔ یہ کیس ایک ایسی عورت کے متعلق ہے جس کی دگرگوں حالت اور آئے دن پڑنے والے دوروں نے اس کے شوہر کو پریشان کر رکھا تھا۔ اس عورت کا رویہ پہلے سیشن میں خاصا حوصلہ شکن رہتا ہے لیکن ڈاکٹر شہروز کی کوشش سے وہ ان پر اعتماد کر لیتی ہے اور پرت در پرت اپنے ماضی کے واقعات بیان کرتی ہے۔

وقارالحسن اور سارا نے محبت کی شادی کی تھی۔ وقار احمد کی یہ دوسری شادی تھی۔ پہلی بیوی مہرالنساء ہے جو وقار کی خالہ زاد بھی ہے۔ مہرالنساء کی زبان درازی اور بدتمیزی کی وجہ سے اس کے پہلے شوہر نے اسے طلاق دے دی تو وقار کی ماں نے وقار کو مجبور کیا کہ وہ مہرالنساء سے شادی کر لیں لیکن وقار کے ساتھ بھی اس کی نہ بن سکی۔ وقار نے سارا سے شادی کر لی تو مہرالنساء میکے چلی گئی۔ سارا کے ہاں ایک بیٹی ایمن پیدا ہوئی۔ وقار بہت خوش تھے لیکن اچانک سارا کا انتقال ہو گیا۔ ایمن ماں کی کمی بہت محسوس کرتی ہے۔ اس کی ضدی طبیعت وقارالحسن کو بے حد پریشان رکھتی ہے، اسے سنبھالنے کے لیے وقار نے خدیجہ بی کو اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے جو ان کی دور پرے کی رشتہ دار ہیں اور اپنے بیٹے، بہو سے ناراض ہو کر ان کے ساتھ

رہ رہی ہیں۔ وقار الحسن کی مستقل پریشانی کو دیکھتے ہوئے خدیجہ بی انہیں مہر النساء کو لانے کا مشورہ دیتی ہیں جس پر وہ ایک لمحے کو چپ رہ جاتے ہیں۔

ایمن کی بگڑتی ہوئی عادت وقار الحسن کو خدیجہ بی کا مشورہ مان لینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ مہر النساء سے ان کی دو بیٹیاں موموا اور جوجو ہیں جبکہ ایک بیٹا بابر پہلے شوہر سے ہے۔

مہر النساء وقار الحسن کے ساتھ آجاتی ہے۔ وہ وقار الحسن کے سامنے سارا سے اپنی بیٹیوں سے بڑھ کر اچھا سلوک کرتی ہے وقار الحسن، مہر النساء کی قربانیوں کو تہہ دل سے تسلیم کرنے لگتے ہیں، اس لیے مہر النساء کے پہلے شوہر کے بیٹے بابر کو بھی اپنے گھر لے آتے ہیں اور اپنے بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے ایمن اور پورے گھر کو مہر النساء کے حوالے کر کے بیرون ملک چلے جاتے ہیں۔

وقار الحسن کا جانا ایمن کے لیے اذیتوں کے نئے باب کا آغاز ثابت ہوتا ہے۔ تمام مراعات جو ایمن کو باپ کی موجودگی میں حاصل تھیں چھین کر گھر کے کاموں کی ذمہ داری اس کے سر ڈال دی جاتی ہے۔ ایمن، مہر النساء کے رویے کی اس تبدیلی پر بے حد پریشان رہتی ہے۔ ایک کے بعد ایک چرکا اسے پڑھائی میں بھی شکست کر دیتا ہے۔ اپنے دل کا حال وہ صرف اپنی سہیلی ثانو سے بیان کرتی ہے۔ مہر النساء موموا اور جوجو کے لیے ٹیوٹر طاہر محمود کا بندوبست کر دیتی ہیں جبکہ ایمن کو گھر کی ذمہ داریوں کے باعث پڑھائی میں شدید مشکل کا سامنا ہے۔

میٹرک کے رزلٹ میں موموا اور جوجو شاندار نمبروں سے پاس ہوئیں جبکہ ایمن بمشکل پاس ہو پاتی ہے۔ اس کے دل میں مہر النساء کے لیے کدورت کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ خدیجہ بی، ایمن سے ملنے آتی ہیں تو اسے سارا کا بریسلیٹ دیتی ہیں جسے وہ اپنے ہاتھ میں پہن لیتی ہے۔

ماڑہ کی منگنی میں ایمن کو مدعو کرتی ہے تو اس کا کزن عفان اس کی معصومیت اور خوبصورتی سے متاثر ہو کر پسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ بات مہر النساء کے علم میں آجاتی ہے۔ مہر النساء اپنے ایک رشتہ دار کی آمد پر کمرہ خالی کرنے کا حکم دیتی ہیں۔ ایمن کے انکار پر موموا اور جوجو اس کا تمام سامان اٹھا کر باہر پھینک دیتی ہیں۔ ساتھ ہی تیز بارش کا خیال کیے بغیر مہر النساء ایمن کو گھر سے نکال دیتی ہیں۔ ایمن محض مہر النساء کو اپنے باپ کی نظروں میں گرانے کے لیے بغیر سوچے سمجھے گھر چھوڑ دینے کا فیصلہ کرتی ہے۔

گھر سے نکل کر تیز بارش میں کوئی امان نہ پاتے ہوئے ایمن ایک گھر میں گھس جاتی ہے۔ وہ گھر طاہر محمود کا ہے جہاں وہ اپنے بوڑھے دادا کے ساتھ رہتا ہے۔ بابر ایمن کو زبردستی گھر لے کر جاتا ہے۔ تیز بارش میں وہیں اس کا بریسلیٹ گر جاتا ہے۔ جو دادا جی کو ملتا ہے جسے دیکھ کر وہ بری طرح چونک جاتے ہیں۔ یہ بریسلیٹ انہیں ماضی کی یاد دلاتا ہے۔ طاہر محمود بھی ایمن کے اس بریسلیٹ کو پہچان کر واپس ایمن کو دینے کے لیے مانگتا ہے تو دادا جی، ایمن کو دوبارہ گھر لانے کا کہتے ہیں۔

طاہر محمود، بابر کے کہنے پر بہت دقتوں سے ایمن کے کالج میں داخلے کا انتظام کرتا ہے جس پر ایمن مزید پڑھنے سے صاف انکار کر دیتی ہے۔ تاہم سر طاہر کے سمجھانے پر محض مہر النساء کو نیچا دکھانے کو کالج کا فارم بھر دیتی ہے۔ طاہر محمود ایمن کو پڑھانے کے لیے دادا جی کے پاس بھیجنے کی تجویز دیتا ہے جس پر ایمن فوری راضی ہو جاتی ہے اور اب ایمن گھر کے تمام کاموں سے کنارہ کش ہو کر مہر النساء سے دوبدو مقابلے پر اتر آتی ہے۔

پیسے چرانے پر ایمن اور مہر النساء میں زبردست معرکہ ہوتا ہے جس پر واویلا مچا کر ایمن، بابر کی ہمدردیاں سمیٹ لیتی ہے۔ بابر مہر النساء کو یاد دلاتا ہے کہ اس کا وقار الحسن سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ مہر النساء، بابر کی خاطر ایمن کے ہر معاملے سے لاتعلق ہونے کا عہد کر لیتی ہیں۔ ان کے رویے کی تبدیلی سے ایمن کو حیرانی ہوتی ہے۔

ابتدا میں دادا جی کا سخت انداز ایمن کو بے زار کرتا ہے لیکن بعد میں اسے دادا جی کی شخصیت دلچسپ لگنے لگتی ہے۔ وہ اپنے دل کا بوجھ ان کے پاس آکر ہلکا کرتی ہے۔

کالج میں پہلے ہی روز موموا، جوجو اور ایمن کی ملاقات فوزیہ (ناشی) سے ہوتی ہے جو جوجو اور ایمن کو ایک آنکھ نہیں بھاتی جبکہ موموا اس سے فوراً دوستی کر لیتی ہے۔ ایمن کی پڑھائی سے بے زاری بابر کو مشتعل کر دیتی ہے۔ وہ سر طاہر کو اسے سمجھانے کی ذمہ داری سونپتا ہے۔ پہلی بار طاہر کو ایمن کی خوبصورتی کا احساس ہوتا ہے۔ بابر اسے طاہر کے سامنے لاپروا حلیے میں آنے پر سخت سست

سناتا ہے۔

پھوپھو زاد عفان کے عقیدے پر ماڑہ اپنی والدہ اور پھوپھو کے ساتھ ایمن کے گھر آتی ہے۔ مہر النساء ان سب کی آمد کا مقصد جان کر بہت اچھی طرح پیش آتی ہیں جس پر ایمن خاصی حیران ہوتی ہے۔ تاہم تمام معاملہ وقار الحسن کی آمد تک مؤخر کر دیا جاتا ہے۔ ایمن اسے مہر النساء کی نئی چال سمجھتی ہے۔ وہ شام ڈھلے ٹیوشن کے لیے دادا جی کے پاس آتی ہے تو طاہر محمود اسے دھوکے سے اندر لے آتا ہے۔ اندر آکر اسے پتا چلتا ہے کہ اس وقت طاہر محمود کے علاوہ گھر میں کوئی اور موجود نہیں ہے۔

ایمن خوش قسمتی سے طاہر محمود کے چنگل سے بچ نکلتی ہے۔ طاہر محمود کو اپنی حرکت پر ندامت محسوس ہوتی ہے لیکن وہ بظاہر نارمل رہتا ہے۔ ایمن، دادا جی کے پاس پڑھنے نہیں آتی تو انہیں تشویش لاحق ہو جاتی ہے۔ طاہر محمود اپنی باتوں سے ایمن کو رام کر لیتا ہے۔

وقار الحسن کی اچانک آمد گھر بھر کو مسرور کر دیتی ہے۔ ایمن ان سے لیا دیا رویہ اپناتی ہے تو وہ ایمن سے وجہ دریافت کرتے ہیں۔ ایمن جذبات میں آکر اپنے آپ باتیں گوش گزار دیتی ہے جس پر وہ سکتے میں آجاتے ہیں۔ تاہم وہ مہر النساء سے اس بابت کچھ دریافت نہیں کرتے۔ تھوڑی سی پوچھ گچھ کے بعد ایمن کا رشتہ عفان سے طے کر دیا جاتا ہے۔ ایمن کے دل کی کلی کھل سی جاتی ہے۔ ایمن، دادا جی اور طاہر محمود کو اپنی منگنی کے متعلق بتاتی ہے اور یہ جان کر کہ دادا جی کی بیٹی کا نام سارا تھا، ایمن ٹھٹک جاتی ہے۔

منگنی والے روز سب ایمن کے جوڑے کی تعریف کرتے ہیں جس پر موموا کو جلاپا محسوس ہوتا ہے۔ موموا کے علاوہ ایک اور شخص ایمن کو دیکھ کر حسد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ شاید اسے اپنے اندر پنپنے والے جذبات کا ادراک اسی وقت ہوتا ہے۔ وہ طاہر محمود تھا جسے عین منگنی کے دن یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ایمن کو پسند کرنے لگا ہے۔ طاہر محمود لاابالی فطرت کا مالک ہے۔ وہ کوئی کام مستقل مزاجی سے نہیں کرتا۔ اپنی بدفطرتی سے مجبور ہو کر وہ ایمن اور عفان میں رنجشیں بڑھاتا ہے۔ ایمن کا معصوم ذہن اس کی عیاریاں سمجھنے میں ناکام ہے۔ وہ اسے اپنا محسن سمجھتی ہے۔ ان ہی دنوں نانا جی ایمن اور طاہر محمود کے سامنے یہ انکشاف کرتے ہیں کہ وہی سارا (ایمن کی ماں) کے سگے باپ ہیں۔ ننھیالی رشتہ دار کا میسر آنا ایمن کو سرشار کر دیتا ہے۔ مزید برآں نانا، ایمن اور طاہر کے مابین بڑھتی ہوئی بے تکلفی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ ایمن اپنے دل کی تمام باتیں نانا جی سے کرتی ہے۔ منگنی کے تحفے کے طور پر طاہر محمود، ایمن کو اس کا کھویا ہوا بریسلیٹ دیتا ہے جس پر وہ اس کی مشکور ہوتی ہے۔ نانا جی، ایمن کو طاہر محمود کے کمرے میں جانے سے منع کر دیتے ہیں جس پر حیران ہونے کے باوجود وہ مان جاتی ہے۔

شاہ میر ایک آزاد فطرت شخص ہے جو کسی معاملے میں حدود و قیود کا قائل نہیں۔ لندن میں اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ کیتھی کے گھر میں رہائش پذیر ہے۔ کیتھی اور شاہ میر میں دوستی سے بڑھ کر "تعلقات" ہیں جس پر شاہ میر کو کوئی شرمندگی نہیں۔ کیتھی اس سے عمر میں خاصی بڑی ہے۔ کیتھی کا باپ پاکستانی تھا جو اس کی کم عمری میں اس کی ماں کو چھوڑ گیا اس لیے اب وہ ہر پاکستانی سے نفرت کرتی ہے۔ شاہ میر کو بھی وقتاً فوقتاً وہ اس کی اوقات یاد دلاتی رہتی ہے۔ کئی سالوں سے شاہ میر کا پاکستان میں کسی سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ اسے اس وقت حیرت ہوتی ہے جب اسے پاکستان سے ایک خط موصول ہوتا ہے۔ یہ خط اسے ذہنی طور پر بے حد مضطرب کر دیتا ہے۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ اس کے دوست احمد علی کی کوششوں کے باعث پاکستان سے یہ نامہ آیا ہے۔ وہ احمد علی سے سخت لہجے میں باز پرس کرتا ہے۔ ان ہی دنوں جب کیتھی اور شاہ میر کا تعلق تقریباً اختتام پر ہوتا ہے کیتھی اسے ماں بننے کی نوید سناتی ہے جس پر شاہ میر کو جھٹکا لگتا ہے لیکن دوسرے ہی پل شاہ میر کیتھی کو شادی کے لیے پرپوز کر دیتا ہے جس پر کیتھی ششدر رہ جاتی ہے۔

18

راستہ بھول جائے

وہ بہت دیر تک کچھ بھی نہ بول سکی۔

"نہیں... کیتھی... آؤ نا... ہم شادی کر لیں۔" شاہ میر نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لیے۔ کیتھی نے محسوس کیا' وہ کانپ رہا ہے۔ اس نے نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے مرد کو دیکھا جس کے ساتھ اس نے دو سال کا عرصہ گزارا تھا اور جسے چند دن پہلے وہ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

وہ سامنے بیٹھا پُرامید نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

کیتھی نے اس کی نگاہوں کی عجیب سی کیفیت سے نظریں چرائیں اور ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔

"لیکن میں تم سے شادی کیوں کروں گی؟"

اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ چھڑائے۔

"ہماری کمٹمنٹ ختم ہو چکی ہے۔ تم اپنا سامان باندھ چکے ہو۔ آج کے بعد ہمیں ایک دوسرے سے نہیں ملنا تھا۔ اگر ہمارے درمیان یہ مصیبت..."

"پلیز... اسے مصیبت مت کہو۔" شاہ میر نے اسے بے اختیار ٹوکا۔

کیتھی نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ اسے لگا' وہ ایک بدلے ہوئے شاہ میر کو دیکھ رہی ہے۔

"میں مانتا ہوں' ہمارے درمیان اب کچھ بھی نہیں رہا۔ مجھے اعتراف ہے کیتھی کہ میں پچھلے کچھ عرصے سے تمہارے ساتھ زیادہ اچھا سلوک نہیں کر رہا ہوں۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جانے والا تھا مگر کیتھی! قدرت ایسا نہیں چاہتی۔ ہماری تقدیر میں کچھ اور رقم ہے۔ ہمارے درمیان سب کچھ ختم نہیں ہوا۔ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ یہ جو میرے اور تمہارے درمیان آ گیا ہے۔ اٹس سائن کیتھی کہ ہمیں ایک دوسرے سے دور نہیں ہونا۔ یہ ہمیں دور ہونے ہی نہیں دے گا۔"

وہ تیز تیز لہجے میں بولتا چلا گیا۔ گویا اسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ وہ سامنے بیٹھی عورت کو جس سے کل تک وہ شدید نفرت کرنے لگا تھا' کیسے قائل کرے۔

کیتھی نے بے حد اکتا کر اپنے چھوٹے سے پرس سے سگریٹ نکال کر اضطراری انداز میں سلگایا اور اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ باہر بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ وہ لمبے لمبے کش لیتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔

"بہت سال پہلے میرے باپ نے بھی اسی طرح میری ماں کی منت کی ہوگی۔"

ایک لمبا کش بھر کر دھوئیں کو گیلی سرد فضا کے حوالے کرتے ہوئے وہ تلخی سے مسکرائی۔

"اور میری ماں اس کی باتوں میں آ کر اس سے شادی کر بیٹھی۔ اب وہ کہاں ہے اور وہ میرا باپ...؟"

شاہ میر نے بڑے صبر سے اس کی تکلیف دہ خاموشی کو جھیلا پھر اٹھ کر اس کے عقب میں آ کھڑا ہوا اور ایک بازو آہستگی سے پھیلا کر خود سے قریب کر لیا۔

"عورت مشرق کی ہو یا مغرب کی' ممتا کا جذبہ ایک سا رکھتی ہے کیتھی! ماں بننے کی خوشی بڑی اچھوتی اور انمول ہوتی ہے۔ کیا تم اسے محسوس نہیں کرنا چاہتیں۔" کیتھی نے بالکل غیر محسوس انداز میں اپنے کسے اور تنے ہوئے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ گویا اس نے جذبات کو محسوس کرنے کی کوشش کی مگر اندر باہر سرد ویرانیاں سا تا تھا۔

"تمہارے ہاں کی عورت لمحہ لمحہ گن کر اس خوش خبری کا انتظار کرتی ہے کیتھرائن!" شاہ میر نے اس کے بالوں میں چہرہ چھپاتے ہوئے گرفت مضبوط کی۔

"میں تمہارے ہاں کی عورت نہیں ہوں شمیر...!" اس نے سگریٹ کا آخری کش لیا اور بچا ہوا حصہ کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔

"عورت تو ہو... کیتھی کیا تمہارا دل نہیں چاہتا' ہم ایک گھر بنائیں۔ ایک چھوٹا سا خوب صورت گھر جس

میں' میں' تم اور ہمارا بچہ..."

کیتھی تڑپ کر اس کی گرفت سے نکلی اور تیزی سے پلٹی۔ اس کی تیز نگاہیں شاہ میر کے چہرے پر جم گئیں پھر وہ پھنکاری۔

"تاکہ ایک دن تم بھی ہمیں چھوڑ کر چلے جاؤ۔ بالکل میرے باپ کی طرح۔ اس نے بھی تو یہی باتیں کی ہوں گی۔"

"سب ایک جیسے نہیں ہوتے کیتھی!" شاہ میر نے آہستگی سے کہا۔

"تم میں اس سے مختلف کیا ہے شمیر! کچھ بھی نہیں۔ تم بالکل ویسے ہی ہو۔ سوچو' جب تم ہمیں چھوڑ جاؤ گے اور میں بھی کسی سے شادی غالباً "جارج" ہی سے کر لوں گی تو اس بچے کا کیا ہوگا۔ پور چائلڈ' کیتھی کی طرح کسی ویلفیئر سینٹر میں پلے گا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا کیتھی! یہ تمہارے خدشے ہیں اور بالکل بے بنیاد ہیں۔" وہ بے بس ہو کر بولا۔

"شمیر! تم پیارے لڑکے ہو' ڈارلنگ بوائے۔ میں نے تمہارے ساتھ اچھا وقت گزارا مگر اب نہیں۔ ہمیں اچھے دوستوں کی طرح جدا ہونا چاہیے۔ سو گڈ بائے ڈارلنگ شمیر...!"

کیتھی نے ایک الوداعی بوسہ دیا پھر اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر عقب میں دھکیل دیا۔ گویا اپنے لیے رستہ چاہ رہی ہو۔

شاہ میر کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ ذرا سا لڑکھڑایا پھر گھٹنوں کے بل نیچے گر گیا۔ اس کے بازوؤں نے کیتھی کی ٹانگیں جکڑ لیں۔ کیتھی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی آہنی گرفت کے ساتھ بولتا چلا گیا۔ وہ رو رہا تھا' بول رہا تھا اور کیتھی کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔

"نہیں کیتھی! تم ایسا نہیں کرو گی... تم اسے نہیں مارو گی... وہ میرا اپنا آپ ہے... میرے وجود کا حصہ... میرے ہونے کا جواز... وہ میرا آنے والا کل ہے... میرا مستقبل' میرا نام و نشان... تم مجھے بے نشان مت کرو... تمہیں تمہارے خدا کا واسطہ ہے کیتھی...! میں تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں گا کہ میں نے تو اپنی جڑیں تمہارے وجود میں گاڑ دیں۔ کہیں اور چلا گیا تو بنجر ہو جاؤں گا... میں تمہارے اور اس کے لیے گھر بناؤں گا... ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے... شاہ میر تم سے وعدہ کرتا ہے کیتھی... اور اسے پال لے گا' تم پر بوجھ نہیں بنے گا... اسے ختم مت کرو... ورنہ شاہ میر ختم ہو جائے گا۔"

کیتھی خود کو چھڑانے کی کوشش میں اسے گالیاں دیتی اور اس کے بال نوچتی رہی مگر نہ شاہ میر کی گرفت کمزور ہوئی' نہ وہ بولتا بند ہوا۔ یہاں تک کہ کیتھی کو محسوس ہوا' وہ ہار رہی ہے۔ اس کی مزاحمت دم توڑ رہی ہے' آخری کوشش کے طور پر وہ حلق کے بل چلائی۔

"یو ڈرٹی باسٹرڈ..."

☼ ☼ ☼

احمد عالی نے تعجب سے دیکھا۔

وہ اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ نہ صرف موجود تھا بلکہ کام بھی کر رہا تھا۔ احمد عالی کے خیال میں آج اسے نہیں آنا تھا۔ شاہ میر نے بتایا تھا' وہ بغیر کسی نوٹس کے فیکٹری چھوڑ جائے گا اور آج فیکٹری کیا اسے تو اس شہر میں بھی نظر نہیں آنا چاہیے تھا لیکن وہ نہ صرف موجود تھا بلکہ کام بھی کر رہا تھا۔

"کیسے ہو شاہ میر...؟" احمد عالی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

شاہ میر نے چونک کر اسے دیکھا پھر مسکرا دیا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ احمد عالی نے بہت دنوں کے بعد شاہ میر کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔

”تمہیں تو آج جانا تھا۔“ احمد عالی پوچھے بنا رہ نہ سکا۔

”ہاں۔“ اس ایک لفظ سے وہ کچھ بھی نہ اخذ کر سکا اور شاہ میر کام میں مصروف ہو گیا۔ احمد عالی نے دیکھا۔ سپروائزر ان کی طرف آ رہا تھا' وہ اپنی مشین کی طرف بڑھ گیا۔ کام کے دوران بھی اس کا دھیان بھٹک بھٹک کر شاہ میر کی طرف جاتا رہا جو مگن سے انداز میں اپنی مشین پر مصروف تھا۔ آج اس کے انداز میں روز والا اضطراب نہ تھا بلکہ عجیب سی طمانیت تھی جو احمد عالی نے پوری طرح محسوس کی۔

”گھر چلیں۔“ آف ہونے پر احمد نے کہا۔ شاہ میر ذرا سا مسکرا دیا۔ اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

شاہ میر کو گھر جانے کی جلدی تھی۔ احمد متعجب سا اسے جاتا دیکھتا رہا۔ شاہ میر کچھ دور جا کر پلٹا۔ قریب آ کر کچھ دیر اپنی بڑھی ہوئی شیو کھجانے کے بعد کھنکھارا۔

”کیا تم مجھے کچھ رقم ادھار دے سکتے ہو۔ پے ملنے پر لوٹا دوں گا۔“

احمد عالی کا ہاتھ بے اختیار اپنی جیب تک گیا۔ والٹ میں جو کچھ تھا اس نے نکال کر شاہ میر کے حوالے کر دیا۔

”شکریہ دوست۔“

”شاید وہ یہ قرض لوٹانے کبھی نہ آئے۔“ اس نے نظروں سے اوجھل ہوتے شاہ میر کو دیکھ کر سوچا۔ اسے افسوس اپنی رقم جانے پر نہ تھا۔

”مگر اس نے یہ کیوں کہا' پے ملنے پر لوٹا دوں گا۔ کیا وہ مہینے کے آخر تک رکنے کا ارادہ رکھتا ہے؟“ ظاہر ہے اس کے سوالوں کا جواب دینے والا جا چکا تھا۔

باہر برف باری ہو رہی تھی اور کیتھی اپنے بستر میں دبکی موٹا کمبل اوڑھے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے کل سے بخار تھا اور شاہ میر نے ساری رات اس کے سرہانے جاگ کر گزاری تھی۔

شاہ میر نے اس کی جلتی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”کیسی طبیعت ہے؟“ بے حد نرم لہجہ۔

کیتھی خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔ تازہ شیو کی نیلاہٹیں اس کے چہرے پر نمایاں تھیں۔ اس کی آنکھیں نسبتاً کم سرخ اور چہرہ گزشتہ دنوں کی نسبت قدرے فریش دکھائی دیتا تھا۔

”تم آج دیر سے آئے؟“ وہ کروٹ بدل کر بالکل سیدھی لیٹ گئی۔ شاہ میر نے اس کے سر کے نیچے تکیہ ٹھیک کیا۔

”تم نے لنچ لیا۔ میں لزا سے کہہ گیا تھا۔“

”ہوں۔“

”کچھ لو گی۔“ وہ لفافے کھول کر چیزیں نکالنے لگا۔ کیتھی کے پسندیدہ سینڈوچ' پھل' کافی کا ڈبہ' ایک خوبصورت نیلا کوٹ۔

”تمہارے لیے۔“

کیتھی کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ انہوں نے گزشتہ دو سالوں سے بہت کچھ شیئر کیا تھا لیکن ایک ایک پونڈ کے حساب کے ساتھ۔

”مجھے اچھا لگا... سوچا تمہارے لیے خرید لوں۔“

"کتنے کا ہے؟" کیتھی کے منہ سے پھسلا۔

"قیمت کا کیا ہے' تمہیں اچھا لگا۔"

"ہاں۔" کیتھی نے آہستگی سے ہاتھ پھیر کر کوٹ کی نرماہٹ محسوس کی۔

"تم مجھے تحفہ دے رہے ہو۔"

"ہمارے ہاں شوہر اکثر بیویوں کو گفٹ دیتے رہتے ہیں۔" شاہ میر نے خوش گوار لہجے میں بتایا۔ کیتھی نے جھنجلا کر کوٹ ایک طرف ڈال دیا۔ اس نے ابھی تک شاہ میر سے شادی کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اچانک لگنے والی ٹھنڈ نے اسے بستر پر ڈال کر شاہ میر کو تیمارداری کا موقع دے دیا تھا اور وہ اسے یوں سنبھال رہا تھا گویا وہ کوئی ننھی سی بچی ہو۔

"تم میرے شوہر نہیں ہو۔" وہ تلخی سے گویا ہوئی۔

"تم نے شادی کے لیے کون سی تاریخ سوچی؟" شاہ میر کچن کی طرف جاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تم سے کس نے کہا میں تم سے شادی کر رہی ہوں؟"

"ہمیں زیادہ مہمان نہیں بلانے۔ تم جانتی ہو میرے پاس کچھ زیادہ سیونگ نہیں ہے۔ بس لزا' لیڈی مارگریٹ' احمد علی اور اس کی فیملی۔ تم کسے انوائٹ کرو گی؟" وہ کچن ہی سے بات کر رہا تھا۔

"جہنم میں جاؤ تم۔" کیتھی چلائی۔

"تم شادی پر کیسا لباس پہنو گی؟" وہ کافی اور سینڈوچز سمیت کچن سے برآمد ہوا۔

"میں تمہیں یہاں سے دھکے دے کر نکالوں گی۔" کیتھی نفرت سے گویا ہوئی۔

شاہ میر نے ٹرے ایک طرف رکھی پھر آخری لفافہ کھولا۔ اس میں سے ایک تصویر بے حد احتیاط سے نکالی۔ کچھ لمحے کمرے کی دیواروں کو دیکھنے کے بعد اس نے کلاک اتار کر ایک طرف رکھا اور اسی احتیاط سے تصویر دیوار پر ٹانگ دی۔ کچھ لمحے بے حد محبت سے تصویر کو دیکھنے کے بعد وہ کیتھی کی طرف پلٹا۔

"کیسی ہے؟"

کیتھی نے کچھ کہنا چاہا تو وہ دوبارہ گویا ہوا۔

"یہ میں ہوں کیتھی!"

کیتھی گم صم سی تصویر دیکھنے لگی جس میں ایک گول مٹول سا بچہ صرف نیکر پہنے تالاب سے نہا کر نکلا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں شادی کر رہا ہوں۔"

احمد عالی کے لیے یہ انکشاف اتنا اچانک تھا کہ وہ حیرت زدہ اس کا چہرہ دیکھتا رہا پھر اس نے شاہ میر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

"تم نے کیا کہا___ تم شادی کر رہے ہو؟"

شاہ میر نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ ابھی ابھی احمد کے گھر آیا تھا۔ فاطمہ انہیں کافی اور پیٹو کو کیز دے کر بچوں کو سلانے لے گئی تھی جن کے لیے وہ ڈھیر سارے چاکلیٹ لایا تھا۔

"او شاہ میر!" فرط جذبات سے احمد عالی کے ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے بے اختیار شاہ میر کو بھینچ لیا۔

"تم نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے دوست!"

"میں جانتا ہوں۔"

"تو تم اسی لیے اتنے مطمئن اور خوش دکھائی دے رہے تھے۔"

"اچھا.... تمہیں ایسا محسوس ہوا۔" شاہ میر نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"میں نے فاطمہ سے کہا تھا شاہ میر کے ساتھ کچھ خاص ہوا ہے۔"

"تم نے کہا تھا۔ تقدیر میری واپسی کے اسباب پیدا کر رہی ہے۔"

"ہاں کہا تھا۔" احمد عالی نے زور زور سے سر ہلایا۔

"لیکن ایسا نہیں ہوا۔" شاہ میر نے کافی کا بڑا سا گھونٹ بھرا۔ "تقدیر نے میری جڑیں اسی سرزمین پر گاڑ دی ہیں۔"

احمد عالی نے ناسمجھی سے اسے دیکھا پھر ہنس دیا۔

"مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم اپنی فیملی بنانے جا رہے ہو۔"

"تو ٹھیک ہے اسی اتوار کو میں اور کیتھی تمہارا انتظار کریں گے۔" وہ خالی مگ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیتھی....!" احمد عالی نے سر اٹھا کر تعجب سے اسے دیکھا پھر وہ اٹھ سا گیا۔

"تم کیتھی سے شادی کر رہے ہو؟"

"ہاں۔" شاہ میر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تم....." وہ کچھ کہتے کہتے رکا پھر کھڑا ہو گیا۔ وہ شاہ میر سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا اور شاہ میر اس کی الجھن جانتا تھا تب ہی آہستگی سے گویا ہوا۔

"پاک باز عورت کی تمنا وہ کرے احمد عالی! جو خود پارسا ہو۔"

احمد بمشکل مسکرایا پھر اس نے دونوں ہاتھ شاہ میر کے کندھوں پر رکھے۔

"بہرحال میں خوش ہوں شاہ میر!"

"میں جانتا ہوں۔" شاہ میر نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔ "تم میرے واحد دوست ہو۔"

"تمہیں اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو....."

"کچھ زیادہ نہیں۔" وہ تذبذب کا شکار ہوا۔ "بس شادی کے انتظام کے لیے کچھ رقم.... بخدا میں اب کہیں نہیں بھاگوں گا۔ سارا قرض لوٹا دوں گا۔ دراصل احمد! میں خالی ہاتھ ہوں۔ بہت بری عادت ہے میری۔ میں نے کبھی کچھ بھی جوڑ کر نہیں رکھا۔ بری عادت ہے نا!"

"ہاں' تمہیں اب اس عادت سے چھٹکارا پا لینا چاہیے۔" احمد عالی نے خوش دلی سے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کیتھی کے لیے سرخ جوڑا بنواؤں۔ میرا خیال ہے وہ دلہن بن کر پیاری لگے گی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" احمد نے تائید میں سر ہلایا۔ "لیکن کیا وہ سرخ جوڑا پہن لے گی۔"

"ہمارے ہاں دلہن یہی رنگ پہنتی ہے۔" شاہ میر نے سنجیدگی سے بتایا۔

"وہ تمہارے ہاں کی دلہن نہیں ہے۔" احمد عالی کہنا چاہتا تھا مگر کہا نہیں۔

"ٹھیک ہے۔ ہم صبح فاطمہ کو ساتھ لے کر کسی پاکستانی بوتیک پر جائیں گے۔ شاید وہاں تمہاری پسند کا لباس مل جائے۔"

احمد عالی واقعی ایک مخلص اور اچھا دوست تھا۔

گھونٹ گھونٹ گرم سوپ اپنے اندر اتارتے ہوئے کیتھی نے شاہ میر کو دیکھا۔ وہ کھڑکی میں کھڑا آدھی رات کے دھندلے اوراق پر نجانے کیا لکھ رہا تھا یا وقت کی تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیتھی کچھ نہ جان سکی لیکن جھرجھری ضرور لے کر رہ گئی کہ وہ اس سرد موسم میں ہلکا سا سویٹر پہنے کھڑا تھا۔

"کھڑکی بند کر دو شمیر! مجھے سردی لگ رہی ہے۔" اس نے ہلکی سی آواز میں کہا۔

شاہ میر نے فی الفور کھڑکی بند کی اور اس کے قریب آ بیٹھا۔ سوپ کا خالی پیالہ کیتھی کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے کیتھی کی پیشانی چھوئی اور بشاش لہجے میں بولا۔

"اب تو تمہارا بخار بالکل ٹھیک ہے۔"

"ہاں۔" کیتھی نے اس کا ہاتھ بہت عرصے بعد تھاما تھا اور بہت عرصے بعد ہی شمیر نے ہاتھ چھڑایا نہیں بلکہ ہولے ہولے سہلانے لگا۔

"تمہارے ہاتھ بہت ٹھنڈے ہیں۔" کیتھی نے کہا۔

"وہ بھی گرم ہو جائیں گے۔"

"تم نے اس بیماری میں میرا بہت ساتھ دیا۔"

پچھلے چند دنوں میں شاہ میر نے کیتھی کا جتنا خیال رکھا تھا' وہ اس کے سارے نہیں تو آدھے خیالات ضرور تبدیل کر گیا تھا۔ خواہش کی کونپل اس کے اندر ہی سر اٹھانے لگی۔ اگرچہ وہ اس کی خوشبو سے ابھی تک انجان تھی مگر شہر کے ہنگاموں سے دور پکی ہوئی گندم کے سنہری خوشوں سے بھرے کھیتوں میں گھرا اک چھوٹا سا گھر یاد آنے لگا تھا' جہاں اس کے ماں باپ نے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اس کے بے حد چھوٹے فارم ہاؤس میں دو سرخ گائیں' چند بکریاں اور بہت سی مرغیاں تھیں۔ کیتھی جانتی تھی' وہ کھیت' وہ گھر اور وہ فارم ہاؤس اس کے باپ کا نہیں بلکہ نانا کا تھا' جہاں اس نے اپنے بچپن کا بہت مختصر حصہ گزارا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"تمہارے بارے میں۔" اس نے ہلکا سا جھوٹ بولا۔

"کیا.....؟"

"تم میری زندگی میں آنے والے عجیب مرد ہو۔"

"اچھا....." وہ لیٹ گیا اور کمبل ٹانگوں پر ڈال لیا۔ اس کی نظروں کے سامنے اس کی تصویر [illegible] میں موجود ننھے شاہ میر کو نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ اس کی نگاہیں عقب میں موجود درختوں میں گھرے تالاب کے پانیوں پر تھیں۔ اسے محسوس ہوا کہ اچانک پانی حرکت کرنے لگا ہے۔ درختوں کی شاخیں ہواؤں کے زور پر لہرانے لگیں۔ اس نے واضح طور پر ہواؤں کی سرسراہٹیں سنیں۔ کیتھی نے آگے کو جھک کر اس کی کھلی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کی پھر بے اختیار پوچھا۔

"تم کون ہو؟"

"شاہ میر۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"پاکستان۔"

"کیوں؟"

یہ وہ سوال تھا جس کا جواب وہ ترنت نہیں دے سکتا تھا۔ یہاں ہونٹوں پر قفل لگ جاتے تھے۔ اس سوال سے آگے جواب نہیں' دلدل تھی۔ وہ اس دلدل میں اترتا چلا گیا۔ اس نے پہلی بار کیتھی کے سامنے اپنا آپ کھول کر رکھ دیا۔

"میری ماں' میرے باپ کی بچپن کی مانگ تھی۔ ہمارے ہاں رشتے یونہی طے ہو جاتے تھے۔ کچھ بھی دیکھے سوچے بغیر۔ عادات' خیالات' فطرت کی تو بات ہی کیا' عمروں کا فرق تک نہ دیکھا جاتا۔ ایک ننھی سی بچی کو جوان سال آدمی سے باندھنے کے لیے یہی جواز کافی تھا کہ خاندانی جائیداد باہر نہ جائے۔ خواہ اس کے لیے کسی کے

جذبات کا خون ہی کیوں نہ ہو۔ میرے باپ نے شادی اپنی مرضی سے کی۔" اس کے دھیان کی گرم دوپہر میں ماضی کے دریچے کھٹ کھٹ کھلتے چلے گئے۔

خاندان میں طوفان اٹھا لیکن فائدہ؟ یہ اس خاندان کی پہلی کہانی نہ تھی۔ یہاں پہلے بھی نوخیز جوانیاں رات کے اندھیروں میں سر پٹختے پٹختے ادھیڑ عمری کی منزلیں طے کرتی رہی تھیں۔ وہ اس خاندان کی پہلی لڑکی نہ تھیں۔ نہ یہ المیہ پہلا المیہ تھا۔

سو جب میرا باپ تین بچوں کا باپ بن گیا تو اس سے التجا کی گئی کہ وہ خدیجہ بانو کو بھی شرف قبولیت بخش دے اور اس نے یہ عنایت کر دی۔ وہ اسے اپنے گھر نہیں لے کر گیا مگر میرے ننھیال والوں کے لیے یہی کافی تھا کہ ان کی بیٹی شوہر والی ہے۔ کنواری بی بی بن کر گھر نہیں بیٹھی' میں اسی عنایت کی دین تھا۔ کچھ سال خدیجہ بانو کو برت کر یوں بھولا کہ کبھی ادھر کا رخ ہی نہ کیا۔ کسی کو کوئی فرق نہ پڑتا تھا مگر میں نے اس عورت کو ساری ساری رات روتے دیکھا تھا۔

وہ سمجھتی تھی' میں سو چکا ہوں۔ اس کے آنسو میرا چہرہ بھگوتے رہتے اور میرے اندر نفرت و بغاوت کے وہ بیج بوتے گئے جو میرے رخصت ہوتے بچپن کے ساتھ ساتھ تناور درخت بن گئے۔ میں نفرت کی آگ سے نیلو نیل ہوتا جا رہا تھا' جب اس شخص کی پہلی بیوی مر گئی۔ بچے اگرچہ چھوٹے نہ تھے مگر گھر کا انتظام و انصرام بکھرنے لگا تھا' تب ہی وہ شخص خدیجہ بانو کو لینے چلا آیا۔ میں نے لاکھ سر پٹخا کہ وہ مت جائیں مگر انہیں نہ ماضی یاد آیا' نہ ہی گزری ہوئی سفاک راتیں۔ میرا پیاسا' محروم بچپن تک بھول گئیں۔ انہوں نے کہا۔

"شاہ میر! میرے ساتھ چلو' وہ تمہارا باپ ہے۔ وہی تمہارا اصل گھر ہے۔ دیر سے سہی' تمہیں تمہارا جائز مقام ملنے جا رہا ہے۔ یہاں کیا ہے' تمہارے لیے کچھ بھی نہیں۔" میں نے کہا۔

"کوئی [illegible] پیدا ہوا تھا اور میری ماں تین جوان بچوں کی ماں بن کر میرے لیے مر گئی۔ میں نے وہ شہر ہی نہیں' ملک بھی چھوڑ دیا۔ نگر نگر بھٹکا ہوں' صحرا صحرا آبلہ پا سفر کیا ہے' بھوک کا عذاب سہا' مزدوری کی مشقت سہی۔ لوگ کہتے ہیں میں اپنے باپ جیسا ہوں۔ انا پرست' ضدی' ہٹ دھرم۔ شاید ایسا ہی ہو۔ خون کا اثر تو ہوتا ہی ہے۔ یہ سن کر مجھے تو خود سے ہی نفرت محسوس ہوتی تھی' تب ہی اپنے آپ کو تھکاتا رہا۔

؎ نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا

کبھی واپس جانے کی خواہش ہی پیدا نہیں ہوئی۔ شاید بے سمتی مجھے بھا گئی تھی۔ جو کمایا' خود پر اڑا دیا۔ سر چھپانے کا ٹھکانا ملا تو ٹھیک نہیں ملا تو جہاں رات ہوئی وہیں سو گئے لیکن اب میں تھکنے لگا ہوں۔ بھاگتے بھاگتے تھک سا گیا۔ دل چاہتا ہے اب لنگر ڈال دوں' کہیں رک جاؤں' تھوڑا سستا لوں۔ کیتھی! دل چاہتا ہے' ایک گھر ہو....."

کہتے کہتے اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

"شام ڈھلے گھر لوٹنے کی خواہش میرے قدموں میں بجلی بھر دے۔ میری بیوی دروازے پر میری منتظر ہو۔ مجھے دیر ہو تو فون کر کے پوچھے۔ یہ سب..... یہ سب..... یہ ساری خواہشیں اس آنے والے کی بدولت ہیں۔ اس نے مجھے روک لیا ہے' باندھ دیا ہے۔"

اس کے لہجے میں دبا دبا جوش بیدار ہوا۔

"کیتھی! محسوس تو کرو' سوچو۔ اس کی کلکاریاں' کھلکھلاہٹیں۔ اس کے نرم ہاتھوں کا لمس۔ اس کی معصوم آواز۔"

اس نے دھیرے سے کیتھی کی طرف کروٹ بدلی۔ وہ پوری آنکھیں کھولے اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی پرجوش سرگوشیوں نے کیتھی کے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑا دی۔ کوئی تھا جو اس کے اندر کروٹ بدلنے لگا۔

"وہ مجھے پاپا کہے گا اور تمہیں ممی۔ کیتھی! وہ یہاں میرے سینے پر سر رکھ کر سوئے گا۔ ہیں کیتھی، پرامس۔"

ایک خوش گوار سنڈے کو مقامی چرچ میں وہ دونوں رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ چرچ میں تقریب کیتھی کی خواہش تھی، جس پر شاہ میر نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کیتھی اپنے روایتی سفید لباس میں اپنی عمر سے کہیں کم اور معصوم دکھتی تھی۔ اسی سنڈے ایوننگ میں اسلامک سینٹر میں ان کا نکاح ہو گیا۔ شاہ میر کی خواہش پر کیتھی نے روایتی پاکستانی سرخ جوڑا پہنا تھا جس میں اس کی گوری رنگت دمک رہی تھی۔

"نئے جوڑے کے لیے پہلا ڈنر احمد عالی کے گھر۔" اسلامک سینٹر سے نکلتے ہی احمد نے اعلان کیا۔

"لیکن آخری ہرگز نہیں۔ ہم اکثر تمہیں تنگ کرتے رہیں گے۔"

سیاہ ڈنر سوٹ میں ملبوس شاہ میر بے حد مسرور و شاداں دکھائی دیتا تھا۔ لگتا ہی نہ تھا، یہ وہی وحشت زدہ، زندگی سے بے زار انسان ہے۔

انہوں نے واقعی ایک گھر کی بنیاد رکھ دی ہے۔

احمد عالی اور فاطمہ نے چپکے سے سوچا۔

☼ ☼ ☼

گاڑی گولی کی سی رفتار سے آگے بڑھی۔

ارد گرد گاڑیوں میں موجود لوگوں نے سر نکال کر جلی کٹی سنائیں۔ کچھ نے نوجوان نسل کی ایڈونچر پسند طبیعت کو کوسا۔

ایمن کے اندر ایک جنون سا بیدار ہوا۔ اس کا جی چاہا وہ یونہی گاڑی بھگاتی جائے۔ یہاں تک کہ زمین کا آخری کنارہ سامنے ہو اور خلا اس کا مقدر۔ سامنے آتے ٹرک کو دیکھ کر اس نے اپنے انجام کے بارے میں سوچا تو عین وقت پر اسٹیئرنگ گھما دیا۔

"کیا سوچ کر اس نے میری جگہ کسی اور کو دی۔"

ہنستا مسکراتا چہرہ نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

"وہ مجھ سے جان چھڑانا چاہتا ہے، وہ جو مجھ پر جان نچھاور کیا کرتا تھا۔"

سامنے سے آنے والوں نے اس کریزی ڈرائیور سے بچنے کے لیے اپنی اپنی سعی کی۔ اگر وہ بچ کر ذیلی سڑک پر نکل آئی تھی تو یہ اس کی لاشعوری کوشش کے ساتھ ساتھ اللہ کا معجزہ ہی تھا۔ وہ وہاں تک گئی، جہاں اس سڑک کا خاتمہ ہوتا تھا۔ سامنے کھیتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ سورج گول تھال کی شکل میں دھرتی کی ہریالی کو نارنجی رنگت میں ڈبوتا افق کے آخری کنارے کو چھو رہا تھا۔ چہار سو پرسکون سناٹا چھایا تھا جس میں گھر لوٹتے پرندوں کی سرسراہٹیں دم توڑ رہی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر جمائے تیز تیز سانس لیتی رہی۔ یوں لگتا تھا، وہ بہت دور سے دوڑتی ہوئی آ رہی ہے۔ تھوڑا وقت یونہی گزرا۔

پھر اتھل پتھل ہوتی سانسوں میں ہمواریت ظاہر ہوئی۔

اسٹیئرنگ پر جمی سخت گرفت کمزور پڑ گئی۔

تنے ہوئے اعصاب پر ماحول کی خاموشی اثر انداز ہوئی۔ یہی سناٹا دھیرے دھیرے اس کے اندر سرایت کر گیا۔ اس نے ہلکی سی سانس کھینچی، دونوں ہاتھ گود میں رکھ لیے اور خالی خالی نظروں سے افق کے کنارے کو دیکھنے لگی۔

آفتاب کا سفر ختم ہوا۔ وہ جاتے جاتے اپنے رنگ چھوڑ گیا تھا، جنہیں دھیرے دھیرے رات کی تاریکی نے نگلنا تھا۔

خیالات کی شوریدہ سری دم توڑ چکی تھی۔

"ہاں، وہ کر سکتا ہے۔ اس کے پاس جواز ہے۔ آخر ان گزشتہ سالوں میں، میں نے اسے دیا ہی کیا۔ بے توجہی، بے اعتنائی، بے رخی۔ یہی تحفے تو ملتے رہے اسے پھر شکوہ کیسا۔؟ اور کس سے۔۔۔؟" وہ ہارے ہوئے سپاہی کی طرح سوچ رہی تھی جس کے ہتھیار اس کے سامنے پڑے ہوں مگر نہ بازوؤں میں اٹھانے کی سکت ہو، نہ دل میں لڑنے کی خواہش۔

"ایمن بی بی! یہ ہار تم نے خود اپنے نصیب میں لکھی ہے۔ آغاز تم نے خود کیا تھا، اب انجام تو دیکھو۔" کھیتوں کے پار گاؤں کے گھروں میں روشنیاں جگنوؤں کی طرح ٹمٹمانے لگیں۔ اندھیرے کی چادر دھیرے دھیرے کھلنے اور کائنات پر پھیلنے لگی۔ تھوڑی دور کسی نے آگ جلائی۔ ایمن نے محسوس نہیں کیا۔ آگ کے گرد بیٹھے تین نفوس بار بار پلٹ کر گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہ تو اپنے دم توڑتے وجود پر خود ہی نوحہ کناں تھی۔ اندر کہیں واپسی کی خواہش ہوتی تو ہی حرکت کرتی۔ اسے تو احساس ہی نہ تھا کہ وہ کس طرف نکل آئی ہے۔ واپسی کا رستہ کون سا ہے۔

"پچھتاووں کا یہ سفر کہاں تک جائے گا ایمن!"

ایک سایہ سا کھڑکی کے شیشے پر لہرایا پھر کسی نے زور سے شیشے پر ہاتھ مارا۔ وہ بری طرح ڈر گئی۔

گاڑی کے شیشے کو زور زور سے کھٹکھٹاتے وہ کچھ کہہ رہا تھا۔

ایمن نے بوکھلا کر چابی گھمائی اور گاڑی اسٹارٹ کر لی۔

وہ اب دروازہ کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایمن نے گاڑی ریورس کی۔ وہ شخص لڑکھڑا کر پیچھے گرا۔ ایمن تیزی سے گاڑی نکال لے گئی۔

☼ ☼ ☼

ان کا خیال تھا کہ ماں جی کے لیے یہاں ایڈجسٹ کرنا ذرا مشکل ہو گا مگر ماں جی کے کسی بھی انداز سے ایسا محسوس نہ ہوا۔ وہ خاموشی سے اس گھر کی روٹین کا حصہ بن گئیں بلکہ ان کے آنے سے حرا کو دوہراہٹ مل گئی۔ فارغ بیٹھنے کی عادی نہ تھیں۔ حرا کالج جاتی تو اس کی غیر موجودگی میں ملازمہ کے سر پر کھڑی ہو کر صفائی کرواتیں۔ کھانا اپنی نگرانی میں پکواتیں بلکہ اکثر میٹھا اپنے ہاتھوں سے بناتی تھیں۔ بچے بھی اسکول سے آ کر ان ہی کے ساتھ لگے رہتے۔

بظاہر یہی لگتا تھا، وہ یہاں خوش ہی نہیں اور مطمئن بھی۔ اب یہ تو کوئی ان کے دل سے پوچھتا جو حویلی کی رونقیں بھولتا ہی نہ تھا۔

"لیموں کے پودوں پر پھول آ گئے ہوں گے۔" یوں ہی چلتے پھرتے لیموں کے پودوں کی ترش و خوش گوار مہک ان کا احاطہ کر لیتی۔

"موتیے کے جھنڈ تو سوکھنے لگے ہوں گے۔"

ہلکی سی مایوسی و اداسی دل میں اترتی، پھر ایک ایک کر کے گاؤں کی وہ ساری عورتیں یاد آنے لگتیں، جو ان کے پاس اپنے اپنے مسائل لے کر آتی تھیں۔

جائے نماز پر بیٹھی وہ تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں مگر ذہن تھا کہ ادھر ادھر ہی بھٹک رہا تھا۔ جب حرا نے جھانک کر پوچھا۔

"ماں جی! آپ فارغ ہو گئی ہیں تو کھانا لگا دوں۔"

انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مغرب کی نماز کے بعد وہ عموماً" وہیں جائے نماز پر بیٹھی رہتی تھیں۔ حرا نے کھانا لگایا۔ بچوں کو آواز دی پھر اسٹڈی میں چلی آئی' جہاں ڈاکٹر شہروز موٹی سی کتاب میں گم تھے۔

"کلینک سے نکلے' اسٹڈی میں گھس گئے۔ زندگی میں کچھ اور بھی ہے یا نہیں۔" اس نے کتاب بند کر کے اس پر دونوں ہاتھ رکھ دیے۔

"کیوں نہیں' میری زندگی میں بہت کچھ ہے۔ ہمہ وقت دعا کرنے والی ماں' دو پیارے پیارے شرارتی بچے اور ایک ہٹلر نما بیوی' جو ہمہ وقت میرے ہی پیچھے پڑی رہتی ہے۔"

"اس کے باوجود آپ ہاتھ کم ہی آتے ہیں۔ اب اٹھ جائیں کھانے پر انتظار ہو رہا ہے۔"

باہر سے بچوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ ڈاکٹر شہروز نے ہی اپنی چیزیں سمیٹ لیں۔

"اماں جی ٹھیک تو رہتی ہیں حرا؟" انہوں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بظاہر تو یہی لگتا ہے کہ ایڈجسٹ کر گئی ہیں۔"

"نہ بھی کر سکیں تو وہ بتائیں گی تھوڑا ہی۔"

"ہوں۔ کل شاہ زیب کا بھی فون آیا تھا۔"

دونوں باتیں کرتے ڈائننگ ٹیبل تک آ گئے' جہاں اماں جی بچوں کے ساتھ ہلکی پھلکی گفتگو کر رہی تھیں۔

"بچے آپ کے ساتھ بہت مانوس ہو گئے ہیں اماں جی!"

"وہ پہلے بھی میرے ساتھ خاصے مانوس تھے۔" وہ مسکرائیں۔

"اب آپ نے جانے کا نام بھی لیا تو یہ رونے لگیں گے۔" حرا نے کھانا سرو کرنا شروع کر دیا۔

"میں نے کب جانے کا نام لیا ہے۔ میں جانتی ہوں' مجھے اب واپس نہیں جانا۔" انہوں نے [illegible] ہاٹ پاٹ سے روٹی نکال لی۔

حرا اور شہروز ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے اماں جی! جب آپ کہیں گی' میں آپ کو لے چلوں گا۔ ہم تو صرف آپ کے تنہا رہنے کے خیال سے کہہ رہے تھے۔"

وہ چپ کر کے عادل کے منہ میں نوالے دینے لگیں۔ جب سے آئی تھیں' وہ ان ہی سے کھانا کھاتا تھا۔ ابھی پہلا نوالہ سب کے ہاتھ میں تھا' جب مسلسل ہوتی بیل نے انہیں ڈسٹرب کر دیا۔

"اس وقت کون آ گیا؟"

ڈاکٹر شہروز اٹھنے لگے تھے' حرا نے روک دیا۔

"کریم دیکھ لے گا۔"

کریم کے ساتھ آنے والی ہستی کو دیکھ کر جہاں باقی لوگ حیران ہوئے' وہیں ڈاکٹر شہروز پریشان ہو کر کھڑے ہو گئے۔

"ایمن۔۔۔ ! تم۔"

وہ بے حد پریشان اور حواس باختہ نظر آتی تھی۔ ننگے پاؤں اور جوتے ہاتھ میں۔

"وہ۔۔۔ میں۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے ہکلائی۔

"آؤ بیٹھو۔" ایک کرسی گھسیٹ کر اسے بٹھاتے ہوئے انہوں نے پانی کا گلاس بھرا۔

"وہ میرے جوتے ٹوٹ گئے تھے۔" ایمن نے حاضرین کی طرف شرمندہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے جوتے ایک طرف ڈال دیے۔

"تم پیدل آرہی ہو؟" ڈاکٹر شہروز نے دیکھا اس کے پیر گندے اور دھول سے بھرے ہوئے تھے۔

"جی۔ وہ۔۔۔ میری گاڑی۔۔۔" اس نے پانی کا گلاس لبوں سے لگالیا۔ وہ بیٹھی نہیں تھی' ایک ہاتھ سے کرسی کی پشت سنبھالے کھڑی تھی۔

"خراب ہوگئی؟"

ایمن نے پانی ختم کیا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"اس میں پیٹرول ختم ہوگیا تھا۔ آپ کا گھر نزدیک تھا اس لیے۔۔۔"

"تم گھر نہیں گئی تھیں۔" ڈاکٹر شہروز نے پوچھا تو ایمن نے شرمندگی سے گردن جھکائی۔

"کھانا کھاؤ گی؟" انہوں نے اس کے چہرے سے بھوک پڑھ لی تھی لیکن ایمن نے نفی میں گردن ہلادی۔ تب ہی ڈاکٹر شہروز کو باقی لوگوں کا خیال آیا جو منہ اٹھائے ان ہی کو دیکھ رہے تھے۔

"اماں جی! یہ ایمن ہے۔ میں اسے اسٹڈی میں لے جا رہا ہوں۔ حرا! ایمن کے لیے کھانا وہیں بھجوادو۔" ڈاکٹر شہروز نے محسوس کیا کہ وہ نہ تو وہاں بیٹھنے پر آمادہ ہے اور نہ ہی کھڑی ایزی فیل کر رہی ہے۔

"آؤ ایمن!" وہ اسے لے کر اسٹڈی کی طرف بڑھ گئے۔

"مما! یہ کون ہیں؟" بچوں نے اشتیاق سے دریافت کیا۔

"خاموشی سے کھانا کھاؤ۔" حرا نے ڈانٹا۔ ناگواری اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔ اماں جی نے بغور اسے دیکھا پھر سرسری انداز میں کہا۔

"شہروز کی مریضہ لگتی ہے۔"

"جی' اب تو مریضوں نے گھر کا رستہ بھی دیکھ لیا ہے۔" اگرچہ اس نے لہجہ سادہ ہی رکھا تھا مگر اماں جی جانتی تھیں' وہ اندر ہی اندر جھنجلا رہی ہے۔

"ٹرے بنادو' میں دے آتی ہوں۔" انہوں نے رسانیت سے کہا تو وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

"گھر والے پریشان ہو رہے ہوں گے۔" ڈاکٹر شہروز نے بے حد احتیاط سے پوچھا۔

"کون گھر والے۔ میرا شوہر۔۔۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔

"وہ اس وقت مجھے یاد کرنے کے لیے بالکل بھی فارغ نہیں ہے۔ خوب صورت چہروں کی سنگت میں مجھ جیسے بجھے ہوئے چہرے کسے یاد رہتے ہیں۔"

"میں اسے فون کر دوں۔" ڈاکٹر شہروز نے موبائل نکالا۔

"آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں' میں چلی جاؤں گی۔" وہ زور زور سے انگلیاں مروڑنے لگی۔

"ایمن! میں تمہارے لیے کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے بے حد نرمی اور رسانیت سے کہا۔ وہ چپ چاپ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر شہروز خاموشی سے باہر گئے۔ اماں جی ٹرے اٹھائے آرہی تھیں۔ وہ ذرا کی ذرا رکے۔

"آپ اسے کھانا کھلائیں' میں اس کے گھر والوں کو فون کر کے آتا ہوں۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کلینک پر آکر فائل میں مطلوبہ نمبر تلاش کر کے واپس آنے میں انہیں دس پندرہ منٹ لگے تھے۔ واپس آئے تو وہ کھانا کھا ہی رہی تھی۔ اماں جی پاس ہی بیٹھی تھیں۔ ڈاکٹر شہروز کو دیکھ کر اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔

"اور لونا۔" اماں جی نے شفقت سے اصرار کیا۔

"بس۔" وہ ٹشو سے ہاتھ صاف کرنے لگی۔ اماں جی نے سوالیہ نظروں سے شہروز کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اماں جی مطمئن ہوگئیں۔ ایمن اب سر جھکائے نجانے کیا سوچ رہی تھی۔

"کیوں! آج گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔"

وہ اس کے سامنے بیٹھ گئے۔ اماں جی ٹرے اٹھا کر باہر نکل گئیں۔

"آج میں نے اسے دیکھا۔" ایمن نے آہستگی سے سر اٹھایا تو آنکھیں لبالب پانیوں سے بھری تھیں۔

"اپنے شوہر کو' وہ کسی اور کے ساتھ تھا۔ وہ گاڑی میں اس کے برابر بیٹھی تھی' خوش اور مطمئن نظر آرہی تھی۔"

"تمہیں اچھا نہیں لگا؟"

"میرا گھر تباہ ہو رہا ہے۔"

ڈاکٹر شہروز نے پہلی بار اسے اپنے گھر کی فکر میں مبتلا دیکھا تھا۔ یہ ایک مثبت تبدیلی تھی۔

"تو تمہیں وہاں ہونا چاہیے تھا۔ اپنے گھر میں۔" انہوں نے آہستگی سے جتایا۔

"یہی تو المیہ ہے ڈاکٹر! کہ ایمن کبھی وہاں نہیں ہوئی' جہاں اسے ہونا چاہیے۔ ایمن نے ہمیشہ اپنی راہیں خود کھوٹی کی ہیں۔ جب مجھے عفان کی پناہ میں ہونا چاہیے تھا' تب بھی میں طاہر کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ ایمن کبھی وہاں موجود نہیں ہوئی' جہاں اسے ہونا چاہیے تھا' اسی لیے تو بے سکونی ہے۔"

ڈاکٹر شہروز ایک طویل سانس لے کر رہ گئے۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ ایمن خود ہی اپنی کہانی سنانے پر آمادہ ہے اور انہیں بہرحال اس بے وقت ٹپک پڑنے والی مریضہ کو اس وقت تک باتوں میں لگائے رکھنا تھا جب تک اس کے گھر سے کوئی لینے نہ آجاتا۔ گویا ایمن کا اگلا سیشن چند گھنٹوں کے وقفے سے ان کے گھر کے اسٹڈی روم میں شروع ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کچھ عجیب سی کیفیت میں وہ عفان سے ملنے گئی تھی۔ کوئی خاص تیاری بھی نہ کی۔ یونہی اٹھ کر چلی گئی۔ دروازہ مائرہ نے کھولا تھا۔

"تم۔۔۔" اس کے انداز میں گرم جوشی مفقود تھی۔

"ہاں میں۔"

وہ رستہ دے کر اندر چلی آئی۔ نہ سلام' نہ دعا' نہ آنے پر خوشی کا اظہار۔ ایمن اس کے رویے پر کچھ حیران ہوتی اندر آئی۔ اس کی مما البتہ حسب معمول گرم جوشی سے ملی تھیں۔

"ڈرائنگ روم میں مہمان بیٹھے ہیں' تم مائرہ کے کمرے میں چلی جاؤ۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ایمن کو اندازہ ہوگیا' مہمان کون ہے۔

"مائرہ کی طبیعت ٹھیک ہے۔" ایمن نے کچھ الجھ کر پوچھا۔

"ہاں' کیوں؟" انہوں نے پلٹ کر حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں' ویسے ہی سست لگ رہی تھی۔" ایمن ٹال کر مائرہ کے کمرے میں آگئی۔

"خیریت گھر آئے مہمان کے ساتھ ایسی بے رخی۔"

مائرہ نے قدرے سنجیدہ اور شاکی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور چپ رہی۔

"مس مائرہ! میں تم سے مخاطب ہوں۔" وہ یہاں آنے سے قبل ہی ذہنی خلجان کا شکار تھی۔ مائرہ کے رویے سے چڑ سی گئی۔

"سن رہی ہوں' بہری نہیں ہوں۔"

"تو اس طرح کیوں بات کر رہی ہو؟" ایمن کو غصہ آگیا۔ "واپس چلی جاؤں۔"

"مرضی ہے تمہاری۔"

ایمن کو غصہ تو شدید آیا مگر کچھ بے بس ہو کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ کچھ دیر دونوں کے مابین خاموشی چھائی رہی پھر مائرہ نے رخ بدل کر اسے دیکھا تو ایمن پوچھ بیٹھی۔

"اس طرح کیوں بی ہیو کر رہی ہو؟"

"تو کیا کروں' تم نے مجھے بہت شرمندہ کروایا ہے ایمی!"

"میں نے....." ایمن نے کچھ حیرت سے پوچھا۔ ذہن عفان کی طرف گیا۔ شاید اس نے کچھ کہا ہے' پہلا خیال یہی آیا تھا۔

"میں نے کیا کہا ہے؟" اس کا لہجہ خود بخود مدھم ہو گیا۔

"ایمی!" مائرہ نے فیصلہ کن انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "تم نے وہ سارے گفٹ کس کو دیے تھے؟"

"کون سے؟"

"انجان مت بنو' وہ سب کچھ جو تم میرے ساتھ جا کر خرید لائی تھیں جس کے بارے میں تم نے امی سے جھوٹ بولا کہ مائرہ کی برتھ ڈے ہے۔" وہ چبا چبا کر بولی۔

"اوہ..... تو تم اس لیے ناراض ہو۔"

"وہ سب کچھ عفان کے لیے نہیں تھا۔"

ایمن کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی پھر آہستگی سے بولی۔

"میں نے تم سے کب کہا تھا کہ وہ سب عفان کے لیے ہے۔"

"تو پھر وہ سب کے لیے تھا ایمن! اور میں..... میں بے وقوف عفان سے کہہ بیٹھی کہ ایمن نے آپ کے لیے بہت کچھ خریدا ہے۔"

ایمن کو عفان کی فکر نہ تھی کہ وہ اسے خود بتا چکی تھی۔

"تم نے خود ہی فرض کر لیا۔ میں نے بتایا تو تھا کہ....."

"ایمن! تم نے وہ سب کچھ کس کو دیا تھا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں کس قدر پریشان رہی ہوں۔ تم گھر میں بھی جھوٹ بول کر گئی تھیں۔" مائرہ واقعی پریشان تھی۔

"تم سے کس نے کہا؟" ایمن نے پوچھا۔

"تمہاری ممی نے اور کس نے ایمی..... ایمی..... بتاؤ..... تم نے وہ سب کس کو دیا؟"

مائرہ نے بے اختیار اس کے قریب آ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"تم مجھ پر شک کر رہی ہو مائرہ!" ایمن اپنا آپ چھڑا کر پیچھے ہٹی۔

"تم بتاؤ گی نہیں تو میں کیا کروں گی۔"

ایمن پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں نے وہ سب طاہر بھائی کو دیا تھا۔" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے بتا دیا۔

"کون طاہر بھائی؟" مائرہ کچھ لمحے کو غائب دماغ ہوئی پھر بری طرح چونکی۔ "وہ تمہارے ٹیوشن ماسٹر!"

"وہ صرف ٹیوشن ماسٹر نہیں ہیں۔" ایمن ناگواری سے گویا ہوئی۔ "وہ میرے کزن بھی ہیں۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔"

"میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں مائرہ!" ایمن کو غصہ آگیا۔ "لیکن تم میری واحد دوست ہو' اس لیے بتا رہی ہوں کہ طاہر بھائی میرے کزن ہیں اور ان کے دادا میرے نانا جان ہیں۔" اس نے مختصر ترین الفاظ میں باقی تفصیل سنائی۔

مائرہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی پھر ایمن کے چپ ہونے پر سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

"تم مجھے فلمی کہانی سنا رہی ہو۔"

"تم جو مرضی سمجھو۔" ایمن نے رکھائی سے کہا اور اٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی' جہاں سے پچھلا صحن دکھائی دیتا تھا۔

مائرہ متذبذب سی اس کی پشت کو گھورتی رہی۔

"اب عفان سے کیا کہو گی؟"

"میں ابھی عفان کے سامنے بھی جواب دہ نہیں۔ سمائرہ بی بی! ہماری صرف منگنی ہوئی ہے' نکاح نہیں۔ ابھی میں اپنے باپ کے گھر میں بیٹھی ہوں۔" ایمن کے لہجے میں تلخی در آئی۔

"عفان بھائی! تم سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" مائرہ نے اس کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ گویا عفان اس سے کہہ چکا تھا۔

"وہ خود جانتے ہوں گے۔ بہرحال ملنے کی خواہش میں نے نہیں کی تھی اور نہ مجھے یہ معلوم تھا کہ مجھے اپنے ہر عمل کے لیے ہر کسی کے سامنے یوں جواب دینا ہو گا۔"

"یہ بات نہیں ہے ایمن! دراصل تم جھوٹ بول کر گئی تھیں' اس لیے....." مائرہ نے صفائی دینا چاہی' ایمن نے تیزی سے اس کی بات قطع کی۔

"تم میرے حالات بہت اچھی طرح سے جانتی ہو مائرہ! اگر مہرالنسا بیگم کو معلوم ہو جائے تو کیا وہ مجھے اپنے ننھیالی عزیزوں سے ملنے دیں گی۔ وہ تو کیا شاید ڈیڈی بھی ایسا نہ چاہیں۔ میں انہیں کھونا نہیں چاہتی' کسی بھی قیمت پر نہیں اور تم لوگ ہو کہ میری اتنی سی خوشی بھی برداشت نہیں کر رہے۔"

مائرہ نے اپنے قریب عفان کی موجودگی کو محسوس کیا۔ مڑ کر اسے دیکھا پھر خاموشی سے باہر نکل گئی۔ وہ آہستگی سے چلتا ہوا ایمن کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔ ایمن چپ ہو گئی تھی۔

"کیسی ہو ایمی؟"

ایک بار تو ایمی کا دل ڈوب کر ابھرا پھر وہ تیزی سے پلٹی۔

باقی آئندہ شمارے میں

میمونہ خورشید علی

جب نبیل اماں سے لڑ کر گھر سے نکلا تو وہ رو رہی تھیں۔ آنسو صاف کرتے ہوئے اچانک ان کی نگاہ جھاڑو پہ پڑی، جو سیدھی کھڑی تھی۔ بس پھر کیا تھا اماں کی توپوں کا رخ میری طرف ہو گیا۔

"کم بخت کو ہزار بار کہا ہے جھاڑو کو سیدھا نہ کھڑا کیا کر اس سے گھر میں جھگڑا ہوتا ہے۔ مگر باز ہی نہیں آتی۔ نجانے کیا کروا کر رہے گی یہ لڑکی۔"

اماں کے ایمان و اعتقاد پہ حسب معمول مجھے ہنسی آنے لگی۔

"اس میں جھاڑو کا کیا قصور ہے؟ قصور تو آپ کی سوچ کا

مکمل ناول

"ہے نہ بیٹے کو سر پہ چڑھاتیں نہ آج یہ نتیجہ بھگتنا پڑتا۔" میں سوچ کر رہ گئی۔ اماں سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں جانتی تھی اماں ان توہمات پہ دل سے کاربند ہیں اسی لیے میں کچھ الٹا سیدھا ضرور کرتی رہتی۔ یہ سب کچھ کر کے میں دراصل ان محرومیوں کا بدلہ لیتی تھی جو مجھے بچپن سے ملی تھیں۔ بچپن سے ہی میں سب بہن بھائیوں سے مختلف تھی۔

بقول اماں کے میں ددھیال والوں پہ چلی گئی تھی اور ددھیال والے اماں کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ اس لیے اماں مجھ سے بھی محبت نہیں کرتی تھیں۔ رہی سہی کسر اس طرح پوری ہو گئی کہ میری پیدائش کے بعد ابا فوت ہو گئے۔

اماں کا بس نہ چلتا تھا کہ مجھ منحوس کو اٹھا کر باہر پھینک دیتیں۔ انہوں نے مجھے ایک طرف ڈال دیا اور یوں بڑی بہنوں نے مجھے پالا۔

اماں کی ناانصافیوں نے میرے اندر جارحیت اور ہٹ دھرمی پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میں کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اور اماں ان سے تو میرا ہمیشہ معرکہ رہتا۔ "نتیجتاً" وہ میری خوب ٹھکائی کرتیں۔ تب میں بہت چھوٹی تھی اور با آسانی اماں کے ہاتھ لگ جایا کرتی لیکن ذرا سی بڑی ہوئی تو جیسے ہی اماں جوتی اٹھاتیں میں گھر سے بھاگ جاتی اور گلی محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو جاتی۔ نبیل میرے ساتھ ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ گلی کے سارے لڑکوں سے میری ٹھیک ٹھاک دوستی تھی۔

نبیل مجھ سے ڈیڑھ برس ہی چھوٹا تھا۔ لیکن اماں کی بے پناہ توجہ اور باقی بہنوں کی محبت کی وجہ سے وہ بالکل چھوئی موئی اور ڈرپوک سا تھا۔

میری وجہ سے اسے بھی گلی میں کھیلنے کا حوصلہ ہو جاتا۔ پھر جب شام ڈھلے ہم دونوں گھر آتے۔ تو نبیل کو نہلا دھلا کر اسے صاف ستھرے کپڑے پہنا کر اماں اپنے ہاتھ سے مکھن کی چوریاں کھلاتیں اور مجھے وہی لعن طعن کی جاتی جس سے بچ کر میں گھر سے بھاگی تھی۔ مجھے اماں کا یہ دوہرا رویہ سخت برا لگتا تھا اور اپنی ان دونوں بہنوں کا بھی جو ہمہ وقت اماں کی چمچیاں بننے کی کوششیں کرتی رہتیں۔ مجھے اماں، صدف اور انیلا پہ ہی غصہ آتا تھا نبیل سے میری کبھی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ ڈرپوک اور بدھو سا تھا۔ اور اماں جو اسے چوریاں کھلاتی تھیں۔ وہ مجھے بچا کر، چھپا کر دے دیا کرتا۔ اس لالچ میں کہ میں اسے باہر لے کر جاؤں گی۔

اماں نے جب ہمارے درمیان اتنی دوستی دیکھی تو انہیں کوئی خیال آیا کہ ہم دونوں کو ایک ہی اسکول میں داخلہ دلوایا جائے۔ مقصد یہ تھا کہ ان کا اکلوتا لخت جگر محفوظ رہ سکے۔

اسکول جاتے ہوئے اماں مجھے خوب سمجھاتیں۔

"بھائی کا خیال رکھنا۔ دیکھنا دوسرے بچے اسے نہ ماریں۔ اسے پیاس لگے تو اس تھرموس سے پانی پلا دینا۔ یہ پکڑو یہ بھائی کا پراٹھا ہے اور یہ تمہاری روٹی۔ یہ پکڑو یہ بکس۔ بھائی کا بستہ لے کر تم آیا جایا کرو۔ بھائی ابھی چھوٹا ہے اور کمزور بھی بہت ہے۔"

یہ نصیحتیں میں گھر کے دروازے تک سنتی۔

باہر نکلتے ہی میں سب کچھ نبیل کو تھما دیتی اور اسے ڈنڈے سے ہانکتی ہوئی چلتی۔

بریک میں پراٹھا خود کھاتی۔ روٹی اسے کھلانے کی کوشش کرتی۔ وہ کھا لیتا تو ٹھیک۔ ورنہ روٹی بھی خود ہی کھا لیتی۔ وہ بازار کی چیزیں کھانے کا شوقین تھا۔ اماں جو پیسے دیتی تھیں۔ اس کی چیزیں لا دیتی اور وہ [illegible] خوش ہو جاتا۔

اس نے کبھی گھر آ کر اماں سے میری شکایت نہیں کی۔ کیونکہ اسے اچھی طرح پتا تھا جب بچے اسکول میں اسے مارتے تھے۔ تو میں بنا لحاظ کے ان کی ایسی ٹھکائی کرتی کہ وہ آئندہ کے لیے توبہ کر لیتے تھے۔ دوسرے مجھ سے جھگڑے کا مطلب تھا اسے گھر میں قیدی بن کر رہنا پڑتا۔

"نبیل یہ کھا لو، نبیل وہ کھا لو، نبیل اوپر نہ چڑھو، تیز نہ دوڑو، یہاں لیٹ جاؤ، چپ کیوں بیٹھے ہو۔"

تین عورتوں کی ان ہدایات کی وجہ سے نبیل بھی دل ہی دل میں فرار کے راستے تلاش کرتا تھا اور وہ فرار میں ہی اسے دلوا سکتی تھی۔ پرائمری دور تو گزر گیا۔ مڈل میں ہم دونوں علیحدہ ہو گئے۔ اماں تو نہیں چاہتی تھیں کہ ہمیں علیحدہ کریں لیکن میری اٹھان دیکھ کر انہیں اپنے دل پہ پتھر رکھنا پڑا۔

میرا قد یکدم ہی نکلتا چلا گیا تھا اور ایسا قد نکلا کہ میں نے صدف اور انیلا دونوں کو ہی پیچھے چھوڑ دیا۔ میں سمجھتی ہوں اللہ کے ہر کام میں ضرور انسان کے لیے بھلائی ہوتی ہے۔ اگر میرا قد کاٹھ نہ نکلتا تو مجھے اب بھی انیلا اور صدف کی

اترن پہننا پڑتی۔ لیکن اب معاملہ الٹ تھا۔ ہر گرمی سردی کے آغاز میں اماں کو سب سے پہلے میرے کپڑوں کی فکر ہوتی اور میں قدرت کے اس احسان پر دل و جان سے شکر گزار تھی لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ میں اپنی تمام کلاس فیلوز سے لمبی اور علیحدہ لگتی ہوں۔ میری آواز بھی کچھ بھاری سی تھی۔

اپنی ہم عمر لڑکیوں کو چھوئی موئی سا پا کر مجھے اندر ہی اندر احساس کمتری نے آ گھیرا۔ میرے اندر شدت سے خواہش ابھرتی کہ میں بھی ان تمام لڑکیوں کی طرح عام سی لڑکی ہوتی لیکن یہ احساس زیادہ دیر تک باقی نہ رہ سکا۔

پھر کالج میں داخلہ ہوتے ہی میری دوستی مہ سے ہوئی۔ مہ چھوئی موئی سی خوب صورت ترین لڑکی تھی۔ میں اس کی تعریف کیا کرتی لیکن وہ تو خود میرے قد کی دیوانی نکلی اور پھر مجھے معلوم ہوا۔ فقط وہی نہیں بہت سی لڑکیاں بہت سی ٹیچرز میری ہائٹ کو توصیفی نگاہوں سے دیکھتی ہیں اور یہ ہائٹ میری پہچان بن گئی ہے۔ قد میرا لمبا ضرور تھا لیکن نسوانیت کا میں مکمل پیکر تھی۔

اور اسی پر کشش شخصیت کا نتیجہ تھا کہ ٹیچرز نے مجھے کالج [illegible] میں ہیرو کا رول کرنے کا موقع دیا اور اس طرح میں پورے کالج میں مقبول ہو گئی۔

کالج کے ان چار سالوں نے میرے اندر کی اس لڑکی کو ختم کر دیا جو اپنے قد اور آواز کی وجہ سے احساس کمتری کا شکار ہوتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کب اور کیسے میری فطری جارحیت، ہٹ دھرمی نرم اور حساس سی طبیعت میں ڈھل گئی۔

بالآخر کالج کے چار سال بھی گزر گئے اور مجھے پھر گھر کی چار دیواری میں بیٹھنا پڑا۔ صدف کی شادی کے بعد انیلا کی شادی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ اماں نے ساتھ ہی مجھے بھی ٹھکانے لگانے کا سوچا اور میرے رشتے کے لیے ہاتھ پیر مارنے لگیں۔ لیکن اگر رشتے اس طرح آسانی سے ملنے لگیں تو کیا ہی بات ہے۔

یوں انیلا گھر سے اکیلی ہی رخصت ہوئی۔ اماں کو اس بات کا قلق تو بہت ہوا۔ پھر انہوں نے شاید یہ سوچ کر دل کو تسلی دی کہ مجھے ابھی تربیت کی ضرورت ہے۔

"یہ تم کالر والی قمیص کیوں پہنتی ہو۔ جب دیکھو نبیل کی ٹراؤزر اور شرٹ پہنے پھرتی رہتی ہو۔ محلے کی عورتیں میرے پاس آتی ہیں کیا کہتی ہوں گی کہ ساجدہ کی تیسری بیٹی لونڈا بنی پھرتی ہے۔"

"تو آپ کہہ دیں ناں ان سے کہ یہ بھی میرا بیٹا ہی ہے۔"

"توبہ توبہ توبہ۔" اماں نے ناگواری سے گال پیٹے۔

"اللہ کی پناہ، میرے لیے تو ایک بیٹا بہت ہے۔ اللہ اس کو زندگی دے۔" اماں کی بات پہ میں نے بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ اور نبیل کی موٹر سائیکل پہ ٹیک لگا کر جھولنے لگی۔

"ایسا بیٹا ہونے سے تو بہتر تھا کہ چوتھی بھی بیٹی ہی ہو جاتی۔"

میری بات پہ اماں کے دل پہ گھونسہ تو لگا لیکن دل ہی دل میں انہوں نے تائید ضرور کی ہوگی۔

ان کے بے جا لاڈ پیار کی وجہ سے نبیل بگڑتا چلا گیا تھا۔ نہ تو وہ میٹرک کے بعد آگے تعلیم حاصل کر سکا۔ اور نہ ہی اس کے اندر یہ احساس ذمہ داری پیدا ہوا کہ وہ اس گھر کا واحد چشم و چراغ ہے اور اس پہ کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ الٹا وہ اماں سے نت نئے مطالبات کرتا رہتا جنہیں اماں کو ماننا ہی پڑتا کیونکہ اگر نہ مانتیں تو وہ دو دن دوبارہ شکل ہی نہ دکھاتا جس سے مجھے تو کبھی ٹینشن نہ ہوتی البتہ اماں کی چارپائی کے نیچے آگ لگ جاتی اور انہیں ایک پل چین نہ آتا۔ اس میں اکیلی اماں ہی قصوروار نہیں تھیں۔ صدف اور انیلا کا بھی بڑا ہاتھ تھا جنہیں وہ اب بچہ نہیں سمجھتا تھا۔ جبکہ میں میرا معاملہ ذرا کچھ اور تھا۔ میں اسے لفٹ ہی نہیں ڈالتی تھی۔ انیلا اور صدف کی طرح اس کی خدمتیں بھی کبھی نہیں کیں۔ کبھی اسے کھانا نکال کر نہیں دیا اور ناشتہ بنانے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ میں صبح کبھی جلدی اٹھی ہی نہیں تھی۔ اماں جز بز ہوتیں لیکن میں سنی ان سنی کر دیتی۔

"وہ کچھ کمانے دھمانے کے لائق تو ہے نہیں' الٹا بوجھ ہے ہمارے لیے۔"

اماں سے ایسی باتیں کہاں برداشت ہوتی تھیں۔ فوراً بول پڑتیں۔

"وہ بوجھ کیوں بننے لگا۔ جیسے اپنے باپ کی جائیداد کا کرایہ تم کھاتی ہو ایسے ہی کھا رہا ہے۔"

"میں تو کہتی ہوں۔ اس کی شادی کر دیں۔ کم از کم ایک بہو تو گھر میں آئے گی۔ محترم کے بھی پاؤں بندھیں گے اور گھر میں کام کاج کا مسئلہ بھی حل ہو گا۔"

"تم کو تو کہیں نپٹا دوں۔ پھر اس کے بارے میں بھی سوچ لوں گی۔" اماں بھڑک کر کہتیں اور میں پھر چپ سی تھی

"اچھا اماں! اپنی دوا کا پرچہ دیں۔ آپ کی دوا لے کر آؤں اور انیلا اور صدف کے لان کے سوٹ منگوانے ہیں تو اس کے بھی پیسے دے دیں۔ ابھی کے ابھی نمٹا آؤں گی۔"

اماں نے ہمیشہ کی طرح بلا چوں چرا دوا کا پرچہ اور پیسے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ انیلا اور صدف کی طرح میں بھی نبیل کی منتیں نہیں کرتی تھی۔

جو کچھ کرنا ہوتا کر گزرتی... نبیل کی عدم توجہی کی وجہ سے اماں لاشعوری طور پہ مجھ پہ انحصار کرنے لگی تھیں۔ اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا' گھر کا سودا سلف' یہاں تک کہ بجلی اور گیس کے بل بھی میں خود ہی بھر آیا کرتی اور اماں کو پتا بھی نہ چلتا۔ کم از کم روز کی چخ چخ سے تو جان چھوٹ گئی تھی۔ ہر کام کے عوض نبیل کا کوئی نہ کوئی مطالبہ اور اماں کی مجبوریاں میری برداشت سے باہر تھیں۔

میں نے جب باہر کی ساری ذمے داریاں اٹھالیں تو اماں کی ٹینشن اور نبیل کی اہمیت ختم ہو گئی۔ اماں دل ہی دل میں اعتراف کرنے لگی تھیں کہ میں ان کے بیٹے سے زیادہ ان کا خیال رکھتی ہوں۔

لیکن جب اماں یہ غور کرتیں کہ گھریلو معاملات' چال ڈھال' کھانے پینے سونے جاگنے کے حوالے سے میرے معاملات ایسے نہیں کہ میں اگلے گھر جا کر ان کا نام روشن کر سکوں گی تو وہ بے چین ہو جاتیں اور میری تربیت کے لیے کمر کس لیتیں۔ میرا اس بے چکے سو کر اٹھنا انہیں کھٹکنے لگتا۔

"کم بخت اگلے گھر جائے گی تو کون اتنی دیر تک سونے دے گا۔ دن چڑھ رہا ہے اور ابھی تک پڑی اینٹھ رہی ہے۔"

اماں نے میری کمر پہ دھموکا جڑا۔

صبح صبح میں ایسی ناگہانی کے لیے تیار نہ تھی۔ سو بلبلا کر بولی۔

"دیکھیں اماں! یہ مارنے پیٹنے والے کام نہ کیا کریں۔ اب میں بڑی ہو چکی ہوں اور الحمدللہ گریجویٹ ہوں۔"

"سب کچھ یہیں دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ جب آگے جا کر "کھلے" لگیں گے۔" اماں نے ڈرایا۔

"کون لگائے گا کھلے؟" میں نے کان پہ سے مکھی اڑائی۔

"جس کے تو پلے بندھے گی۔" میں نے ہنسی میں بات کو اڑا دیا۔ "انیلا اور صدف کو بھی آپ یہی کہا کرتی تھیں' بھول گئیں۔ صدف کے سسرال میں صبح صبح اٹھ کر ساس صاحبہ کے کمرے میں جانے پہ کیا اعتراض ہوا تھا۔ بہو صاحبہ چین سے اپنے کمرے میں کیوں نہیں رہتیں' صبح ہی صبح نیند خراب کرنے آ جاتی ہے اور انیلا۔ انیلا پہ تو باقاعدہ الزام لگ گیا تھا کہ وہ صبح اٹھ کر ناشتہ نکلنے تک جاتی ہے۔ حالانکہ آپ کے پڑھائے ہوئے سبق کے مطابق وہ تو تابعدار شوہر سو کی طرح سب کے ناشتے کی خبر گیری کرتی تھی۔ لیکن چھ' چھ منہ کی کھانی پڑی۔ میری پیاری اور بھولی اماں۔ یہ ایڈوانس دور ہے۔ آج کے دور میں کوئی کسی کی بے جا مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ سسرال والے بھی دیر تک سوتے ہیں اور بہو بھی انہی کی پسند کی [illegible] ہیں جو سویرے سویرے آ کر تلاشیاں نہ لے اور جلے پیر کی بلی کی طرح نہ پھرے۔ وہ دور گئے جب میاں منہ اندھیرے ہی کمرے سے بھاگ جایا کرتے تھے اور بہوئیں چپکے چپکے کمرے سے نکل کر ساس یا چھوٹے نندوں دیوروں کے کمرے میں جا کر بیٹھ جاتیں اور ایک کونے میں بیٹھ کر اونگھنے لگتیں۔ بچے سو کر اٹھتے تو سمجھتے بھابھی حضور رات بھر اسی کونے میں یہی شغل فرماتی رہی ہیں۔"

اماں نے میری فراٹے چلتی زبان پہ سر پکڑ لیا اور میں ہنستے ہوئے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

صدف اور انیلا کا روز روز آنا اور روزانہ اماں کی ان سے کھسر پھسر کا نتیجہ آئے روز نئے نئے مہمانوں کی آمد کی صورت سامنے آ گیا۔

میں نے ان کاموں میں ذرا بھی کن سوئیاں لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں کہ مجھے شادی سے دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے شادی سے سو فیصد دلچسپی تھی۔ میرا ایک آئیڈیل تھا۔ ایک خوبرو ضدی ہٹ دھرم اور اپنی ہی بات منوانے والے شخص کا پیکر۔ بظاہر یہ پیکر میری ہی شخصیت کا عکس تھا۔ وہ پیکر جس میں میں نے خود کو صنف مخالف کے روپ میں ڈھال رکھا تھا۔

اس روز میں بہت خوش تھی۔ میری تمام سہیلیاں مجھے گھیرے بیٹھی تھیں۔ اماں نے وہ بڑے داماد بھی اچھے ہی ڈھونڈے تھے۔ سو میرے لیے بھی اچھا ہی بر دیکھا ہو گا۔ میں اندر تک شانت تھی۔ تب ہی میری سہیلیوں نے صدف اور انیلا سے پوچھا کہ موصوف کا نام تو بتا دیں۔ اماں کو تو وہ نام لینا ہی نہیں آتا تھا۔

"مضراب محمود۔" صدف نے بتایا۔

"مضراب!" مجھے کچھ زنانہ سا نام لگا۔ لیکن میری ساری سہیلیاں نام سن کر چلا اٹھیں کہ نام مختلف اور اچھا ہے۔

باقی کے دن خواب دیکھتے ہوئے پر لگا کر اڑنے لگے۔

انیلا اور صدف رہنے کے لیے آ گئی تھیں اور شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ اپنی شادی کی زیادہ تر تیاریاں میں نے خود کیں۔ انیلا اور صدف کی نسبت [illegible] تھی اور نہ ہی ان میں اتنا اعتماد تھا جتنا مجھ میں تھا۔ کیونکہ تعلیمی قابلیت میں بھی اور بچپن سے باہر کی ہوا لگنے کی بدولت میں زیادہ پُراعتماد تھی۔ سو ان میں سے جو بھی بازار جاتا مجھے ساتھ ضرور گھسیٹتا۔ اماں بھی میری خریداری سے مطمئن رہتیں۔

حیرت انگیز طور پہ نبیل نے بھی میری شادی کی تیاریوں میں حصہ لیا۔ بلکہ اچھی خاصی ذمے داری اٹھائی۔

اللہ اللہ کر کے میری زندگی میں وہ دن بھی آ گیا جس کا ہر لڑکی کو ارمان ہوتا ہے۔

میں نے سوچا اداس ہونے کی کوشش کروں۔ مگر میں خوش اتنی تھی کہ اداسی نامراد میرے قریب ہی نہ پھٹکی تھی۔ اس خوشی کی سب سے اہم وجہ کہ میں کسی کے لیے خاص بننے جا رہی تھی۔ میں اپنی ہمجولیوں کے درمیان دلہن بنی بیٹھی تھی اور ان کی چھیڑ چھاڑ پہ میرے دانت نکل رہے تھے۔ تب ہی میری بہنیں منہ بسورتے ہوئے نظر آئیں۔ پھر اماں نے آ کر مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

اور تب میں نے محسوس کیا جو محاذ میں اماں کے ساتھ قائم رکھتی تھی۔ وہ دراصل ہماری محبت تھی۔ یا محبت کا کوئی انداز تھا۔ میں اماں کے دھان پان سے وجود سے لپٹ گئی اور رونے لگی۔ یہ خیال ہی روح کو نوچ رہا تھا کہ اب اماں بالکل اکیلی رہ جائیں گی۔ نبیل کی طبیعت میں جو لاپروائی تھی وہ تو نہیں بدلنا تھی۔ میں نے جو رونا شروع کیا تو چپ کرانا ہی مشکل ہو گیا۔ ادھر اماں بھی رو رہی تھیں۔

"میں نے آپ کو بہت ستایا ہے اماں! مجھے معاف کر دینا۔"

"تو میرے گھر کی رونق تھی۔ آج وہ رونق میرے آنگن سے رخصت ہو کر کسی دوسرے گھر میں جا رہی ہے۔ اللہ تجھے اس گھر میں ہمیشہ خوش رکھے۔" اماں مجھے پیار کرتے ہوئے بولیں۔

"ہم جلد ہی نبیل کی شادی کر دیں گے۔ اماں کے گھر میں پھر سے رونقیں آ جائیں گی۔" صدف نے اماں کو اور مجھے بیک وقت دلاسا دیا۔

"نبیل کی شادی تو کرنا ہی ہے۔ مگر نمرہ کی کمی پوری نہیں ہو سکتی۔ یہ میری بیٹی ہی نہیں بیٹا بھی تھی۔"

اماں کے منہ سے اپنی تعریف سن کر میں پھولے نہ سمائی اور اماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔ جب آپ حکم کریں گی۔ آپ کا داماد آپ کی خدمت میں حاضر ہو جایا کرے گا۔"

"کون سا داماد بیٹا؟" میری سکھیوں نے مجھے چھیڑا۔ میں ذرا شرمندہ ہوئی۔

"یعنی ابھی گئی بھی نہیں ہو اور ابھی سے اتنا مان ہے موصوف پہ۔"

اب میں کیا کہتی۔ کمرہ لمحوں میں زعفران زار بن گیا تھا۔ اماں بھی مسکرانے لگی تھیں۔

☆ ☆ ☆

تمام روایتی رسوم کے بعد میری سسرالی خواتین نے مجھے میرے بیڈ روم میں پہنچا دیا۔ جو میرے جہیز کے سامان سے سجا ہوا تھا۔ درمیانے سائز کا کمرہ۔ فرنیچر کی سادہ سی آرائش سے دلکش لگ رہا تھا۔ میں نے اچٹتی نگاہوں سے ہی کمرے کا جائزہ لے ڈالا تھا پھر میں نے خود پہ غور کیا تو مجھے بڑا عجیب سا لگا۔

یوں بے وقوفوں کی طرح بیٹھ کر میں کیوں وقت ضائع کر رہی تھی۔ کیا نئی زندگی کی ابتدا کے لیے میرا ذہن ادنیٰ درجے کی ان روایتی حرکتوں کے لیے تیار تھا۔ میرے اندر سے جواب آیا۔ "نہیں!"

جس شخص کو میں جانتی تک نہیں اس کے حوالے خود کو چپ چاپ کر دینا کتنا عجیب لگتا ہے۔

یہ خیال آتے ہی میری ساری شرم و حیا رفوچکر ہو گئی اور میں نے بڑے اطمینان سے میک اپ اور زیور اتار کر کپڑے تبدیل کیے اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

یہ تو میں جانتی تھی کہ مضراب محمود پڑھا لکھا ہے اور اس کی اسپیئر پارٹس کی بہت بڑی دکان ہے جو شخص بڑے صنعتی اداروں سے ڈیلنگ کرتا ہے کیسے ممکن ہے کہ اسے گفتگو کا سلیقہ نہ آتا ہو۔ وقت کی سوئیاں رک رک کر چل رہی تھیں۔ اور نت نئے خیالات دبے پاؤں میرے نزدیک آ رہے تھے۔

تب ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور محترم اندر تشریف لے آئے۔ چہرے پہ عجیب کھسیانی سی ہنسی سجائے سفید اچکن اور پاجامے میں ملبوس وہ شخص میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے مجھے سلام کیا اور میرے نزدیک آ گیا۔

"دراصل میں اپنی بہنوں کو ٹیک دے رہا تھا۔ اسی وجہ سے دیر ہو گئی۔ میری بہنوں کو میری شادی کا بہت ارمان تھا۔ مگر میں شادی پہ آمادہ نہیں تھا۔ (یہ مجھ سے کس قسم کی گفتگو کر رہا ہے) سوچتا تھا نجانے آنے والی کیسی ہو۔ کہیں وہ ہم بہن بھائیوں کو ایک دوسرے سے دور نہ کر دے۔ مگر اب یہ بھی ممکن نہیں تھا وہ مجھے کنوارہ ہی رکھتیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور میرے سر پہ سہرا سجا ہی دیا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ پھر کھسیانے سے انداز میں ہنسا۔

"اب یہ آپ پر منحصر ہے کیسے ان رشتوں کو نبھاتی ہیں۔ میری پانچ بہنیں ہیں اور میں ان کا اکلوتا بھائی ہوں۔ دو بہنیں مجھ سے بڑی ہیں اور تین مجھ سے چھوٹی ہیں۔ امی نے آپ کا انتخاب کیا ہے تو ضرور آپ میں کچھ صلاحیتیں دیکھی ہوں گی۔ میں نے تو آپ کے متعلق کچھ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ سب کچھ گھر والوں پہ چھوڑ دیا تھا۔ اگر آپ میرے گھر والوں کو خوش رکھیں گی تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔"

(یعنی کہ میں بلا واسطہ نہیں بالواسطہ تم تک رسائی حاصل کروں گی) میں اس کی گفتگو پہ اندر ہی اندر تلملا رہی تھی۔

"ارے میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔" اس کی وہی کھسیانی سی ہنسی جس سے مجھے اب چڑ ہونے لگی تھی۔

"میرا نام مضراب محمود ہے۔" میں سیدھا سادہ سا شریف بندہ ہوں۔ آپ سے پہلے میری زندگی میں کوئی عورت نہیں آئی۔"

"عورت!" میں چلا کر احتجاج بھی نہ کر سکی۔

"آپ پہلی خاتون ہیں اور شاید آخری بھی۔" اس نے اسی کھسیانی ہنسی سے کہا تو میرا دل لہولہان ہو گیا۔ اگر وہ یہ جملے کسی اور طرح سے کہتا تو میں ہواؤں میں اڑنے لگتی۔ پھر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک سرخ مخمل کی ڈبیا نکالی اور اسے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

"یہ میری طرف سے آپ کی رونمائی ہے۔ بس جلدی میں تو یہی بن سکی تھی۔ اگر آپ کو کچھ اور پسند ہو گا تو میں لا دوں گا۔"

اور میں نے ذہن پہ زور ڈالنے کی کوشش کی کہ جو مرد اپنی بیوی کو رونمائی میں انگوٹھی دیتا ہے وہ کن خصوصیات کا مالک ہوتا ہے۔ مگر لاکھ کوشش کے میں یاد نہ کر پائی۔ اس تحفہ دینے کا انداز ہی اتنا نرالا تھا کہ میری سوچ جامد ہو کر رہ گئی۔

شاید میرے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے تھے۔

"اگر آپ کہیں تو میں خوب سجا دیتا ہوں۔"

اف اتنی عاجزی میری برداشت سے باہر تھی۔

"آپ کچھ بول نہیں رہیں۔ بولتا تو میں بھی زیادہ نہیں ہوں۔ بس آپ کی وجہ سے بول رہا ہوں۔ آخر اس خاموشی کو کسی ایک نے تو توڑنا ہی ہے۔"

وہ یہ کہہ کر ہلکا سا مسکرایا تھا میں نخس ہی بیٹھی رہی اور سوچتی رہی۔

کیا کوئی شخص اتنا بدھو بھی ہو سکتا ہے۔ اسے یہ بھی احساس نہیں ہوا کہ میں شکھار سے "پاک" کیوں ہوں؟ آخر وہ کچھ تو احتجاج کرتا۔ لعن طعن کرتا ناراض ہوتا۔ پھر سراہتا کچھ تو کہتا۔

"لگتا ہے آپ بہت تھک گئی ہیں۔"

میں نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔

"ارے یہ سب سامان کون یہاں رکھ گیا تھا؟" اس کی نگاہ پہ رکھی اشیاء کی طرف اب گئی تھی۔

"لگتا ہے یہ میری بہنوں کی کارگزاری ہے۔ شاید یہ بھی کچھ رسم ہوتی ہو۔" اس کی لاعلمی تھی یا جان بوجھ کر بن رہا تھا۔ دونوں میں سے جو بھی وجہ تھی مجھے سخت زہر لگ رہی تھیں اس کی باتیں۔

"لڑکیوں کو تو ویسے بھی بہت پٹیاں پڑھانے والی مل جاتی ہیں۔ مگر میرا تو کوئی قریبی دوست نہیں ہے جو مجھے یہ سب کچھ بتاتا۔ آپ کو تو ان سب رسومات کا علم ہو گا۔"

اس نے مٹھائی کا ڈبہ اٹھاتے ہوئے کہا تو میں جل کر خاک ہو گئی اور میرا دل چاہا کہوں جی ہاں میں تو دس کورس کر آئی ہوں۔

"مٹھائی میں کون سی چیز آپ کی فیورٹ ہے؟"

بجائے کچھ اٹھا کر میرے منہ میں ڈالنے کے اس نے سارا ڈبہ ہی میرے آگے کر دیا۔

مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ میری قسمت پھوٹ چکی ہے اور میرے خواب ریزہ ریزہ ہو چکے ہیں۔ یا تو یہ شخص بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ یا واقعی ایسا ہے۔ اگر واقعی مسٹر عاجز و خادم ہیں تو زندگی تو ہو گئی عذاب۔

میں تنگ کر اس کے نزدیک سے اٹھ گئی۔

"مجھے کچھ نہیں کھانا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

اس نے مٹھائی کا ڈبہ رکھ کر فوراً میری کلائی پکڑ لی۔ اس کی گرفت اتنی کمزور تھی کہ میں بیٹھے سے جھٹکے سے نکل سکتی تھی۔ لیکن دانستہ میں نے ایسا نہیں کیا۔

"اگر آپ کی طبیعت خراب ہے تو آرام کیجیے۔ میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گا۔"

مجھے تو پہلے ہی ایسے حالات دکھائی دے رہے تھے۔

اس کی اتنی بے اعتنائی پہ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

اور میں خود بھی سمجھ نہ پائی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ میں جو مضراب کے آنے سے پہلے سوچ رہی تھی کہ پہلے انڈر اسٹینڈنگ ہو گی پھر... اب نہ جانے کیوں اس کی سرد مہری مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

"ارے آپ رو رہی ہیں؟" وہ سچ مچ پریشان ہو گیا۔

اور اس کا پریشان ہونا مجھے پہلی بار کچھ اچھا لگا۔ کم از کم اس پریشانی کا محور صرف اور صرف میں تھی۔ وہ میرے نزدیک آ گیا۔

"اگر آپ آرام کرنا چاہتی ہیں تو آرام کیجیے۔ میں آپ کو کچھ نہیں کہوں گا۔"

اس نے نہایت سادگی سے یہ جملے کہے اور اپنی اچکن وغیرہ اتارنے میں مصروف ہو گیا۔ پھر وہ کمرے سے ملحقہ واش روم میں چلا گیا۔

میں تکیے میں منہ گھسیڑ کر لیٹ گئی اور چپکے چپکے اپنی قسمت پہ آنسو بہانے لگی۔

پھر جیسے ہی اس نے لائٹ آف کی میری ساری حسیات بیدار ہو گئیں۔ ظاہر ہے کمرے میں آرام کرنے کے لیے فقط ایک ہی بستر تھا اور جب اس نے یہ پوچھا۔

"اگر آپ پسند کریں تو میں یہاں لیٹ جاؤں؟" تو میرے سارے ہی اندازے غلط ہو گئے۔ اور میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر رو دوں۔

"چلو ٹھیک ہے۔ اگر آپ کو پریشانی ہوتی ہے تو میں ادھر صوفے پہ لیٹ جاتا ہوں۔ ویسے بھی دن تو نکل ہی چکا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے وہ دوسری طرف جانے لگا تو میں تنگ کر بستر سے اٹھ گئی۔

"اگر میری وجہ سے آپ یہ ڈرامہ کر رہے ہیں تو میں ادھر صوفے پہ لیٹ جاتی ہوں۔" رونے کی وجہ سے میری آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور لہجے میں تلخی تھی۔ وہ بھی حق دق میرا چہرہ دیکھنے لگا۔

یہ کہتے ہوئے میں صوفے کی طرف بڑھ گئی۔ نیند تو مجھے کیا آنی تھی۔ بس کروٹیں ہی بدلنا تھیں چاہے بیڈ ہو یا صوفہ۔ میں نے آنکھیں میچ لی تھیں۔ میں اس قلب منظر سے غائب ہو جانا چاہتی تھی۔ مگر آنکھوں میں جو ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں تھیں وہ نیند کو کوسوں دور بھگا رہی تھیں۔

کچھ دیر تک تو کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر وہ کمرے سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد جو میں اتنی دیر سے گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ دل کھول کر روئی پھر نجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

☆ ☆ ☆

کمرے کا دروازہ ظاہر ہے کھلا ہوا تھا۔ اس لیے میری شادی شدہ نندیں کمرے میں آ گئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کے بچے بھی آ گئے اور کنواری نندیں بھی۔ شور سے میری آنکھ کھلی تو بڑی نندیں بچوں کو شور کرنے اور چیزوں کو چھیڑنے سے روک رہی تھیں۔

اتنے سارے افراد کو اپنے سر پہ دیکھ کر پہلے تو مجھے کچھ سمجھ میں نہ آیا کیونکہ ماشاءاللہ روز ہی دس بجے سو کر اٹھتی

تھی۔ وہ بھی فقط اماں کی ڈانٹ پھٹکار کے بعد۔
پھر یکدم ہی میرا ذہن بیدار ہو گیا۔ اب میں اماں کے گھر میں نہیں تھی۔
''ہم لوگوں کی وجہ سے آپ کی نیند خراب ہو گئی۔ گیارہ بج رہے ہیں ناشتہ کر لیں پھر سو جائیں۔'' یہ میری بڑی نند تھی۔ جو خواہ مخواہ ہی خوش مزاجی کا ڈرامہ کر رہی تھی۔ میں خود کو سنبھالتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔
''تم لوگ بچوں کو لے کر باہر جاؤ۔ ہم ابھی آتے ہیں۔'' دوسری والی نند میرے قریب بیٹھ گئی۔
میں اپنے حنائی ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ میرے ہاتھوں پہ مہندی سج کر رہی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں نے زندگی میں پہلی بار مہندی لگائی تھی۔ مہندی کی وجہ سے میرے ہاتھ بہت خوب صورت لگ رہے تھے۔ اس سے قبل میں عام لڑکیوں کی نسبت اپنے ہاتھوں کو بڑے اور مردانہ ہی سمجھتی تھی۔ لیکن آج اپنے ہاتھوں کا حسن دیکھ کر میں خود بھی حیران تھی۔ یہ چوڑیوں اور مہندی کا حسن تھا یا واقعی مجھ پر بہت روپ چڑھا تھا۔
''ہم نے آپ سے چند باتیں کرنی ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ ہمیں فریش ملیں گی۔ لیکن ابھی تو آپ....'' جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے وہ ذو معنی انداز میں مسکرائی۔
میں کچھ خجل سی ہوتے ہوئے واش روم میں چلی گئی۔
واش روم میں جانے کے بعد میرے ذہن میں رات کی باتیں تازہ ہو گئیں اور میں مضراب کی شخصیت میں الجھنے لگی۔ رات اس نے مجھ پہ ذرا بھی اچھا تاثر نہیں چھوڑا تھا آخر وہ مجھ سے ہر بات پوچھ پوچھ کر کیوں کر رہا تھا۔ کیا دنیا میں ایسے مرد بھی ہوتے ہیں؟
وہ شخصی لحاظ سے مجھے کتنا کنزرویو اور بے وقوف تھا۔
میں نے شاور لے لیا تھا۔ وہیں کھونٹی پہ میرا سادہ لباس اور ایک عدد نائٹی بھی لٹک رہی تھی۔ میں نے وہ سادہ کاٹن کا سوٹ پہن لیا۔
جب واش روم سے باہر نکلی سینٹرل ٹیبل پہ ناشتے کے انواع و اقسام کے لوازمات رکھے تھے۔ رات کا تمام کھانے پینے کا سامان وہاں سے غائب تھا۔ مضراب صاحب صوفے پر ایستادہ تھے۔ کریم کلر کے قمیص شلوار میں ملبوس وہ رات کی نسبت نکھرا نکھرا سا اچھا لگ رہا تھا۔
اسے سامنے دیکھ کر مجھے یکدم حیا سی آ گئی اور میں جو تولیہ بالوں میں لپیٹے بنا دوپٹے کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ جلدی سے دوپٹہ اٹھا کر اوڑھ لیا۔ یہ میری اچانک لاشعوری حرکت تھی۔
میرا ارادہ تھا کہ بال کھول کر سکھاؤں۔ لیکن میرا ارادہ بھانپتے ہوئے اس نے کہا۔
''ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ پہلے ناشتہ کر لو۔ پھر بال بنانا۔''
مجھے اس کے اس خشک رویے پہ چپ چڑھ گئی۔
اس کی رات والی ساری زیادتیاں تازہ ہو گئیں۔
''مجھے ناشتہ نہیں کرنا۔'' میں نے اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔
''مجھے پتا ہے کہ تم مجھ سے جس بات پہ ناراض ہو۔ مگر تم فکر نہ کرو۔''
میں جو آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ شرمندہ ہو کر رہ گئی مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ ہو سکی کہ پلٹ کر اسے دیکھوں۔ آئینے میں میں نے اسے دیکھا۔ وہ یہ کہہ کر سنجیدگی سے ناشتہ کرنے لگا تھا۔ رات کی نسبت اس وقت وہ خاصا پُراعتماد لگ رہا تھا۔
وہ ناشتہ کر کے کمرے سے چلا گیا۔ میں ناشتے کی ٹیبل پہ آ گئی۔
اس وقت میں ایک پیالی چائے ہی پی سکی جو کہ ٹھنڈی اور بدذائقہ تھی۔ اس کے لفظوں کی بازگشت مجھے اب بھی شرمسار کر رہی تھی۔ اتنی بڑی بات کو اس نے کس قدر معمولی انداز میں کہہ دیا تھا۔ اس پہ میرا کیا تاثر رہا ہے؟ میں جانے کب تک اس بات پہ غور و فکر کرتی۔ مگر میری دونوں نندیں پھر سے میرے کمرے میں آ گئیں۔ ان کی آنکھوں میں شرارت اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔
''ہمارا بھائی آپ کو کیسا لگا؟'' ہما نے مجھ سے پوچھا۔
میں اس بات کا کیا جواب دیتی۔ میں تو خود الجھی ہوئی تھی۔
''تو بھلا یہ بھی کوئی بات ہے پوچھنے کی۔'' امبرین نے ہنس کر کہا۔ پھر کہنے لگیں۔ ''یہ تو وقت کے ساتھ ساتھ ہی تم دونوں ایک دوسرے سے واقفیت حاصل کر لو گے۔ لیکن اپنے بھائی کے بارے میں اتنا ضرور بتا دوں کہ وہ ہم پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ ہمارے ساتھ کھیلا کودا ہے اسی وجہ سے فطرتاً شرمیلے مزاج کا ہے اور نہایت ہی سادہ ہے۔ تم اس کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی ہو اس لیے مضراب تمہیں عام لوگوں سے مختلف لگے گا۔ وہ ہم سب سے بہت محبت کرتا ہے۔ اس نے باہر کی دوستیاں نہیں پالیں۔ ہم

سب بہن بھائی ہی ایک دوسرے کے دوست رہے ہیں۔ مگر لحاظ اور ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے۔ ہم بہنیں تو پھر بھی ایک دوسرے سے فری ہو جاتی ہیں۔ لیکن مضراب ہم سے بھی محتاط ہی رہا ہے۔ اس لیے ہم چاہتے تھے کہ خاندانی اور نیک سیرت لڑکی لائیں تاکہ ہمارے گھر کا سکون اسی طرح برقرار رہے۔ تمہاری بڑی دونوں بہنوں کو میں اچھی طرح جانتی ہوں ایک تو میرے سسرالی رشتہ داروں میں ہی آئی ہے۔ ان ہی کے کردار کو دیکھتے ہوئے ہمارا دھیان تمہاری طرف آیا تھا۔ ہمیں امید ہے تم ہمارے گھر کا سکون قائم رکھو گی اور امی ابو کا مضراب کی طرح ہی خیال رکھو گی۔''
میں چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہی۔
دوپہر تک میری بہنیں مجھے لینے آ گئیں۔ مجھے دو تین گھنٹے کے لیے جانا تھا۔ کیونکہ رات کو ولیمہ تھا۔
صبح سے میری ساس میرے کمرے میں نہیں آئی تھیں۔ مجھے یہ بات عجیب سی لگ رہی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب تب لگا۔ جب جاتے ہوئے میں نے انہیں سلام کیا تو وہ ذرا جھینپ کر رہ گئیں۔
''ہما اور امبرین کو میں نے تمہارے پاس بھیج دیا تھا۔ نئی نویلی دلہن کے کمرے میں جاتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ اس لیے میں تمہارے پاس نہیں آئی۔''
اپنی ساس کی شرم پہ مجھے شرم سے ڈوب مرنا چاہیے تھا۔ وہ بے چاری بڑھاپے میں اتنی ادب لحاظ والی تھیں۔ جبکہ میں... مجھے تو ایک بار بھی شرم نہیں آئی تھی۔
لیکن خیر جو کچھ بھی تھا گھر کا ماحول میری ساس کے زیر اثر تھا۔ اسی وجہ سے مضراب محمود بھی شرمیلے مزاج کے تھے۔ میں راستے بھر مختلف نتائج نکالتی رہی۔
''کیا بات ہے تمہاری بالکل بولتی بند ہو گئی؟'' منال نے مجھے چھیڑا۔
میں اتنی الجھی ہوئی تھی کہ بات کا کوئی سرا ہی نہ نکال سکی۔ اماں نے میری خوب آؤ بھگت کی۔
ایلا، صدف اور منال کی چھیڑ چھاڑ میں وقت گزر گیا۔ شام کو مجھے مضراب کی بہن لینے آ گئی۔ وہ مجھے سیدھا بیوٹی پارلر لے گئی۔ پھر وہیں سے ہم میرج ہال چلے گئے۔
ولیمہ کا فنکشن بالکل سادہ سا تھا۔ مختصر سے مہمان تھے مرد حضرات کا علیحدہ انتظام تھا اور خواتین کا علیحدہ۔ حالانکہ ہمارے یہاں تو لڑکا لڑکی ولیمہ کے روز اکٹھے بیٹھتے تھے۔ میری سہیلیاں مضراب سے ملنا چاہتی تھیں۔ لیکن ایسا موقع ہی نہ بن سکا اور وہ تشنہ خواہش لیے چلی گئیں۔ رات گئے ہم لوگ بھی گھر آ گئے۔ میں مضراب کے ہمراہ گاڑی میں تھی۔ ساتھ ہی ساس سسر اور ایک نند بھی تھی۔ اسی وجہ سے راستہ خاموشی سے طے ہوا۔ گھر آنے کے بعد سب ہی تھکے ہوئے تھے۔ سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔
میں اپنے کمرے میں آ گئی۔ ابھی مضراب اندر نہیں آیا تھا۔ میں چاہتی تو چینج کر لیتی لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں مضراب کی نظروں سے اپنی ستائش چاہتی تھی۔
آج سب ہی نے میری بہت تعریف کی تھی۔ بقول منال کے نکاح والے دن سے زیادہ میں آج اچھی لگ رہی تھی۔ فالسئی رنگ کا کامدار غرارہ واقعی مجھ پہ بہت اٹھ رہا تھا۔ میں نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ تھوڑا سا ٹچ اپ کیا۔ میرا میک اپ ابھی تک ترو تازہ تھا۔ میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ جب ہی مضراب اندر آیا۔ اس نے بلیک ٹو پیس پہن رکھا تھا۔ اس نے آہستہ سے مجھے سلام کیا۔
آج وہ بہت مختلف اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے اچانک دیکھ کر میرے دل کو کچھ ہوا۔ میں سیدھی ہو بیٹھی۔ پھر وہ میرے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔
میرے من میں ہلچل ہونے لگی۔ میرا خیال تھا وہ میری تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گا۔ لیکن اس نے میرا چہرہ دیکھتے ہوئے اسی سادگی سے کہا۔
''نہ جانے خواتین اتنا میک اپ کیوں تھوپتی ہیں مجھے تو سادہ چہرے اچھے لگتے ہیں۔'' حالانکہ اس کے انداز میں طنز نہیں تھا مگر مجھے اچھا نہیں لگا جبکہ میرے لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جنہیں میک اپ پسند نہیں ہوتا۔ لیکن جب میں کل بنا میک اپ کے تھی تب تو اس نے اس قسم کے خیالات کا اظہار نہیں کیا تھا۔
''کوئی بھی دلہن بنا میک اپ کے تیار نہیں ہوتی۔'' میں نے قدرے روکھا سا جواب دیا۔ ساتھ یہ بھی جتا دیا کہ میں دو دن کی دلہن ہوں۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔
''اگر آپ کو میک اپ پسند ہے تو میں بھی اعتراض نہیں کروں گا۔'' اس کی مفاہمت مجھے ایک آنکھ نہ بھائی۔
''بندے میں کچھ تو کوالٹی ہونا چاہیے۔ پسند ناپسند۔ مرضی یا نامرضی۔ یہ کیا کاٹھ کے الو کی طرح بیوی کی ہاں

میں ہاں ملانے لگے۔

”دو بجنے والے ہیں۔ رات کافی ہو رہی ہے۔ آپ چینج کرلیں۔ میں بھی چینج کرنے جا رہا ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے وہ میرے پاس سے اٹھ گیا۔ مجھے شدید غصہ آیا۔

اور میں بھی یوں کی توں بیٹھی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سادہ سی قمیص شلوار میں واش روم سے نکلا تو مجھے یونہی بیٹھا دیکھ کر بولا۔

”کیا ارادہ ہے آپ کا؟“

”کیا مطلب؟“ میں انجان بنی۔

”ظاہر ہے آپ نادان تو نہیں ہیں اور نہ ہی بچی ہیں۔“ اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی کمرے کی لائٹس آف کرکے زیرو پاور کا بلب جلا دیا۔

وہ میرے نزدیک آگیا اور آہستگی سے میرے کان کا آویزہ چھیڑتے ہوئے بولا۔

”اگر تھکی ہوئی ہو تو میں ہیلپ کرا دوں؟“

”کل تو آپ کو اس بات کا خیال نہیں آیا۔“ میری زبان بھلا کب تک رک سکتی تھی۔ وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔

”کل آپ نے سب کچھ خود ہی اتار پھینکا تھا۔ میں بھلا کیا ہیلپ کراتا۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے خود سے قریب کرلیا۔

”آپ نے تو کل اس قابل ہمیں سمجھا ہی نہیں۔ اب میرے لیے کیا حیثیت ہے ان باتوں کی۔“

میرے دماغ میں چھناکا سا ہوا۔ میں تو اسے بدھو سمجھ رہی تھی لیکن وہ تو گھنا میسنا نکلا۔

وہ آہستہ سے ہنسا۔ ”پہلے اپنے متعلق کچھ غلط فہمیاں دور کر دوں۔“

”مجھے تو کوئی غلط فہمی نہیں ہے آپ کے متعلق۔“ میں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”اچھا... پھر آپ کا رویہ اتنا اکھڑا اکھڑا کیوں ہے مجھ سے؟“

مجھے بے حد سبکی محسوس ہوئی۔

”میرا خیال ہے وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے۔ آپ بھی سو جائیے اور میں بھی سو رہی ہوں۔“ میں نے یکدم اکھڑے ہوئے انداز میں کہا۔

یہ کہہ کر میں لیٹ گئی۔ میں نے آنکھیں بھینچ لیں میری کنپٹیاں سلگ رہی تھیں اور مجھے خوامخواہ خود پہ غصہ آ رہا تھا۔

”کیا ضرورت تھی نخرے دکھانے کی۔ اتنا دبو اور کمزور مرد۔ تب ہی تو وہ ہر معاملے کو میرے سر تھوپ رہا ہے۔ اتنا صبر و استقلال آج سے پہلے میں نے کسی مرد میں نہیں سنا۔ نہ جانے یہ آزمائش میرے گلے کیوں بندھ گئی۔“

میں نے آنکھیں کھول کر یونہی جائزہ لینا چاہا۔ مضراب محمود سے آنکھیں چار ہوگئیں وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا میں نے غور کیا اس کے چہرے پر الجھن تھی۔

میں سمجھ چکی تھی۔ اس کا سارا مسئلہ حوصلے کی کمی کا ہے۔ اس چیز نے مجھے بے حد دل شکستہ کیا تھا۔ میں تو زندگی میں اس سے کبھی نخرہ بھی نہیں دکھا سکتی تھی۔ نخرے کا مطلب تھا اس چیز سے ہاتھ دھونا۔

ابھی میں خیالوں کی رو میں بہہ رہی تھی کہ کسی نے میرے بازو پہ ہاتھ رکھا تو میں چونک گئی اور یکدم آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا اور مضراب میرے بالکل نزدیک۔ اتنا کہ میں کچھ بول نہ پائی۔

☆ ☆ ☆

صبح مجھے کوئی اٹھا رہا تھا۔ مجھے اس وقت نیند کا اتنا غلبہ تھا کہ باوجود چاہنے کے میری آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔ کسی بھاری سے ہاتھ نے میرا گال تھپتھپایا تب مجھے جھنجھلا کر آنکھیں کھولنا پڑیں۔ یہ میرے شوہر نامدار تھے۔ میرا جی چاہا کہوں۔ ایک نئی نویلی دلہن کو ایسے جگایا جاتا ہے۔ اوھر وہ چہرے پہ بے زاری لیے کہہ رہے تھے۔

”وقت دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔ ابھی کوئی کمرے میں آجائے گا۔ کم از کم اپنا حلیہ تو درست کرلیں۔“

یہ کہہ کر وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر بال سنوارنے لگا۔ میں شرمندہ ہوتے ہوئے چپ چاپ واش روم میں چلی گئی۔ میں باہر آئی تو مضراب کمرے میں نہیں تھا۔ میں نے بیڈ کی چادر درست کی۔ اپنا زیور ڈبوں میں رکھا۔ رات کے کپڑے ہینگر میں لٹکائے تب ہی میری نند اندر آگئی۔

”آپ ناشتہ یہیں کریں گی یا ہم سب کے ساتھ؟“

”سب کون؟“ میں پوچھ تو نہ سکی لیکن شاید اس نے میرے چہرے پہ یہ سوال پڑھ لیا تھا۔

”امی اور ہم بہنوں کے ساتھ کیونکہ مضراب اور ابو تو جا چکے ہیں۔“

”میں آپ لوگوں کے ساتھ ہی ناشتہ کرلوں گی۔“ میں نے دوپٹہ درست کیا اور اس کے ساتھ ساتھ باہر آگئی۔

پہلی بار میں گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔

چار کمروں پہ مشتمل یہ گھر کوئی سات آٹھ مرلے کا ہو گا۔ دو کمروں کے آگے درمیانہ سا برآمدہ تھا اور اس کے بعد چھوٹا سا صحن۔ صحن کے ایک طرف کچن اور باتھ روم تھا۔ دوسری طرف میرا کمرہ تھا جس کا اپنا اٹیچڈ باتھ۔ اس کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم تھا۔ سامنے گھر میں داخل ہونے کے لیے راہداری تھی جہاں میں نے موٹر سائیکل کھڑی دیکھی تھی جو اس وقت نہیں تھی۔ ”یقیناً“ وہ مضراب کے استعمال میں ہوگی۔ گھر کی کنڈیشن اور ساز و سامان ان کی اچھی حیثیت کا پتا دیتا تھا۔ میں سلام کرتے ہوئے ان لوگوں کے درمیان میں بیٹھ گئی۔ وہ سب برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ میرے بیٹھتے ہی دستر خوان بچھ گیا۔

”کل سے ناشتے پہ امی ابو تم اور مضراب ہو گے۔“

میں نے اپنی بڑی نند کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں خود بھی اپنی اس حرکت پہ حیران تھی۔ میں جو چٹاخ سے جواب دے دیتی تھی اب بنا بولے کیسے رہ رہی تھی۔

”ارے بھئی ہم تھیں تو آج شام کو اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ [illegible] امی ابو۔“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ناشتے پہ گپ شپ ہوتی رہی میں چپ چاپ صرف مسکراتی رہی۔

دن ایسے ہی مصروفیات میں پر لگا کر گزر گیا۔ شام کو نبیل کھانا لے کر آیا تو میں حیران رہ گئی۔

”کس نے بنایا ہے یہ سب کچھ؟“

”بریانی، شامی کباب، کڑاہی گوشت، سلاد، رائتہ۔ یہ سب اماں کے ہاتھ کا تو نہیں تھا۔“

”صدف آئی ہوئی تھی۔ اس نے بنایا ہے سب کچھ۔“ نبیل نے بتایا۔ ”وہ ادھر ہی رکے گی۔ شاید میں صبح کا ناشتہ بھی لے آؤں۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے فالتو خرچے کرنے کی۔“ میں نے نبیل کو ڈپٹا۔

وہ ہنسنے لگا۔ ”ابھی تک ویسی کی ویسی ہی ہو۔“ میں نے نبیل کو گھورا نبیل اور مضراب کے درمیان بس دعا سلام ہی ہو سکی۔ نبیل چلا گیا تو مضراب نے اس سارے کھانے کو دیکھا جو میں کچن میں رکھنے جا رہی تھی۔

”کیا ضرورت تھی اس تکلیف کی۔ یہ سب کچھ تو یہاں بھی بنا رہتا ہے۔“

”یہ سب کچھ میں نے کہہ کر تو نہیں منگوایا۔“ میرے لہجے میں تلخی سی تھی۔ مضراب خاموش ہو گیا۔ اسے شاید زیادہ بولنے کی عادت نہیں تھی۔

میں بھی خاموشی سے برتن کچن میں لے آئی۔

رات کو سب نے یہی کھانا کھایا اور ہمارے گھر کے کھانے کی تعریف کی کھانا کھا کر نندیں چلی گئیں۔

مضراب اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور میں جویریہ، ماریہ کے ہمراہ اپنے ساس سسر کے پاس بیٹھی رہی۔ گپ شپ ہوتی رہی۔ درمیان میں میں نے دو بار چائے بھی بنائی۔

”رات کافی ہو رہی ہے۔ جویریہ، ماریہ تم لوگوں نے صبح اسکول بھی جانا ہے اور ثمرہ بیٹا! تم بھی جا کر آرام کرو۔ مجھے بھی ابھی عشاء کی نماز پڑھنی ہے۔“

امی کے کہنے پہ ہم سب باری باری اٹھ گئے۔

میں کمرے میں آئی تو وقت دیکھ کر مجھے بھی حیرانی ہوئی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ مضراب ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے ضرور پوچھے گا کہ اتنی دیر سے تم کہاں تھیں۔ ظاہر ہے وہ میرے انتظار میں ہی تو ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ مگر میری یہ خوش فہمی فوراً ہی دور ہو گئی۔

جب میں بستر کی طرف بڑھی تو اس نے عام سے انداز میں کہا۔

”لائٹ آف کر دو۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔“ یہ کہتے ہی اس نے ریموٹ سے ٹی وی آف کیا اور لیٹ گیا۔

”اتنی دیر سے کیوں جاگ رہے تھے۔ سو جاتے۔“ میں نے لیٹتے ہوئے کہا تو مضراب نے میری طرف کروٹ لے لی اور مجھے خود سے قریب کرلیا۔

”تمہارے بغیر اب نیند نہیں آتی۔“ اس کی یہ سرگوشی میرے من کے تار ہلانے لگی۔

”کیوں ایسی کیا خاص بات ہے مجھ میں؟“ میں نے اترا کر پوچھا۔ شاید میں اپنی تعریفیں سننا چاہ رہی تھی۔

”پتا نہیں۔“ مضراب کا لہجہ بوجھل اور نشیلا تھا۔

میں اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ گفتگو کے موڈ میں نہیں تھا۔ رات خاموشی سے سرکتی چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

آج صبح پہلے میری آنکھ کھلی تھی۔ مضراب بے سدھ

سو رہا تھا۔ میں اسے دیکھنے لگی۔ اس کے خدوخال جاذب نظر تھے۔

"بندہ ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔" میں مسکرائی اور بال سمیٹتے ہوئے واش روم میں چلی گئی۔

"کیوں نہ آج موصوف کو اس طرح جگایا جائے کہ ہوش ٹھکانے آجائیں۔ یعنی کوئی رومنٹک سا انداز یا کوئی شرارتی انداز۔"

مگر واش روم سے نکلتے سارا رومنٹک اور شرارتی انداز دھرا کا دھرا رہ گیا۔ جب میں نے کمرہ خالی پایا۔

یکدم ہی میرا موڈ آف ہو گیا۔ میں نے بال جھٹک کر پیچھے کیے تب ہی میرے بالوں میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ میں ڈر کر جو اچھلی تو کسی سے ٹکرا گئی۔ پیچھے ہی معتزاب کھڑا تھا۔

"صبح بخیر...؟" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ابھی تو وہ کمرے میں نہیں تھا۔ اچانک کہاں سے آگیا۔

"کیا بات ہے ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟"

"یونہی بس۔" میں نے سر جھٹکا اور خفیف سا مسکرا دی۔

"ڈر گئی تھیں مجھ سے؟"

مجھے ہنسی آگئی "اتنے بھی ڈراؤنے نہیں ہیں آپ۔"

"یعنی کچھ کچھ ڈراؤنا ہوں۔" وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ میں نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اچھا لگ رہا تھا۔

میرا دل چاہا یہ لمحے یونہی تھم جائیں۔

"بتاؤ نا ۔ کیا تمہیں پتا نہیں تھا کہ میں کمرے میں ہوں؟" میں جو اس سے کسی پیار بھری بات کی توقع کر رہی تھی یک دم بیزار ہو گئی۔

"کیا ان لمحات میں ہم کوئی اور بات نہیں کر سکتے؟"

"مثلاً...." وہ دلچسپی سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"یعنی اب یہ بھی مجھے ہی بتانا پڑے گا۔" میں نے سرد آہ کھینچی تو وہ ہنس پڑا۔

"ظاہر ہے بات تم نے شروع کی ہے۔"

اور میں نے سوچا۔ اگر میں جل کلس کر ایک طرف بیٹھ گئی تو معتزاب کی مجھ سے دلچسپی ختم ہو جائے گی۔ اس وقت میں اس کی توجہ کا محور ہوں اس لیے اپنی بے زاری پر قابو پا کر بولی۔

"یہ بتائیں میں آپ کو کیسی لگی؟"

"کیا مطلب؟ جیسی تم ہو ویسی ہی لگیں۔ ظاہر ہے تمہیں یہاں مشترکہ پسند سے ہی لایا گیا ہے۔"

"اُفوہ!" میں اس کے جواب پہ جھنجلا گئی۔

"میرا مطلب ہے پہلے دن سے اور اب تک۔"

"پہلے دن مغرور سی' دوسرے دن روٹھی ہوئی۔ تیسرے دن گم صم اور آج چوتھا دن ہے۔ کچھ کچھ بے وقوف سی۔"

"کیا مطلب؟" میں چلا پڑی۔ مجھے سخت غصہ آیا۔

"ایک بھی دن آپ نے میری شخصیت کی صحیح ترجمانی نہیں کی اور یہ بتائیں میں نے آج کیا بے وقوفی کی ہے؟"

"یہ بے وقوفی نہیں تو اور کیا ہے۔ خوامخواہ وقت ضائع کر رہی ہو۔ تمہیں ناشتے کی فکر ہی نہیں۔ مجھے ساڑھے سات بجے جانا ہوتا ہے۔"

"وقت میں نہیں آپ ضائع کر رہے ہیں۔" میں نے اس کے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ میں اپنے اصل موڈ میں آچکی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔ "ایک ہی بات ہے۔" میرے بالوں کو چھیڑتا ہوا وہ واش روم میں چلا گیا۔

میں بالوں کی چوٹی بنا کر دوپٹہ درست کرتے ہوئے کچن میں گئی اور ناشتہ بنانے لگی۔ میرا دل عجیب سی سمت پرواز کر رہا تھا۔ وہ سمت میرے لیے کچھ نامانوس بھی نہیں تھی۔ وہ سارے ڈرامے جن میں میں نے ہیروئن کا کردار کیا تھا۔ میرے ذہن میں آرہے تھے۔ اگر میں مرد ہوتا تو کتنا انجوائے کرتا ان لمحوں کو۔ اور اس لڑکی کو اپنے پیار بھرے جذبات کا کتنی خوب صورتی سے یقین دلاتا کہ وہ میری جیون ساتھی ہونے پہ فخر کرتی۔ مگر یہ قسمت کی ستم ظریفی نہیں تو کیا تھی۔ ہمیشہ میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ مجھے کیا کھٹس سا مرد ملا تھا۔

☼ ☼ ☼

جویریہ اور ماریہ اسکول چلی جاتی تھیں۔ گھر میں اور امی ہوتے تھے۔ امی کو زیادہ بولنے کی عادت نہیں تھی۔ میرا زیادہ وقت کمرے میں گزرتا۔ معتزاب صبح کا گیا رات کو آتا۔ رات اسی معمول سے گزرتی۔ اگر میں کسی روز معتزاب کا ہاتھ جھٹک دیتی یا کروٹ بدل لیتی تو وہ چپ چاپ سو جاتا۔ نہ کوئی شوق' نہ دلچسپی نہ لگاوٹ۔ یسی روکھی پھیکی سی زندگی گزر رہی تھی۔ ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ نبیل

مجھے لینے آگیا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ اماں کو بخار ہو گیا تھا۔ میں نبیل کے ساتھ گھر آگئی۔ اماں کی حالت دیکھ کر میں تڑپ اٹھی اور جو بے دلی اور بے زاری مجھ پر طاری تھی سب بھول گئی۔

میرے آنے کے بعد معتزاب بھی اماں کی طبیعت پوچھنے آیا تھا۔ دو دن بعد وہ دوبارہ آیا۔ پہلے کی نسبت اماں کی طبیعت اب قدرے بہتر تھی۔ اماں کا اور نبیل کا خیال تھا کہ معتزاب مجھے آج ضرور ساتھ لے جائے گا۔ لیکن وہ مجھے ساتھ لے کر نہیں گیا۔ جس سے اماں اور نبیل کو تو بہت خوشی ہوئی لیکن مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔

مجھے پورے سات دن ہو گئے تھے یہاں آئے ہوئے۔ ایک بھی دن اس نے نہ تو مجھے فون کیا تھا۔ نہ ہی مجھ سے کوئی بات کی تھی۔ بس اماں کے سامنے ہی جو دعا سلام ہو جاتی بس وہی ہوتی تھی۔ پھر اماں معتزاب کے بیٹھتے ہی مجھے اس کی خاطر تواضع کے لیے دوڑائے رکھتیں۔ کیا میں اس کے لیے اتنی ہی غیر اہم تھی۔ معتزاب کا رویہ اکثر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

اس کی ذات میں کتنا ٹھہراؤ اور سکون تھا۔ مجھے معتزاب سے وحشت سی ہونے لگی تھی۔

نجانے یہ افسردگی کب تک قائم رہتی کہ اچانک موسم بدل گیا۔ آسمان پہ اُمڈتی کالی بدلیاں اور تیز ہوائیں اور پھر چھاجوں چھاج برستا مینہ ساون کا جیسے آغاز ہو گیا تھا۔

بارش بھی ایسی ہوئی تھی کہ ہر شے نکھر گئی تھی۔ ہوا کی ٹھنڈک سے کیکپی سی طاری ہونے لگی تھی۔ میں دوڑ دوڑ کر اماں کے گملے اٹھا کر صحن میں رکھ رہی تھی۔ اس وقت اماں اور میں ہی گھر میں اکیلے تھے۔ اماں برآمدے میں بیٹھی مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

"پگلی! ٹھنڈ لگ جائے گی تجھے۔ دو گھنٹے سے بارش میں نہا رہی ہے۔ ہوا بھی تیز ہے۔"

"اماں! میں تمہارے گملوں کو نہلا رہی ہوں۔ دیکھنا کیسی کونپلیں پھوٹیں گی۔ سارے گملے بھر جائیں گے۔"

"اچھا بس کر۔ نبیل آتا ہی ہو گا۔ تلی ہوئی مچھلی لے کر آرہا ہے وہ۔ تو جلدی سے نہا کر کپڑے بدل لے۔ شاید آج معتزاب بھی تجھے لینے آجائے۔"

میں نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا۔ اماں اپنی دھن میں مگن چھالیہ کاٹ رہی تھیں۔

میں نہانے چلی گئی۔ آسمانی رنگ کا شیفون دوپٹے کا لان کا یہ جوڑا میں نے اسی خیال کے تحت پہنا تھا کہ معتزاب مجھے لینے آئے گا۔

لیکن ایسا نہیں ہوا بارش تھم گئی۔ پھر شام سے رات ہو گئی۔ اور رات سے پچھلا پہر مجھے کروٹیں بدلتے بدلتے بیت گیا۔

"کیا وہ مجھے یاد آرہا ہے؟ نہیں۔ پھر میں کیوں شام ڈھلے سے اس کا انتظار کر رہی ہوں۔ کیا ساون کی پہلی بارش نے اس کے من کو نہیں جھنجوڑا ہو گا۔ کیا اسے میری یاد نہیں آئی ہو گی؟ کیا مجھ میں ایسا کچھ بھی نہیں جو معتزاب محمود کو جھنجوڑ سکتا۔" اپنی کم مائیگی کے احساس سے میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔

نبیل باہر برآمدے میں سو رہا تھا اور اماں مجھ سے کچھ فاصلے پر خراٹے لے رہی تھیں۔ میرے بچپن کی محرومیاں پھر سے میرا احاطہ کرنے لگی تھیں۔ اس وقت مجھے منال بہت یاد آئی۔ اور میرا دل چاہا کہ میں اس سے اپنا دکھ شیئر کروں۔ لیکن رات کے گیارہ بجے اسے ڈسٹرب کرنا میں نے مناسب نہ سمجھا اور یونہی کروٹیں بدلتے بدلتے میری آنکھ لگ گئی۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح نہایت ہی خوشگوار تھی ہلکی ہلکی دھوپ ہر سو پھیلی تھی اور ہوائیں پرشور تھیں۔ گھر میں غیر معمولی چہل پہل سے میری آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ اماں نے مجھے جگایا ہی نہیں تھا۔ میں ابھی تو ٹک رہ گئی۔ سامنے ہی منال اماں سے باتیں کر رہی تھی اور پھر مجھے اٹھتا دیکھ کر وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

"رات ہی میں تمہیں یاد کر رہی تھی اور تم صبح آن پہنچیں۔" میری خوشی بھی دیدنی تھی۔

"اسے ہی تو کہتے ہیں دل کو دل سے راہ دو روپے کا ایس ایم ایس کرنے کی بھی فرصت نہیں تھی تمہیں۔ یاد ہے کوئی بھی بارش ہم نے اکیلے انجوائے نہیں کی۔ ہمیشہ تمہارا فون پہلے آجاتا تھا اور میں سوچتی رہ جاتی تھی۔ اور اب رات بارش تھمنے تک میں تمہارا انتظار کرتی رہی۔"

منال کی بات نے مجھے رنجیدہ کر دیا۔

"پھر دل کو یہ سوچ کر سمجھایا کہ اس وقت تم اپنے پیا کے ساتھ بارش میں نہا رہی ہو گی۔ لیکن جب صبح آنکھ

ے بات ہوئی تو پتا چلا تم یہاں ہو بلکہ کئی روز سے۔ اس پر رکا ہی نہیں گیا۔ یہ بتاؤ چکر کیا ہے؟ اتنے دن سے یہاں کیوں پڑاؤ ڈالا ہوا ہے؟"

"اماں کی طبیعت صحیح نہیں تھی۔ اسی لیے آئی تھی۔ تم بیٹھو میں ابھی فریش ہو کر آتی ہوں۔"

اس کے بعد ہم نے اکٹھے ہی ناشتہ کیا۔ منال کے پاس اپنے منگیتر کی بے شمار باتیں تھیں۔ اس کے والہانہ جذبات تھے جو وہ مجھ سے شیئر کرنا چاہتی تھی۔ شاید وہ اسی وجہ سے آئی تھی۔

"فیضی کو تو شادی کی بہت جلدی ہو رہی ہے۔ پر ابو کہتے ہیں پہلے راحیل کی شادی ہوگی تب منال کی شادی کریں گے۔ مگر راحیل صاحب کو کوئی لڑکی ہی پسند آکر نہیں دیتی۔ یار تم ہی کوئی لڑکی بتاؤ۔"

"بہت جلدی ہو رہی ہے تمہیں شادی کی۔"

میری بات پہ منال جھینپ گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

"فیضان مجھے خودکشی کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ کہتا ہے۔ اگر اس سال کے اینڈ تک انکل نے ہمارا نکاح نہ پڑھایا تو میں اپنی جان دے دوں گا۔"

"اور تم اس کی دھمکیوں میں آگئیں؟"

"یار.... سچ پوچھو ناں تو وہ ایسا ہی پاگل ہے۔ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اب یہ دیکھو زبردستی اس نے مجھے یہ رنگ پہنائی تھی۔ حالانکہ ہمارے ہاں یہ رواج بھی نہیں ہے اور امی ابو نے بھی بہت برا منایا تھا۔ مگر موصوف نے فرمایا "اپنی چیز پہ مہر لگا رہا ہوں" یقین کرو کوئی اور ہوتا ناں تو جوتوں سے پیٹتا مگر ابو کا اکلوتا بھتیجا تھا سو ابو کو برداشت کرنا ہی پڑا۔"

"اور تم بھی بے شرموں کی طرح انگوٹھی پہن کر پھر رہی ہو۔"

"تو کیا کروں.... فون کر کر کے ناک میں دم کیے رکھتا ہے کل رات بھی دو گھنٹے بات کی ہے۔"

"خوش نصیب ہو تم۔ زندگی کے ہر دور میں تمہیں چاہنے والے ہی ملے۔ یہاں تو بچپن سے اب تک ہر چیز چھین کر ہی لینا پڑی ہے۔"

"کیا مطلب؟" منال مجھے دیکھ کر چونک گئی۔

"تم.... ادھر دیکھو میری طرف۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے تم خوش نہیں ہو۔"

"نہیں ٹھیک ہی ہے سب کچھ۔"

[illegible] منال کی [illegible] اتر گئی۔ "نہیں تم جھوٹ بول رہی ہو۔ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔"

"یار تم اتنی زبردست رومینٹک لڑکی اور.... نہیں یہ ہو نہیں سکتا۔ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ مجھے بتاؤ معاملہ کیا ہے۔ کوئی بھی شخص تمہاری شخصیت پہ ناز کر سکتا ہے۔ تم کہیں بھی ہوتی تھیں اپنا آپ منوا لیتی تھیں۔ پر آج تو تم بکھری کیوں لگ رہی ہو۔"

میں نے منال کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ "سچ بتاؤں اب میں اپنا آپ منوانا نہیں چاہتی۔ کیوں ہمیشہ ہی کوششوں سے خوشیاں میرے حصے میں آئی ہیں۔ قدرتی طور پہ سب کچھ کیوں نہیں ہوتا۔ فیضان بھی تو تم سے محبت کرتا ہے۔ کیا یہ محبت پانے کے لیے تم نے کوششیں کی تھیں؟ نہیں ناں۔ ایسا میرے ساتھ کیوں نہیں ہوا؟"

"شاید اس لیے کہ تمہیں محبت کا اظہار کرنے کا زیادہ سلیقہ ہے۔ پتا ہے کیا۔ جب فیضان نے پہلی بار تمہارے وہ لیٹرز اور شعر کارڈز دیکھے تھے تو سخت جذباتی ہو گیا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ کسی لڑکی کے ہیں۔ اب اتنا ہنر تو ہر ایک میں نہیں ہوتا ناں۔"

"پر میرا بھی تو دل ہے میرا بھی دل چاہتا ہے کہ کوئی مجھے چاہے۔ اور ہر پل اس کا اعتراف بھی کرے۔"

میری بات پہ منال [illegible] فیضان تو [illegible] سیراب کر رہا تھا بلکہ میں پھر بھی [illegible] پیاسی تھی۔

"یار بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جنہیں چاہنے سے زیادہ چاہے جانا پسند ہوتا ہے۔" منال اپنی انگلی میں رنگ ہلاتے ہوئے سر جھکا کر ایسے کہہ رہی تھی جیسے اعتراف جرم کر رہی ہو۔ "ہو سکتا ہے مضراب بھائی کی بھی ایسی ہی طبیعت ہو۔"

میں اس کی بات پہ ہنس پڑی ایک کھوکھلی اور بے جان ہنسی۔

"چاہنا یا چاہے جانا چاہت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اور چاہت کبھی چھپی نہیں رہتی اور سچ تو یہ ہے کہ وہ ہر احساس سے عاری ہے اور اس میں کسی چیز کی چاہت ہی نہیں۔"

"ایسا نہیں ہوتا۔" منال نے سختی سے تردید کی۔

میں نے حیرت سے منال کی طرف دیکھا "تم خواہ مخواہ ایک اجنبی شخص کی حمایت کر رہی ہو۔"

"بے شک مضراب بھائی میرے لیے اجنبی ہیں۔ لیکن

محبت کے جذبے ہر ایک کے لیے آشنا ہوتے ہیں۔ تم اگر اسے پیار اور توجہ دو تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ تمہاری طرف متوجہ نہ ہو۔ اسے وش کرنے کے ایسے مواقع ڈھونڈو کہ وہ چونک جائے۔"

"یعنی ایک مرد کو محبت کرنا میں سکھاؤں گی۔" میں خود پہ ہنسی۔

مجھے غیر سنجیدہ دیکھ کر منال خاصی جذباتی ہو گئی۔

"یا تو یہ چیلنج تم خود قبول کر لو۔ ورنہ میں یہ کر کے دکھا سکتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ اور اس کی سنجیدگی نے مجھے چونکنے اور سوچنے پہ مجبور کر دیا۔ اتفاق سے منال کے جاتے ہی میری ساس کا فون آگیا۔ انہوں نے پہلے اماں کی خیریت دریافت کی۔ جب میں نے بتایا کہ الحمدللہ وہ اب بالکل ٹھیک ہیں تو انہوں نے اتنا شکوہ کیا۔

"اگر تمہاری اماں کی طبیعت سنبھل گئی تھی تو تمہیں گھر آجانا چاہیے تھا۔ دو روز سے مضراب کو سخت بخار ہے اور وہ گھر میں پڑا ہوا ہے۔"

"اگر دو روز پہلے ہی مجھے اس بات کی اطلاع مل جاتی تو میں یہاں رکتی ہی کیوں۔" مگر میں یہ بات اپنی ساس سے کہہ نہ سکی اور جی جی کر کے فون بند کر دیا۔

میں اسی وقت تیار ہو کے گھر آگئی۔ مضراب ڈاکٹر کے پاس گیا ہوا تھا۔ گھر میں اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ مضراب کی بڑی بہنیں آئی ہوئی تھیں۔ میں سلام دعا کر کے بیٹھی ہی تھی کہ وہ شروع ہو گئیں۔

"میاں کی طبیعت خراب ہے اور تم ہو کہ اماں کے گھر بیٹھی ہوئی تھیں۔"

"لو بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ اتنے دن جا کر بیٹھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" یہ دوسری نند تھی۔

"ہم تو اتنا حیران ہوئے کہ نو دن سے مسلسل تم اپنے میکے میں ہو۔ آج کل کے دور میں تو کوئی نو گھنٹے بھی نہیں چھوڑتا۔ اکلوتی ایک بہو۔ وہ بھی اتنا میکے میں رہے گی تو مضراب کی شادی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

اب وہ اپنی ماں سے مخاطب تھی۔ میں اس اچانک پیشی کے لیے تیار نہیں تھی کہ ساس کی طرف سے بیان آیا۔

"بھئی میں تو ان میاں بیوی کے معاملے میں مداخلت نہ کرتی ہوں نہ کروں گی۔ ان دونوں کے درمیان کیا طے پایا تھا یہ انہیں ہی پتا ہوگا۔"

ان سب باتوں کا میرے پاس ایک ہی جواب تھا۔

"مجھے کوئی اطلاع کر دیا لیتے۔ تو میں کیوں رکتی فوراً آجاتی لیکن کسی نے بھی میری بات پہ توجہ نہ دی۔ سب کا زور اسی بات پہ تھا کہ مجھے دو تین روز بعد خود ہی آجانا چاہیے تھا۔

☆ ☆ ☆

مضراب ڈاکٹر سے دوا لے کر آچکا تھا۔ اس کی بہنیں اس کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں۔ سو مجھے بھی اپنی اہلیت دکھانی چاہیے تھی لیکن پانچ بہنوں کے ہوتے ہوئے مجھے یہ موقع نہ مل سکا اور میں چپ چاپ اپنے کمرے میں آگئی۔ مضراب کے آنے تک میں نے کمرے کی حالت درست کر لی تھی۔

کمرے میں کاغذ کے پھولوں کی آرائش اور بے وجہ کے دل وغیرہ میں نے سب نوچ کھسوٹ کر پھینک دیے سادگی سے کمرے کی دلکشی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

تب ہی مضراب کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے حیرت سے کمرے کی دیواروں کو دیکھا پھر میری طرف اور چپ چاپ بستر پہ لیٹ گیا۔ پتا نہیں اسے اچھا لگا تھا یا برا۔

میں بھی منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے واش روم میں چلی گئی۔ تولیے سے ہاتھ منہ پونچھ کر میں نے ایک طرف ٹکایا۔ اور مضراب کے قریب آگئی۔

اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ بخار نے اسے جھنجھوڑ ڈالا ہے۔ شیو اچھی خاصی بڑھی ہوئی تھی۔ اور یہ دو دن کی شیو نہیں تھی۔ قریباً آٹھ دن کی ضرور ہوگی۔ تو کیا اس نے میرے ہجر میں یہ حال کر لیا تھا۔ ہائے رے خوش فہمی۔

"اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" یہ سوال کرتے ہوئے من ہی من میں میں سوچ رہی تھی اگر مجھ سے اس چویشن میں میرا محبوب پوچھتا تو میں کہتی۔

"ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پہ رونق"

پھر ہاتھ تھام کر اپنی شدتوں کا اظہار کرتی۔ مگر وہاں سے تو وہی بوسیدہ سا جواب آیا۔

"ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک تو نہیں لگ رہے۔ یہ حالت کیا مجنونانہ سی بنا رکھی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے مضراب کا ہاتھ تھاما اور اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"دروازہ کھلا ہوا ہے۔ کوئی اچانک آبھی سکتا ہے۔" اس نے تنبیہہ کی۔ تو میرا منہ ایک دم کڑوا ہو گیا ہے۔ پھر

بھی میں ڈھٹائی سے بیٹھی رہی۔
"تو آ جائے میں کوئی جرم کر رہی ہوں۔" معتراب نے مجھے چونک کر دیکھا۔
"نورین میں خاصا چینج آ گیا تم میں۔"
ایک اور دل جلانے والا جملہ۔ میں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور مسکرا کر بولی۔
"آپ نے مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی ورنہ میری خوش اخلاقی تو آپ سے چھپی نہ رہتی۔"
"خوش اخلاقی!" وہ طنزیہ مسکرایا۔
"آج سے قبل تو میں نے تمہیں کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ ہی مجھ سے لڑتی یا ناراض ہی رہتی ہو۔ بلکہ میں تو خود حیران ہوں کہ مجھے بیمار پا کر تمہیں کاہے کی خوشی ہو رہی ہے۔"
میری برداشت جواب دے گئی۔ میں نے معتراب کا ہاتھ چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔
"درست سمجھا آپ نے۔ آپ کو بیمار پا کر میرا کروڑوں کا فائدہ ہو رہا ہے۔ مجھے تو خوب جشن منانا چاہیے۔"
وہ چپ چاپ میرا منہ دیکھتا رہا۔ پھر مجھے خود ہی خیال آیا۔ اور میں نے خود کو نارمل کیا۔
"اگر آپ کی طبیعت اتنی ہی خراب تھی تو مجھے فون کیوں نہیں کیا؟"
"میری دیکھ بھال کرنے کے لیے یہاں بہت سے لوگ تھے۔" وہی روکھا سا جواب۔
"تو کیا ان بہت سے لوگوں میں میری کوئی اہمیت نہیں؟" میرے اندر کچھ ٹوٹا تھا۔
"دن ہی کتنے ہوئے ہیں تمہیں میری زندگی میں آئے ہوئے۔ فقط بیس دن اور ان بیس دنوں میں سے نو دن تو تم اپنے میکے میں رہی ہو۔"
"میں اپنی مرضی سے تو جا کر نہیں بیٹھی تھی۔ ضرورت تھی تو بلا لیجئے۔" میں نے تنک کر کہا۔
"الحمد للہ۔ میری سب ضرورتیں ہمیشہ بغیر کہے پوری ہو جاتی ہیں۔" لہجے کی ٹھنڈک نے مجھے اندر تک ٹھٹھرا دیا۔
"آخر آپ کی ان سب باتوں کا مطلب کیا ہے؟" میں اس کے سر پہ جا پہنچی۔
"میرا کوئی مطلب نہیں ہے۔ میں نے دوا لی ہوئی ہے اور مجھے نیند آ رہی ہے۔" اس نے اسی سرد انداز میں کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے چہرے پہ وہی سرد مہری تھی۔ جس نے مجھے اندر تک جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ بہت دیر تک میں صوفے پہ یونہی بیٹھی رہی۔ جب کہ وہ سو چکا تھا۔
رات کافی ہو گئی تھی۔ میں نے کمرے کی لائٹس آف کیں اور بیڈ کے دوسرے کنارے پہ پڑ گئی۔ اس شدید گرمی میں اے سی کی کولنگ نے کمرے کو ٹھیک ٹھاک جنت بنا رکھا تھا۔ معتراب کو شاید سردی لگ رہی تھی۔ اس نے کمبل ٹانگوں پہ پھیلا رکھا تھا۔ یونہی لیٹے لیٹے مجھے خیال آیا تو میں نے اس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ جو اس کے مزاج کی طرح بالکل سرد ہو رہی تھی۔ میں نے اٹھ کر کولنگ تھوڑی سی کم کر دی اور واپس آ کر لیٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں بستر پہ اکیلی تھی۔ بیمار غائب تھا۔ میں ہڑبڑا کر تیزی سے اٹھی تو معتراب کو الماری میں کچھ تلاش کرتا پایا۔ وہ بہت عجلت میں تھا۔ اور اپنی دکان پہ جانے کے لیے بالکل تیار تھا۔
"اگر آج کی بھی چھٹی کر لیتے تو کیا ہو جاتا۔" میں نے اس کی طبیعت کے خیال سے ہی تو کہا تھا۔
مگر اسے اس بات کا کہاں احساس ہونا تھا۔ [illegible] جوابات کا رخ [illegible] ہو گیا۔
"پہلے ہی دو چھٹیاں ہو چکی ہیں اور پھر گھر میں پڑ کر رہنا بھی کیا ہے۔"
یہ دوسرا جملہ جو ذرا آہستگی سے کہا تھا میں نے با آسانی سن لیا تھا۔ میں اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔
"ایک بیمار انسان کو گھر میں رہ کر سکون ہی چاہیے ہوتا ہے اور وہ آپ کو با آسانی مل جاتا ہے۔"
"سکون انسان کے اندر ہوتا ہے اگر وہاں نہ ہو تو پھر کہیں نہیں ہوتا۔" یہ کہتے ہوئے وہ نکلتا چلا گیا اور میں اس کے اس چھوٹے سے جملے میں جو فلسفیانہ بھی تھا اور معنی خیز بھی کھو سی گئی۔
زندگی پھر معمول پہ آ گئی۔
میں دوپہر کا کھانا پکا کر ابھی فارغ ہو کر لیٹی ہی تھی کہ منال کا فون آ گیا۔
میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے گن گن لینے کے لیے بے چین ہو گی۔ مگر میرے پاس تو کوئی خوش کن خبر نہ تھی۔ میں نے بے دلی سے فون اٹینڈ کیا۔ وہ مجھے سالگرہ کی

مبارک باد دے رہی تھی۔ میری کلفت دور ہونے لگی۔ میں کسی کے لیے تو اہم تھی۔
"صبح سے اب خیال آیا ہے۔" میں نے شکوہ کر ڈالا۔
"اور اپنے فون پہ میسج دیکھتے ہیں۔" وہ الٹا ڈپٹ کر بولی تو میں خاموش ہو گئی۔ اب یہ خرافات دیکھنے کی فرصت کہاں تھی۔
"اچھا سنو۔ رات کھانے پہ ہماری طرف آ جاؤ۔ معتراب بھائی کے ساتھ۔"
"پتا نہیں وہ کیا محسوس کریں۔" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔
"کیا بوریت ہے یار۔ میں کیا تمہیں کسی کلب یا ہوٹل میں انوائٹ کر رہی ہوں۔"
"اچھا!" میں نے ہار مان لی۔ "شام کو آئیں گے تو پوچھ لوں گی۔"
"شام کو کیوں۔ ابھی فون کر کے پوچھ لو نا۔ کیا فون نمبر نہیں ہے تمہارے پاس؟"
"چلو ٹھیک ہے۔ میں ابھی کال بیک کرتی ہوں۔"
میں نے معتراب کا نمبر ملایا۔ دوسری ہی بیل پہ اس نے فون اٹھا لیا۔ میں نے پہلی بار معتراب سے فون پہ بات کرنی تھی۔
موبائل میں سے اس کے سلام کی آواز ابھری اور تب ہی میرے دل میں اچانک شرارت جاگی۔ کیوں نہ اسے ستاؤں۔ رانگ نمبر بن کر۔۔۔۔
"ہیلو!" میں نے آواز بدل کر کہا۔
"جی!" لہجے میں وہی ٹھہراؤ آ گیا جو میرے لیے مخصوص تھا۔ اور جس سے مجھے فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ میری آواز پہچان گیا ہے۔ میں خاموش ہو گئی۔
"کیسے فون کیا ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا اور میری خوش فہمیاں "مجھ پہ ہنس رہی تھیں۔ جتنا بدھو میں اسے سمجھتی تھی وہ اتنا بدھو نہیں تھا۔
"میں یہ پوچھ رہی تھی کہ شام کو آپ مصروف ہیں یا نہیں۔"
"کیا مطلب کوئی کام ہے کیا؟" ابھی میرا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ اس نے سوال جڑ دیا۔
"ہاں کہیں جانا تھا۔ ہم لوگ ڈنر پہ انوائٹ ہیں۔"
"ٹھیک ہے میں گھر آؤں گا تو پھر بات کریں گے۔" اس نے کہتے ہی فون بند کر دیا۔

اور میں سوچنے لگی۔ دو نئے نویلے میاں بیوی کے درمیان ایسی گفتگو بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی بے ربط اور بے رس۔۔۔۔ خیر میں نے رات کی ساری تیاری مکمل کر لی۔
رات کو آتے ہی اس نے پوچھا تھا "کہاں جانا ہے؟"
"میری دوست ہے منی اس نے انوائیٹ کیا ہے۔" میں نے بتایا۔
"کس قسم کا ڈنر ہے؟"
"وہ یہ ڈنر میری ہی خوشی میں دے رہی ہے۔ تمام کزنز اور دوست وہاں اکٹھی ہوں گی۔"
"کیسی خوشی؟" معتراب کی نظریں میرے چہرے پہ مرکوز ہو گئیں۔
"آج میرا جنم دن ہے۔" میں نے آہستگی سے بتایا۔ میرا خیال تھا شاید وہ بھی مجھے وش کرے اور کہے کہ "تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔"
"تو تم ہر سال اپنی سالگرہ پہ کیک کاٹتی ہو۔" اس کے چہرے پہ استہزائیہ مسکراہٹ تھی۔ "اگر ایسی ہی بات تھی تو مجھے بتا دیتیں میں کیک وغیرہ یہیں لا دیتا۔ اب یہ سب تکلیف کرنے تم اس کے گھر جاؤ گی۔ مجھے تو بہرحال یہ سب اچھا نہیں لگے گا۔ اگر تمہیں یہ سب کچھ اچھا لگتا ہے تو میں روکوں گا بھی نہیں۔ لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔"

اپنی بے قدری اور اس کے خشک رویے پہ میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے منال کو تو فون پہ انکار کر دیا پر اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو نہ روک سکی۔
رات کے کھانے سے فارغ ہو کر جب میں بستر میں لیٹی تو میرا تکیہ بھیگتا چلا گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ معتراب کمرے میں کب آیا۔ جب وہ لائٹ آف کر کے میرے قریب لیٹا تو اسے محسوس ہو گیا کہ میں رو رہی ہوں۔
اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے اس نے لائٹ جلا دی اور میرے سامنے آ گیا۔
"تم رو رہی ہو؟" اس کے لہجے میں محبت نہیں حیرت تھی۔
میں نے انگلیوں سے آنسو جذب کرتے ہوئے آنکھیں میچ لیں۔
"اگر تم اپنی سالگرہ منانا چاہتی ہو۔ تو میں ابھی تمہیں کیک اور دیگر اشیاء لا دیتا ہوں۔ مگر اس میں رونے والی کون سی بات ہے۔ تم اب بھی اپنی سالگرہ منا سکتی ہو۔ اور
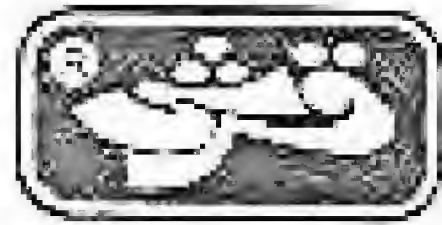
یہ بات تمہیں مجھے پہلے بتا دینی چاہیے تھی کہ تم سائکو، منافق ہو۔"

اس کی گفتگو میں اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔ اور اس سے زیادہ خود پہ کہ کیوں نہ خود پہ ضبط کر سکی کیوں خوامخواہ تماشا بن رہی ہوں۔

جو شخص صرف کیک کاٹنے کو ہی سائکو سمجھتا ہو اس کے سامنے جذبوں کی کیا تشریح کی جا سکتی تھی۔

"دیکھو مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے مجھ سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو۔ پلیز اٹھو میں ابھی تمہیں کیک لا دیتا ہوں۔ تم اب بھی سائکو، منافق ہو۔"

"فار گاڈ سیک۔" میں چادر پکڑ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کیا آپ کچھ دیر مجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے؟" میں گھٹی گھٹی آواز میں التجا ہی کر سکی۔ پھر اٹھ کر واش روم میں بند ہو گئی۔ قسمت پتھر سے پھوٹ جاتی یا مضراب سے ایک ہی بات تھی۔ وہ شخص جذبوں سے عاری تھا۔

میں کئی دن سے نوٹ کر رہی تھی۔ مضراب اپنے موبائل پہ زیادہ ہی مصروف رہنے لگا تھا۔ اور یہ سب میں جان بوجھ کر نظر انداز کر رہی تھی۔

ہر ماہ کی دوسری تاریخ پہ وہ مجھے معمول کے مطابق جیب خرچ دیتا تھا جس کی مجھے خاص ضرورت نہیں ہوتی تھی اور وہ میں ایسے ہی دراز میں ڈال دیا کرتی۔ آج بھی جب وہ مجھے جیب خرچ دے رہا تھا تب ہی اس کا سیل فون بج اٹھا میرے سامنے ہی اس نے تین بار اس کال کو کاٹا۔ کوئی مستقل مزاج ہی تھا۔ بالآخر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے پیسے دراز میں ڈال لیے۔

چھ ماہ میں ٹھیک ٹھاک رقم جمع ہو گئی تھی۔ اگر میں انہیں تحفے تحائف میں اڑاتی تو آج یہاں ایک روپیہ بھی نہ ہوتا۔ مگر اب میں تحفہ دیتی بھی تو کسے؟ مضراب کو... تو مجھے اپنی انسلٹ اچھی طرح یاد تھی۔

شادی کے دو ماہ بعد جب میں نے مضراب کے لیے ایک شرٹ اور ایک پرفیوم خرید اور اسے اچھی طرح پیک کر کے مضراب کو دیا تو اس نے بڑی بے دلی سے اسے دیکھا اور کہنے لگا۔

"تم نے خوامخواہ اتنا تکلف کیا۔ میرے ہی پیسوں سے مجھے ہی گفٹ دے دیا۔ یہ پیسے تو میں تمہیں تمہارے خرچ کے لیے دیتا ہوں۔ اگر ان کو مجھ پر خرچ کرو گی تو اپنی ضرورتیں کہاں سے پوری کرو گی۔"

اف میں بیان نہیں کر سکتی۔ مضراب کے یہ خیالات جب مجھ پہ آشکار ہوئے تو میری کیا حالت تھی۔ غم و غصے سے میرا جی چاہا کہ اپنا سر پھاڑ لوں یا اس بندے کو کچھ کر دوں۔ یہ تحفے تحائف تو محبت بڑھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ مانا کہ حقیقت پسندی کچھ لوگوں کی طبیعت کا خاصہ ہوتی ہے۔ مگر ایسی بھی کیا حقیقت پسندی کہ کسی کے دل کا بھی خیال نہ رکھا جائے۔

☆ ☆ ☆

ایک تتلی تو میں بھی پکڑ ہی لیتا
ہاتھ میں پھول اگر لے کر رکھتا میں بھی

جب میں نے یہ شعر پڑھا تو صوفیہ کھکھلا کر ہنس پڑی اور میں اس کی ہنسی کے ترنم میں کھونے لگا۔ ثمرہ کی نسبت صوفیہ میں کتنی سادگی اور معصومیت تھی یہ اندازہ مجھے صوفیہ سے مل کر ہوا تھا۔

صوفیہ میری زندگی میں آنے والی دوسری عورت تھی۔ حالانکہ جب میں نے شادی کے بعد ثمرہ کو دیکھا تھا تو یہ تہیہ کیا تھا کہ وہ میری زندگی میں آنے والی پہلی اور آخری عورت ہے۔ تب میں نے ثمرہ سے جھوٹ بھی نہیں بولا تھا۔ واقعی میری زندگی میں آنے والی وہ پہلی عورت تھی۔ مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ جلد ہی ایک اور لڑکی میری زندگی میں داخل ہو جائے گی۔ ثمرہ میری زندگی میں باقاعدہ داخل ہوئی تھی۔ جبکہ صوفیہ بالکل اچانک۔

وہ مجھے بڑے عجیب عجیب سے ایس ایم ایس بھیجا کرتی تھی۔ اور یہ سلسلہ شادی کے ٹھیک تین ماہ بعد سے شروع ہوا تھا۔ پہلے پہل تو میں سب باتیں نظر انداز کرتا رہا۔ لیکن اس کی مستقل مزاجی ہی تھی کہ میں جواب دینے پہ مجبور ہو گیا۔

پھر یہ سلسلہ فون کالز تک آ گیا۔ میں ان خرافات کا فطری طور پہ قائل نہیں تھا۔

لیکن ثمرہ کی بہت سی باتوں نے مجھے اس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ ثمرہ کے اندر ہٹ دھرمی اور جارحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جبکہ میں صلح جو انسان تھا۔ میں نے اپنے ارد گرد ایسی خواتین نہیں دیکھی تھیں جیسی ثمرہ تھی۔ مردمار قسم کی خاتون۔

حالانکہ وہ غیر معمولی حسن کی مالک تھی۔ اور اسے کسی بھی شخص کو محبت ہو سکتی تھی۔ لیکن.... لیکن

نہیں وہ پہلے ہی دن سے مجھ پہ کیا جتانا چاہتی تھی۔

صوفیہ کی بے تکلفی کی حوصلہ شکنی میں نے اس لیے نہیں کی تھی کہ میں عورت کو جاننا چاہتا تھا۔ نمرہ کی شخصیت نے مجھے یہ قدم اٹھانے پہ مجبور کر دیا تھا۔

یہ سب کچھ ایک طرف اور نمرہ کا رویہ دوسری طرف تھا۔

میں آج تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ نمرہ نے میرے ساتھ ایسا رویہ کیوں رکھا تھا۔

"جب میں شادی کی پہلی رات پہ اپنے کمرے میں پہنچا تو نمرہ سادہ لباس میں ملبوس صوفے پہ ایستادہ تھی۔ میں خلوت میں پہلی بار ایک لڑکی سے ملنے جا رہا تھا۔ ظاہر ہے میں کچھ نروس بھی تھا۔ لیکن جب مجھے مقابل فریق شرمانا لجانا نہ ملا تو میں اور بھی نروس ہو گیا۔ میں اپنی شریک سفر سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن میرے پاس وقت بہت کم تھا۔"

میری اس بات پہ صوفیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"وقت کم تھا کیا مطلب؟"

"ہاں وقت کم تھا۔ جب میں کمرے میں گیا تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ گھر کا اکلوتا فرزند اور بھائی ہونے کے ناتے سب کو مجھ سے بہت سی توقعات تھیں تو وہاں خدشات بھی بہت تھے۔ بیوی سے ملتے ہی کہیں میں بیوی کا ہی نہ ہو جاؤں۔ اسی لیے میں شادی کی پہلی صبح اپنے کمرے سے اسی وقت نکلا جس طرح روز نکلتا تھا۔ ٹھیک آٹھ بجے۔

اور اس بات پہ میری بہنوں کا اطمینان مجھ سے چھپا نہ رہ سکا۔ ظاہر ہے ایسا سب کچھ امی ابو بھی چاہتے ہوں گے تب ہی وہ مجھ سے خوش تھے۔

پھر اگر میں کمرے میں رکتا بھی تو الجھتا ہی رہتا۔ کیونکہ نمرہ سے پہلی ملاقات کے بعد میں پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا اور دن بھر مجھے یہی احساس ہوتا رہا کہ اس کے بھی کچھ حقوق تھے۔ مجھے اس چیز کو پس پشت نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔ وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہو گی۔

اگلی ملاقات پہ جب میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو اس نے میری تردید نہیں کی اور چپ رہی۔ وہ شادی کی پہلی صبح تھی۔ ولیمہ کے بعد جب ہماری ملاقات ہوئی۔ تو میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ولیمہ کے ڈریس میں وہ اتنی حسین لگ رہی تھی تو شادی والے روز تو اس سے بھی زیادہ حسین لگ رہی ہو گی کیوں اس نے اپنا میک اپ اور جیولری اتار دی تھی۔ میرا حق تھا کہ میں اس سے پوچھوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا مگر میں نے نہیں پوچھا۔

پہلے ہی پہلی رات کون سی اچھی گزری تھی۔ جو میں یہ تلخ باتیں لے کر بیٹھ جاتا۔ ویسے بھی میں تو فطرتاً" صلح جو آدمی ہوں۔

لیکن مجھے پچھلی رات کی خلش ضرور تھی۔ اس لیے دانستہ میں نے اس کی تعریف نہیں کی۔ میں اس منافقت کا آج اظہار کر رہا ہوں۔ اگر وہ سمجھنا چاہتی تو میرے احساس کو جان سکتی تھی۔ لیکن مجھے ایسا لگا جیسے خود پسندی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ کیونکہ جب میں نے پیش قدمی شروع کی تو وہ اکڑ دکھانے لگی۔ حالانکہ میں نے تو سنا ہے کہ لڑکیاں ان لمحات میں شرماتی ہیں مگر وہ حساب کتاب کر رہی تھی۔ اس کی اس خودسری اور مجھ پہ حاوی ہونے والی فطرت ہی وہ وجہ تھی کہ میں نے اسے رونمائی کا تحفہ بھی اپنے ہاتھ سے نہیں پہنایا تھا جسے اس نے ایک طرف پھینک دیا تھا۔ تب میں پیچھے ہٹ گیا۔ اور نئے سرے سے الجھنے لگا۔ اور وہ جا کر لیٹ گئی۔

اس نے کسی بھی رویے میں میرے لیے اپنا پن نہیں تھی بلکہ حاکمیت تھی۔ مگر پھر بھی میں نے اس کی اس بدتمیزی کو نظرانداز کر دیا۔

اسے شاید صبح دیر تک سوتے رہنے کی عادت تھی۔ مجبوراً" مجھے ہی اسے جگانا پڑا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی ذمے داری اچھی طرح سنبھال لے اور میرے والدین اور بہنوں کو کسی بھی شکایت کا موقع نہ ملے۔"

"واٹ نان سینس۔" صوفیہ نے میری بات پہ سر جھٹکا۔ "دو روز کی دلہن بھلا اپنی کیا کارکردگی دکھا سکتی ہے۔ آپ نے اس سے غلط توقعات وابستہ کیں۔ ابھی تو وہ آپ کے ساتھ ایڈجسٹ بھی نہیں ہوئی تھی۔ آپ کے گھر والوں کو کیسے قبول کر لیتی۔ آئی مین ان کی خدمتیں وہ تب ہی کر سکتی تھی جب وہ آپ سے خوش ہوتی۔ وہ تو آپ سے خوش ہی نہیں تھی۔ پھر وہ کیوں لوگوں کے دلوں میں جگہ بناتی کیوں انہیں خوش کرتی۔ اس چیز کے لیے وقت تو لگتا ہے ناں....."

میں نے صوفیہ کی بات بڑے دھیان سے سنی۔ کہہ وہ بھی ٹھیک ہی رہی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ انسان کا پہلا تاثر ہی دیرپا ہوتا ہے۔

جتنے جوش و خروش سے میری بہنیں اور والدین نمرہ کو بیاہ کر لائے تھے میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ماند پڑے۔ اور اس میں نمرہ ہی کا تو فائدہ تھا۔ اسی کی تو عزت بڑھانا چاہتا تھا میں۔ وہی ہمارے گھر پہ چھائی رہے یہی میری خواہش تھی۔"

"تو کیا آپ نے اپنے ان احساسات کا اظہار اس کے سامنے کیا؟" صوفیہ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"ہاں میں نے اس چیز کو بارہا جتایا اور پہلی رات میں نے صرف اسی بات پر زور دیا تھا کہ وہ میرے گھر والوں کی چاہت بن کر آئی ہے۔ یہ چاہت کم نہ ہونے پائے۔"

"حیرت کی بات ہے پھر بھی آپ کی بیوی سمجھ نہ سکی؟" صوفیہ نے کاندھے اچکائے تو میں صوفیہ کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"اصل میں بات یہ ہے کہ اس نے میرے گھر والوں کو اہمیت ہی نہیں دی اور آج تک اس کا یہی رویہ ہے۔ وہ مجھ سے شاکی ہی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے۔ جیسے وہ کسی اور کو پسند کرتی تھی اور زبردستی میرے ساتھ نباہ کر رہی ہے۔"

"بڑی جلدی کی آپ نے اس نتیجے پہ پہنچنے کی۔ آپ مردوں کی یہی تو خرابی ہے۔ عورت پہ الزام لگانے میں ایک منٹ نہیں لگاتے جبکہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں تو آپ خود اس وقت کیا کر رہے ہیں۔"

میں صوفیہ کی بات پہ محظوظ ہوا اور چلتے چلتے رک گیا۔ پھر صوفیہ کی خوب صورت آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"میں آپ سے فلرٹ تو نہیں کر رہا۔"

صوفیہ میری بات پہ گھبرا گئی۔ ایسی گھبراہٹ میں نے کبھی نمرہ کے چہرے پہ نہیں دیکھی تھی میں نے مسکراتے ہوئے اس پہ سے نظریں ہٹا لیں۔

روزانہ شام کو صوفیہ کے ساتھ وقت بتانا میرا معمول بن چکا تھا۔

مجھے اس کی سنگت میں خوشی حاصل ہوتی تھی۔ وہ مجھے سنتی بھی تھی اور مجھے سناتی بھی تھی لیکن اس نے کبھی مجھ پہ حاوی ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"یہ محض میری غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن نمرہ نے کبھی مجھے یا میرے گھر والوں کو اہمیت نہیں دی۔"

"آپ کے گھر والوں نے کبھی اس کو اہمیت دی ہے۔ کبھی اس کو سراہا؟ اس کی تعریف کی؟"

"یہ سچ ہے کہ میرے گھر والوں میں سے آج تک اس کی تعریف کسی نے نہیں کی۔"

صوفیہ اس بات پہ معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "یہ تو ہمارے معاشرے کا وتیرہ ہے کہ بہوؤں کی کوئی تعریف نہیں کرتا۔"

"مگر میرے گھر والے اس کی برائیاں بھی نہیں کرتے۔" میں نے سچائی سے کہا۔

"یہ تو پھر آپ لوگوں کا بڑا پن ہے کہ اس میں خوبیاں بھی نہیں ہیں۔ پھر بھی اس کی برائی نہیں کرتے۔" صوفیہ محظوظ ہوتے ہوئے مجھ پہ طنز کر رہی تھی۔

"ویسے یہ آپ کی بیوی کی خوبی نہیں کہ جب آپ رات کو دیر سے گھر جاتے ہیں تو وہ آپ سے پوچھتی نہیں کہ آپ کہاں تھے؟"

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس نے اب مجھ میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا ہے یا اپنے جذبات سے تائب ہو گئی ہے۔"

"صرف چند ہی ماہ میں۔" صوفیہ کو حیرانی ہوئی۔

"ہاں میں نے بتایا ناں خود پسندی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔"

"تو آپ اس خود پسندی کا یہ فائدہ اٹھا رہے ہیں کہ آپ نے راستہ ہی بدل لیا۔"

"نہیں۔" میں نے اس کی بات کو سختی سے رد کیا۔

"میں بھی زندگی کو اب کھل کر انجوائے کرنا چاہتا ہوں ساری عمر میں نے اپنے جذبات صرف ایک لڑکی کے لیے سنبھال کر رکھے تھے۔ لیکن اس نے مجھے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ کیا جتانا چاہتی تھی مجھے میرے ہی پیسوں سے مجھے گفٹ دے کر۔ کیا مجھے یہ سب کچھ کرنا نہیں آتا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار جو تحفہ کسی لڑکی کو دیا تھا۔ وہ رونمائی کی انگوٹھی تھی۔ جسے اس نے آج تک انگلی میں نہیں ڈالا۔ یہاں تک کہ میں نے اس سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر اسے یہ پسند نہیں تو میں دوسری کوئی اور چیز بھی لا سکتا ہوں۔"

"کیا وہ انگوٹھی آپ نے اسے خود پہنائی تھی؟" صوفیہ کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"جب اس نے تمام زیور ہی اتار کر پھینک رکھا تھا تو میں اسے انگوٹھی کیوں پہناتا؟ بندہ کا پہلا امپریشن ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ یہ جان بوجھ کر میری جذبات کی نفی کرے گی۔ اس لیے میں نے اس سے

کسی بھی معاملے میں بحث یا ضد نہیں باندھی۔ کبھی میں نے اسے تکرار کا موقع نہیں دیا اور میں جانتی ہوں اس بات پر وہ بہت تیخ پا ہوتی ہے اور مجھے رد کرکے اپنا آپ منوانا چاہتی ہے۔"

"یعنی آپ تو بڑے تھکے ہوئی ہیں۔" صوفیہ نے صاف گوئی سے کہا۔

"میں ایسا تھا نہیں لیکن مجھے یہ سب کچھ کرنا پڑ رہا ہے۔ صرف اس کی حرکتوں کی وجہ سے۔ ابھی شادی کو چند ہی دن ہوئے تھے اور وہ اپنی اماں کی تیمارداری کے بہانے اپنے میکے چلی گئی۔ پورے نو دن مزے سے اپنے گھر میں بیٹھی رہی۔"

"تو آپ اسے لینے چلے جاتے۔ کیوں چھوڑا اتنے دن؟"

"کیوں لینے چلا جاتا۔ کیا وہ مجھ سے پوچھ کر گئی تھی۔ یا میری ماں سے پوچھ کر گئی تھی۔ صرف اتنی کو بتا کر گئی تھی کہ اس کی اماں کی طبیعت خراب ہے۔ میں دوبار اس کی اماں کی طبیعت پوچھنے گیا مگر اس نے میرے ساتھ آنے کے لیے نہیں کہا۔ میں اپنے گھر والوں کے سامنے دل ہی دل میں پشیمان ہوتا رہا۔ میرے گھر والے بنا کے میری ہر بات کا خیال رکھتے ہیں تو اس کو بھی ان کا خیال ہونا چاہیے۔"

"یہ احساسات آپ کے گھر والوں کے آپ کے لیے تھے۔ آپ کی بیوی کے لیے تو نہیں تھے۔" صوفیہ نے دو ٹوک انداز میں کہا تو میں چونک گیا۔ میں نے صوفیہ کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔

"آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بیوی آپ کا اور آپ کے گھر والوں کا خیال رکھے تو آپ کو اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال رکھنا چاہیے۔"

"ہونہہ!" میں صوفیہ کی بات پہ تلخ ہو گیا۔

"وہ اپنی ہر خوشی کے لیے خود ہی پہلے سے اہتمام کرلیتی ہے۔"

"اچھا یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اس کا مطلب ہوا آپ کی بیوی زندہ دل اور رومنٹک ہے۔ اب تک تو میں اسے لڑاکا، جھگڑالو ہی سمجھتی آرہی تھی۔"

"رومنٹک اور زندہ دل صرف اپنے لیے۔" میں زہر خند ہوا۔

میں نے صوفیہ کو اس کی برتھ ڈے والی بات بتائی۔

"کیوں اس نے یہ چاہا کہ وہ اپنی خوشی کو اپنی دوست کے گھر جا کر منائے۔ کیا وہ وہاں زیادہ انجوائے کر سکتی تھی۔ اگر وہ اپنے گھر میں اس چیز کا اہتمام کرتی تو کیا سب اس کی خوشی میں شامل نہ ہوتے اور گھر میں چھوٹی سی پارٹی بھی ہو جاتی۔ میری بہنیں اور والدین بھی خوش ہو جاتے۔ وہ اپنے گھر چلی جاتی ہے یا فون پر دوستوں سے باتیں لگاتی رہتی ہے۔ اس کے لیے اب بھی وہی سب کچھ اہم ہے۔ جو وہ چھوڑ آئی ہے۔ تو پھر میرے لیے وہ اہم کیوں نہ ہوں جن کے ساتھ میں رہ رہا ہوں۔"

"لگتا ہے بہت جلدی بدظن ہو گئے ہیں آپ اپنی بیوی سے۔" صوفیہ مسکرا رہی تھی۔ ایک عجیب سا تاثر اس کے چہرے پہ تھا۔

"کچھ بیویاں اپنے سیدھے سادے شوہروں کو جاہل اور پرانے خیالات کا سمجھ کر ایسے ہی ٹھکراتی ہیں۔ حالانکہ ایسے مرد تو آج کے دور میں نایاب ہوتے ہیں۔"

صوفیہ نے شرارتی انداز میں میری تعریف کی تو میں نے اتراتے ہوئے فرضی کالر جھاڑا۔

"ہائی داوے اب آپ بھی نایاب نہیں رہے۔ شادی شدہ ہوتے ہوئے اب بھی تو بدیانتی کر رہے ہیں۔"

"میں کوئی بددیانتی نہیں کر رہا۔ اپنی بیوی کے خیالات کی تصحیح کر رہا ہوں۔"

"تم از کم ایسے خیالات کسی عورت سے کہیں ہو سکتے" صوفیہ میری اور اپنی دوستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہنسی۔

"مجھے پتہ ہے تمہیں یقین نہیں آئے گا۔ لیکن تمہیں یہ پڑھ کر ہو سکتا ہے یقین کرنا پڑے۔"

میں نے اپنی جیب سے ایک ورق نکالا اور صوفیہ کے سامنے کر دیا۔

صوفیہ دلچسپی سے وہ کاغذ لے کر پڑھنے لگی۔

کاش!
مجھ سے پہلے تمہاری زندگی میں
کوئی لڑکی آئی ہوتی
بہت شوخ بہت چنچل
بہت سندر بہت کومل
جس کے بنا جینے کا تصور تمہارے لیے محال ہوتا
موسم سرما کا سا مزاج رکھنے والے
اسے محبت میں کمال ہوتا
تب وہ تم میں اپنی محبت کی گرمی سمو دیتی

وہ تمہیں روٹھنا سکھاتی
وہ تمہیں منانا سکھاتی
بارشوں کے موسم میں
چاندنی راتوں میں
سرد صبحوں میں
خنک شاموں میں
کس طرح بتاتے ہیں
ان حسین لمحوں کو
وہ تمہیں ہر لمحے سے آشنا کرتی
پھر کچھ یوں سانحہ ہوتا
وہ تم سے دور ہو جاتی
اور
تب میں تمہاری زندگی میں آتی
تم اس کی محبت بھلانے کے لیے
مجھ سے محبت کرتے
ہر وہ عمل دہراتے جو وہ تمہارے ساتھ کر چکی تھی
پھر......
شاید مجھے دوسرا نمبر میسر ہوتا
لیکن جان من...... تب تمہیں محبت کا ہنر آتا

"واؤ فنٹاسٹک بڑی زبردست نظم ہے۔"

"اور ایک چیلنج بھی۔" میں نے مسکرایا۔

صوفیہ نے شوخ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"اور آپ نے اس چیلنج کو یوں قبول کیا۔"

"ہونہہ اور اب دوسرا نمبر اس کا نہیں تمہارا ہے۔" میرے کہنے پہ صوفیہ کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ نالنے والے انداز میں بولی۔

"ہائی دا وے آپ کی مسز شاعری بھی کرتی ہیں؟"

"پتا نہیں یہ اس کی ہے یا کہیں سے چرائی ہوئی ہے۔ میں تو ان باتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا۔"

"حالانکہ آپ کو انہی باتوں میں دلچسپی لینی چاہیے۔" وہ مجھے چھیڑ رہی تھی۔

"ایک بات پوچھوں تم سے؟" میں بالکل سنجیدہ تھا۔

"ہوں...." وہ یکدم پھر میری طرف متوجہ ہو گئی۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہماری یہ دوستی کسی نام رشتے میں بندھ جائے۔" میری بات پہ صوفیہ کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں اور یہ مجھے بالکل عجیب نہیں لگا۔ اگر وہ مجھے الو سمجھ کر الو کا پٹھا بنا رہی تھی تو میں کون سا دیدہ و دل فرش راہ کیے بیٹھا تھا۔ میں تو یہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر اس نے مجھ سے دوستی کیوں کی تھی۔ محض وقت گزاری کے لیے یا وہ بھی کوئی تجربہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ میری طرح۔

وہ میری سوچ سے زیادہ چالاک نکلی۔ جلدی سنبھل گئی اور کہنے لگی۔

"آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"آف کورس۔" میری خوشی دیدنی تھی۔

"کوئی وجہ؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"یہی کہ ہمارے خیالات بہت ملتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"حالانکہ ہمارے خیالات بالکل بھی نہیں ملتے۔" وہ استہزائیہ مسکرائی۔

"اتنے دن سے ہم کیا کر رہے تھے؟" میں نے دانستہ اپنا اور اس کا مذاق اڑایا۔

"صرف وقت گزاری۔" اس نے کاندھے اچکائے۔

"کیا وقت گزارنے کے لیے میں ہی ملا تھا آپ کو؟" میں نے قدرے روکھے انداز میں پوچھا۔

"یہ شکوہ میں بھی تو کر سکتی ہوں۔ آپ نے مجھے بور کیا اپنی بیوی کے قصے سنا سنا کر۔"

"میں تو آپ کے جمال پہ بھی قصیدہ خوانی کر سکتا ہوں۔ بشرطیکہ آپ اجازت دیں۔" میں شرارتاً مسکرایا۔

"فار گاڈ سیک۔ آج سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنا کہ کسی خوب صورت لڑکی کی تعریف کے لیے کسی مرد نے اجازت طلب کی ہو۔" اس کی ہنسی طنزیہ تھی اور انداز میں بالکل ویسی ہی بیزاری تھی۔ جیسی میں نے ثمرہ میں دیکھی تھی۔ مجھے ثمرہ کی بیزاری سے کبھی سبکی محسوس نہیں ہوئی لیکن آج صوفیہ کے سامنے میں بالکل شرمندہ ہو گیا اور مجھے دل ہی دل میں تسلیم کرنا پڑا۔

"میری یہ اظہار نہ کرنے کی عادت اچھی نہیں ہے۔ اسے بدلنا چاہیے۔ اگر میں ایسا کرلوں تو ثمرہ کی شکایتیں ختم ہو جائیں پھر مسئلہ ہی کیا ہے؟"

صوفیہ نے میرے سامنے ہاتھ نچایا۔ "کہاں کھو گئے؟"

"کہیں نہیں۔" میں کھسیانا سا ہنسا۔

"سوچ رہا ہوں۔ تمہیں میرا پروپوز کرنے کا انداز برا لگا ہو گا۔"

"برا نہیں آپ کی شخصیت کے بالکل متضاد لگا۔"

”آپ اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ نہ تو آپ جلد باز ہیں۔ اور نہ ہی آپ اپنے خیالات و نظریات تبدیل کرنے والے شخص ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ اپنی بیوی کے ساتھ ہی کمپرومائز کر چکے ہوتے۔ دیکھیں مضراب صاحب! ایک بات کہوں، برا مت مانیے گا۔ آپ کے ٹھوس خیالات نے آپ کی شخصیت کو ٹھس کر رکھا ہے۔ بجائے اس کے آپ کے ارد گرد تبدیلی آئے۔ خود کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کے ارد گرد اچھے اثرات پڑیں گے۔“

صوفیہ کی گفتگو مجھے بہت سخت ثابت کر رہی تھی۔ اور تب مجھے احتیاط سے کام لینا پڑا۔

”یہ سب باتیں میرے سوال کا جواب تو نہیں ہیں؟“

اس نے ایک بار پھر حیرانی سے میری طرف دیکھا۔

”اگر آپ واقعی سنجیدہ ہیں تو میں سوچ کر جواب دوں گی۔“

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری اور صوفیہ کی یہ آخری ملاقات ہوگی۔ جس طرح وہ بالکل اچانک میری زندگی میں آئی تھی۔ ویسے ہی روپوش بھی ہو گئی اور میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

☆ ☆ ☆

منال کو رخصت کر کے جب میں نبیل کے ہمراہ گھر آئی تو بہت تھک چکی تھی۔ اور صرف سونا چاہتی تھی لیکن مضراب کو پہلے سے سویا ہوا پا کر میں نئے سرے سے چیخ گئی۔ کچھ دن سے میں مضراب کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

”منافق!“ میں چلا چلا کر کہنا چاہتی تھی مگر مجھے ضبط کرنا پڑا۔

میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ مضراب اندر سے اتنا گھٹیا ہوگا۔ جس شخص نے پچھلی رات اتنے بڑے بڑے دعوے کیے تھے۔ وہ بھی اندر سے وہی تھا۔ وہ ایک غیر لڑکی سے عشقیہ ڈائیلاگز بول سکتا تھا۔ بیوی سے یہ سب کچھ کہتے ہوئے اسے شرم آتی تھی۔ اور یہاں تک کہ اس نے منال کو پرپوز بھی کر دیا تھا۔

اور یہ بات مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

منال نے صوفیہ بن کر جہاں مضراب کی شخصیت کے اور پرت کھولے تھے۔ وہاں اس کی ایسی فطرت کو مجھ پہ واضح کر کے مجھے سخت بددل کر دیا تھا۔

”وہ میری کوتاہیوں کو نظر انداز نہیں کر سکا۔ تو میں کیسے اس کے اتنے بڑے جرم کو معاف کر سکتی ہوں۔“ میں نے آنسو ضبط کرتے ہوئے منال سے کہا تو اس نے اپنی ولمنانیا بھلا کر مجھے سینے سے لگا لیا اور کہنے لگی۔

”میں نے یہ سب تم دونوں کو ایک دوسرے سے دور کرنے کے لیے نہیں کیا تھا۔ میں تم لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا چاہتی تھی۔“

”وہ تم سے کہہ سکتا تھا۔ اس نے مجھ سے کیوں نہیں کہا سب کچھ۔“ میں رو پڑی تھی۔ منال سچ مچ پریشان ہو گئی۔

”میں نے ان کی ذات کی ساری کمزوریاں اس لیے تم پہ واضح کی ہیں۔ تاکہ تم انہیں اچھی طرح سمجھ سکو اور پھر تم نے خود ہی تو آفر کی تھی مضراب بھائی کو دوسری لڑکی کی۔“

اس کا اشارہ اس نظم کی طرف تھا۔ جو کالج مشاعرے میں ہماری ایک دوست نے پڑھی تھی اور جسے میں نے تب ہی اپنی ڈائری میں لکھ لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وقت کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ اب نمرہ کی دلچسپیوں کا مرکز میں نہیں، میرے گھر والے تھے۔ نمرہ نے سب میں گھل مل کر اپنی اچھی خاصی جگہ بنا لی تھی۔ حالانکہ اس کی طبیعت پریگننٹ ہونے کی وجہ سے خاصی گری گری رہتی تھی۔ نہ اس کے چہرے پہ بشاشت تھی اور نہ آنکھوں میں وہ چمک اور تازگی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔

لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ نمرہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اسے مجھ سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی تھی۔ ہمارے درمیان ایک خلیج سی حائل تھی۔

میں گھر میں داخل ہوا تو گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی میری تینوں بہنیں بمعہ بچوں کے آئی ہوئی تھیں۔ نمرہ امی کے پاس بیٹھی تھی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ابو ..... نہایت سنجیدہ اور لیے دیے رہنے والے ابو دیواروں پہ پھول چسپاں کر رہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی تینوں نے فنکشن تیار ہونے کا آرڈر جاری کر دیا۔

”مگر مجھے پتا تو چلے معاملہ کیا ہے؟“ میرے سوال پہ امی نے سب سے زیادہ مجھے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔

”آج کے دن نمرہ ہمارے گھر میں آئی تھی۔“

”یعنی میری ویڈنگ اینی ورسری۔“ میں زیر لب بڑبڑایا۔

”جی ہاں!“ میری ساری بہنوں نے ایک ساتھ کہا اور میں نے نمرہ کی طرف دیکھا۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے لاتعلقی سے بیٹھی تھی۔

”اب تم جلدی سے نہا دھو لو۔ تمہارے بہنوئی بھی آنے والے ہوں گے۔“ امی نے کہا۔

مجھے اپنے آپ سے شرمندگی ہونے لگی۔ میں نے تو کوئی اچھا سا گفٹ بھی نہیں خریدا۔ اب اتنی جلدی میں کیا لوں۔

”آپ کے ٹھوس نظریات نے آپ کی شخصیت کو ٹھس کر دیا ہے۔“ صوفیہ کی بات مجھے شدت سے یاد آئی۔

”کیا میں نمرہ سے پوچھوں کہ وہ کیا لینا چاہے گی؟“ نہیں میں اپنی پسند سے نمرہ کے لیے گفٹ لوں گا۔

میں الٹے قدموں گھر سے نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

سب نے میرے ہاتھ کے پکے کھانوں کی تعریف کی تھی اپنا چھوٹے سے فنکشن سے سب ہی بہت خوش تھے۔ مجھے بہت سے تحفے ملے تھے۔ میری نندوں نے نندوں کے بچوں نے اور امی نے یہاں تک کہ نبیل نے بھی۔ میں مضراب کی محبت ڈھونڈنے نکلی تو مجھے میرے بہت سی محبتیں مل گئیں۔ میں ان محبت کرنے والوں کے درمیان خود کو بہت پرسکون محسوس کر رہی تھی۔

”کیا مجھے اب مضراب کی محبت کی ضرورت نہیں تھی؟“ میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا چھوڑ دیا تھا۔

سب کے چلے جانے کے بعد میں امی ابو کے درمیان بیٹھی رہی۔ جویریہ ہمارے لیے چائے بنا لائی تھی اور اب جویریہ اور ماریہ مل کر برتن وغیرہ سمیٹ رہی تھیں۔

مضراب کمرے میں جا چکا تھا اور کچھ بعید نہیں سو بھی گیا ہو۔ مجھے چونکہ نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے میں باتوں میں مشغول رہی۔ تھوڑی دیر بعد ابو بھی سونے چلے گئے۔ تب میں کمرے میں آ گئی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔

لیکن خوشبو ایسی تھی کہ میں چکرا سی گئی کہ میں غلط جگہ تو نہیں آ گئی اور تب ہی مضراب نے مجھے بازوؤں میں لے لیا۔

"شادی کی سالگرہ مبارک ہو۔" میں چونک سی گئی۔
"آپ کو بھی مبارک ہو۔" کچھ توقف کے بعد میں نے ہچکچاہٹ سے کہا۔
"کیا لائٹ گئی ہوئی ہے؟" مجھے اس طرح لائٹ آف کر کے وش کرنا بالکل بے تکا لگا تھا۔
"میں خود اپنے ہاتھ سے لائٹ آن کرو۔"
جب میں نے لائٹ آن کی تو دنگ رہ گئی۔
کمرے میں بے تحاشا پھول تھے۔ سرخ گلابوں کا ڈھیر۔ میں نے حیرانی سے مضراب کی طرف دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔
"آج کے دن پھولوں سے اچھا تحفہ کوئی نہیں ہوتا۔ ہے ناں؟" یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھاما اور میری وارڈروب کی طرف بڑھا۔
میں پھولوں کی پتیوں پہ چلتے ہوئے جب وارڈروب تک پہنچی تو وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔
"کھولو اسے۔" وہ چاہت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
میں نے وارڈروب کھولی۔ سامنے ہی ریڈ اینڈ بلیک شیفون کا نفیس کڑھائی والا سوٹ لٹک رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا۔
وہ سوٹ مجھے بے حد پسند آیا تھا لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ "ابھی اور اسی وقت اسے پہن کر دکھاؤ۔" اس کی فرمائش پہ میں حیران تھی۔
"میں اسی وقت اسے پہن نہیں سکتی۔" میں نے اس کے جوش کو ٹھنڈا کیا اور صوفے پہ بیٹھنے لگی۔ تب ہی کشن اٹھاتے ہوئے ایک ڈبہ میرے ہاتھ لگا اس میں کانچ کی چوڑیاں تھیں۔ میں جلدی سے سنبھل گئی۔ ذرا سی غفلت سے وہ چوڑیاں ٹوٹ بھی سکتی تھیں۔ ابھی میں چوڑیوں پہ غور و فکر کر رہی تھی کہ میری نگاہ بیڈ پہ پڑی وہاں ایک گفٹ پیک رکھا تھا۔
میں متجسس سی ہو کر اٹھ گئی۔ قریب جا کر دیکھا تو چار شاعری کی کتابیں رکھی تھیں۔ پیپر ان پہ ایسے ہی رکھا ہوا تھا ابھی پیکنگ نہیں کی تھی۔
میں نے مضراب کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھوں میں مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔ اپنی طرف دیکھنے پہ اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے پرفیوم رکھا تھا۔ مجھے اس کا یہ انداز شاید اچھا لگتا مگر اب ایک پھانس میرے حلق میں آ کر پھنس گئی۔ یہی وہ شخص تھا جس نے منال کو پرپوز کیا تھا۔ اس سے زیادہ اور میری تحقیر کیا ہو گی۔ میری روح جھلسنے لگی۔ یکدم میری میرے چہرے پہ پڑی زردی پا کر وہ میرے قریب آ گیا۔
"کیا بات ہے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟" اس نے مجھے شانوں سے پکڑ کر صوفے پہ بٹھایا اور دو زانو میرے سامنے بیٹھ گیا۔
"ہاں میری طبیعت صحیح نہیں ہے۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔"
"اچھا آخری گفٹ تو لے لو۔" اس کا جوش ابھی ماند نہیں پڑا تھا۔
میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔
پھر وہ اٹھا اور اس نے اپنی محبت کی مہر میری پیشانی پہ ثبت کی۔
"تم واقعی لاجواب عورت ہو۔ تم نے اپنی محبت سب میں بانٹ کر مجھے محبت کرنا سکھا دیا۔ زندگی میں میں نے اتنی تیز شاپنگ بھی نہیں کی جیسا مجھے آج کرنا پڑی۔"
"اس اچانک تبدیلی کی کوئی وجہ تو ہو گی؟" میں نے اسے بے تحاشا خوش پا کر پوچھا۔
"تمہاری گفٹ اور کیا؟" اس نے مجھے لاجواب کرنا چاہا۔
"یہ میرا نہیں کسی اور کا رنگ ہے۔" میں بالکل سنجیدہ تھی۔
"کیا مطلب ہے؟" وہ چونکا۔
"صوفیہ کون تھی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ یک دم اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس نے چہرہ جھکا لیا۔ میرے ساتھ بھی تو وہ یہی کرتا تھا جب میں خوش ہوتی تھی تب ہی مجھے رلاتا تھا۔ میں نے خود کو بھلا دیا۔ سب کچھ مٹا دیا۔ تب وہ بہت خوش ہے۔ میں کیوں نہ اسے احساس دلاؤں۔
میں نے اپنے من کو مار دیا تو وہ مجھے لاجواب عورت کہہ رہا تھا۔
اگر میں لاجواب ہوں تو صوفیہ کون تھی؟ تادیر ہمارے درمیان خاموشی رہی۔
"صوفیہ ایک رانگ نمبر تھی۔ جس کے ذریعے میں تمہیں ڈھونڈتا۔" وہ اعتماد سے بول رہا تھا۔
"مجھے؟" میں نے اس کا مذاق اڑایا۔

"ہاں.... تمہیں۔" وہ سنجیدہ ہو گیا۔
"میں نہیں جانتا صوفیہ کون تھی کہاں سے آئی کیوں میری زندگی میں آئی اور کیوں چلی گئی۔ مگر میں اتنا جانتا ہوں اس کے آنے یا جانے سے میری زندگی پہ کچھ فرق نہیں پڑا۔ فرق پڑا ہے تو تمہاری تبدیلیوں سے۔"
اس نے اعتماد سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر کہنے لگا۔

ایک تتلی تو میں بھی پکڑ ہی لیتا تو خیر
ہاتھ میں کرچیاں لے کر نکلتا میں بھی
اور سچ تو یہ ہے کہ.....

تمہاری نظم "دوسرا نمبر" نے مجھے مایوس کیا تھا۔ تب ہی صوفیہ جیسی لڑکی کی طرف توجہ کرنا پڑی اور بس۔" وہ مطمئن تھا۔
"کیا میں نے وہ نظم آپ کو لکھ کر دی تھی؟" میں نے مضراب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ وہ شرمندہ سا ہوا پھر جلدی سے بولا۔
"نہیں لیکن انسان کے انتخاب سے اس کی شخصیت ظاہر ہوتی ہے۔"
"اچھا جی۔ میرے انتخاب سے میری شخصیت [illegible] کھلی کتاب کی۔" میں نے تھکے تھکے سے انداز میں کہا اور سر صوفے پہ ٹکا دیا۔
ہمارے درمیان تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر وہ میرے نزدیک آ کر بیٹھ گیا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔
"لگتا ہے تم بہت تھک گئی ہو۔ جب ہی تمہیں کسی بھی چیز سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوئی۔" میں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر سے آنکھیں موند لیں۔ سچ یہی تھا کہ مجھے مضراب کی کسی بھی چیز سے خوشی حاصل نہیں ہوئی تھی۔
"ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے مضراب! اور اب میرا وہ جوش ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔"
شاید میرے اندر کہیں آنسو گر رہے تھے۔ تب ہی میں نے آنکھوں کے کناروں کو جلتا محسوس کیا تھا۔
"مگر محبت کے لیے کوئی وقت نہیں ہوتا۔" وہ میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر مجھے احساس دلا رہا تھا۔
"میں جانتا ہوں تمہیں مجھ سے بہت سے شکوے ہیں۔ میں تمہارے سارے شکوے دور کر دوں گا۔"
اس کی بھوری آنکھوں میں محبت [illegible] اور یہ محبت صرف میرے لیے تھی۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ میں متاثر ہی نہیں ہو پا رہی تھی سارے احساسات جیسے منجمد سے ہو چکے تھے..... مضراب نے میرے سرد رویے کو اچھی طرح سے نوٹ کیا اور مسکراتے ہوئے میرے ہاتھ پہ بوسہ دیتے ہوئے بولا۔
"مجھے تو وہی ہنستی مسکراتی لڑتی جھگڑتی نمرہ چاہیے جس نے مجھے یکسر بدل ڈالا ہے اور اب یہ اداس موڈ تبدیل کرو۔ میرے بچے پہ برا اثر پڑے گا اور میں یہ بالکل نہیں چاہوں گا کہ اس کا مزاج میرے جیسا ہو۔ اسے اپنی ماما جیسا ہونا چاہیے۔ نٹ کھٹ اور شرارتی۔" مضراب کی بے ساختگی پہ مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ میری ہنسی اتنی بے ساختہ تھی کہ وہ مجھے حیرانی سے تکنے لگا۔
عجیب بات تھی..... زندگی میں اکثر وہ ہو جاتا ہے جسے ہم نہیں سوچتے اور جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا۔
بس میرے من نے یہی کہا۔
دیر آید درست آید۔

⁂

نعیمہ ناز

دشمنِ جاں

"بیگم چھوٹی بھابھی کہاں رہ گئیں؟ اب تک نہیں آئیں۔ حماد ذرا فون تو کرو۔" شائستہ بیگم نے فکرمندی سے کہتے ہوئے اپنے چھوٹے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"پارلر میں ہوں گی، جب تک سنگھار پورے نہ ہوں، وہ کہاں آئیں گی؟" بڑی بھابھی نے کھٹا کھٹ تسبیح کے دانے گرانے کا عمل درمیان میں روک کر طنز کیا۔

"راستے میں ہیں۔ بس ابھی پانچ منٹ میں پہنچ جائیں گی۔" حماد نے موبائل آف کر کے اپنی امی کو جواب دیا۔

اور واقعی ٹھیک چھ منٹ بعد وہ حسب عادت قہقہے لگاتیں نک سک سے درست فیملی سمیت ان سب کے روبرو تھیں۔

"بہت بہت مبارک ہو شائستہ! اللہ تعالیٰ بچے کی عمر دراز کرے، اسے صحت و تندرستی عطا فرمائے۔" انہوں نے گلے لگتے ہوئے دیورانی کو پوتے کے عقیقہ کی مبارک باد بھی دی اور ساتھ ساتھ دعا بھی۔

"اور نیک بھی بنائے۔" بڑی بھابھی نے تسبیح درمیان میں روک کر لقمہ دیا۔

"آمین۔" شائستہ بیگم نے صدق دل سے کہا۔

گلابی اور فیروزی کنٹراس میں جدید تراش خراش کا سلا ہوا سوٹ، میچنگ جیولری، چمکتا دمکتا چہرہ جو کچھ تو پابندی سے پارلر کی حاضری اور کچھ قیمتی کاسمیٹکس اور سلیقے کے میک اپ کی مرہون منت تھا۔

"بچے جوان ہیں، شادیاں ہونے والی ہیں اور اس عمر میں بھی فیشن کا یہ حال ہے، شرم بھی تو نہیں آتی اتنی لیپا پوتی کرتے۔ پتہ نہیں خدا کو کیا منہ دکھائیں گی؟"

بڑی بھابھی اپنی چھوٹی دیورانی سے سلام دعا سے فارغ ہونے کے بعد ایک بار پھر تسبیح کے دانے گرانے میں مصروف، انہیں حسب عادت حقارت سے دیکھ رہی تھیں جن کے انداز و اطوار ان کی دانست میں چھچھورے بھی تھے اور غیر شرعی اور غیر اسلامی، خاتون ان سے ذرا ہی دور ہمیشہ کی طرح محفل جما کے بیٹھی تھیں اور خوب چہک رہی تھیں اور اگلے ہفتے ہونے والی اپنے بیٹے کی منگنی کے بارے میں بتا رہی تھیں۔

"بھئی سب ہی جانتے ہیں کہ میں تو جدید خیالات رکھتی ہوں۔ بیٹے نے اپنی پسند بتائی، میں نے فوراً" روشن خیالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے کی مرضی پہ لبیک کہا۔ اب وہ پرانے دور گئے کہ اولاد کے تمام معاملات انسان اپنی مرضی سے طے کرے۔ اب تو بھئی ماڈرن دور ہے۔ اولاد کو آزادی دینے کے معاملے میں تو والدین کو روشن خیال ہونا ہی چاہیے اور دنیا والوں کی پروا کیا کرنی۔"

بڑی بھابھی ان کی باتیں سن سن کر دل ہی دل میں ان پر نفرین بھیج کر خدا کے حضور ان کا انجام سوچ رہی تھیں۔

یہ ان میں ایک بہت بڑا کمال تھا کہ ان کی زبان خدا کے ذکر میں مشغول رہتی اور دل و دماغ آس پاس ہونے والی گفتگو اور سرگرمیوں میں مصروف رہتے۔ اذان کی آواز پر انہوں نے تسبیح کو سائیڈ میں رکھ دیا۔

"چلو بھئی، اٹھ جاؤ سب۔ نماز کا وقت ہو گیا۔" اس طرح کی تبلیغ وہ ہر محفل میں ہی کرتی تھیں۔ نماز روزے کے فضائل، پردے کے احکامات، غیر شرعی اور غیر اسلامی کاموں کی تفصیلات اور ان کے عواقب۔ انہیں سب ازبر تھا، جنہیں وقتاً" فوقتاً" بیان کر کے وہ سب کی اصلاح کرنے اور انہیں اپنی ہی طرح کا ایک نیک اور سچا مسلمان بنانے کی کوشش کرتیں۔

"ہم نے تو پرفیوم لگایا ہوا ہے۔ اس میں سنا ہے کہ الکحل ہوتا ہے۔ پتہ نہیں وضو ہو گا یا نہیں۔ نماز کیسے ہو گی؟" چھوٹی بھابھی نے ایک مسئلہ بیان کیا۔

"بھابی! اللہ میاں کا دامن رحمت ہماری سوچ سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ بندہ ان کے حضور کھڑا ہو جائے تو شاید وہ ایسی چھوٹی موٹی باتوں کی پروا نہ کرتے ہوں؟" یہ زوار تھا جو زبان پر آئی بات کو روکے یا دل میں رکھنے کا بالکل بھی قائل نہ تھا۔

"ارے بھئی، قضا پڑھ لیں گے۔ اللہ تعالیٰ بڑے غفور الرحیم ہیں۔" انہوں نے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ ویسے بھی ابھی ابھی تو تھی

www.pkdigest.com

بھر رقم دے کر میک اپ کروا کر آئی تھیں، وضو کیسے کرتیں؟

"اللہ تعالیٰ رحیم و کریم ہونے کے ساتھ ساتھ جبار و قہار بھی تو ہیں۔ گرفت بھی پھر ایسی سخت ہوتی ہے۔" بڑی بھابھی نے اپنی دیورانی کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"افوہ... آپ جیسے لوگوں نے تو بس اللہ تعالیٰ کا ایک ایسا امیج بنایا ہوا ہے کہ جیسے وہ اپنے ہر بندے کو سزا دینے کے لیے فوراً" تیار بیٹھے رہتے ہیں کہ ذرا بندے سے کوئی بھول چوک، کوئی غلطی، کوئی قصور سرزد ہو اور سزا کا مستحق بنے۔" چھوٹی بھابھی جھنجلا کر بولیں۔

"تو بھلا میں نے کیا کہہ دیا؟" بڑی بھابھی کے بھی تیور بگڑ گئے۔ "نیک اعمال کیے بغیر، فرائض پورے کیے بغیر، حیلوں بہانوں سے تو جنت ملنے سے رہی۔ نہ اللہ کی پکڑ سے کوئی بچ سکتا ہے اور میں تو..."

"چلیے چھوڑیے بھابھی جان! آپ ادھر آئیے۔" سب سے چھوٹی دیورانی اور میزبان شائستہ بیگم نے نرمی سے کہتے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے کمرے میں لے آئیں۔

"آپ نماز پڑھ لیں، میں نے جائے نماز بچھادی ہے۔" انھوں نے اشارہ کیا۔ "عارفہ نے تو حد ہی کر دی۔" جائے نماز پر کھڑے ہو کر وہ بڑبڑانے لگیں۔

"اب ایسا بھی کیا ماڈرن ازم کہ انسان اللہ کو بالکل ہی بھول جائے۔ دین کو بالائے طاق رکھ دے۔ ذرا نماز پڑھنے کو کہہ دیا تو برا لگ گیا۔"

"آپ نے کہہ کر اپنا فرض پورا کر دیا۔ آگے وہ جانیں ان کا کام۔ ہر ایک کا عمل اس کے اپنے لیے ہے۔" انھوں نے سہولت سے بولتے ہوئے بات ہی ختم کر دی۔

وہ واپس آئیں تو چھوٹی بھابھی نے انھیں پکڑ لیا۔

"کیا کہہ رہی تھیں میرے بارے میں؟" انھوں نے شائستہ بیگم کو کریدا۔

"کچھ نہیں بھئی، مجھ سے تو کچھ نہیں کہا انھوں نے۔ بس نماز پڑھنے کھڑی ہو گئیں۔" انھوں نے ہمیشہ کی طرح مصالحت آمیز جواب دے کر بات کو مزید بڑھنے سے روکا۔

"ہونہہ۔ کیا میں جانتی نہیں ہوں، جس جس سے بھی میرے متعلق جو بھی بات کہتی ہیں، سب مجھ تک پہنچ جاتی ہے۔ نماز، روزے اور پردے کے سارے مسائل معلوم ہیں۔ غیبت کے بارے میں کچھ نہیں پتہ؟" ان کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

"چھوڑیں بھابھی! وہ بے چاری تو اپنی طرف سے نیک نیتی سے اللہ، رسول کی باتیں بتاتی ہیں، آپ تھوڑی کچھ کہتی ہیں۔ آپ برا نہ مانا کریں۔" صلح جو فطرت کی مالک شائستہ بیگم نے انھیں بھی ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں، یہ سمجھتی ہیں کہ بس یہ خود اللہ والی ہیں اور ہم تو جیسے خدانخواستہ کافر ہیں، مشرک ہیں۔ کبھی لباس پر اعتراض، کبھی زیور پہ تنقید، کبھی میک اپ پر طنز، کبھی سب کے سامنے نصیحتوں کے انبار، سب سے زیادہ مجھے ہی وعظ سنانے کی کوشش کرتی ہیں۔" چھوٹی بھابھی پتہ نہیں کب سے بھری بیٹھی تھیں۔

"بڑی ہیں، آپ بھی سوچ کے درگزر کر جایا کریں۔ مجھے اور آپ کو کچھ سمجھتی ہیں تو نصیحتیں کرتی ہیں نا۔ کسی ایرے غیرے کو کوئی تھوڑا ہی بولتا ہے۔" شائستہ بیگم نرمی سے انھیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"اور ویسے بھی آج کے جدید دور میں ہر ایک کی ہر بات کو لے کر ہم بیٹھ جائیں تو زندگی گزارنا مشکل ہو جائے۔"

شائستہ بیگم نے ان کے مزاج کی عین مطابق خاص طور پر جدیدیت کا ذکر کیا اور یہی ہوا۔ وہ فوراً" کہنے لگیں۔

"ارے ہاں، چھوڑو، ہم تو ٹھہرے جدید دور کے تقاضے پورے کرنے والے لوگ۔ بھلا اتنی فرصت اور وقت کہاں کہ ان سب باتوں کو لے کر بیٹھے رہیں۔ تم نے میرا سیٹ نہیں دیکھا؟" انھوں نے بڑے ذوق و شوق سے ان کی توجہ اپنے جیولری سیٹ کی طرف کروائی۔ "فریہ اپنے لیے لائی تھی، میں نے اس سے لے لیا۔"

"ہاں، ماشاء اللہ بہت خوبصورت ہے۔ نزاکت بھی ہے اور نفاست بھی۔" شائستہ بیگم نے کھلے دل سے تعریف کی اور وہ سیٹ اگر اتنا خوب صورت نہ بھی ہوتا تب بھی وہ تعریف کرنے میں کبھی کنجوسی نہیں کرتی تھیں۔ وہ یہ سوچ رکھتی تھیں کہ اگر ہمارے چند لفظوں سے کسی کا مان بڑھتا ہے یا وہ خوش ہوتا ہے تو وہ چند لفظ کہنے میں بھلا کیا حرج ہے؟

شائستہ بیگم وہاں سے اٹھ کر اپنے دوسرے مہمانوں کو تھوڑا تھوڑا وقت دینے لگیں۔ ساتھ ساتھ دعوت کے انتظامات بھی ان کے زیر نگرانی تھے۔ ادھر عارفہ بیگم نوجوان لڑکیوں کے گروپ کو جوائن کر کے ان سے بال اور کھال کی حفاظت و خوب صورتی کے لیے ایک دوسرے سے مختلف ٹپس کا تبادلہ کرنے میں مصروف ہو گئیں۔

★ ★ ★

ایک ماہ بعد بڑی بھابھی شائستہ بیگم کے گھر آئی تھیں۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ بڑے رازدارانہ انداز میں گویا ہوئیں۔

"سنا ہے فریہ نے بھی اپنا بر خود ہی تلاش کر لیا؟ ظاہر ہے بھئی، ماڈرن فیملی ہے۔ ماں نے بچوں کو پوری چھوٹ دی ہوئی ہے جو گل کھلا لیں کم ہے۔ بھلا وہ کیوں اپنے بھائی سے پیچھے رہتی۔" بڑی بھابھی کے لہجے میں طنز بھی تھا اور تمسخر بھی۔

"ایسی بات نہیں ہے بھابھی!" شائستہ بیگم ان کی پوری بات سن کر تحمل سے کہنے لگیں۔ "فریہ ہمارے آپ کے سامنے کی پلی بڑھی بچی ہے۔ آج تک کوئی ایسی ویسی بات سننے میں نہیں آئی۔ ہاں بس یہ ہے کہ فریہ کے کلاس فیلو نے اپنے گھر والوں کے ذریعے پرپوزل بھیجا ہے جو بھی بات ہوئی، بڑوں کے درمیان ہوئی۔ ان شاء اللہ وہ عزت کے ساتھ اپنے گھر سے رخصت ہوگی۔ ہمیں کسی کے متعلق یوں بدگمانی نہیں کرنی چاہیے۔"

شائستہ بیگم نے اپنی نیک اور سادہ فطرت کے مطابق اچھے الفاظ اور انداز میں فریہ کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ عارفہ بیگم نے تو فریہ کے معاملے میں انھیں اعتماد میں لیتے ہوئے پوری بات بتائی تھی کہ لڑکا خاندانی اور مالی دونوں لحاظ سے ان کا ہم پلہ نہیں مگر فریہ نے ضد باندھی ہوئی ہے وہیں کرنے کی۔

"چلو جی، میں نے بھی سوچا کہ ہماری روشن خیالی کس کام کی۔ اگر ہمارے بچے اپنی زندگی کے اتنے اہم معاملے میں بھی اپنی مرضی استعمال نہ کر سکیں۔" اپنے آخری فقرے میں انھوں نے عندیہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی ضد پوری کر دیں گی۔

شائستہ بیگم پہ اعتبار کرتے ہوئے عارفہ بیگم ہی کیا بہت سے لوگ ان سے اپنے راز اور مسئلے مسائل شیئر کر لیتے تھے اور وہ کبھی کسی کے اعتبار کو ٹھیس نہیں پہنچاتی تھیں۔ اس وقت بھی انھوں نے مناسب انداز میں اس موضوع کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

"سنا ہے خاندانی بھی نہیں ہیں، جانے کون لوگ ہیں؟" بڑی بھابھی کافی "باخبر" ہو کر آئی تھیں۔

"سب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ہم بھلا کسی پہ کیسے حکم لگا سکتے ہیں۔ خاندانی اور غیر خاندانی ہونے کا۔"

"اے پھر بھی، ماں باپ کا فرض ہے کہ دیکھ بھال کے رشتے کریں۔ ایسی بھی کیا آزادی دینی بچوں کو کہ والدین کی ناک میں نکیل ڈال کر اپنے پیچھے پیچھے گھماتے پھریں۔" بڑی بھابھی کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

"تمام والدین اپنی اولاد کے بہترین خیر خواہ ہوتے ہیں۔ فریہ کے والدین جو مناسب سمجھیں گے، وہ کریں گے ہم اور آپ کیا کہہ سکتے ہیں؟" شائستہ بیگم نے بات ختم کرتے ہوئے موضوع بدل دیا۔

"اور آپ بتائیں، سدرہ ٹھیک ہے؟ اس کے بیٹے کا بخار ٹھیک ہو گیا؟"

"ہاں، اللہ کا شکر ہے میری بچی بالکل خیریت سے ہے اور اس کے بچے کا بخار بھی اب اتر گیا ہے۔ کل ہی

تو آئی تھی۔ بیٹا تو ماشاء اللہ پھدک پھدک ہو گیا ہے۔ گھٹنوں سرکنے لگا ہے۔ ہر چیز میں گھستا ہے۔ کبھی اُدھر کبھی اُدھر۔ بس اس کے پیچھے پیچھے لگے رہو۔"

بیٹی اور نواسے کے ذکر پر ان کے چہرے پر چمک سی آگئی اور وہ نان اسٹاپ شروع ہو گئیں۔ یہ ان کی بڑی بیٹی تھی جس کی شادی اپنے کزن کے ساتھ ایک طویل معرکے کے بعد ہوئی تھی۔ سدرہ کی ممانی اسے اپنی بہو بنانے پر رضامند نہ تھیں اور اپنی بھاوج کے نخرے دیکھتے ہوئے بڑی بھابھی نے بھی اپنی انا اور ہٹ دھرمی کا گراف اونچا رکھنے کی کوشش کی مگر سدرہ اور اسد کی مستقل مزاجی نے دونوں کی امّیوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر ہی دیا۔

یہ داستان اتنی سادہ نہ تھی کافی رنگین و سنگین موڑ تھے اس میں اور عارفہ بھابھی نے یہ داستان لمحہ بہ لمحہ لائیو نشریات کی طرح شائستہ بیگم کو سنانے کی کوشش کی تھی، جنھوں نے ہمیشہ کی طرح ایسے چٹخارے دار تو موضوع کو بار بار بدلنے کی کوشش میں اگر کچھ سن بھی لیا اسے خود تک محدود رکھ کے داستان آگے نہیں بڑھائی۔

* * *

فریحہ کی منگنی گو اس کے بھائی کی طرح بے حد دھوم دھام کے ساتھ تو نہیں ہوئی مگر پھر بھی خاندان کے تو تقریباً سب ہی افراد موجود تھے۔ پہلے کی طرح میوزیکل فنکشن تو ارینج نہیں کیا گیا مگر گھر پر میوزک اور ڈانس کا اہتمام کر کے یہ کسر پوری کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور اس میں عارفہ کے ساتھ ان کی ہونے والی بہو بھی پیش پیش تھی۔

"بھئی واہ انیلا تم نے تو کمال کر دیا۔" اس کی بے حد عمدہ پرفارمنس پر عارفہ بیگم تو قربان ہی ہو گئیں۔ سب خاندان کے ہی تو لوگ تھے۔ میکے والے اور سسرال والے اور پڑوس کے دو تین گھرانے۔ بیشتر افراد کی آنکھوں میں ستائش دیکھ کر انھیں اپنی ماڈرن اور اپ ٹو ڈیٹ (ہونے والی) بہو پر بے حد فخر ہو رہا تھا۔ ہاں بس بڑی بھابھی ہمیشہ کی طرح ناگواری کے ساتھ یہ سب دیکھ رہی تھیں اور برداشت کر رہی تھیں پھر حسبِ عادت تنقید کا آغاز کر ہی دیا۔ برابر میں ہی تو ان کی بیٹی بیٹھی تھی۔

"عارفہ نے تو بالکل ہی لٹیا ڈبو دی۔ شادی سے پہلے ہی بہو کا گھر میں اتنا آزادانہ میل جول، نہ کوئی شرم نہ حیا۔ توبہ توبہ۔ قیامت کی علامت ہے۔" انھوں نے توبہ تلّا کرتے ہوئے اپنے کان چھوئے۔

"چھوڑیں امی! آج کل تقریبات میں اتنا تو چلتا ہی ہے اور شادی سے پہلے اب لڑکے لڑکیوں کا سسرالوں میں آنا جانا عام سی بات ہے۔" سدرہ نے ان کی بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

"پھر بھی سب کے سامنے یوں ناچ گانا کرنا کوئی شریف بہو بیٹیوں کا کام ہے؟" وہ پھر بڑبڑانے لگیں۔

"اور یہ عارفہ کو دیکھو بیٹی کی منگنی ہے اور بیٹی سے زیادہ خود تیار ہوئی ہے۔ نہ عمر کا کچھ خیال نہ شریعت کی کوئی پروا۔ سینگ کٹا کے بچھڑوں میں نام کر لیا۔ فیشن دیکھو بیچ دیکھو جیسے چھوٹی کی دلہن۔"

"جب ہو جائیں امی! کوئی سن لے گا تو کتنی بری بات ہوگی۔" سدرہ نے بدمزہ ہو کر انھیں ایک بار پھر خاموش کرانے کی کوشش کی۔

"السلام علیکم بڑی مامی!" اریبہ نے ان کے قریب آکر انھیں سلام کیا اور وہیں بیٹھ گئی۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔" انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ابھی آئی ہو؟"

"جی، بس فریحہ اور چھوٹی مامی سے مل کر یہاں آگئی۔"

"اچھا۔" بڑی بھابھی نے تسبیح نکال لی تھی اس میں مشغول ہو گئیں۔

"کون سا ٹانک استعمال کر رہی ہو؟ بڑی حسین و جمیل ہو گئی ہو۔" سدرہ نے آہستہ سے اسے ٹہوکا دیا۔ دونوں تقریباً ہم عمر کزنز تھیں اور بہت بے تکلف بھی۔

"اچھا!" وہ ہنس پڑی۔ اس کا خوب صورت چہرہ چمک اور جگمگا اٹھا۔

"اوہ۔ خوشخبری کب سنا رہی ہو؟" سدرہ نے سرگوشی کی۔

"ابھی تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اریبہ شرماتے ہوئے اور بھی پرکشش لگ رہی تھی۔ اس کی شادی کو ابھی پانچ ماہ ہی تو ہوئے تھے۔

"اپنی چمک دمک کا راز نہیں بتا رہیں؟" سدرہ نے پھر اسے چھیڑا۔

"ڈھیر ساری محبت اور ڈھیر ساری خوشیاں۔" اریبہ نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔

اور اریبہ کی یہ مسکراہٹ ڈھیر ساری محبت اور ڈھیروں خوشیاں فقط ایک ماہ اور اس کا نصیب رہیں۔ ایک ٹریفک حادثے نے یہ سب کچھ اس سے دور کر دیا۔

چھ ماہ کی دلہن کی جواں سال بیوگی نے سب کی آنکھیں اشکبار کر دیں اور والدین اور گھر والوں پہ تو جیسے غم کا کوہِ گراں ٹوٹ پڑا تھا۔ عدت کے بعد وہ اپنے گھر آگئی تھی۔

"اللہ تعالیٰ کوئی دکھ انسان کی استطاعت سے بڑھ کر نہیں دیتا۔ غم کے ساتھ ساتھ صبر بھی خود ہی دیتا ہے۔"

آہستہ آہستہ ان سب کے آنسو بھی تھمتے جا رہے تھے۔ قسمت کے لکھے کو قبول کرنے میں ہی عافیت ہے۔ سو اریبہ نے بھی اس حقیقت کو قبول کر لیا لیکن وہ جو حسین یادیں اور دل کے کسی کونے میں نہاں غم تھا وقت کے ساتھ ساتھ ہی جاتا تھا۔

بیٹی کا یہ غم صرف بڑی آپا کا ہی نہیں تھا بلکہ ان کے تینوں بھائیوں کا بھی مشترکہ تھا جنھیں اپنی اکلوتی اور بڑی بہن اور ان کے بچے بے حد عزیز تھے۔ سب سے پہلے معین صاحب نے اپنی بیگم سے بات کی۔ انھیں یقین تھا کہ ان کی بات رد نہیں ہوگی کیونکہ شریکِ حیات تو بے حد شرع کی پابند اور دینی مزاج اور اسلامی ذہن رکھنے والی خاتون تھیں مگر شوہر کی بات سنتے ہی ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"لو خدا نخواستہ ہمارے بیٹے میں ایسی کیا خامی ہے کہ ایک بیوہ سے اس کی شادی کر دیں؟" ان کی حیرت ختم ہوئی تو وہ ناگواری سے بولیں۔

"کیوں، کیا وہ لوگ بیوہ سے شادی کرتے ہیں جن میں کوئی خامی ہو؟" ناگواری اب ان کے شوہر کے لہجے میں بھی چھلک آئی۔

"بھئی میرا مطلب ہے کہ ہمارا بیٹا جوان ہے، لائق فائق ہے۔ صحت و تندرستی بھی ماشاء اللہ ہے۔ ہم کیوں اس کے ارمانوں کا گلا گھونٹ کر ایک بیوہ سے اسے بیاہ دیں۔" ان کی بیوی اب کے ذرا سنبھل کے بولیں اور بیٹے کی مرضی اور خواہشات بھی سامنے لے آئیں۔

"لڑکے سے میں بات کر لوں گا، مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ وہ راضی ہو جائے گا اور تم اتنی دین کی اور اللہ رسول کی باتیں کرنے والی بار بار اتنی حقارت سے بیوہ بیوہ کہہ کر کیوں بات کر رہی ہو کیا بیوہ ہونا کوئی بہت ذلت و حقارت کی بات ہے؟ اپنے بس میں ہوتا ہے یہ سب کچھ؟" ان کا لہجہ تیز ہو گیا۔

"وہ اپنی بیٹی کی جہاں چاہیں دوسری شادی کر دیں۔ ہم کیوں اپنے بیٹے کی قربانی دیں؟" بیوی کا لہجہ بھی تیکھا ہو گیا۔

"بس یہی دین داری ہے تمہاری؟ تسبیح اور مصلّے پہ اللہ اللہ کرنے سے اللہ نہیں ملتا۔ بندوں کے کام آنے سے ان کی مشکلات دور کرنے سے ملتا ہے۔" شوہر کے لہجے میں بیوی کے لیے خود بخود طنز آگیا۔ "اور اللہ کے رسولؐ نے مثال قائم نہیں کی بیواؤں سے نکاح کرنے کی؟ اتنا "علم" کس کام کا جو "عمل" میں نہ ہو۔" وہ برابر طنز کے تیر برسا رہے تھے۔

"اے ہائے۔ توبہ توبہ، استغفر اللہ۔ کہاں وہ اللہ کے حبیبؐ، ہر گناہ اور خطا سے پاک دنیا و آخرت کے عظیم بشر۔ کہاں ہم گناہ گار، خطا کار، ہم بھلا کیسے ان کی برابری کر سکتے ہیں؟" وہ بار بار کانوں کو ہاتھ لگا رہی تھیں۔

"اُفوہ، بے وقوف انسان۔" ان کے شوہر نے ڈانٹ پیسے۔ "کسی فرض یا سنت کو ادا کر کے ہم پیغمبرؐ کی برابری

نہیں' ان کی پیروی کرتے ہیں اور اسی پیروی کا انہوں نے حکم دیا ہے۔" وہ برابر اپنی بیوی کو سمجھانے میں لگے ہوئے تھے۔

"جہاں اپنی غرض ہو' وہاں سب فرض' سنت یاد آجاتے ہیں۔" وہ بڑبڑائیں۔ "پہلے بھی تو مانگی تھی' جب کیوں نہیں دی؟" وہ ایک پرانا موضوع چھیڑنے لگیں۔

"اچھی طرح جانتی ہو کہ کیوں نہیں دی تھی۔" انہوں نے اپنی بیوی کو گھورا۔ "تمہارے ساتھ ساتھ عارفہ نے بھی اپنے بیٹے کا رشتہ اریبہ کے لیے دیا تھا اور بڑی آپا کی مشکل یہ تھی کہ وہ ایک کو دیتیں تو دوسری ناراض ہوتی' اس لیے انہوں نے ہم تینوں بھائیوں سے مشورہ کر کے تیسری جگہ ہاں کر دی تھی اور ویسے بھی اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ اگر اریبہ کی قسمت میں بیوگی کا دکھ لکھا تھا تو وہ ہمارے گھر آکر بھی ہو سکتی تھی۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہے تھے۔

"اللہ نہ کرے۔" وہ ایک دم دہل گئیں۔ "اللہ میرے بچے کو گرم ہوا سے بھی بچائے۔ آپ کو شرم نہیں آتی اپنی اولاد کے متعلق ایسی منحوس بات منہ سے نکالتے ہوئے۔"

"موت منحوس نہیں' یقینی ہے۔ ہر ایک کو آنی ہے۔ اس میں اس طرح ری ایکٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ بڑے اطمینان سے کہہ رہے تھے۔

"بہرحال' آپ میری بات پر جتنی جلدی ہو' غور کر لیں اور مجھے مثبت جواب چاہیے۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہونہہ! مثبت جواب چاہیے۔ مثبت جواب دے گی میری جوتی۔ مجھے کیا مار پڑی ہے کہ اپنے کنوارے بیٹے کے لیے ایک بیوہ کو بیاہ لاؤں۔ شادی چھ سال رہی یا چھ ماہ' ہے تو بیوہ۔ خدانخواستہ اس کا منحوس سایہ میرے بیٹے پہ بھی پڑ گیا تو...... توبہ توبہ' استغفراللہ۔" انہیں جھرجھری سی آ گئی۔ وہ وضو کے لیے اٹھ گئیں۔ نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا۔

ادھر عارفہ بیگم کو یکے بعد دیگرے دو مشکلات نے ایسے اپنے لپیٹے میں لیا تھا کہ خلاصی کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔

پہلی مشکل تو جب کھڑی ہوئی جب نیلما کے بھائی کی شادی میں اسے سلیولیس شارٹ قمیص اور چست پاجامے میں ملبوس دیکھ کر انہیں اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آیا۔ چھوٹی آستینیں اور چست پاجامے تو خیر وہ بھی پہنتی تھیں مگر یہاں تو آستینیں سرے سے ہی غائب تھیں۔ ان کے شوہر ان سے زیادہ شاکڈ تھے۔ عارفہ بیگم کی روشن خیالی میں دراڑیں سی پڑنے لگی تھیں۔

گھر آکر شوہر صاحب اپنی بیوی اور بیٹے پہ برس پڑے تھے۔

"یہ لڑکی ہماری بہو بنے گی؟ کسی کیٹ واک کی ماڈل لگ رہی تھی۔ فیشن میں اور بے حیائی میں کوئی فرق ہوتا ہے یا نہیں۔" وہ ان دونوں پہ ایسے برس رہے تھے جیسے یہ ان دونوں کا قصور ہو۔

"مجھے کیا پتہ تھا ابو! کہ وہ اتنی زیادہ ماڈرن ہے۔" بیٹا منمنایا۔

محبت اپنی جگہ' آزاد خیالی اپنی جگہ' مگر چودہ طبق تو اس کے بھی روشن ہو ہی گئے تھے۔ اس روشن خیالی کا مظاہرہ دیکھ کر عارفہ بیگم تو خیر کچھ کہنے کی پوزیشن میں ہی نہ تھیں۔ بہرحال دونوں ماں بیٹے نے اپنی اپنی جگہ نیلما کو اپنی "روشن خیالی" کی حدود سمجھانے کی کوششیں کی تھیں مگر وہ تو بات سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"مجھ پر آج تک میرے پیرنٹس نے پابندی نہیں لگائی۔ میں سلیولیس پہنوں یا برقعہ میری مرضی' تم کیا کوئی بھی مجھ سے اس بارے میں پوچھ گچھ نہیں کر سکتا۔"

ادھر عارفہ بیگم کو تو اس نے دو ٹوک جواب دے کر چپ کرا دیا تھا۔

"یو ڈونٹ مائنڈ آنٹی! اگر آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ مجھے بتائیں مجھے کیسا لباس پہننا ہے اور کیسا نہیں۔ آپ اتنی ماڈرن اپروچ رکھنے والی خاتون کو کسی مڈل کلاس کی دقیانوسی ساس کی طرح بات کرتے دیکھ کر

کم از کم مجھے تو بے حد حیرانی ہو رہی ہے۔" اس نے اپنے مخصوص اسٹائل میں کندھے اچکائے۔

دونوں روشن خیال خاندانوں کے مابین اس معاملے کو لے کر بدمزگی اس حد تک بڑھ گئی کہ رشتہ ختم ہونے کی نوبت آ گئی گو کہ وہ لڑکے والے تھے۔ منگنی ٹوٹنا ان کے لیے کوئی اتنا خاص مسئلہ نہ تھا اور رشتے بہت مگر پھر بھی پوچھنے اور جاننے والوں کے سامنے ذرا شرمندگی سی ہوئی۔ جب وہ اتنے چاؤ' چونچلوں اور پسند سے کی جانے والی منگنی ٹوٹنے کا سبب بتاتیں تو کچھ منہ پھٹ لوگ بے دھڑک ان کے منہ پر ہی کچھ اس قسم کی حیرت کا اظہار کرتے۔

"ارے' اتنی چھوٹی سی بات پر رشتہ ختم ہو گیا۔ آپ تو خود اتنے ماڈرن خیالات رکھتی ہیں پھر بھی۔"

اور اس وقت عارفہ بیگم سے کوئی جواب نہیں بن پڑتا تھا' ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سامنے والے کو کیسے سمجھائیں کہ وہ بے شک روشن خیال ہیں مگر اس معاملے میں ان کی اپنی کچھ حدود ہیں۔ دراصل ان کے ذہن میں ابھی تک نیلما کی تقریر کا وہ حصہ بھی تھا جس میں اس نے کہا تھا۔

"ذرا دنیا کو دیکھیں' کس قسم کا فیشن اور لباس چل رہے ہیں آج کل۔ میں تو خود اتنی احتیاط رکھتی ہوں' نہ آگے پیچھے کے اتنے بڑے بڑے گلے پہنتی ہوں نہ ہی پنڈلیوں سے اوپر تک کے کٹ جائے اور ٹراؤزر۔ مجھے بھی اپنی لمٹس معلوم ہیں لیکن اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں شامیانے پہننا شروع کر دوں۔"

آخر میں اس کے لہجے میں طنز ہی نہیں' تلخی بھی آ گئی تھی اور عارفہ بیگم اب تک یہ سمجھنے سے قاصر تھیں کہ بیک وقت دو آزاد خیال افراد کی لمٹس الگ الگ کیسے ہو سکتی ہیں؟ بہرحال اس قصے سے ابھی پوری طرح ان کی جان چھوٹی بھی نہیں تھی کہ وسیع و عریض حلقہ احباب کے جواب دیتے اور سمجھاتے سمجھاتے وہ کچھ بے زار سی ہو گئی تھیں کہ ان کے شوہر نے ایک نیا شوشا (ان کی دانست میں) ان کے سامنے چھوڑ دیا۔ انہیں یہ ٹوٹا رشتہ غنیمت بلکہ ایک نعمت لگا اور اپنے بیٹے کے لیے انہوں نے جھٹ سے اپنی بھانجی کا نام پیش کر دیا۔

"دماغ ٹھیک ہے آپ کا؟" عارفہ بیگم نے انہیں یوں دیکھا جیسے سچ مچ ان کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

"ہمارے بیٹے کی منگنی ختم ہوئی ہے' کوئی شادی نہیں جو آپ اس طرح کے رشتے لگا رہے ہیں اور ویسے بھی آج کل دوسری کیا تیسری شادی کرنے والے مردوں کو بھی کنواری لڑکیاں مل جاتی ہیں۔ ہمیں کیا ضرورت ہے ایک بیوہ کو بہو بنا کر گھر لانے کی۔"

"وہ میری بھانجی ہے' بیوہ ہے تو کیا ہوا! ہے تو میرا خون۔ مشکل وقت میں ہم آگے نہیں بڑھیں گے تو اور کون آئے گا۔ کس سے امید رکھیں گے وہ لوگ!"

"ارے' اس کے اس حادثے میں کوئی ہمارا قصور ہے جو ہم سزا بھگتیں۔" عارفہ بیگم ویسے ہی شوہر پہ حاوی تھیں۔ اب تو اور پچ تیز کر رہی تھیں۔

"لاحول ولا قوۃ۔" وہ بھنا گئے۔ "کسی بیوہ سے شادی کیا کوئی سزا ہے؟ ویسے تو تم بڑی یورپ' امریکہ' لندن کی مثالیں دیتی ہو۔ وہاں نہیں ہوتیں کیا ایسی شادیاں۔ بیوہ' طلاق یافتہ' دو چار بچوں کی ماں' سب ہی کو شادی کے لیے پارٹنر مل جاتے ہیں۔ وہاں تو ایسی جاہلانہ تنگ نظری کا مظاہرہ کوئی نہیں کرتا جن سے متاثر ہو کر تم زندگی گزار رہی ہو۔"

وہ بھی خم ٹھونک کر بیوی کے مقابل میدان میں آ گئے۔

"وہاں کی شادیوں کے نتائج بھی دیکھ لیں کیا ہوتے ہیں؟ کتنا چلتی ہیں ایسی شادیاں۔"

"نتائج ایک الگ چیز ہے' اس کی وجوہات پر ایک لمبی چوڑی بحث ہو سکتی ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اس ترقی یافتہ اور جدید معاشرے میں بھی اسے کوئی اتنا برا نہیں سمجھتا' نہ ہی یوں دھتکارا جاتا ہے جیسے تم کر رہی ہو۔"

"بیٹے سے تو پوچھ لیں' وہ بھی راضی ہو جائے گا یا نہیں۔"

عارفہ بیگم نے مزید بحث سے بچنے کے لیے گیند بیٹے

کے کورٹ میں ڈال دی۔

"اسے راضی کرنا میرا کام ہے' وہ میرا بیٹا ہے' میری بات کبھی نہیں ٹالتا۔ ویسے بھی ہم ایک بار اس کی مرضی پوری کرچکے ہیں مگر اس کی قسمت میں نہیں تھا' اللہ کی مرضی مگر تم تو اریبہ کے لیے ہامی بھرو' بیٹا بھی راضی ہو ہی جائے گا۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے ایسے ایمرجنسی میں ہامی بھرنے کی۔" وہ تمسخر سے بولیں۔ "کوئی لولا' لنگڑا ہے خدانخواستہ ہمارا بیٹا یا کھٹو ہے یا دوسری' تیسری شادی ہے اس کی جو ایک بیوہ سے کردیں۔ وہ تو اپنے چاؤ چونچلے پورے کرچکیں' ہمارا لڑکا نہ کرے؟ ابھی میرے بیٹے کی عمر ہی کیا ہے۔ ایک سے ایک اچھی' خوبصورت' ایجوکیٹڈ اور کنواری لڑکی مل سکتی ہے اسے۔ "خوبصورت' ایجوکیٹڈ" اور "کنواری" پر ان کا خاص زور تھا۔

"دوپٹہ گلے میں ڈال کر یا فیشن کے تقاضے پورے کرنے سے کوئی روشن خیال نہیں بن جاتا' بہت سے معاملات کے لیے دل میں گنجائش رکھنا پڑتی ہے۔ وسعتِ قلب سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہی اصل روشن خیالی ہے۔ اندر سے تو تم وہی جاہل' دقیانوسی عورت ہو جو ہمارے معاشرے میں عام ہے۔"

انہیں اتنا شدید غصہ آرہا تھا کہ اپنی بات کا ردِعمل دیکھنے اور سننے کے لیے بھی نہیں رکے اور سیدھے لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔

دونوں بھائی اپنی اپنی بیویوں کو رضامند ہی کرتے رہ گئے اور میدان چھوٹے بھائی' بھابھی نے مار لیا۔ بڑی بھابھی اور چھوٹی عارفہ بیگم دونوں کے لیے شائستہ بیگم کا یہ قدم صرف حیرت کا ہی نہیں بلکہ صدمے کا بھی باعث تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے تئیں یہ فرض کر رکھا تھا کہ حماد کے لیے ان کی چھوٹی بیٹی بہت موزوں رہے گی۔ شائستہ بیگم سے اچھی ساس بھلا ان کی لڑکیوں کو کہاں ملتی؟ یہ شائستہ بیگم نے تو حد ہی کردی۔ اب بھلا بتاؤ "اتنا قابل لڑکا" صورت شکل سے بھی اچھا" اتنی اچھی نوکری' عمر بھی کوئی زیادہ نہیں' اسے کیا سوجھی بے چارے بچے کو لے کے قربانی کا بکرا بنادیا۔ سندر کی محبت میں اسے قربان کردیا۔"

بڑی بھابھی اور عارفہ بیگم دونوں حماد اور اریبہ کے رشتے کو بلکہ غیر متوقع رشتے کو ڈسکس کررہی تھیں۔

"ہاں تو اور کیا۔" عارفہ بیگم نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"خاندان کی اور لڑکیاں نظر نہیں آئیں شائستہ کو حماد کے لیے۔ آپ کی یسریٰ ہے' ہماری ثمن ہے' دونوں کا جوڑ تھا حماد کے ساتھ' کسی سے بھی کرلیتیں۔" عارفہ بیگم کے دل میں دبی حسرت کھل کے بول رہی تھی۔

"یسریٰ کی تو خیر شائستہ سے اچھی خاصی بنتی ہے' وہ تو آسانی سے ایڈجسٹ ہوجاتی مگر تمہاری ثمن کا گھل مل کے رہنا بڑا مشکل ہے۔ اس کے تو مزاج ہی الگ ہیں پھر تم نے ماڈرن ماڈرن کا پہاڑہ پڑھا کر اس کی پرورش کی ہے۔ اتنی آزاد خیالی کے ساتھ اس کا گزارہ کہاں ہوتا شائستہ کے گھر۔"

بڑی بھابھی نے حسبِ عادت عارفہ بیگم اور ان کی فیملی کو تنقید کا نشانہ بنایا اور عارفہ بیگم کو چپ رہنا محال تھا۔

"آپ کی بیٹیاں خیر سے کون سی کنویں کی مینڈک ہیں۔ ہمیں نہیں پتہ کہ سدرہ کی شادی کیسے ہوئی تھی؟" انہوں نے طنز کے تیر برسائے۔ "اور ویسے بھی میں نے اپنی بیٹیوں کو آزادی کے ساتھ ساتھ اچھے برے کی تمیز بھی دی ہے۔ وہ چھپ چھپ کے غلط حرکتیں نہیں کرتیں۔"

"تو میری بچی نے ایسا کون سا چھپ کے کوئی غلط کام کیا ہے۔ پسند کی شادی کی اجازت تو اسلام میں بھی ہے۔" بڑی بھابھی نے جوش کے ساتھ دلیل دی۔

"اسلام سے زیادہ روشن خیال مذہب کوئی نہیں ہے۔ یہ نام نہاد ماڈرن ازم بھی اس کے آگے کچھ نہیں۔" وہ مزید بولیں۔

"اور مسلمانوں سے زیادہ تنگ دل اور تنگ نظر کوئی نہیں۔" عارفہ بیگم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اللہ کا شکر ہے کہ میں ایسی مسلمان نہیں ہوں' لبرل ہوں۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں' تم۔"

ان دونوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی بحث شروع ہوچکی تھی۔

اور شائستہ بیگم یوں تو اچھی تھیں' بہت اچھی تھیں مگر اتنی اعلا ظرف پھر بھی نہیں تھیں کہ یوں اتنی آسانی سے فقط ایک دوبار اپنے شوہر کے اصرار پر اریبہ کے لیے مان جاتیں۔ بے شک وہ اریبہ کو بہت پسند کرتی تھیں اور پہلے پہل اپنی دونوں جٹھانیوں کے ساتھ ساتھ ان کا بھی ارادہ تھا کہ اریبہ کو اپنے گھر کی بہو بنائیں مگر وہ ہونہ سکا تھا اور اب ان بدلے ہوئے حالات میں ایسا کرنا ان کے لیے مشکل ہورہا تھا کیونکہ بہرحال وہ ایک بیٹے کی ماں بن کر سوچ رہی تھیں۔ ساری تان بس اسی نکتے پہ آکر ٹوٹتی کہ "لوگ کیا کہیں گے؟" انہیں اپنے بیٹے کے لیے کوئی اور لڑکی نہ ملی اور پھر بیٹے کے بھی بہرحال کچھ ارمان ہوں گے' پتہ نہیں اسے قبول کرے گا یا نہیں یا اگر باپ کے اصرار پر قبول کر بھی لے تو کون سا خوش ہوگا بیٹا۔"

تین چار روز تک مسلسل گھر میں یہ کھچڑی پکتی رہی اور خود ان کا دماغ بھی سوچ سوچ کر بہت تھک گیا تھا۔ وہ تو اس دن سارہ کے ہاتھ پر جانے کیسے ابلتا ہوا گرم پانی گر گیا' شکر ہے کہ پانی تھوڑا سا تھا مگر پھر بھی تین آبلوں نے سارہ کو پوری رات بے چین رکھا اور بیٹی کی تکلیف نے ماں کی آنکھوں میں نیند نہیں آنے دی۔ تمام رات اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کی اذیت کو کم کرنے کی اللہ سے دعا کرتی رہیں اور جانے کس پہر یونہی شوہر کی ایک بات ایسی دماغ میں آئی کہ لاکھ جھٹکنے پر بھی نہیں نکلی۔ انہوں نے اریبہ کے معاملے پر ان سے کہا تھا۔ "ایک بیٹے کی نہیں بلکہ بیٹی کی ماں بن کر سوچنا" اور اس وقت تو انہوں نے اس بات پر کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی مگر اب وہ صرف اور صرف ایک بیٹی کی ماں بن کر ہی سوچ رہی تھیں۔ "اگر خدانخواستہ میری بیٹی کے ساتھ ایسا سانحہ گزرے تو؟" اور اسی پل یوں لگا کہ جیسے کسی نے ان کا دل دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا ہو۔

"اللہ نہ کرے' اللہ نہ کرے۔ میری بیٹی کا دل کبھی غم آشنا ہو۔" بے ساختہ ان کے اندر سے بڑی شدت سے یہ آرزو لبوں پہ آئی۔

"میری بیٹی کو میرے حصے کی خوشیاں بھی مل جائیں۔" ایک ماں کا دل بڑی دل سوزی سے دعا کررہا تھا۔ انہیں صلۂ رحمی کے تقاضے بھی یاد آرہے تھے۔

"اور دنیا والے؟" ان کا نفس پھر پکھ سے چین ہوا۔

"دنیا کی پروا کیا کرنی؟ اس دنیا نے تو پیغمبروں کو بھی نہیں چھوڑا۔" کسی نے چپکے سے اندر سے کہا۔

"امی۔۔!" سارہ پھر کراہی' چھالے تکلیف دے رہے تھے۔

"میری بچی۔۔!" امی اس کا سر سہلانے لگیں اور اس کا چہرہ تکتے دیکھتے انہیں خود بھی پتہ نہیں چلا جانے کب ان کا دل اتنا وسیع ہوگیا کہ اس میں سارہ کے ساتھ ساتھ اریبہ بھی سماگئی۔

☼

رگِ جاں سے پیارے

نازیہ کنول نازی

ناولٹ
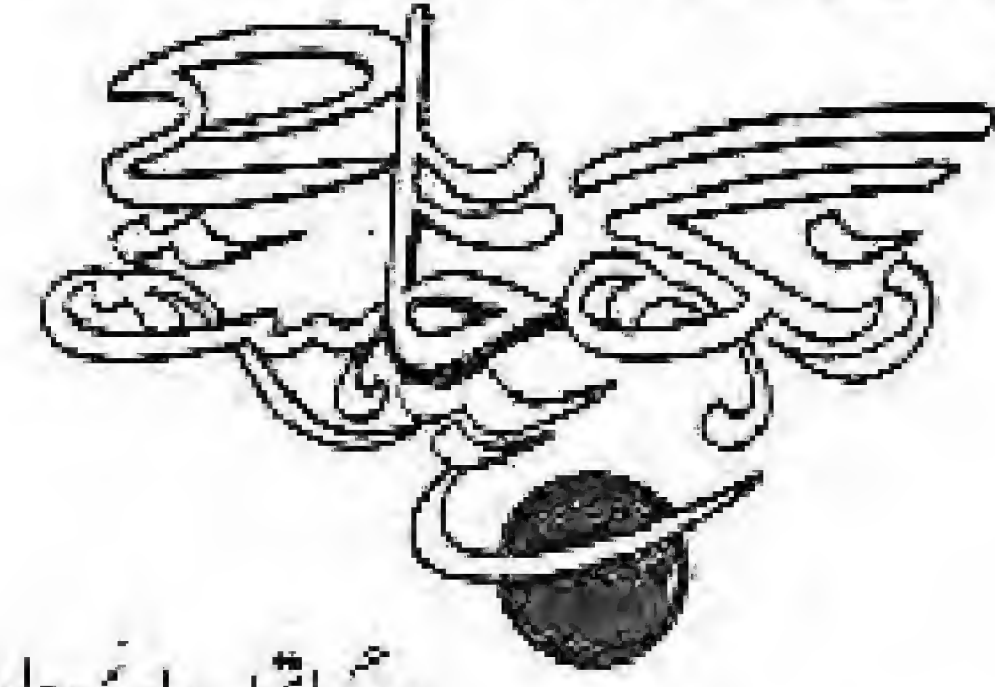
عشق کے علاقے میں حکم یار چلتا ہے
ضابطے نہیں چلتے
حسن کی عدالت میں
عاجزی تو چلتی ہے
مرتبے نہیں چلتے

موسم بے حد سرد ہو رہا تھا۔
جب وہ روٹیاں پکا کر فارغ ہوئی تو مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ جلدی جلدی وضو کر کے نماز ادا کی۔ دعا مانگی اور ابھی جائے نماز لپیٹ کر رکھ رہی تھی کہ جاذب حسن بڑے پُرجوش انداز میں کمرے کا دروازہ دھکیلتے ہوئے تیزی سے اس کے قریب چلا آیا۔

"سارا! یہ میں نے تمہارے لیے چوڑیاں خریدی ہیں۔ پہن کر دیکھو کیسی لگتی ہیں۔"

"دیکھ لوں گی' ابھی تو رکھ دو سائیڈ پر۔" اس نے بیزاری سے کہتے ہوئے ٹی وی آن کر لیا۔

جاذب اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

"کیا بات ہے؟ تم خفا ہو مجھ سے؟"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے' ابھی میرا سر بہت درد کر رہا ہے۔ پلیز' تم جاؤ یہاں سے۔"

وہ چاہ کر بھی اپنے لہجے کے روکھے پن کو چھپا نہیں سکی تھی۔

مگر جاذب حسن کو برا نہیں لگا۔ وہ اب بھی اسی لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"میں ٹیبلیٹ لا دیتا ہوں' چائے کے ساتھ لے کر سو جانا۔"

"اچھا لے لوں گی' تم اتنی فکر نہ کیا کرو میری۔"

"کیسے نہ کروں ہنی! زندگی میں تمہارے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس۔"

تھکے تھکے سے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے قریب ہی صوفے پر ٹک گیا تھا۔

سارہ کا غصہ مزید بڑھ گیا۔

"فضول باتیں مت کیا کرو جاذی! جو تم سوچ رہے ہو' ایسا ممکن نہیں ہے۔" وہ چیخی تھی۔

"کیوں ممکن نہیں ہے؟ مجھ میں ایسی کون سی کمی

ہے۔" وہ اداس لہجے میں بولا۔

"مجھے نہیں پتہ۔ لیکن تم میرا خیال اپنے دل سے نکال دو۔"

"لیکن کیوں؟" "تمہیں وجہ بتانی ہوگی۔"

سارا کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے اس نے پھر پوچھا' جواب میں وہ بڑی ڈھٹائی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"وجہ اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں کہ میں نوید سے پیار کرتی ہوں' آج سے نہیں بلکہ پچھلے دو سال سے۔ اس کے پاس وہ سب کچھ ہے جو مجھے چاہیے دولت' حسن' وجاہت' معاشرے میں باعزت مقام' سب کچھ' اب تم ہی بتاؤ' میں تمہیں اس پر ترجیح کیسے دے سکتی ہوں۔ تمہارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ مستقل ملازمت نہ حسن' نہ وجاہت' نہ معاشرے میں بلند مقام' کیا دے سکتے ہو تم مجھے' سوائے فکر اور پریشانیوں کے' ناکام تمناؤں اور تشنہ حسرتوں کے' پلیز جاذب' میری باتوں کا برا مت ماننا مگر حقیقت یہی ہے کہ نوید ہر لحاظ سے تم پر برتری رکھتا ہے۔

وہ بلا تکان بولتی جا رہی تھی اور ادھر جاذب حسن کی خوبصورت آنکھوں میں دھواں اٹھنا شروع ہو گیا تھا۔ کتنی چھوٹی سوچ رکھتی تھی وہ اس کے بارے میں' جسے وہ اپنی جان سے بڑھ کر چاہتا تھا۔

"میں مانتی ہوں جاذبی! کہ تم مجھ سے بے حد محبت کرتے ہو' مگر محبت انسان کا پیٹ نہیں بھرتی۔ معاشرتی تقاضوں کو پورا نہیں کرتی' لہٰذا پلیز یہ محبت' محبت' ڈاٹ کام کا کھیل بند کر کے کوئی مقام بناؤ اپنا' تاکہ کسی اچھی سی لڑکی کے ہم سفر بن سکو' پلیز۔"

وہ اس سے کہنا چاہتا تھا۔

"تم سے اچھی لڑکی کائنات میں اور کون ہے" مگر نہیں کہہ پایا۔

دل و دماغ جیسے کام کرنا ہی چھوڑ گئے تھے۔ وہ لڑکی جو اپنے حسن' خوش اخلاقی' اور چنچل حرکتوں کے باعث پچھلے کئی سالوں سے اس کے دل و دماغ پر راج کر رہی تھی۔ اس لمحے اس پر اپنی پست سوچ عیاں کر کے محض چند سیکنڈز میں دل سے اتر گئی تھی۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑا اس چہرے کو تک رہا تھا' جہاں ڈھونڈنے سے بھی اسے کوئی بدصورتی دکھائی نہیں دی تھی۔ سارا اس پر اپنی پسند ناپسند واضح کر کے بڑی مطمئن کھڑی تھی' جب وہ بمشکل اپنے قدموں کو گھسیٹتا اس کے مقابل آیا اور قدرے شکستہ لہجے میں بولا۔

"تم نہیں جانتیں سارا! کہ سچی محبت اس کائنات کی سب سے بڑی خوشی اور طاقت ہے' میرا دل کھول کر دیکھو کتنا قیمتی ہے' تمہارا نوید صدیقی' خود بھی بک جائے تب بھی اس دل کی قیمت نہیں چکا سکتا۔ کاش۔ کاش سارا! تم جان سکتیں کہ آج اس لمحے تم نے کیا کھویا ہے۔"

دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ نم لہجے میں کہتا وہ پھر ایک لمحے کے لیے بھی اس کے مقابل نہیں ٹھہرا تھا۔ سارا حبیب بغور اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھتی' بے نیازی سے کندھے اچکا کر رہ گئی تھی۔

تم مجھے چاہو گی اک دن دیکھنا
ہاں چلی آؤ گی اک دن دیکھنا
اس عشق نے مجھ کو جلایا ہے
تم بھی جل جاؤ گی اک دن دیکھنا

وہ سارا کے کمرے سے باہر آیا تو موسم کی خنکی کا احساس مزید شدید ہو گیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اسے شدید بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ مگر اب چند لمحوں کے بعد جیسے ہر چیز سے دل بھر گیا تھا۔

ضبطِ گریہ کی کوشش میں آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

تھکے تھکے نڈھال قدم اٹھاتا وہ صحن میں سیڑھیوں پر آ بیٹھا تھا۔

اسے یاد آ رہا تھا' وہ بہت چھوٹا سا تھا جب اچانک اس کی والدہ کی وفات ہو گئی تھی۔ اس وقت اسے شعور نہیں تھا۔ لہٰذا اپنی جنت کے چھن جانے پر رو نہیں سکا تھا۔ تاہم اس سانحے کے کچھ ہی عرصے بعد جب اس کے بابا نے کسی دوسری عورت سے شادی کر کے اسے اپنے گھر کی مالکن بنایا تو وہ بہت رویا تھا۔

گو اس وقت بھی وہ زیادہ باشعور نہیں تھا' مگر اچانک ماں کی عدم موجودگی نے اسے حساس بنا ڈالا تھا' اوپر سے جو عورت "ماں" بن کر اس کے گھر میں آئی تھی' وہ ماں تو دور ایک انسان کہلانے کے لائق بھی نہیں تھی۔

بہت سارے دن بھوکے پیاسے رہ کر' سوتیلی ماں کے ظلم سہنے کے بعد جب وہ اس زندگی سے تنگ آ گیا تو ایک روز بھاگ کر عابدہ بیگم کے پاس چلا آیا' وہ اس کی اکلوتی پھوپھو تھیں اور اولاد نرینہ سے محرومی کے باعث اس سے بے حد پیار کرتی تھیں۔

یہیں آکر جاذب نے ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ عابدہ بیگم کے شوہر حبیب علی پر فالج کا پہلا حملہ ہوا تو وہ بستر سے لگ کر رہ گئے۔ جاذب نے تعلیم کو خیرباد کہہ کر چھوٹی موٹی ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔

وہ اس گھرانے کو کسی آزمائش میں مبتلا نہیں دیکھ سکتا تھا' یہی وجہ تھی کہ ان کی خوشیوں کے لیے صبح سے رات گئے تک تھکے ہوئے بیل کی طرح کام کرتا اور اس پر بھی خوش رہتا۔ ساجد علی کی وفات کے بعد ساری ذمہ داری اس کے سر پر آ پڑی تھی۔

عابدہ بیگم کو وہ اپنی ماں ہی سمجھتا تھا' جبکہ سارا کو چھوڑ کر ان کی باقی تینوں بیٹیوں کو اس نے کبھی اپنی بہنوں کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھا تھا۔

سارا چار بہنوں میں سب سے بڑی اور سب سے زیادہ چرب زبان تھی۔ وہی جاذب کے ساتھ سب سے پہلے فری ہوئی تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اس پر رعب جماتی آئی تھی' اپنا اسکول کا ہوم ورک روزانہ' وہ بڑے دھڑلے کے ساتھ اس سے کرواتی تھی۔ اپنی چھوٹی سے چھوٹی بات اسے بتاتی' اس کا ہر مسئلہ وہی حل کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ جاذب قطعی بے ساختگی میں اس کی طرف کھنچتا چلا گیا تھا۔

بچپن رخصت ہوا اور جوانی آئی تو سارا سے اس کا لگاؤ محبت میں ڈھل گیا اور یہ محبت کب وقت کے ساتھ ساتھ جنون میں ڈھلی اسے مطلق خبر نہ ہو سکی۔

اسے خود پر سارا کا رعب جمانا بھی اچھا لگتا تھا۔ اور اسے تھوڑا تنگ کر کے اس کا ہر حکم بجا لانا بھی خوب بھاتا تھا۔ سارا کو چٹ پٹی چیزیں اچھی لگتی تھیں' وہ اس کی خوشی کے لیے روزانہ کوئی نہ کوئی چیز اٹھا لاتا۔ عابدہ بیگم اسے منع بھی کرتیں' اور کبھی کبھار فضول خرچی پر ڈانٹ بھی دیتیں مگر وہ ہنس کر ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے اڑا دیتا۔

سارا کے معاملے میں کسی کی نصیحت اس پر کوئی اثر نہیں کرتی تھی۔

سارا سے چھوٹی فائزہ' حسن اور سلیقہ میں بے مثال تھی' مگر وہ خاموش طبع لڑکی تھی' زیادہ وقت اپنی کتابوں کے ساتھ مصروف رہتی۔ یا کچن میں گھسی کچھ نہ کچھ پکاتی رہتی۔

سارا کے ساتھ اس نے بھی صرف میٹرک کیا تھا' بعد میں فراغت سے تنگ آکر پرائیویٹ انٹر کی تیاری شروع کر دی اور انٹر میں اچھے نمبروں سے پاس ہونے کے بعد گریجویشن کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جاذب نے اس سے متاثر ہو کر کئی بار سارا کو بھی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے کہا' مگر اس کا ہمیشہ ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

"میں کیوں مفت میں اپنا دماغ کھپاؤں' سولہ پڑھ کر بھی چولہا چوکی کرنی ہے اور بچے ہی پالنے ہیں تو پھر میٹرک کیا کم ہے' فضول کی ٹینشن نہیں لیتی میں۔"

جواباً وہ خاموش رہ جاتا۔

فائزہ سے چھوٹی عائزہ بھی بہت ذہین تھی۔ سب ہی اس کی سمجھداری کی وجہ سے اسے پسند کرتے تھے۔ سارا کے بعد وہی جاذب کے زیادہ قریب تھی۔

عائزہ سے چھوٹی فرا تھی' جو عام سی شکل و صورت کی حامل تھی۔ مگر حساس بہت زیادہ تھی۔ کچھ تو روپ رنگ اور سے اس کی "ناپسندیدہ آمد" اسے حساس بنانے کے لیے کافی تھی وہ بھی فائزہ کی طرح خاموش طبع اور سلیقہ مند تھی۔ اپنے اسکول کی ذہین ترین طالبات میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ جاذب اس سے بہت

پیار کرتا تھا اور اس کی خوشی کا پورا خیال رکھتا تھا۔

اپنے پھوپھا کی رحلت کے بعد تو وہ اور بھی ذمہ داری سے ان سب کا خیال رکھنے لگا تھا۔ عابدہ بیگم کے لب اس کے لیے دعائیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔

زندگی میں سب کچھ ہی تو حاصل ہو گیا تھا۔ مگر اب بھی کہیں اگر کوئی کمی تھی' تو وہ صرف محبت کی تھی۔ اس کے اندر بچپن کی معصوم حسرتیں اب بھی سر اٹھاتی تھیں۔ کبھی کبھی شدت سے اس کا دل چاہتا کہ کوئی اس کی دھڑکنوں کی آواز سنے اور اس کے جذبوں کا راز پالے' اسے ڈھیر سارا پیار کرے' خود سے بڑھ کر اس کا خیال رکھے' اسے یوں خود میں سموئے کہ زندگی کی ساری محرومیوں کا ازالہ ہو جائے۔

اور ایسا سوچتے ہوئے صرف سارا حسیب کا چہرہ ہی اس کی نگاہوں میں آیا تھا' جو اپنی خود سری کے باوجود اسے بے حد اچھی لگتی تھی۔

آج تک کیا نہیں کیا تھا اس نے سارہ حسیب کے لیے۔ مگر وہ اس کی وفاؤں کی اہل نہیں تھی۔ اس کے دل نے غلط انتخاب کیا تھا اور یہی غلط انتخاب اسے جلا رہا تھا۔

وہ کبھی سوچ ہی نہیں پایا تھا کہ سارا کی خواہشات کیا ہیں؟

آئندہ زندگی کے لیے اس کی سوچ اور تقاضے کیا ہیں؟ جان جاتا تو شاید آج اتنا دکھی نہ ہوتا۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جارہی تھی۔ مگر وہ بے نیاز سا ٹھنڈی سیڑھیوں پر بیٹھا ضبط سے آنسو پیتے ہوئے دل کے اندر ہی گراتا رہا۔

جانے کتنا وقت یونہی بیت گیا تھا۔ جب اچانک اسے اپنے شانوں پر' نرم شال کی گرماہٹ محسوس ہوئی۔ چونک کر سر اٹھاتے ہوئے اس نے اوپر دیکھا' تو فائزہ اس سے کچھ ہی قدموں کے فاصلے پر کھڑی بہت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"سردی کافی بڑھ گئی ہے۔ میرے خیال میں اس وقت آپ کو یوں ٹھنڈی سیڑھیوں پر نہیں بیٹھنا چاہیے۔"

وہ ہمیشہ اس سے بہت مختصر بات کرتی تھی' جاذب آج تک کبھی چاہ کر بھی اس سے فری نہیں ہو پایا تھا۔ تاہم اس کی عزت اور احترام ضرور کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے احساس دلانے پر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور تیز قدم اٹھاتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز اسے بہت تیز بخار چڑھ آیا تھا۔

ساری رات جاگ کر انگاروں پر لوٹنے کے بعد یہ لازم بھی تھا۔ عابدہ بیگم کی گویا جان پر بن آئی تھی۔ جاذب کو ہمیشہ اپنے لیے ان کی فکر اچھی لگتی تھی' مگر وہ کبھی بھی جان بوجھ کر انہیں اپنے لیے پریشان نہیں کرتا تھا۔

سارا بھی خبر ہوتے ہی اس کے کمرے کی طرف دوڑی آئی تھی۔ عابدہ بیگم وہاں موجود نہ ہوتیں تو شاید وہ رات والی بات پر اس سے مزید کچھ کہتی' معذرت ہی کرلیتی مگر عابدہ بیگم کی موجودگی میں کچھ بھی نہ کہہ سکی تھی۔

عابدہ بیگم نے اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھی تھیں' بخار ہلکا ہو گیا تو اس کو اپنے ہاتھوں سے دلیہ کھلایا تھا' جاذب نے طبیعت سنبھل جانے پر بڑی مشکل سے انہیں واپس ان کے کمرے میں بھیجا تھا۔ خود وہ چونکہ دن بھر سویا رہا تھا لہٰذا انہیں واپس بھیج کر پلکیں موندنے کے باوجود اسے نیند نہیں آسکی تھی۔

بہت دیر تک وہ اضطراب کے عالم میں بستر پر پڑا کروٹیں' بدلتا رہا تھا۔ ابھی اٹھ کر باہر جانے کا قصد کر رہا تھا کہ اچانک اس کے کمرے کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور اگلے ہی لمحے کوئی نہایت محتاط انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے اس کے بستر کے قریب چلا آیا۔

جاذب کو سو فیصد یقین تھا کہ یہ سارا کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ سو وہ آنکھیں بند کیے بے نیاز پڑا رہا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اتنی رات گئے یوں چوروں کی طرح اس کے کمرے میں آنے کا مقصد کیا ہے؟

جب کچھ لمحوں کے بعد اسے اپنے چہرے پر کسی کی گرم مگر سکون آمیز پھونکوں کا احساس ہوا۔ شاید نہیں یقیناً "اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا جا رہا تھا۔ وہ از حد حیران ہوا تھا کیونکہ سارا نے آج تک کبھی جاگتے میں بھی اس کے لیے کوئی ایسا عمل نہیں کیا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد اس کو اپنی پیشانی پر کسی کی نرم انگلیوں کی پوروں کا لمس محسوس ہوا اور اس کے پورے وجود میں جیسے بجلی سی لپک گئی۔

اس لمحے اس کا شدت سے دل چاہا تھا کہ وہ آنکھیں کھول کر اس ہستی کا دیدار تو کرے جو اس پر چپ چاپ اپنی محبت نچھاور کر رہی تھی۔ مگر جانے کیا بات تھی کہ وہ چاہ کر بھی ایسا نہیں کر سکا تھا۔

تھوڑی دیر میں مسیحائی کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا اور اس کے قریب بیٹھی وہ ہستی جو خوشبو کا پیکر تھی اٹھ کر واپسی کے لیے پلٹ گئی۔ تب جاذب نے ذرا سی پلکیں وا کرکے' نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں آنے والی ہستی کا سراپا دیکھنا چاہا تھا۔ مگر خواہش کے باوجود وہ شناخت نہیں کر سکا۔

اگلے روز وہ بیدار ہوا تو اس کی آنکھوں میں سرخی نمایاں تھی۔

عائزہ اور فرزانے اسکول جانے سے قبل اس کے کمرے میں آکر اس کی مزاج پرسی کی تھی' پھر روزانہ کی طرح اس سے ڈھیروں پیار لے کر خوشی خوشی اسکول روانہ ہو گئیں۔ عابدہ بیگم نماز فجر کی ادائیگی کے بعد اس کے پاس ہی آبیٹھی تھیں۔

سارا اس کے لیے ناشتہ لے کر آئی تو جانے کس خیال کے تحت وہ ان سے پوچھ بیٹھا۔

"پھوپھو' آپ ہمیشہ مجھے میرا سوہنا پتر' میرا سوہنا پتر کہتی رہتی ہیں' میں بھی آپ کے لفظوں پر اعتبار کرکے خود کو سوہنا سمجھنے لگا تھا' مگر۔ کل رات مجھے پتہ چلا کہ میں کتنا بد صورت ہوں۔"

اس کے لبوں پر بڑی زخمی سی مسکراہٹ پھیلی تھی' عابدہ بیگم کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"ماں صدقے جائے' تو ایسا کیوں سوچتا ہے؟"

"پتا نہیں پھوپھو' بس کل رات مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ میں بہت بد صورت ہوں۔"

سارا اس کے الفاظ پر شرمندہ دکھائی دے رہی تھی۔ مگر وہ خاموش نہیں ہوا تھا۔

"آپ نے تو مجھے خوش فہم بنا دیا تھا۔ پھوپھو! شکر ہے کہ آئینہ دیکھ لیا۔"

"نہیں میرے بیٹے! مجھے تو تیرے جیسا سوہنا کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔"

وہ رو پڑی تھیں۔ جاذب نے کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر دھر لیے۔

☼ ☼ ☼

جاذب نے خود کو بہت مصروف کر لیا تھا۔

پہلے وہ صبح دیر سے اٹھتا تھا۔ پھر ناشتہ کرکے اپنی مرضی سے کام پر جاتا تھا' مگر اب اس کے معمول میں تبدیلی آگئی تھی۔

اب وہ صبح فجر کی نماز کے لیے اٹھتا۔ نماز پڑھ کر کچھ دیر قرآن پاک کی تلاوت کرتا' پھر چائے پی کر گھر سے نکل جاتا۔ پہلے دو تین روز تو اس نے چائے بھی نہیں پی تھی۔ بعد میں عابدہ بیگم کو پتہ چلا تو انہوں نے ڈانٹا' اور یوں فائزہ اب روز اسے چائے بنا کر دینے لگی۔

عابدہ بیگم اس کے صبح سویرے کام پر جانے سے بھی متفکر ہوئی تھیں مگر اس نے بہانے بنا کر انہیں راضی کر لیا تھا۔ اب صبح سویرے گھر سے نکل کر وہ کسی کی شاپ پر بیٹھتا تھا۔ پھر دو تین گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد اپنے مستقل کام پر چلا جاتا اور شام تک ساحل سمندر کے قریب رندا سنبھالے' کشتی میں استعمال ہونے والی لکڑیاں چھیلتا رہتا۔ گھر میں کوئی بھی اس کے اس کام سے باخبر نہیں تھا۔

کچھ ماہ پہلے تک اس نے بھی مستقل یہ کام کرنے کا قطعی نہیں سوچا تھا' مگر ایک دم سے اس کی سوچ بدل گئی تھی۔ اب اسے ایک لمحے کو بھی فارغ رہنا گوارا نہیں تھا۔

ہفتہ وار ملنے والی اجرت وہ خود ہی سنبھال کر جمع کرتا رہتا۔ اور مہینے کے بعد جب سات آٹھ ہزار روپے بن جاتے تو عابدہ بیگم کے ہاتھوں پر دھر دیتا۔ اسے محنت کرکے روزی حاصل کرنے میں کسی قسم کی کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔

فائزہ نے انٹر کی طرح گریجویشن بھی بہت اچھے نمبروں سے کرلیا۔ اب وہ ایم اے کرنا چاہتی تھی۔ مگر عابدہ بیگم ایسا نہیں چاہتی تھیں۔ کیونکہ ان کا ارادہ اب سارا کے ساتھ ساتھ اسے بھی گھر سے رخصت کرنے کا تھا۔ اور اس سلسلے میں وہ جاذب سے بات کرنا چاہتی تھیں۔

عابدہ بیگم اس کے لیے بہت پریشان رہنے لگی تھیں۔ کیونکہ اس کا مزاج اور معمولات یکسر بدل گئے تھے۔ پہلے کی طرح سب کے درمیان بیٹھ کر ہنسنا کھیلنا' کھانا پینا' سب چھوڑ دیا تھا اس نے۔ عابدہ بیگم نے ایک بار اسے احساس دلایا تو وہ مسکرا کر کہہ اٹھا۔

"وقت بدل گیا ہے پھوپھو! میری بہنیں اب بڑی ہو رہی ہیں۔ انہیں گھر سے رخصت بھی تو کرنا ہے اور ان کی رخصتی کے لیے میرا صبح شام کام کرنا بے حد ضروری ہے۔"

اس کی بات درست تھی۔ لہٰذا عابدہ بیگم سوائے اس پر نثار ہونے کے اور کچھ نہیں کہہ سکی تھیں۔

اس شام بہت دنوں کے بعد شاور لے کر وہ سب کے درمیان بیٹھا تو ایک عجیب سی سرشاری کا احساس ہوا۔ عائزہ اور فرا کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ عابدہ بیگم بھی مطمئن نظر آرہی تھیں۔ جاذب نے سرسری سی نظر شوخ و چنچل سارا حسیب کے دل کش چہرے پر ڈالنے کے بعد اپنے مقابل بیٹھی فائزہ کو دیکھا' وہ اسی کی طرف دیکھتے ہوئے دل کشی سے مسکرا رہی تھی۔ اس سے نظریں ملیں تو فوراً سنجیدہ ہوگئی۔

کچھ دیر بعد وہ چائے پی کر اپنے کمرے میں آگیا تو سارا بھی اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔

"جاذی! کیا تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو۔؟"

وہ جو شرٹ اتار کر لیٹنے کا ارادہ کر رہا تھا اس کی آواز پر قدرے حیرانی سے پلٹا۔

"نہیں میں تو کبھی بھی تم سے ناراض نہیں رہا۔"

"تو پھر تم پہلے کی طرح مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے' الگ تھلگ کیوں رہنے لگے ہو۔؟"

"پتا نہیں' شاید کچھ عقل آگئی ہے۔"

بہت مدھم لہجے میں اس نے کہا تھا۔ پھر بات بدلتے ہوئے بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے سارا! مجھے وقتی طور پر بہت دکھ ہوا تھا کیونکہ میں نے تمہیں دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف سمجھا تھا۔ مگر جلد ہی مجھے عقل آگئی۔ تم اپنی جگہ پر صحیح ہو سارا۔ میرے پاس واقعی تمہیں دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور تم نے صحیح کہا تھا۔ محبت کبھی کسی انسان کا پیٹ نہیں بھرتی' ہر انسان کو اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنے کا حق حاصل ہے۔"

"تھینک یو' سوچ جاذی' تم ریئلی بہت اچھے ہو۔"

وہ اس کے الفاظ پر خوش ہوئی تھی۔ مگر جاذب دکھ سے مسکرا اٹھا تھا۔

"پھر سے خوش فہمیوں میں مت الجھاؤ چڑیل! یہ حصار ٹوٹتا ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

اس بار اس کا لہجہ اتنا مدھم تھا کہ سارا کوشش کے باوجود کچھ نہیں سن سکی تھی۔

"نوید کون ہے۔؟" کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا۔

"میری ایک عزیز دوست کا بھائی ہے' دو سال پہلے ہم ملے تھے' تب وہ باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ تین بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے۔ خود مختار ہے۔ امی نے بھی دیکھا ہے اسے بہت اچھا لگا ہے وہ ان کو بھی۔"

"اوکے اب تم جاؤ پلیز' میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

ایک دم اسے ٹوکتے ہوئے وہ پھر روڈ ہو گیا تھا۔ سارا کو اس کا رویہ بے حد برا لگا۔ وہ فوراً ہی اس کے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

کبھی شکستوں کے دکھ اٹھائے تو اس سے پوچھوں
وہ میری مانند ٹوٹ جائے تو اس سے پوچھوں
اسے بھی کوئی ستارہ منزل سے دور کر دے
اسے بھی رستہ نظر نہ آئے تو اس سے پوچھوں
سفر میں وہ بھی کسی کڑے امتحاں سے گزرے
اسے بھی یوں کوئی آزمائے تو اس سے پوچھوں
اسے محبت میں کون سا دکھ دیا ہے میں نے
کبھی نظر سے نظر ملائے تو اس سے پوچھوں
میری طرح دن چڑھے تک وہ بھی نہ سوئے
اسے بھی شب بھر نہ نیند آئے تو اس سے پوچھوں

وہ سارا حسیب کے ساتھ ساتھ خود سے بھی ناراض تھا۔ ہزار خود کو سمجھانے کے باوجود اس کا دل سارا حسیب سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ وہ گھر میں آتا تھا تو سانس جیسے سینے میں گھٹنے لگتی تھی۔ جبکہ سارا کا چہرہ اب بھی پہلے کی طرح شاداب تھا۔

☆ ☆ ☆

اس روز رات میں حسب معمول وہ کافی دیر سے گھر واپس لوٹا تھا۔ کھانا چونکہ وہ باہر سے ہی کھا آتا تھا۔ لہٰذا چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ مگر برآمدے سے گزرتے ہوئے' اچانک اس کے قدم ٹھٹھک گئے۔

رات کے اس پہر سارا' بڑے مگن انداز میں ٹیلی فون اسٹینڈ کے قریب کھڑی' کسی سے کہہ رہی تھی۔

"آپ کب آئیں گے نوید! گھر والے اب زیادہ دن مجھے آزاد نہیں رہنے دیں گے' چند روز پہلے میں نے اپنے کزن کو بھی آپ کے بارے میں بتادیا ہے۔ اماں ہم بہنوں کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہیں۔ پلیز جلد واپسی کا پروگرام بنائیں۔ نہیں تو کسی اور کے ساتھ رخصت کردیں گے یہ مجھے۔"

دوسری طرف نوید نے شاید انتظار کرنے کو کہا تھا تبھی اس نے کہا تھا۔

"وہ تو کر ہی رہی ہوں۔ مگر ڈر لگتا ہے۔ آپ کی واپسی سے قبل کہیں کچھ اور نہ ہو جائے۔ وقت تیزی سے ہاتھ سے نکلتا جارہا ہے۔ اب تو عائزہ اور فرا بھی مجھ سے بڑی لگنے لگی ہیں۔"

اس نے شاید پھر امید کے پھول تھمائے تھے تب سارا کے چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور اس نے رابطہ منقطع کردیا تھا۔

دل میں بہت سی حسرتیں پنپ رہی تھیں۔

خود اچھی زندگی بسر کرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے گھر والوں کو سپورٹ کرنے کی خواہش بھی رکھتی تھی۔ اسی لیے اب تک جس کسی نے بھی رشتے کی غرض سے ادھر کا رخ کیا تھا۔ اس نے اوٹ پٹانگ حرکتیں کرکے انہیں بھگا دیا تھا۔

جاذب اتنے سالوں سے یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے ایسا کر رہی ہے۔ مگر وہ "کس" کے لیے ایسا کر رہی تھی' یہ اب اسے معلوم ہوا تھا۔ پچھلے دو سالوں میں کتنا بدل لیا تھا اس نے خود کو۔ وہ جو ہر وقت ہواؤں کے رتھ پر سوار رہتی تھی۔ اب گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ جیسے ڈھلتی جارہی تھی۔

وقت مزید تیزی سے آگے بڑھ آیا تھا۔

جاذب کا کام بڑھ گیا تھا۔ اب اکثر رات میں بھی وہ گھر واپس نہیں آتا تھا۔ فائزہ نے بی اے کی طرح ایم اے بھی نہایت اچھے نمبروں سے پاس کرلیا۔ گھر کی تمام ذمہ داری بھی پہلے سے بڑھ کر اس نے سنبھالی تھی۔ جاذب کے تمام چھوٹے موٹے کام بھی وہی سرانجام دیتی تھی' سارا اب یا تو خود کو کمرے میں محصور رکھتی یا جاب کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتی۔

عابدہ بیگم کی صحت اب پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ بیٹیوں کی فکر انہیں ہر وقت مختلف سوچوں کے حصار میں جکڑے رہتی تھی۔ اب جو بھی لوگ سارا' فائزہ کو دیکھنے آتے وہ فائزہ کے ساتھ ساتھ عائزہ کو بھی پسند کرلیتے۔ نتیجتاً عابدہ بیگم کو خاموشی اختیار کرنی پڑتی تھی۔ کیونکہ وہ ہر صورت پہلے سارا کے فرض سے ہی سبکدوش ہونا چاہتی تھیں۔ جاذب سب کچھ دیکھتے

اور جاتے ہوئے بھی خاموش تھا۔ اور سارا اس کی اسی خاموشی پر کڑھ رہی تھی۔

اس نے جاذب سے کہا تھا کہ وہ عابدہ بیگم سے بات کرے اور انہیں سمجھائے کہ وہ سارا کے چکر میں دوسری بیٹیوں کے اچھے رشتے نہ گنوائیں۔ مگر وہ ابھی تک ان سے اس مسئلے پر بات نہیں کر سکا تھا۔

عائزہ نے قد کاٹھ بہت اچھا نکالا تھا۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی وہ بالکل فائزہ پر گئی تھی۔ خوش اخلاق بھی تھی اور خوش لباس بھی۔ لہٰذا سب اسی کے گرویدہ ہو گئے تھے۔

آج کل رشتے کے لیے آنے والی زیادہ تر خواتین اسی کو پسند کر جاتی تھیں اور یہی بات عابدہ بیگم کو پریشان کر رہی تھی۔ مگر سارا کو ان کی پریشانی کا احساس نہیں تھا۔ وہ اپنی ہی دنیا میں مدہوش تھی۔

نوید نے ہزاروں میل دور بیٹھ کر بھی اس پر اپنا حصار تنگ کر رکھا تھا۔ صرف اس کے حصول کے لیے وہ اپنی ماں، بہنوں، جاذب اور زندگی کے من پسند مشاغل سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔

جاذب نے دن رات کی محنت سے کافی روپے جمع کر لیے تھے اور اب اس کا ارادہ ملک سے باہر جانے کا تھا۔ اس سلسلے میں ابھی تک وہ عابدہ بیگم سے بات نہیں کر سکا تھا۔ تاہم اس نے انہیں اس بات کے لیے قائل کر لیا تھا کہ اب فائزہ، عائزہ اور سارا میں سے جس کا رشتہ بھی آئے وہ بڑی چھوٹی کے مسئلے کو سائیڈ پر رکھ کر فوراً "طے کر دیں۔

اس سلسلے میں اس نے سارا سے بھی بات کی تھی اور اسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ نوید سے جلد پاکستان واپسی کے سلسلے میں بات کرے کیونکہ وہ عابدہ بیگم کو مزید پریشان نہیں دیکھ سکتا۔ اور سارا نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد از جلد نوید کی پاکستان واپسی کے لیے اس پر دباؤ ڈالے گی۔

✻ ✻ ✻

اس روز خلاف معمول طبیعت ناساز ہونے کی بنا پر وہ دوپہر میں گھر آ گیا تھا۔ اور خاصا حیران ہوا تھا۔ کیونکہ بھرے گھر میں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بیرونی دروازہ بھی بند نہیں تھا۔

عائزہ اور فرزانہ تو اسکول کالج گئی ہوئی تھیں۔ یہ اسے معلوم تھا۔ مگر فائزہ، سارا اور عابدہ بیگم کی غیر موجودگی اسے ضرور حیران کر رہی تھی۔ اسی حیران کن الجھن میں مبتلا وہ آگے بڑھ رہا تھا جب اچانک فائزہ کو اپنے کمرے کی صفائی کرتے دیکھ کر رک گیا۔ ہر روز صبح جانے سے قبل افراتفری میں وہ کافی پھیلاوا بکھیرتا تھا، مگر روز رات میں اسے اپنا کمرا نئے سرے سے سجا سنوار ملتا تھا۔

وہ حیران ہوتا تھا کہ سارا اس سے دلی وابستگی نہ ہونے کے باوجود اس کا کتنا خیال رکھتی ہے۔ مگر یہ انکشاف بھی ابھی ہوا تھا کہ اس کا اتنا خیال رکھنے والی سارا حسیب نہیں، بلکہ فائزہ حسیب تھی، جو چپ چاپ بنا کسی صلے اور تمنا کے اس کی خدمت کر رہی تھی۔

جاذب کو تلے ہوئے پکوان پسند تھے۔ جب بھی بارش برستی تھی وہ سارا سے پکوڑوں اور چپس وغیرہ کی فرمائش کرتا تھا مگر عموماً" وہ اس کی فرمائش ٹال دیا کرتی تھی۔ جبکہ فائزہ بنا کہے کچھ ہی دیر میں پکوڑوں اور چپس کے ساتھ ساتھ جانے اور کیا کیا بنا لاتی تھی۔

اس وقت بھی وہ اپنے دھنک رنگ آنچل سے اس کی تصویر صاف کرتے ہوئے بے آواز رو رہی تھی۔ اور وہ دروازے کی چوکھٹ پکڑے کھڑا اس وقت ششدر رہ گیا تھا، جب تصویر صاف کرنے کے بعد اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے اچانک اپنے لب اس کی سادہ سی تصویر پر رکھ دیے۔

اس ایک لمحے میں اس پر یہ راز کھلا تھا کہ اس رات جب وہ تیز بخار میں پھنک رہا تھا تو اس پر دم کر کے اپنی محبت لٹانے والی وہ مسیحا لڑکی کون تھی۔؟

وہ چہرہ جو سارا حسیب کو بدصورت لگتا تھا اسی چہرے کی وہ لڑکی پرستش کر رہی تھی جو خود حسن اور سلیقے میں بے مثال تھی۔

وہ تیزی سے واپس پلٹا تھا اور برابر کے کمرے میں آ کر عابدہ بیگم کے بستر پر ڈھے گیا تھا۔

محبت کا جو رنگ ابھی ابھی اس پر منکشف ہوا تھا، وہ کتنا مختلف تھا؟

کیسی محبت تھی اس کم گو لڑکی کی، جس میں کوئی غرض، کوئی مفاد، کوئی صلہ پوشیدہ نہیں تھا، یہاں تک دل کی چوری پکڑے جانے کے خوف سے وہ کبھی اس کے سامنے اپنی نگاہیں بھی نہیں اٹھاتی تھی۔

اس کی دھڑکنیں طوفان اٹھا رہی تھیں۔

وہ رونا چاہتا تھا۔ اپنے غلط انتخاب پر، اپنے سچے جذبوں کی بے قدری پر۔ مگر آنکھیں تو جیسے پتھرا کر ہو گئی تھیں۔

مرد کے لیے رد کیے جانے کا دکھ بہت بڑا اور ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ وہ بھی پل پل اپنی تحقیر پر کڑھتا رہتا تھا۔ مگر آج۔ اس لمحے وہ تکلیف، تکلیف کی وہ شدت پہلے سی نہیں رہی تھی۔ اس کے اندر چاہے جانے پر ایک انوکھا سا احساس جاگا تھا اور یہی احساس اسے پھر سے زندہ ہونے کا پتہ دے رہا تھا ورنہ پچھلے دو تین سالوں میں خود کو بے دردی سے تباہ کرنے میں اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

چہرہ کیسا بے رونق ہو گیا تھا، آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے، مسلسل محنت کی وجہ سے ہاتھ الگ کھردرے ہو گئے تھے۔ صحت بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔ زندہ رہنے کا جیسے مقصد ہی ختم ہو گیا تھا۔ مگر آج اس لمحے روح کے کسی کونے میں تھکی ماندی زندگی نے پھر سے کروٹ لی تھی۔ فائزہ اس کا کمرا صاف کر کے عابدہ بیگم کے کمرے کی طرف آئی تو اسے بستر پر لیٹے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

"آپ۔۔۔ آپ کب آئے۔؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے، طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کام بھی نہیں ہو رہا تھا اسی لیے گھر چلا آیا، سارا اور پھوپھو کہاں ہیں۔۔؟"

آج اس نے پہلی بار بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ بے شک وہ بے مثال لڑکی تھی۔ مگر اس کے باوجود کبھی سارا کی جگہ نہیں لے سکی تھی۔

"امی سارا کے ساتھ بازار گئی ہیں۔ کچھ چیزیں لانی تھیں۔ نوید بھائی پاکستان آ گئے ہیں ناں، اس لیے۔"

نظریں بدستور جھکائے اس نے ہمیشہ کی طرح بہت سادہ لہجے میں جواب دیا تھا۔ تاہم جاذب کے اندر جیسے پھر سے بے چینی دوڑ گئی۔

"او کے، پلیز۔ ایک کپ چائے بنا دو، میرا سر بہت درد کر رہا ہے۔"

سخت لہجہ بدلتے ہوئے وہ آنکھوں پر بازو رکھ کر سو تا بن گیا تو فائزہ بھی فوراً" پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ اس کا دکھ سمجھتی تھی۔

سارا سے اس کی والہانہ محبت بھی اس سے پوشیدہ نہیں تھی، مگر اس کے باوجود وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس موضوع پر جتنی بار بھی اس نے سارا سے بات کر کے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی، اس نے اسے بری طرح لتاڑ کر رکھ دیا تھا۔ ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دے دیا تھا کہ اگر اسے جاذب کا اتنا ہی خیال ہے اور دل میں اس کے لیے اتنی ہی ہمدردی ہے تو وہ خود اس سے شادی کر لے، کم از کم وہ تو مزید غربت کی چکی میں پسنے کی خواہش نہیں رکھتی۔

اور اس کے مشورے پر وہ محض حسرت سے آہ ہی بھر سکی تھی۔ کیونکہ جاذب کی نگاہ میں مقام پانا اس کے اپنے اختیار میں نہیں تھا۔

سارا تو نوید کی پاکستان آمد پر بے تحاشا خوش تھی۔ اس کا غرور بھی دیکھنے کے لائق تھا، یوں اتراتی پھرتی تھی جیسے ہواؤں پر حکمرانی کا راج مل گیا ہو۔ جاذب کے ساتھ ساتھ اب اپنے گھر والوں کے ساتھ بھی اس کا رویہ کافی تبدیل ہو گیا تھا۔ بے وجہ سب پر رعب جمانے لگی تھی۔

جاذب اس کے خوشی سے دمکتے چہرے کو بہت حسرت زدہ سی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

جانے اس شخص میں کیا خوبی تھی۔ جو وہ اس کی محبتوں کے خزانے کو ٹھوکر مار کر اس شخص کے لیے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

اس کا دکھ پھر سے بڑھ گیا تھا۔ خود کو ہزار حیلوں سے بہلانے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہو رہی تھی۔

رقابت کی جلن اسے کسی پل چین لینے نہیں دے رہی تھی۔

اب اس نے اور بھی تیزی سے اپنے باہر جانے کی کوششیں تیز کر دی تھیں۔

☼ ☼ ☼

نوید اور اس کے گھر والے آئے تھے۔ سارا نے خود کو یوں شوق سے سجایا سنوارا تھا کہ کوئی کمی نہ رہنے دی تھی۔ شاید اسے خدشہ تھا کہ کہیں کسی معمولی سی کمی کے باعث وہ مسترد نہ کر دی جائے۔ مگر دل کو اپنی جگہ نوید کی وفاؤں پر یقین بھی تھا۔ جاذب نے اس موقع پر صرف اس کی خوشی کے لیے نہ صرف عابدہ بیگم کے سامنے انجانے نوید کی تعریفوں کے پل باندھے تھے، بلکہ بجٹ کی پروا کیے بغیر لوازمات کے ڈھیر لگا دیے تھے۔ وہ اسے کسی بھی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

عابدہ بیگم نے اس بار یہ ہوشیاری کی تھی کہ فائزہ اور عائزہ کو مہمانوں کے قریب پھٹکنے بھی نہیں دیا تھا۔ ان کی خاطر مدارت کے فرائض بھی انہوں نے خود ہی جاذب کے ساتھ مل کر سرانجام دیے تھے۔ فائزہ اور عائزہ مہمانوں کے جانے تک اوپر چھت پر بیٹھی رہی تھیں۔

خدا خدا کر کے یہ بیل منڈھے چڑھی تو اس کا رشتہ طے ہو گیا۔

اپنا من پسند ہم سفر مل جانے کی خوشی میں وہ دنیا کے ساتھ ساتھ دین سے بھی یکسر غافل ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے دن میں عابدہ بیگم کے ڈانٹنے پر وہ چار نمازیں پڑھ لیتی تھی۔ اب ان کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ ہمہ وقت وہ ہوتی اور اس کا موبائل فون، جو نوید نے اسے منگنی کے تحفے کے طور پر خرید کر دیا تھا۔

جاذب کی صحت تیزی سے گرتی جا رہی تھی۔ رات میں دیر تک جاگنے کے ساتھ اب اس نے اسموکنگ بھی شروع کر دی تھی۔

اس روز شام میں وہ گھر واپس آتے ہوئے اپنے دوست سے ویزے کے بارے میں بات کر رہا تھا جب اچانک اس کا بائیک سامنے سے آتی گاڑی کے ساتھ ٹکرا گیا۔ اور خود کو لاکھ سنبھالنے کی کوشش کے باوجود، گہری چوٹ لگوا بیٹھا۔

اس کا دوست جس کے ساتھ وہ گھر واپس آ رہا تھا فوری طور پر اسے ہاسپٹل لے گیا۔ جہاں اس کی ٹانگ پر پلستر چڑھا، پیشانی پر ٹانکے لگے اور کہنی کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کو عارضی طور پر جوڑ کر اس کی مرہم پٹی کی گئی۔ وہ اڑھائی گھنٹے وہاں رکنے کے بعد، جس وقت وہ اپنے دوست کے ساتھ، اس کا سہارا لے کر گھر کی دہلیز پر قدم رکھا۔ صحن میں کھڑی فائزہ کے ہاتھ سے آٹے کا تسلہ چھوٹ کر زمین پر آ گرا۔

عابدہ بیگم کی نگاہ جوں ہی اس کی طرف اٹھی، وہ دل پر ہاتھ رکھ کر فوراً اس کی طرف لپکی، عائزہ اور فترا بھی پریشانی سے اس کی طرف بڑھی تھیں۔ مگر وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑی رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے وجود میں چلنے کی سکت بھی نہ رہی ہو۔

جاذب نے ایک مرتبہ پھر اس کے چہرے سے نگاہ چرائی تھی۔

رات میں جب وہ سب کو اپنے حادثے کی تفصیل بتا کر مطمئن کر چکا، تو بظاہر اس کے لیے متفکر سارا نے قدرے ناراضی سے کہا تھا۔

"تم حد سے زیادہ لاپروا ہوتے جا رہے ہو جاذی، بندہ روڈ پر تو دیکھ بھال کر چلے۔ ابھی اگلے ہفتہ پھر نوید کے گھر والے آ رہے ہیں، اب ان کی خاطر مدارت کون کرے گا۔ تم تو پندرہ بیس روز سے پہلے چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے، کتنی شرمندگی ہو گی اب ان کے سامنے۔"

وہ خود غرض لڑکی اب بھی صرف اپنے لیے سوچ رہی تھی۔

کمرے میں عابدہ بیگم نہیں تھیں، صرف وہ، سارا،

فائزہ اور فترا تھیں۔ عائزہ اس کے لیے کچن میں کچھ بنا رہی تھی جبکہ عابدہ بیگم اس حادثے کے بعد اس کی سلامتی پر شکرانے کے نوافل ادا کر رہی تھیں۔

فائزہ نے سارہ کے الفاظ پر کچھ کہنے کے لیے لب کھولنا چاہے تھے۔ مگر اس سے پہلے ہی وہ بول اٹھا تھا۔

"تم فکر نہ کرو سارا! وہ لوگ آئیں گے تو سارا انتظام ہو جائے گا، تمہیں ان کے سامنے شرمندگی نہیں اٹھانی پڑے گی اور نہ ہی میں اپنی زندگی میں ایسا کوئی موقع آنے دوں گا جب میری وجہ سے تمہیں کوئی پریشانی اٹھانا پڑے۔"

اس بار اس کے الفاظ پر جہاں سارا احساس تفاخر سے مسکرائی تھی۔ وہیں فائزہ چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

اس کے زخم کافی شدید تھے۔ اوپر سے سردی کے باعث ان زخموں سے اٹھتی ٹیسوں نے اسے مزید کمزور کر دیا تھا۔ بہت کوشش کے باوجود وہ خود کو کراہنے سے باز نہیں رکھ سکا تھا۔ تب ہی اس نے اپنے قریب فائزہ کی گھبرائی ہوئی آواز سنی تھی۔

"جاذب! کیا آپ کو بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔؟"

"ہاں" وہ بے بسی سے اعتراف کر گیا تھا۔ فائزہ کی دلی تکلیف مزید بڑھ گئی۔

"میں.... میں کچھ کروں؟"

ستے چہرے کے ساتھ، خوبصورت آنکھوں کو بے دردی سے رگڑتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

"تم کیا کر سکتی ہو؟"

"نہیں۔ میں کوئلے دہکا کر لاتی ہوں، سنکائی کروں گی۔ تو درد میں شدت نہیں رہے گی۔"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں ہے، پھوپھو جاگ گئیں تو رات بھر بے آرام رہیں گی۔ تم سو جاؤ جا کر۔"

"مجھے نیند نہیں آ رہی۔"

"سارا کہاں ہے، سو گئی ہے کیا۔؟"

"پتہ نہیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے تو نوید بھائی سے بات کر رہی تھی، میں نماز سے فارغ ہوئی تو وہ بستر میں جا چکی تھی۔"

سادگی سے دھیمے لہجے میں جواب دیتے ہوئے اس نے بدستور گردن جھکائے رکھی تھی۔

"ٹھیک ہے تم بھی سو جاؤ، مجھ پر بھی دوا اثر کر رہی ہے۔ میں بھی تھوڑی دیر میں سو جاؤں گا۔"

اس نے اسے وہاں سے رخصت کرنا چاہا تھا، مگر وہ ایسا کوئی ارادہ ظاہر نہ کرتے ہوئے بولی۔

"ایک بات کہوں۔ آپ مان جائیں گے نا۔"

"کہو۔"

حقیقی معنوں میں وہ اب اس کی توجہ سے چڑنے لگا تھا۔

"آپ کام کے لیے باہر مت جائیں۔ آپ کے سوا یہاں گھر میں اور کون ہے جس سے تحفظ کا احساس ہو۔" کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی تھی یہ بات وہ جانے پچھلے کتنے دنوں سے کہنا چاہ رہی تھی۔ مگر ہمت ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

جاذب نے قدرے چونک اس کی طرف دیکھا۔ پھر بے بسی سے بولا۔

"مجھے اس بات کا احساس ہے فائزہ! مگر باہر جانا میری مجبوری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر میں تم سب لوگوں کو زندگی کی حقیقی خوشیاں نہیں دے سکتا۔"

"ٹھیک ہے، لیکن ہماری خوشیوں کے لیے کیا آپ خود کو مٹا دیں گے۔ اپنی پروا نہیں کریں گے۔ امی آپ کے لیے ہر لمحہ پریشان رہتی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ سارا کے ساتھ آپ کی شادی کا فریضہ بھی انجام پا جائے کیونکہ آپ کی عمر بھی تو تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے۔"

وہ ان کے الفاظ پر مسکرایا تھا۔

دھیمے لہجے میں گردن جھکائے ہنستی جانے کیوں اس لمحے وہ اسے بے حد اچھی لگی تھی۔

"اچھا.... لیکن مجھے تو اپنی بڑھتی عمر کا احساس نہیں رہا۔"

"کیسے رہ سکتا ہے، خود پر توجہ دیں تو احساس رہے گا نا۔"

صرف ایک لمحے کے لیے نظریں اٹھا کر اس نے پھر

جھکائی تھیں۔ بچرو کو دے مسکرا دیا تھا۔

"مت اتنی اہمیت دیا کرو مجھے میں اس قابل نہیں ہوں ابی۔"

وہ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پایا تھا۔ کہا تھا تو محض اتنا۔

"میری فکر نہ کیا کر فائزہ! سارا کے ساتھ ساتھ تمہارے اور عائزہ کے فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد میں اپنے لیے سوچوں گا تب تک شاید کوئی مسیحا لڑکی مل جائے۔"

وہ دیکھ سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں کی سطح تیزی سے نم ہوگئی تھی۔

"مجھے شادی نہیں کرنی کبھی بھی نہیں۔"

وہ بھرائے لہجے میں کہتی وہ فوراً اٹھ کر اس کے کمرے سے باہر نکل گئی تو جاذب محض سرد آہ بھر کر رہ گیا۔

مجھ کو معصوم سی لڑکی پہ ترس آتا ہے
اس کو دیکھو تو محبت میں مگن کیسی ہے؟

اس بار نوید صدیقی کے گھر والے آئے تو سب نے مل کر ان کی خاطر مدارت کی تھی۔

عائزہ، فائزہ اور فرح بھی نوید کو بھرپور پروٹوکول دینے کی کوشش میں بہت دیر تک اس سے ہنسی مذاق کرتی رہی تھیں۔

"ماشاء اللہ، آپ کی یہ دونوں بیٹیاں تو بہت خوبصورت ہیں۔ پچھلے اتوار گھر میں نہیں تھیں اس لیے دیکھ نہ سکے ورنہ شاید ہمارا فیصلہ کچھ اور ہوتا۔"

نوید کی بڑی بہن نے فائزہ اور عائزہ کو بھرپور ستائشی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تو سارا کے ساتھ ساتھ عابدہ بیگم کے چہرے پر بھی تاریک سا سایہ لہرا گیا۔

نوید اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا تھا جبکہ کمرے کی دہلیز سے ٹیک لگائے کھڑے جاذب کے لبوں پر دکھی سی مسکان بکھر کر رہ گئی۔

بھری محفل میں سارا کی یہ توہین اسے قطعی گوارا نہ ہوسکی تھی۔

☼ ☼ ☼

ان دنوں فائزہ کے لیے بھی ایک بہت اچھا رشتہ آیا تھا۔ لڑکا ملٹی نیشنل کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ گھر میں صرف ایک بوڑھی ماں اور بہن تھی۔ بڑی بہن جس کی شادی ہوچکی تھی اسی نے فائزہ کو اس کی دوست کے گھر دیکھ کر اپنے بھائی کے لیے یہ رشتہ ڈالا تھا۔

عابدہ بیگم کے پاؤں تو خوشی سے زمین پر نہیں لگ رہے تھے۔ اللہ نے کتنی جلدی ان کی سن لی تھی۔ ان کے ہونٹ اللہ کی پاک ذات کا شکر ادا کرتے نہ تھک رہے تھے۔ مگر فائزہ مسلسل رو رہی تھی۔

اس کو نہ لڑکے کی اچھی پوسٹ سے دلچسپی تھی نہ اس کے اعلیٰ گھرانے سے۔ اس کا ایک ہی راگ تھا۔

"مجھے شادی نہیں کرنی کسی سے بھی نہیں۔"

جاذب اس کے انکار کی وجہ جانتا تھا اسی لیے اسے سمجھانا چاہتا تھا۔

اپنی حیثیت، کام اور شکل صورت کے معاملے میں اب بہت زیادہ احساس کمتری اس کے اندر در آئی تھی۔ وہ اس کانچ سی نازک حساس لڑکی کو کوئی دکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔ اسی لیے اب تک لب سی رکھے تھے ورنہ وہ اس کی محبت کی شدتوں سے بے خبر نہیں تھا۔

اس کے باہر جانے کی تیاریاں بھی شروع ہوگئی تھیں۔ گھر کا ماحول عجیب سا بنا ہوا تھا۔

عابدہ بیگم اتنے اچھے رشتے سے فائزہ کے انکار کو قطعی نہیں سمجھ پارہی تھیں۔ اسی لیے پریشان تھیں۔ جاذب اس روز رات میں ذرا جلدی گھر آگیا تھا۔ ارادہ فائزہ سے بات کرکے اسے سمجھانے کا تھا۔ اسی غرض سے عابدہ بیگم سے سلام دعا کرنے کے بعد وہ فائزہ کے کمرے کی طرف آیا تو سارا کی کمرے میں موجودگی نے اس کے قدم وہیں دہلیز سے باہر روک لیے۔

غالباً" نہیں یقیناً" اندر اسی کے بارے میں بات ہو رہی تھی۔

"پاگل پن کا مظاہرہ مت کرو فائزہ! خوب اچھی

طرح سمجھتی ہوں کہ تم اتنے اچھے رشتے سے انکار کیوں کررہی ہو۔ مگر کان کھول کر سن لو۔ آج کل محبت کسی کو آسودگی نہیں دیتی۔ آج کل ہر طرف صرف پیسے کی قدر ہے' جس بندے کے پاس پیسہ ہو' صرف وہی زندگی کے حقیقی رنگوں کا لطف اٹھا سکتا ہے۔ ورنہ ہم مڈل کلاس گھرانوں کی لڑکیاں ساری زندگی دو جمع دو کرتی لاتعداد مسائل کا شکار ہو کر مرجاتی ہیں۔ قسمت سے اگر تمہیں راج کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ تو کیوں فضول حماقت کا مظاہرہ کررہی ہو' وہ جاذب کا بچہ کچھ نہیں دینے والا تمہیں۔ اچھی خوراک اور لباس بھی نہیں۔"

"مجھے اچھی خوراک اور لباس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتی کہ وہ مجھ پر اپنی محبتیں لٹائے' کچھ نہیں مانگتی سوائے اس چیز کے کہ وہ میرے پاس میری آنکھوں کے سامنے رہے کیونکہ میں اسے دیکھے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ سوائے اس کے میرے لیے زندگی کا کوئی مقصد کوئی حسن نہیں۔"

جاذب کو لگا اس لڑکی نے محض ایک لمحے میں اس کا کھوکھلا پن پاش پاش کرکے رکھ دیا ہو۔

"تم پاگل ہوگئی ہو' تمہیں کچھ بھی سمجھانا نری حماقت ہے۔ شاید تم جانتی نہیں ہو کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ اس کے پاس تمہیں دینے کے لیے کچھ اچھے جملے' کچھ خواب بھی نہیں ہیں۔"

سارا تلملاتی ہوئی لگ رہی تھی مگر فائزہ مسلسل رو رہی تھی۔

"میں خوابوں میں نہیں جیتی' وہ حقیقت میں میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور میں اس حقیقت کو خواب بنانا نہیں چاہتی' وہ میرا آئیڈیل ہے سارا! میں اسے اپنے اندر سے نکال کر کسی اور مرد کو اس کی جگہ نہیں دے سکتی۔ وہ جیسا بھی ہے' میرے لیے کل کائنات ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر رہو اسی چار مرلے کے مکان میں ساری عمر نوکرانی بن کر۔ کرو اس کی خدمتیں چھوٹی چھوٹی آسائشوں کو ترستے ترستے مرجانا۔ تم جیسی عشق سے پیدل لڑکیوں کی زندگی کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔" اس نے تنفر سے کہا

"وہ مجھے اپنی خدمت کی اجازت تو دے سارا! میں ساری زندگی چپ چاپ اس کے قدموں میں بسر کرلوں گی۔ کبھی کسی کو الزام نہیں دوں گی۔"

"ہاں' ابھی عشق کا بھوت سوار ہے نا دماغ پر' اس لیے ایسی باتیں کررہی ہو۔ کل کو مجھے عیش کرتے ہوئے دیکھو گی تو ٹھنڈی آہیں بھرو گی مگر افسوس تمہیں کوئی نوید نہیں ملے گا۔"

اس کا لہجہ غرور سے پر تھا۔ جاذب کے لیے مزید وہاں کھڑے رہنا دشوار ہوگیا۔ اندر سینے میں جیسے بہت سارا دھواں بھر گیا تھا۔

ایک ہی گھر میں پلنے والی دو بہنوں کی رائے اور سوچ اس کے بارے میں کتنی مختلف تھی۔

وہ لڑکی جسے اس نے دل کی گہرائیوں سے ٹوٹ کر چاہا تھا جسے بے تحاشا محبت اور عزت دی تھی' وہ اسے کتنا بے مول کر گئی تھی اور وہ لڑکی جسے آج تک کبھی اس نے نگاہ بھر کر دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی' وہ اسے انسان سے دیوتا بنا کر انمول کردی گئی۔

اسے اپنی بے بسی پر رونا آرہا تھا۔ کوئی ایسی جگہ دکھائی نہیں دے رہی تھی' جہاں وہ اپنا شکستہ وجود گھسیٹ کرلے جاتا۔

اس رات وہ بے چینی سے بستر پر پہلو بدل رہا تھا' جب اس نے ایک مرتبہ پھر فائزہ کو اپنے روم میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کے کمرے کی لائٹ چونکہ جل رہی تھی اور وہ اضطراب سے پاؤں بھی ہلا رہا تھا لہٰذا فائزہ کی آمد پر پھر سے حیران ہوتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

وہ اب بھی رو رہی تھی۔

"تم۔۔۔ یہاں۔۔۔؟"

"ہاں' مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔" چہرے کے ساتھ ساتھ اس کی آواز بھی بھیگی ہوئی تھی۔

"ہاں' کہو۔ میں سن رہا ہوں۔"

اسے پھر اس پر غصہ آیا تھا مگر وہ اس کے غصے سے بے نیاز نم لہجے میں بولی۔

"مجھے شادی نہیں کرنی۔ آپ پلیز امی کو سمجھا لیں۔ وہ آپ کی کوئی بات نہیں ٹالتیں۔ میں۔۔۔ میں ہمیشہ ان کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ ان کا بیٹا بن کر۔"

"ان کا بیٹا میں ہوں' تم حماقت کا مظاہرہ مت کرو۔ آج کل کے دور میں اچھے رشتے ملنا بہت زیادہ مشکل ہوگئے ہیں پھر کیوں کفران نعمت کررہی ہو تم؟"

وہ نرم پڑ گیا تھا۔ جواب میں پہلی بار فائزہ نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور جاذب' کہیں اس کی ایک نظر کے سوال سے ہار گیا۔

اگلے چند روز میں جانے اس نے عابدہ بیگم سے کیسے بات کی کہ وہ اس کی جگہ عائزہ کی بات پکی کر آئیں۔ لڑکے والوں کو وہ دونوں ہی پسند تھیں لہٰذا یہ معاملہ خوش اسلوبی سے نپٹ گیا۔

فائزہ اتنی خوش تھی کہ جاذب کا شکریہ ادا کرتی نہ تھک رہی تھی۔ عائزہ بھی شرمائی شرمائی سی رہنے لگ گئی تھی۔

پچھلے دنوں نوید کسی ایمرجنسی کے سلسلے میں دوبارہ سعودیہ چلا گیا تھا۔ جاذب کا ٹکٹ بھی سعودی عرب کے لیے کنفرم ہوچکا تھا۔ لہٰذا وہ بھی اپنے دوست کے ساتھ ان سب کو اللہ کی امان میں چھوڑ کر سعودی عرب چلا گیا۔

دو سال کیسے گزر گئے' کچھ خبر نہ ہوسکی۔

ملک میں عید کا تہوار آرہا تھا اور جاذب کی خواہش تھی کہ دو سال کے بعد وہ یہ تہوار اپنے گھر والوں کے ساتھ سیلیبریٹ کرے۔ سو چپ چاپ سرپرائز دینے کے چکر میں بنا خبر کیے پاکستان چلا آیا۔ اپنے گھر کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کو کپکپائے تھے۔

دروازہ چھوٹی فروا نے کھولا تھا اور وہ اسے غیر متوقع طور پر اپنے سامنے پاکر بے ساختہ چلاتے ہوئے اس کے ساتھ لپٹ گئی۔

وہ گھر میں داخل ہوا تو عابدہ بیگم' سارا اور عائزہ اپنے اپنے کاموں میں مشغول' اسے اچانک سامنے پاکر حیران رہ گئیں۔ عابدہ بیگم تو رو ہی پڑی تھیں۔ اس کی اپنی آنکھیں بھی لمحہ بھر کو نم ہوگئی تھیں۔ پورے دو سال کے بعد اسے وہ آغوش ملی تھی جس میں سر رکھ کر وہ ہر فکر اور پریشانی سے بے نیاز ہوجاتا تھا۔

بھائیں بھائیں کرتے گھر میں ایک دم سے جیسے رونق اتر آئی تھی۔

"پھپھو! فائزہ دکھائی نہیں دے رہی۔ کہیں گئی ہے کیا؟"

باتوں کے دوران اچانک اسے خیال آیا تو اس نے پوچھ لیا۔ تب ہی انہوں نے بتایا۔

"نہیں بیٹے! اندر اپنے کمرے میں ہے۔ پتا نہیں کیا ہوگیا ہے اس لڑکی کو۔ کبھی ٹھیک ہی نہیں رہتی۔ پچھلے ماہ ٹائیفائیڈ ہوگیا تھا' ابھی تک بستر سے اٹھ نہیں سکی۔"

عابدہ بیگم کی اطلاع پر اس کے دل کو جیسے کچھ ہوا تھا۔

"او خدا۔ آپ نے بتایا کیوں نہیں مجھے۔"

"کیا بتاتی بیٹا! پردیس میں تجھے پریشان بھی کرتی تو کیا فائدہ' تم آتو نہیں سکتے تھے۔"

"مگر پھر بھی آپ کو مجھے خبر کرنا چاہیے تھا۔" الجھے لہجے میں کہتا وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں ایک نظر اس کو دیکھ کر آتا ہوں۔"

دھیمے لہجے میں کہتا وہ فوراً اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اس پر نظر پڑی تو ٹھٹک گیا' ٹھٹک گیا۔ یہ وہ فائزہ تو نہیں تھی جسے دو سال قبل وہ چھوڑ کر گیا تھا۔

"فائزہ۔۔۔"

وہیں اس کے بستر کے قریب سمٹ کر بیٹھتے ہوئے جانے کس جذبے سے اس نے پکارا تھا کہ فائزہ نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ کچھ لمحے وہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھتی رہی تھی پھر یک لخت ہی آنکھیں آنسوؤں سے دھندلا گئیں۔

"آپ آگئے؟" اس نے یوں پوچھا تھا جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ جاذب کا دل مچل کر رہ گیا۔

"تم کبھی نہیں سدھر سکتیں۔"

رخ پھیرتے ہوئے وہ دھیمے لہجے میں بڑبڑایا پھر کچھ دیر خاموشی سے اس کے سراپے کا جائزہ لینے کے بعد اٹھ کر باہر آگیا۔

عابدہ بیگم عید کے "فوراً" بعد سارا اور عائزہ کا بیاہ کر دینے کا فیصلہ کیے بیٹھی تھیں اور جاذب اس معاملے میں ان سے پورا پورا متفق تھا کیونکہ پچھلے دو سالوں میں اس نے بہت کچھ کما لیا تھا۔ تاہم نوید کے گھر والے ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ سارا اسی لیے آج کل پریشان رہنے لگی تھی کیونکہ نوید سے اس کا رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس روز بڑی مشکل سے وہ اس سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

"نوید! مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ پانچ سال ہو گئے ہیں ہماری محبت کو۔ دو سال ہو گئے منگنی ہوئے اور تمہارے گھر والے ابھی تک سنجیدہ نہیں ہیں۔ مسئلہ کیا ہے؟ کہیں تمہارا فیصلہ بدل تو نہیں گیا۔"

اسے غصہ بھی آرہا تھا اور رونے کو بھی دل چاہ رہا تھا۔ نوید نے بڑے تحمل سے اس کی بات سنی تھی۔

"سارا! میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ دراصل گھر والوں کی تو پہلے ہی مرضی نہیں تھی۔ میرے مجبور کرنے پر وہ بددلی کے ساتھ راضی ہو گئے تھے مگر جب عائزہ اور فائزہ کو دیکھا تو ان کو احساس ہوا تمہاری عمر زیادہ ہے۔ میں نے ان کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کسی طور اس رشتہ پر راضی نہیں۔ میں خود تم سے اس سلسلے میں بات کرنے والا تھا۔ تم بہت اچھی ہو سارا! یقیناً تمہیں مجھ سے بہتر لڑکا مل جائے گا۔ پلیز مجھے معاف کر دینا' میں اپنی امی کا دل نہیں دکھا سکتا۔ انہیں اپنے بیٹے کے لیے دوسری تمام ماؤں کی طرح خوبصورت' کم عمر لڑکی چاہیے۔ صرف میری ضد اور فرمائش پر انہوں نے تمہیں پسند کیا تھا مگر اب فائزہ اور عائزہ کو دیکھنے کے بعد وہ میری نہیں سن رہی ہیں۔ تم میری پوزیشن سمجھ رہی ہو نا سارا!"

بڑی تفصیل سے مکمل صورت حال اس پر واضح کرنے کے بعد وہ پوچھ رہا تھا۔ جواب میں سارا نے چپ چاپ ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔ اس کے پاس رونے کے لیے آنسو بھی نہیں تھے۔

وہ بھی اس کہاوت کو سمجھ ہی نہیں پائی تھی کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں سجتا۔ جاگتی آنکھوں سے دیکھے گئے خوابوں کی تعبیر صرف دکھ کی صورت میں ملتی ہے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس صورت حال میں نوید سے کیا کہے اور اپنے گھر والوں کو کیا بتائے؟ پچھلے چار سالوں سے جن خوابوں نے اسے پاگل کر رکھا تھا۔ یک لخت ان خوابوں کے ٹوٹ جانے پر وہ آنسو بہائے یا شرمندگی سے منہ چھپائے؟

نوید نے یہ کیسی بے وفائی کی مار ماری تھی کہ وہ اندر سے ٹوٹنے کے باوجود احتجاج نہیں کر سکتی تھی۔

اپنی انا اور خودداری کا پرچم بلند رکھنے کے لیے اسے دو چار کھری کھری بھی نہیں سنا سکی تھی۔

دو چار روز رو دھو کر اپنی بے قدری کا ماتم کرنے کے بعد بالآخر اس نے خود کو سنبھال لیا کیونکہ ابھی جاذب اس کے ہاتھ میں تھا۔ پچھلے دو سال میں جہاں اس کی شخصیت مزید نکھری تھی' وہیں اب وہ ٹھیک ٹھاک کمانے بھی لگا تھا۔ سعودیہ سے آتے ہوئے وہ فائزہ کے علاوہ ان سب بہنوں کے لیے بہت اچھے اچھے قیمتی تحائف بھی لے کر آیا تھا۔

جاذب کا سوچ کر ہی اس نے نوید کی کمینگی بھلانے میں زیادہ وقت نہیں لگایا تھا۔ اس روز سب لوگ فائزہ کے کمرے میں اس کے پاس بیٹھے تھے۔ جب باتوں کے دوران اچانک اس نے عابدہ بیگم سے کہا۔

"امی۔۔۔ میں نوید سے شادی نہیں کروں گی۔"

اس کے الفاظ پر جہاں عابدہ بیگم کو شاک لگا تھا' وہیں باقی سب لوگ بھی چونک اٹھے تھے۔

"کیوں' کیا ہو گیا ہے نوید کو؟"

عابدہ بیگم کے بجائے جاذب نے پوچھا۔

"اسے کیا ہونا ہے' ایسے ذلیلوں کو کچھ نہیں ہوتا۔" وہ نخوت سے ناک چڑھا کر بولی۔

"مگر بات کیا ہوئی ہے' یہ ایک دم سے نفرت کیسے ہو گئی؟"

عابدہ بیگم پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھیں نوید کے گھر والوں کی ٹال مٹول سے ان کا ماتھا تو پہلے ہی ٹھنکا تھا۔

"وہ ہے ہی نفرت کے قابل امی! اس ذلیل نے ناروے میں پہلے سے شادی کر رکھی ہے۔ دو تین بچے بھی ہیں اس کے' اسی لیے اس کے گھر والے ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے' پتہ تھا اپنے بیٹے کے کرتوتوں کا۔ میری اسکول کی ایک دوست اس کی رشتہ دار ہے۔ ابھی پرسوں اس نے مجھے نوید کی اصلیت بتائی ہے۔ آپ خود ہی بتائیں امی! یہ سب جاننے کے بعد میں اس سے کیسے شادی کر سکتی ہوں؟"

اس نے اتنی ہوشیاری اور فراٹے سے جھوٹ بولا تھا کہ عابدہ بیگم کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی اس کے کہنے پر ایمان لے آئے۔ عابدہ بیگم کے چہرے کا رنگ تو دیکھنے والا تھا۔

"اتنا چار فراڈ مگر وہ تم سے محبت کرتا تھا سارا!" جاذب کے لہجے میں کیا طنز تھا مگر سارا نے کیا فرق پڑنے نہیں دیا۔

"محبت تو وہ اب بھی کرتا ہے مجھ سے بلکہ جب سے مجھے اس کی اصلیت کا علم ہوا ہے اور میں نے اسے کھری کھری سنائی ہیں' تب سے ہر وقت کال کر کے معافی مانگتا رہتا ہے۔ علیحدہ گھر' بینک بیلنس سب کا وعدہ کیا ہے اس نے مگر۔۔۔ اب میرے لیے یہ چیزیں معنی نہیں رکھتیں۔۔۔ میں اپنے شوہر کی محبت تقسیم نہیں کر سکتی' نہ ہی کسی کا جھوٹا کھاتی ہوں۔ بدنصیب ہے بے چارہ جو مجھ جیسی لڑکی کو حاصل نہ کر سکا۔"

وہ اب بھی اپنی "میں" کے غرور میں مبتلا تھی اور جاذب جو اتفاق سے اس کی اور نوید کی گفتگو دوسرے سیٹ پر سن چکا تھا' اس کے کھوکھلے بھرم پر دکھ سے مسکرا دیا۔

گھر والوں کی نظروں میں اپنا وقار بحال رکھنے کے بعد اس نے نوید کو کھری کھری سنائیں اور سختی سے کہہ دیا کہ اب وہ زندگی میں کبھی اس کے گھر کا دوبارہ رخ نہ کرے۔

جو چوٹ وہ کھا چکی تھی۔ اس کا درد جلدی ختم ہونے والا نہیں تھا' تاہم وہ خود کو بہلا رہی تھی۔ سب کے ساتھ بیٹھ کر ہنستی مسکراتی' عابدہ بیگم کی دل جوئی کرتی اور جاذب کا خصوصی خیال رکھتی۔ اس کے تمام کام بھی اس نے پھر سے اپنے ذمہ لے لیے تھے۔

☆ ☆ ☆

فائزہ کی طبیعت آہستہ آہستہ بہتر ہو رہی تھی۔ جاذب کا زیادہ وقت اب اس کے کمرے میں ہی گزرتا تھا اور سارا کو یہ بات بے حد ناگوار گزرتی تھی۔ اس نے صاف لفظوں میں کئی بار اسے ٹوکا بھی تھا مگر وہ مسکرا کر کہہ دیتا۔

"فائزہ بیمار ہے سارا! اس کا خیال رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔"

جواباً وہ تلملا کر رہ جاتی۔

عائزہ کے سسرال والے اب شادی کی جلدی کر رہے تھے' اسی لیے عابدہ بیگم کی پریشانی بھی بڑھ گئی تھی کیونکہ سارا کا پہاڑ پھر سے سر پر آن گرا تھا اور فائزہ بھی مسلسل بیمار رہنے کے بعد اب وہ پہلی سی دلکشی کھو چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس روز وہ جاذب کے سامنے رو پڑی تھیں۔

"میں کیا کروں بیٹے! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ دو بڑی بیٹیوں کو چھوڑ کر تیسری کا بیاہ کیسے کروں؟"

"آپ فکر کیوں کرتی ہیں پھپھو! انشاء اللہ' اللہ بہتر کرے گا۔ آپ ایک نہیں' چار شادیاں ایک ساتھ کریں گی۔" حسب عادت ان کے ہاتھ تھامتے ہوئے اس نے تسلی دی تو وہ چونک اٹھیں۔

"چار کیسے؟"

"چار ہی ہوں گی' تین بیٹیوں کی اور ایک بیٹے کی۔"

وہ مسکرا رہا تھا۔ سارا کے دل کی دھڑکن ایک لمحے

اسا تیز ہو گئی تھی۔

"بیٹے کو کوئی لڑکی پسند آئے گی تب ہی کر سکوں گی نا۔"

وہ پھر مایوس ہوئی تھیں۔

"لڑکی تو کب سے پسند آ چکی ہے پھپھو! بس حالات سازگار نہیں تھے۔ اب ان شاءاللہ آپ کو کوئی پریشانی لاحق نہیں ہونے والی گی۔"

اس نے کچھ اس عزم سے کہا کہ عابدہ بیگم کی آنکھیں مسرت سے چمک اٹھیں۔

"خدا تیری عمر دراز کرے میرے بچے! مجھے بتا وہ لڑکی کون ہے تاکہ میں فوراً" سوال لے کر اس کے گھر جاؤں اور اسے تیرے لیے مانگ لاؤں۔"

ان کے پر مسرت چہرے پر ممتا کے سچے رنگ تھے۔ سارا وہاں سے فوراً" اٹھ کر بھاگ گئی تھی جبکہ فائزہ نے بے ساختہ دروازے کی چوکھٹ تھام کر خود کو گرنے سے بچایا تھا۔

"بتا دوں گا پھپھو! پہلے ان چڑیلوں کا معاملہ تو سیٹ ہو۔"

مسرور لہجے میں کہتا وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا پھر دروازے میں کھڑی فائزہ کی سائیڈ سے نکل کر باہر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

کبھی یہ پھول جیسی ہے کبھی یہ دھول جیسی ہے
کبھی یہ چاند جیسی ہے کبھی یہ پھول جیسی ہے
کبھی مسرور کرتی ہے
کبھی مجبور کرتی ہے
کبھی یہ روگ دیتی ہے کبھی یہ رول دیتی ہے
کبھی لے پار جاتی ہے کبھی یہ مار جاتی ہے
محبت جیت ہوتی ہے مگر یہ ہار جاتی ہے

پچھلے چند روز میں سارا پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ بھی جاذب سے محبت کرتی ہے اور اس کا اظہار فوراً" ہی جاذب سے کرنے میں اس نے کسی قسم کی تاخیر کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

"جاذی! میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں۔"

وہ چھت پر کھڑا اوپر نیلے آسمان پر اڑتے پرندوں کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا جب اس نے دبے پاؤں اس کے پیچھے آ کر کہا۔ جواب میں وہ چونک کر اس کی طرف پلٹا تھا۔

"اچھا... لیکن کیوں؟"

"اپنی بے وقوفی کی وجہ سے جاذی! میں نے نوید جیسے گھٹیا انسان کو تمہاری محبت پر ترجیح دے کر تمہارے پر خلوص احساسات کا خون کیا اور مالک دو جہاں نے مجھے اس کی سزا دے دی۔ میں نے جو نہیں سوچا تھا وہ ہو گیا مگر تم نے جو سوچا اور چاہا تھا' بالآخر ویسا ہو گیا۔ تم بہت اچھے ہو جاذی! پچھلے چند دنوں میں مجھ پر یہ بھید کھلا ہے کہ محبت کے معاملے میں تم اکیلے مسافر نہیں ہو بلکہ اس سفر میں' میں بھی تمہارے ساتھ ساتھ ہوں۔ میری سوچ بدل گئی ہے۔ میں یہ جان گئی ہوں' تمہارے جیسا پیار اور عزت مجھے دوسرا کوئی مرد نہیں دے سکتا۔"

وہ بول رہی تھی اور جاذب کے اندر جیسے چھڑے دھواں اترتا جا رہا تھا۔

"نہیں سارا! میں زندگی میں کبھی تمہیں شرمندہ نہیں دیکھ سکتا۔ تم نے جو بھی چاہا یا کیا' وہ تمہارا حق تھا۔ ہر انسان کو اپنی زندگی' اپنی پسند اور اپنے معیار کے مطابق گزارنے کا پورا پورا حق ہے۔ میں ہرگز تمہیں غلط نہیں سمجھتا' اس لیے پلیز سوری کہہ کر مجھے شرمندہ مت کرو۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا تو سارا حبیب کی پلکیں یک لخت نم ہو گئی تھیں۔

"جاذی... تم اب بھی مجھ سے محبت کرتے ہو...؟"

کیسی بچوں کی معصومیت سے اس نے پوچھا تھا۔ جب وہ مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہاں' محبت ہو جائے تو کبھی ختم نہیں ہوتی۔ بس اپنا روپ بدل لیتی ہے۔"

بہت دھیما لہجہ تھا اس کا۔ سارا کے اندر دور تک اطمینان اتر گیا۔

اسی شام وہ فائزہ کے کمرے میں آیا تو وہ بہت معصومیت سے اس سے کہہ رہی تھی۔

"آپ بہت اچھے ہیں جاذب! سچی محبت کرنے والے۔ آج کل کے دور میں ایسے مخلص انسان ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ امی بہت خوش ہیں اور سارا... وہ تو شروع سے پاگل ہے' بہت محبت کرتی ہے آپ سے۔ بس اسے سمجھ نہیں تھی۔ آپ کے ساتھ رہے گی تو یقیناً اچھی اور بری چیز میں فرق کرنا سیکھ جائے گی۔"

"اچھا... پھر اس کے بعد تم کیا کرو گی؟"

بہت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ جب وہ مسکرا کر نگاہیں چراتے ہوئے بولی۔

"میں... میں... میں جاب کرنا چاہتی ہوں میرا رزلٹ آ جائے تو..."

"جاب کے سہارے زندگی گزار لو گی؟"

اس بار اس نے بہت گہری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ جواب میں فائزہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

عین اسی لمحے سارا اور عائزہ کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔

"یار! راز و نیاز ہو رہے ہیں بھئی' کچھ ہمیں بھی تو پتہ چلے۔"

اس کی شوخیاں پھر سے لوٹ آئی تھیں۔ جاذب نے مسکرا کر نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"فائزہ سے پوچھ رہا تھا کہ ہماری شادیوں کے بعد وہ کیا کرے گی۔"

"اس نے کیا کرنا ہے' فضول میں امی کو پریشان کر رکھا ہے۔ بعد میں بھی پرابلم ہوگی' اس لیے اب کے جو رشتہ بھی آیا' میں تو امی سے کہہ کر اس کی رخصتی کا بندوبست کروا دوں گی۔ تم تو جانتے ہی ہو۔ ایک میان میں دو تلواریں بھی نہیں سما سکتیں۔"

اسے جاذب کی فائزہ کے لیے فکر ایک آنکھ نہیں بھائی تھی۔

"میں تمہیں کبھی پریشان نہیں کروں گی سارا! پرامس۔" جاذب نے دیکھا' اس کی آنکھوں میں پھر سے کرب سمٹ آیا تھا۔

"اوکے بابا! جیسا تم چاہو گی' ویسا ہی ہو گا۔ بس ٹینشن نہیں لینی۔"

فوراً" سے پیشتر اس کا ہاتھ تھام کر جاذب نے تسلی دی تو سارا ماتھے پر تیوریاں ڈالتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ عید کا تہوار بالکل قریب آ گیا تھا۔

جاذب اس بار بہت خوش تھا۔ عید کے فوراً" بعد اسے پھر سے سعودیہ واپس چلے جانا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس روز عائزہ اور فزا نے اسے شاپنگ کے لیے رضامند کیا تھا۔ چونکہ عید کی شاپنگ کرنا تھی اس لیے اس نے سارا اور فائزہ کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دے ڈالی جسے سارا نے فوراً" قبول کر لیا مگر فائزہ کے لیے کہہ دیا۔

"فائزہ گھر میں رہے گی۔ آخر امی کے پاس بھی تو کسی کو ہونا چاہیے۔ ویسے بھی اسے ان چیزوں سے دلچسپی نہیں ہے۔"

جاذب نے نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ فائزہ کا چہرہ ایک دم بجھ گیا تھا پھر بھی وہ نظریں جھکائے کہہ رہی تھی۔

"سارہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں امی کے پاس جاتی ہوں' آپ لوگ بازار ہو آئیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ویسے بھی عید میں ابھی کافی دن پڑے ہیں۔ تم بعد میں ساتھ چلی جانا۔" سرعت سے کہہ کر وہ گھر سے باہر آیا تو عائزہ کے بغیر نہ رہ سکی۔

"جاذب بھائی! پتہ نہیں کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہمارے گھر میں فائزہ آپی کے ساتھ بڑی زیادتی ہو رہی ہے۔"

"کون کر رہا ہے زیادتی؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔ جواباً" وہ مختصراً" بولی۔

"شاید ہم سب ہی۔"

"سب کا نام کیوں لے رہی ہو' اس کی خوشیوں کی سب سے بڑی دشمن تو تم ہو' جہاں کہیں بات بنتی ہے' تم درمیان میں ٹپک پڑتی ہو۔ جانے کیا کیا الم غلم لگا کر

خود کو خوبصورت بنایا ہوا ہے۔ ہونہہ زیادتی۔ کہہ تو
ایسے رہی ہو جیسے تم سے بڑا ہمدرد اس کا کوئی نہیں۔"
سارا کو جانے کیا ہوا تھا' فوراً "سنگ کر بول اٹھی
تھی۔ جواب میں عائزہ ہکا بکا رہ گئی۔ وہ اس کے بارے
میں اتنی پست سوچ رکھتی ہو گی۔ عائزہ سوچ بھی نہیں
سکتی تھی۔
"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ میں نے کب حق مارا ہے
ان کا۔"
وہ روہانسی ہو گئی تھی' سارا نخوت سے ناک
چڑھاتے ہوئے بولی۔
"بس زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے جیسی
تم ہو مجھے سب پتہ ہے۔ پہلے نوید کے ساتھ لگ لگ کر
بیٹھتی تھیں پھر اس انجینئر پر ڈورے ڈالے۔ بالآخر
ہتھیا کر رہیں۔ تم جیسی بہنیں ہی ہوتی ہیں جو اپنی سگی
بہنوں کا گھر اجاڑ ڈالتی ہیں۔"
فائزہ کے ساتھ ساتھ وہ اب عائزہ سے بھی خوف
زدہ رہنے لگی تھی کہ کہیں جاذب اس کے سحر انگیز
حسن سے متاثر نہ ہو جائے۔
"بھائی! آپ سن رہے ہیں' آپی کیا کہہ رہی ہیں؟"
عائزہ باقاعدہ رو پڑی تھی۔ جاذب نے چپ چاپ
ہاتھ کے اشارے سے ایک ٹیکسی رکوائی پھر سب کو
اس میں سوار کرنے کے بعد تحمل سے بولا۔
"چپ ہو جاؤ عائزی! تمہاری آپی کا دماغ تھوڑا
کھسک گیا ہے۔ درست کرنا پڑے گا۔"
اس روز اس نے معاملہ سنبھال لیا تھا۔ سب کو ان
کی پسند سے اتنی اچھی شاپنگ کروائی کہ کسی تلخی کا
وجود نہ رہا مگر فائزہ کے دل کو بہت بری ٹھیس لگی تھی۔
جاذب کا دل بھی اس کی اتنی پست سوچ پر دکھا تھا۔ دو
دن سکون سے گزر گئے تھے۔ تیسرے روز صبح صبح وہ سو
کر اٹھا تو سارا کی تیز آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔
"بس امی! بہت ہو گیا یہ کھیل۔ میں مزید اپنی
آنکھوں کے سامنے بے حیائی کے یہ کھلے مظاہرے
برداشت نہیں کر سکتی۔ پوچھیں اپنی راج دلاری سے'
کیوں اس رشتے کے لیے نہیں مان رہی ہے۔ جب
اچھا ہے' لڑکا شریف اور سمجھ دار ہے پھر اسے کیا
تکلیف ہے اس رشتے سے؟ مگر جو تکلیف ہے' وہ میں
اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس کی نظر جاذی پر ہے' اسی
لیے سارا دن اس کے کمرے میں گھسی رہتی ہے
اور آپ کی آنکھیں ہی نہیں کھلتیں۔ بیٹیاں جو مرضی
گل کھلاتی رہیں' کوئی پروا نہیں آپ کو۔" وہ شدید غصے
میں بول رہی تھی۔ جاذب بے ساختہ بستر سے اٹھ
بیٹھا۔
"بکواس بند کرو سارا! میں اپنے اور جاذب کے
کردار پر ایک لفظ برداشت نہیں کروں گی۔" پہلی بار
جاذب نے فائزہ کی بلند آواز سنی تھی۔
"شٹ اپ۔ جانتی ہوں تمہاری پارسائی کو بہت
اچھی طرح سے۔ سارا دن میرے خلاف اس کے کان
بھرتی رہتی ہو' اسی کے لیے جوگ لے رکھا ہے تم نے
مگر وہ تمہارے ڈراموں میں آنے والا نہیں ہے۔
ہیرے اور پتھر کا فرق معلوم ہے۔"
وہ چلا رہی تھی' جاذب بستر سے نکل کر باہر آ گیا۔
"کیا بات ہے؟ صبح صبح جنگ کیوں چھیڑ رکھی ہے
لوگوں نے۔"
ایک نظر فائزہ کے عام سے حلیے پر ڈالنے کے بعد
اس نے سارا کی طرف دیکھا تو وہ بول اٹھی۔
"مجھے کوئی شوق نہیں فضول لوگوں کے منہ لگنے
کا۔ نہ ہی شادی کے بعد مجھے ان لوگوں کے ساتھ رہنا
ہے۔"
"بالکل صحیح ہے۔ پھوپھو! ابھی جو رشتہ آیا ہے' میں
نے اس کی تحقیق کروائی ہے' بہت اچھا لڑکا ہے۔ میرا
خیال ہے سارا اس کے ساتھ خوش رہے گی۔"
فائزہ کے پہلو میں کھڑے ہو کر اس نے اتنے آرام
سے کہا کہ وہ ہکا بکا سی اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔
"تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو جاذی! میری شادی
تمہارے ساتھ ہو گی' اس بڈھے کے ساتھ نہیں۔"
"وہ بڈھا نہیں ہے' اچھا خاصا سمجھ دار' معقول
شخص ہے۔ تمہارے جیسی گرم دماغ لڑکی کے لیے وہی
مناسب رہے گا۔ باقی جہاں تک میرا سوال ہے تو مجھے

کوئی پاگل لڑکی ہی خوش رکھ سکتی ہے جسے سچی محبت
کرنے کا فن آتا ہے' جو بنا کسی صلے کے اپنی وفائیں لٹا
کر مسیحائی کرنے کا ہنر جانتی ہے اور وہ لڑکی ہمارے گھر
میں بس فائزہ ہی ہو سکتی ہے۔"
اس کی آنکھوں میں جگنو تک رہے تھے۔
فائزہ ساکت کھڑی رہ گئی تھی گویا جسم میں جان ہی
نہ رہی ہو۔
یہ کیسا معجزہ ہو گیا تھا' اس نے تو کبھی ہوا کو بھی اپنے
جذبوں کا پتہ لگنے نہیں دیا تھا پھر یہ شخص کیسے مہربان
ہو گیا تھا اس پر۔
"تمہیں جو بھی چیزیں پسند نہیں ہیں سارا! مگر میں
جو ٹھا ہوں کیونکہ میری سوچ اور دل اب فائزہ کی امانت
ہو چکے ہیں۔ تمہیں خوبصورتی اپیل کرتی ہے' میں
خوبصورت نہیں' یہ تم نے ہی مجھے بتایا تھا مگر جب میں
نے اپنا عکس فائزہ کی آنکھوں میں دیکھا تو مجھے اپنا آپ
اتنا حسین لگا کہ میں ششدر رہ گیا۔ تم نے دولت کو
محبت پر ترجیح دی تھی۔ نتیجتاً محبت تمہارا در چھوڑ کر
[illegible] آئی اس کی منزل ہمارا [illegible] تھا۔
میں اب بھی امیر نہیں ہوں سارا! میرے ہاتھ اب بھی
مزدوری کرتے ہیں۔ قلم کی ہلکی سی جنبش سے لاکھوں
روپے نہیں کماتے مگر پھر بھی مجھے کوئی احساس کمتری
نہیں کیونکہ میرے پاس ہیروں سے بھی انمول رشتے
ہیں اور اس پاک باز عورت کی سچی محبت ہے جسے
سوائے میرے ساتھ کے اور کچھ بھی مطلوب نہیں۔
یاد رکھنا سارا! محبت ہر ریا اور غرض سے پاک ہوتی ہے
جو لوگ اس مقدس جذبے میں کسی قسم کے لالچ یا
غرض کا پیوند لگاتے ہیں' یہ ان کی کبھی نہیں ہوتی۔ آج
کے بعد کبھی فائزہ سے جھگڑا مت کرنا کیونکہ کوئی میری
محبت کا دل دکھائے' یہ میں برداشت نہیں کروں گا اور
پھوپھو! پلیز آپ عید کے فوراً بعد شادی کی تقریب
رکھ لیں۔ میرے پاس بہت کم چھٹیاں باقی رہ گئی ہیں۔
اس بار جاؤں گا تو سب کچھ سمیٹ کر جلد واپس آ جاؤں
گا تاکہ پھر کوئی ہمارے ہجر میں حال سے بے حال نہ
ہو جائے۔"
جگمگاتی روشن نگاہیں' ساکت کھڑی فائزہ کے
شفاف چہرے پر جمائے اس نے کہا تو عائزہ اور فرط خوشی
سے مسکرا اٹھیں کیونکہ ان کی اپنی خواہش بھی یہی
تھی۔
"فائزہ! میں جانتا ہوں تم مجھ سے بہت محبت کرتی
ہو' سچی اور بے لوث محبت۔ میں اس قابل تو نہیں ہوں
مگر پھر بھی تم سے وعدہ کرتا ہوں' زندگی میں اپنی وجہ
سے کبھی ان آنکھوں میں کوئی آنسو نہیں آنے دوں
گا۔ ہر خوشی دوں گا۔ بس تم اسی طرح رشتوں کا مان
رکھنا۔ میں سعودیہ سے تمہارے لیے سونے کی
انگوٹھی لایا تھا' ابھی پھوپھو میرے نام سے تمہیں
پہنائیں گی پھر شام میں عید کی شاپنگ کرنے چلیں
گے۔ میرے ساتھ چلو گی نا؟"
اس لمحے اس کی مقناطیسی نگاہوں میں کیسے کیسے
جذبے مچل رہے تھے۔ گم صم کھڑی فائزہ قدرت کی
اس فیاضی پر بے ساختہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رو
پڑی تھی۔
"نہیں یار! اب نہیں۔" نہایت محبت سے اس کا
آنسو انگلی کی پور پر چن کر اس نے کہا تو عابدہ بیگم نے
بھی آگے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں سمو لیا جبکہ ان
سے کچھ ہی فاصلے پر سارا حسیب یوں نڈھال بیٹھی تھی
جیسے وقت کی چال نے اسے ایک دم سے ہرا کر خالی کر
ڈالا ہو۔

ثروت نذیر

ان کا ایک ہاتھ میرے کان کو پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی (جو ان کے وجود کا حصہ تھی) میری کمر، میری گردن اور میرے...... خیر تابڑ توڑ حملے کر رہی تھی۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے دل نفرت سے بھرا ہوا تھا۔ کمر میں جلن کا احساس تھا۔ لیکن یہ سب کچھ تو کچھ بھی نہ تھا۔ سب سے زیادہ تکلیف تو مجھے اس بات کی ہو رہی تھی کہ پورا محلہ میری یہ دُرگت بنتے دیکھ رہا تھا اور محظوظ ہو رہا تھا۔ گھٹی گھٹی آواز میں روتے ہوئے میں تیز تیز قدم چل رہا تھا تاکہ جلد گھر آجائے اور میری یہ ذلت ختم ہو۔

گھر کے دروازے کے پٹ کھلے تھے میں نے شکر ادا کیا۔ ورنہ دروازہ بند ہونے کی صورت میں انھوں نے اسے اس خوف ناک طریقے سے کھٹکھٹانا تھا کہ محلے کے باقی ماندہ لوگ بھی اپنے گھروں سے نکل آتے اور پوچھنے لگتے۔

"کیا ہوا صوفی صاحب! کیا کیا ہے بچے نے؟" اور پھر بس اللہ دے اور بندہ لے والا معاملہ ہوتا۔

"ثریا! ثریا کہاں ہے عبدالشکور۔" وہ گرج دار آواز میں بولے۔ امی فوراً دوپٹہ سر پر سلیقے سے جماتے ہوئے باورچی خانے سے برآمد ہوئیں۔

"اسلام علیکم بھائی جی!"

"کہاں ہے شکور۔" انھوں نے میرا کان چھوڑ کر دھکا دیا اور میں لڑکھڑا کر سامنے پڑی کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

"وہ تو ابھی دفتر سے نہیں..."

"بس دفتر میں فائلوں میں سر دے کر بیٹھا رہے یہ نہ دیکھے کہ اولاد کیا گل کھلا رہی ہے۔"

"کیا کیا ہے اس نامراد نے؟" امی نے میری کمر پر دھپ مار کر پوچھا۔

"نادر پان والے کی دوکان پر بیٹھا اپنے لفنگے دوستوں کے ساتھ جوا کھیل رہا تھا۔"

"ہائے میں مر گئی۔" امی فوراً یقین کر بیٹھیں اور سینے پر دوہتڑ مار کر بین والے انداز میں رونے لگیں۔

"امی میں جوا نہیں کھیل رہا تھا تاش کھیل رہا تھا۔" میں اپنے دفاع میں منمنایا۔

"بند کر اپنی بکواس ایک تو بد معاشوں کے ساتھ بیٹھا جوا کھیل رہا تھا اور اب جھوٹ بھی بول رہا ہے۔"

انھوں نے مارنے کے لیے دوبارہ چھڑی اٹھائی اور میں کرسی پر دبک کر رہ گیا۔

"میں جا رہا ہوں! عبدالشکور آئے تو میری طرف بھیجنا۔" یہ کہہ کر وہ بپھرے ہوئے طوفان کی مانند گھر سے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی میری جان میں جان آگئی۔

امی اب دوپٹہ آنکھوں پر رکھ کر بڑبڑاتے ہوئے رونے لگیں۔

"ہائے میرے مولا! یہ دن بھی دیکھنا تھا۔ ایسی اولاد تو دشمن کو بھی اللہ نہ دے وغیرہ وغیرہ۔"

میں اپنی ہڈیاں پسلیاں سہلاتا ہوا امی کے قریب آگیا۔

"امی میں کوئی جوا نہیں کھیل رہا تھا عصر کی نماز کے بعد میں، نادر پان والے کے پاس سے گزرا، وہاں پرویز اور جعفر، صابر سب تاش کھیل رہے تھے۔ میں بھی ذرا کی ذرا ان کے پاس بیٹھ گیا۔ بس یہی میری غلطی ہے اوپر سے بلا کی طرح تایا جی نازل ہو گئے۔"

"بے شرم تایا کو بلا کہتے شرم نہیں آتی۔"

"تو اور کیا کہوں انھوں نے میرا ذرا خیال کیا۔ پورے محلے کے سامنے میری اتنی بے عزتی کی۔ سارے لوگ مجھے مار پڑتا دیکھ رہے تھے۔" غصے اور ذلت کے احساس سے میری آواز پھٹ پڑی۔

"آہستہ بول زیادہ عزت والا۔ جو کچھ تیرے تایا جی نے کیا تیری بہتری کے لیے کیا۔"

"مجھے نہیں چاہیے بہتری ہر وقت پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ یہ نہ کرو وہ نہ کرو یہاں کیوں گئے تھے وہاں کیوں نہیں گئے۔" میں بڑبڑانے لگا۔

☆ ☆ ☆

یہ جو واقعہ میں نے آپ کو سنایا ہے یہ میرے بچپن کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ نئی نئی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ بچپن اور جوانی کا

تنظر تھا۔ بچوں کے ساتھ جب کھیلنا اچھا نہیں لگتا اور نوجوان اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔ بس اسی جھٹپٹے کے زمانے کا وقت تھا۔ جن صاحب کا اوپر والے واقعہ میں ذکر ہوا وہ میرے تایا جی حضور تھے۔ درمیانہ قد ' گٹھا ہوا جسم ' سرخ و سفید رنگت چہرے پر سفید داڑھی اور سفید داڑھی سے ہم رنگ ٹوپی (یعنی سفید) آنکھوں میں غصہ اور ہاتھ میں چھڑی اور چہرے پر ہمہ وقت تحکم والا تاثر۔ جیسے دنیا پر صرف رعب ڈالنے اور حکم چلانے کے لیے تشریف لائے ہیں اور بات بھی صحیح تھی ' بچے تو دور کی بات میرے والد محترم کو بھی ہمت نہ ہوتی نظریں اٹھا کر ان سے بات کرنے کی۔ والد صاحب تو تایا جی کی بات کہنے سے پہلے ہی آمنا صدقنا کہہ چکے ہوتے۔

"ساجدہ اور رفعت کو اس بار دو سوٹ عیدی میں آرڈر کر دینا۔" تایا جی ہمارے گھر میں برآمدے کے موڑھے پر بیٹھے میرے ابا جی کو احکامات دے رہے ہوتے۔

"جی بھائی جان!" ابا جی ایک مؤدب نیاز مند کی طرح سر جھکائے بیٹھے ہوتے۔

"آڑھت سے کتنا چاول کی بوریاں میرے گھر سے لے کر آسیہ کے گھر۔۔ دے آئے۔"

"جی بھائی جان!"

"عفت کے بارے....."

"جی بھائی جی!"

"کیا جی بھائی جی کیا کہا ہے میں نے" وہ غصے سے گرجے۔ وہ ابا جی کی بے دھیانی پر غصے سے کھول اٹھے۔

"میں یہ پوچھ رہا ہوں عفت کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے" تایا جی نے کچھ دھیمے پڑتے ہوئے پوچھا۔

"آپ بڑے ہیں جو آپ کہیں گے ویسا ہی ہو گا میں نے کیا سوچنا ہے۔"

"بیٹے ابا جی نے دوسرے کاموں کے علاوہ سوچنے کا کام بھی تایا جی کے سپرد کر رکھا تھا اب میں آپ کو کیا بتاؤں۔ میرے ابا جی کے علاوہ میرے دونوں چچا دونوں پھوپھیاں اور ان کے بچے ہم سب تایا جی کے آگے

کچھ بولنے کی تاب نہیں رکھتے تھے۔ وہ ایک طرح سے ہمارے حکمران تھے اور ہم سب ان کی رعایا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے ابا جی اور باقی بھائی بہن چھوٹے چھوٹے تھے جب ان کے سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا۔ اور پھر ساری ذمہ داری میرے تایا جی نے سنبھال لی۔ دادا جی کی دوکان اور دادا جی کے بچے سب کے وہ نگران بن گئے۔

بہن بھائیوں کی تعلیم ان کی شادیاں ان کے بچوں کی تعلیم ان کی شادیاں سب کی فکر تایا جی کے کندھوں پر آ گئی جسے وہ بڑی خوش اسلوبی اور جابرانہ اصولوں کے تحت نبھا رہے تھے اور کسی بہن بھائی یا ان کے بچوں کی مجال نہ تھی کہ ان سے اختلاف کر سکے۔

پھوپھیاں تو بیاہ کر دوسرے شہروں میں چلی گئیں اور دونوں چچاؤں میں ایک سعودی عرب ملازمت کی وجہ سے مقیم تھے اور دوسرے اسی شہر میں تھے لیکن سرکاری رہائش گاہ کی وجہ سے ان کا گھر ہمارے آبائی گھر سے دور تھا۔ رہ گئی ہماری فیملی تو ہمارا گھر اور تایا جی کے گھر میں بس ایک گلی کا فاصلہ تھا۔ ویسے تو تایا جی کو اپنے تمام بہن بھائیوں کے حالات و واقعات بمعہ بچوں کی تعداد ان کی کلاس ان کی پڑھائی میں دلچسپی یا غفلت لڑکیوں کے رشتے کی فکر تمام طرح سے مکمل واقفیت تھی۔ لیکن ہمارا گھرانہ چونکہ زمینی فاصلے کے لحاظ سے ان کے سب سے زیادہ زیر نظر تھا اس لیے ان کے آمرانہ رویے کی زد میں بھی زیادہ تھا۔

میں جیسے جیسے بڑا ہو رہا تھا میرے اندر تایا جی کے خلاف بغاوت اور غصے کے جذبات ابھرنا شروع ہو گئے ہماری زندگی کا بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا فیصلہ تایا جی کے مشورے اور مرضی کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔

مجھ سے بڑی دو بہنیں زینت باجی اور آسیہ باجی ان کی شادیاں تایا جی کی مرہون منت تھیں۔ تایا جی نے ان کے رشتے تلاش کیے تایا جی نے لڑکوں کے بارے میں چھان پھٹک کی۔ تایا جی نے حق مہر تجویز کیا۔ غرض ان کی شادی کے تمام بیرونی اور قانونی معاملات کے ذمہ

دار تایا جی تھے اور میرے ابا جی اور امی جی دوسرے بہت سے احسانات کے علاوہ اس احسان کے بھی زیر بار آ چکے تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے ان کی اپنے گھر میں حد درجہ مداخلت بہت بے چین کرتی تھی۔ یعنی کہ ہماری کوئی مرضی نہیں جو کریں تایا جی کریں۔ میں بھی کبھار چڑ کر امی سے الجھ پڑتا۔

"بیٹا وہ ہمارے بڑے ہیں۔" امی مجھے پیار سے سمجھاتیں۔

"بڑے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ چھوٹوں پر ہر وقت حکم چلاتے رہو۔"

"وہ کوئی غلط بات تو نہیں کرتے ہماری بھلائی کے کام ہی کرتے ہیں۔"

"امی کوئی بھلائی ولائی نہیں کرتے انہیں صرف حکم چلانے میں مزہ آتا ہے۔ بس سب لوگ ان کے آگے ہاتھ باندھے کھڑے رہیں اور ان کا حکم بجالاتے رہیں۔" میں بڑے جلے ہوئے دل کے ساتھ امی سے بحث کر رہا تھا اور میری کڑھن اور جلن بھی جائز تھی۔ میں جب ایف ایس سی کے امتحانات سے فارغ ہوا تھا۔ فلمیں پھر دوست تھے اور میں تھا۔ فلموں کا بھی نیا نیا چسکا لگ چکا تھا۔ ہیرو بننے کے چکروں میں کپڑے جوتے اور ہیئر اسٹائل بھی ویسا ہی بنانے لگا۔ قلمیں لمبی اور بال ذرا گردن کو چھونے لگے تو شامت اعمال تایا جی کی نظر میں آ گیا۔ میں گھر سے نکل رہا تھا اور وہ ہمارے گھر میں داخل ہو رہے تھے۔ وہ ٹھٹک کر رک گئے۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟" انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک مکمل گھورا۔

"جی کیا ہوا؟" میں نے انجان بنتے ہوئے اپنے دائیں بائیں دیکھا۔

"جی کے بچے یہ کیا میراثیوں والا حلیہ بنا رکھا ہے۔" وہ کڑک کر بولے۔

"نہیں تو تایا جی!"

"نہیں تو تایا جی.... یہ کھلا گریبان لمبی زلفیں یہ ٹیڈی پینٹ تم کسی تھیٹر میں کام کرنے لگے ہو۔" وہ طنزیہ انداز میں گویا ہوئے۔

"وہ تایا جی.... امتحانات کی وجہ سے فرصت نہیں ملی۔ بال کٹوانے کی۔" میں نے اپنی دانست میں بڑا اچھا بہانہ گھڑا۔ جو الٹا مجھ ہی پر پڑ گیا۔

"اب تو امتحانات سے فارغ ہو گئے ہو نا۔"

"جی۔"

"تو چلو میں خود تمہاری حجامت بنوا کر لاتا ہوں۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دروازے سے باہر لے آئے۔

"نہیں تایا جی! میں خود کروا لوں گا پلیز تایا جی بس"

لیکن انہوں نے میری ایک نہ سنی اور مجھے عاشق ہیر کٹنگ سیلون لے جا کر میرے بالوں کی وہ درگت بنائی کہ بس ٹنڈ ہوتے ہوتے بچی۔

اور پھر پورا ہفتہ میں اپنی حسین زلفوں کی یاد میں راتوں کو تکیے میں منہ دے کر روتا رہا اور تایا جی کو کوستا رہا۔

☼ ☼ ☼

میں بظاہر اپنے کمرے میں بیٹھا کورس کی کتابیں کھنگال رہا تھا لیکن میری ساری توجہ برآمدے میں ہونے والی گفتگو میں اٹکی ہوئی تھی۔

"دیکھو بھئی شکور! ساجدہ نے مجھ سے خود بات کی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آپ بڑے ہیں اگر مناسب سمجھیں تو آگے بات چلائیں۔" مجھے یوں لگتا تھا کہ تایا جی اپنے بڑے ہونے کو بڑے فخریہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔

"مجھے تو اس بات میں کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ کیوں بھئی ثریا!" اب انہوں نے امی کو مخاطب کیا جن کے چہرے پر کچھ کچھ پریشانی ہویدا تھی۔

"حرج تو کوئی نہیں لیکن بھائی جی میری عفت بی اے کر رہی ہے اور مشتاق نے تو میٹرک بھی نہیں مکمل کیا جو تھوڑی بہت..... "امی بچھ جھجک کر بولیں۔

"بے وقوفی لڑکوں کی شکل و صورت یا تعلیم نہیں بلکہ ان کی شرافت اور نوکری دیکھنی چاہیے۔ اور پھر مشتاق تو اپنے خاندان کا بچہ ہے نیک شریف ہے پان سگریٹ کی عادت نہیں اس کو اور پھر جدی پشتی کاروبار

ہے ان کا کیوں شکور؟" اتنی لمبی تقریر کے بعد انہوں نے ابا جی کی طرف دیکھا۔

"زینت اور آسیہ کی شادیاں بھی آپ نے کی ہیں اور عفت بھی آپ کی ہی بیٹی ہے۔ آپ مناسب سمجھتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" ابا جی نے تو بات ہی ختم کر دی۔

"چلو پھر ٹھیک ہے ساجدہ کو تمہاری طرف سے ہاں کا جواب دے دوں گا پھر تم عورتیں مل کر کوئی چھوٹی موٹی رسم کر لینا۔" تایا جی امی کی طرف دیکھ کر بولے۔

تایا جی کے دو ہی بیٹے تھے جن کی عرصہ دراز پہلے وہ شادیاں کر چکے تھے اور اب خاندان کے دوسرے تمام جوان لڑکے لڑکیوں کے رشتوں کا ٹھیکہ از خود تایا جی نے اپنے سر لے لیا تھا۔ اب پھوپھی ساجدہ کے گھٹنے سانولے سے مشتاق کا رشتہ مجھ سے چھوٹی بہن عفت سے طے کرنے آئے تھے۔ جس کی صرف ایک ہی خوبی تھی کہ ان کا انار کلی میں جما جمایا کاروبار تھا فالودے کا۔

"حد ہو گئی ہے امی! ابا جی کی سعادت مندی کی۔" میں نے بے زاری سے کتابیں میز پر پٹخی۔

"اور ہاں یہ آج کل آذر کیا کر رہا ہے۔" اور اب تایا جی کا روئے سخن میری جانب تھا۔ میں چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔

"اس نے ایم اے اکنامکس میں داخلہ لے لیا ہے۔" ابا جی یوں بولے جیسے کوئی اعتراف جرم کر لیا ہو۔

"حد ہو گئی ہے اس لڑکے کی من مرضی کی..... کیا کرے گا یہ ایم اے ویم اے کر کے تمہاری طرح کسی دفتر میں بابو بن کے بھرتی ہو جائے گا۔ یہ نوکریوں میں کچھ نہیں رکھا۔ اب تم نے کیا تیر مار لیا نوکری کر کے بتاؤ بھلا۔"

میں اندر بیٹھا غصے سے بل کھا کر رہ گیا۔ مجھے یوں لگا تایا جی میرے پیارے ابا جی کی بے عزتی کر رہے ہیں۔

"اب مجھے دیکھو حمید اور لطیف کو اپنے کاروبار میں سے الگ الگ دو کانیں کر دیں۔ خود بھی ابھی تک ایک آدھ چکر دوکان کا لگا لیتا ہوں۔ پیسے کا لالچ نہیں ہے مجھے بس چاہتا ہوں کہ ہاتھ پیر چلتے رہیں۔ اور پھر اس سے اپنا اور اپنے بہن بھائیوں کا بھی کچھ آسرا ہو جاتا ہے۔"

"اب اپنے احسانات جتائے جا رہے ہیں۔" میں نے کڑھ کر سوچا۔

لیکن تایا جی کی بات درست بھی تھی ہمارے گھر کے مالی حالات کبھی بھی اتنے اچھے نہ تھے۔ لیکن سچ بات ہے کہ ہمیں کبھی کسی چیز کی تنگی یا کم مائیگی کا بھی احساس نہ تھا۔ شاید وہ زمانہ ہی سادگی کا تھا یا شاید وہ تایا جی کی ہر موقع پر بغیر پوچھے امداد تھی جو ہمارے گھر کبھی چاولوں کی بوری کبھی گھی کے کنستر کبھی پھلوں کے ٹوکرے کی صورت میں موجود رہتی۔ بہنوں کی شادیوں پر فرنیچر اور بارات کا کھانا بھی تایا جی نے خود اپنے ذمہ لے لیا تھا یہ بات بہت عرصے بعد مجھے امی جی کی زبانی معلوم ہوئی۔ لیکن تب میں نے تلخی سے سوچا ان سب کے بدلے انہیں بے زبان ہر حکم پر جی حضور کرنے والے غلام بھی تو ملے ہوئے تھے۔

عفت کے بعد میں، ناظمہ اور انیق بچے تھے۔ انیق خیر سب سے چھوٹا اور مجھ سے تو چودہ سال چھوٹا بھائی تھا۔ لیکن اب مجھے دھڑکا لگا رہتا کہ کسی روز تایا جی آئیں گے اور ابا جی امی جی کو میرے لیے کوئی لڑکی تجویز کر دیں گے اور بس پھر ویسا ہو گا جو وہ چاہیں گے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ ایک رات تایا جی تہجد کی نماز کے لیے اٹھے وضو کرنے لگے۔ لیکن وہیں نلکے کی ٹونٹی کے پاس لڑکھڑا کے گر گئے۔

بس اس کے بعد وہ غصے، رعب اور حکومت سے بھرا ہوا شخص منوں مٹی کے نیچے جا سویا۔ ابا جی باقی اپنے بہن بھائی یوں بلک بلک کر روئے گویا آج ہی یتیم ہوئے ہیں اور ان کے بعد ایسا ہوا کہ تسبیح کے دانوں کی ڈوری ٹوٹ گئی اور سارے دانے ادھر ادھر بکھر گئے۔

لیکن سچی بات ہے کہ ان کی وفات پر میں نے دل میں ایک کمینی سی خوشی محسوس کی۔ مجھے یوں لگا کہ میرے ابا جی امی جی اور خود میں کسی جابر دیو کی قید سے آزاد ہو گئے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے فارسی کا یہ مقولہ "سنگ باش برادر خورد مباش" اکثر میرے ذہن میں آتا اور یہ سوچ کر میرا دل اطمینان سے بھر جاتا کہ میں کسی کا چھوٹا بھائی نہیں ہوں بلکہ مجھ سے چھوٹا بھائی ہے۔ لیکن میں نے ہمیشہ یہ بھی سوچا کہ میں کبھی اپنے چھوٹے بھائی پر اس طرح ظلم نہیں کروں گا جس طرح کا میرے تایا جی نے میرے ابا جی پر روا رکھا۔ ان شاء اللہ اور پھر میں نے ساری عمر ایسا ہی کیا۔

☼ ☼ ☼

اگر غور کیا جائے تو ہم اپنی زندگی میں کس چیز کو حاصل زندگی کہہ سکتے ہیں۔ یا انگریزی میں achievement کہہ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کی بنا پر ہماری زندگیوں کے دو بڑے نصب العین ہوتے ہیں۔ ایک گھر بنانا اور دوسرا بچوں کی شادیاں کرنا۔ سفید پوش لوگ ساری زندگی ان دو کاموں میں کھپا دیتے ہیں۔ اور اگر ان میں کوئی اور تخلیقی صلاحیت ہو بھی تو وہ کہیں گم ہو جاتی ہے۔ میں بھی ایک متوسط طبقے کا فرد تھا۔ ترکے میں والدین کی دعاؤں اور ان کی تربیت، ایمان داری اور ہمت کے وصف ملے تھے جن کی بدولت میں ایک ایک قدم کر کے ترقی کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

ایم اے اکنامکس کے بعد کالج میں لیکچر شپ کی پھر کسی کے مشورے پر مقابلے کا امتحان دیا۔ پھر آہستہ آہستہ سول سروس میں آ گیا۔ پھر اس میں اپنی زندگی کے بتیس سال لگا دیے اور حصول زندگی کیا ملا۔ ایمان داری اور محنت کے بل بوتے پر اتنا ہوا کہ اب لاہور کے ایک اچھے علاقے میں میرا ذاتی گھر ہے۔ اور دوسرا یہ کہ شادی کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو بیٹے اور بیٹی کی نعمت سے نوازا تھا میں بخیر و خوبی ان کی شادیاں کر چکا ہوں۔

اور اب ریٹائرمنٹ کی بے کیف، بے رنگ زندگی گزار رہا ہوں۔ مجھے ریٹائر ہوئے چار سال ہو گئے ہیں۔ پہلے سال تو ریٹائر ہونے کے نقصانات اور فوائد کو سمجھنے میں لگ گیا۔ سب سے بڑا نقصان تو مہینے کے آخر میں ملنے والی وہ رقم تھی جو یک لخت بند ہو گئی۔ اب پنشن کے نام پر ملنے والی مریل سی رقم میں اتنی جان بھی نہ ہوتی کہ میں یوٹیلٹی کے بل ہی ادا کر سکتا۔ دوسرا بڑا نقصان وہ لگی بندھی روٹین تھی جس سے میرے اندر چابی بھری رہتی ہر روز تیار ہو کر چاق و چوبند انداز میں سارا دن کام کرنے کا اپنا ہی لطف اور چارم تھا۔ یہ سلسلہ رک جانے سے طبیعت میں عجیب سی بیزاری اور سستی چھا گئی۔ کہاں وہ روز چھ بجے اٹھ کر شیو کرنا نہانا دھونا پینٹ کوٹ کسنا بریف کیس پکڑنا اور کہاں یہ کہ اٹھ تو چھ بجے ہی گئے لیکن اب شیو بنانا اور تیار ہونا چہ معنی دارد۔ بقول شاعر کا تھی۔

ع نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں
اور بال بناؤں کس کے لیے

پھر دل نے سمجھایا کہ اگر یونہی ماتمی صورت حال رہی تو وہ دن دور نہیں جب دنیا سے ہی ریٹائرمنٹ کا بلاوا آ جائے گا۔ تو اب جو ہے اسی میں خوشی اور دل چسپی تلاش کرو۔ پھر دل نے ریٹائرمنٹ کے فوائد پر غور کرنے کا مشورہ دیا پہلے جب ساری دنیا نیند کے مزے لوٹ رہی ہوتی تھی تو ہم تھے کہ منہ اندھیرے اٹھ کر رزق کی تلاش میں خاک چھانتے تھے اب کم از کم اس صبح بیداری سے تو جان چھوٹ گئی۔ (وہ الگ بات تھی کہ برس ہا برس صبح اٹھنے کی ایسی عادت پڑ چکی تھی کہ اب بقول شاعر " چھٹتی نہیں منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ جب دل چاہا اٹھو دل چاہے نہ اٹھو۔ پرانے دوستوں کے ساتھ پھر سے تعلقات استوار کیے گئے۔ کلب کی ممبر شپ بنوائی لائبریری کارڈ ایشو کروایا۔ باغبانی سے دل و دماغ کو طراوت پہنچانے کے گر آزمائے گئے۔ گھر کی مرمت کے غیر دلچسپ کاموں میں خود کو مصروف کیا۔ باتھ روموں کے نلکے کچن کے کیبنٹ ٹھیک کروائے۔ اکھڑے ہوئے پلستر اور بیرونی مین گیٹ پینٹ کروایا۔ دنیا میں کیا کچھ تھا کرنے کو۔

دو سال ایسے ہی کاموں میں کھپا دیے جن کو کرنا ہمیشہ سے میری بیوی کا دل پسند مشغلہ اور میرا انتہائی ناپسندیدہ کام تھا۔ تیسرے سال سوچا چلو اب کچھ دو

اور اللہ کی طرف بھی رجوع کیا جائے۔ یہاں بھی صرف اسی نکتہ نظر کو سامنے رکھا گیا کہ اب فارغ ہیں تو کیوں نا دین کا اکھڑا ہوا پلستر بھی دوبارہ مرمت کر لیا جائے۔ تو اسی مقصد کے تحت میں اور میری بیوی حج کرنے چلے گئے۔ حج کے علاوہ مقصود اپنی بیٹی سے ملاقات بھی تھی۔ چنانچہ حج بھی کیا اور دو ماہ جدہ میں بیٹی کے پاس گزارے۔ واپسی پر سامان میں جہاں احباب کے لیے کھجوریں، تسبیح، جائے نماز اور آب زم زم تھا وہاں احباب کو چونکانے کے لیے میرے چہرے پر داڑھی بھی تھی۔ حج کرنے جب گیا تھا تو پیش نظر صرف فراغت اور فرض کی ادائیگی تھی لیکن جب واپس لوٹا تو احساسات کا موسم بدل چکا تھا۔ اب آخرت کو سنوارنے کی ایسی مصروفیت ہاتھ آئی تھی کہ فارغ ٹائم بھی نہ ملتا۔ اب صبح اٹھنا تو ہوتا لیکن اس لیے کہ فجر کی نماز پڑھی جائے وہ بھی مسجد میں جا کر وا ک بھی ہو جاتی اور ثواب بھی مل جاتا۔ واپس آکر قرآن پاک کی تلاوت معہ ترجمہ پھر نمازوں کا سلسلہ چل سو چل اور اب مجھ پر یہ راز کھلا کہ اکثر لوگ ریٹائرمنٹ کے بعد باریش اور نمازی کیوں ہو جاتے ہیں۔

میں نماز کے بعد قرآن پاک ترجمے کے ساتھ پڑھ رہا تھا کہ بیوی کوڈلیس فون لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔

"اور تم لوگ آپس میں فیاضی کو نہ بھولا کرو۔" البقرہ میں اس آیت کی تھی تفسیر کے ذریعے سمجھا رہا تھا کہ۔

"یہ لیں علی کا فون ہے۔" بیوی فون پکڑا کر باہر چلی گئی اور میرے ذہن میں کسی علی کی کوئی شبیہ نہ ابھر سکی۔

"ہیلو کون بول رہا ہے۔"

"السلام علیکم تایا جان! میں علی بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے ایک بچے کی آواز سنائی دی۔

میرے ذہن میں شناسائی کی کوند لہرائی۔ "تایا جان" اپنے لیے یہ لقب مجھے ماضی کے کن کن صحراؤں میں بگولے کی طرح اڑائے گیا۔

"علی آپ..... اچھا کیسے ہو علی بیٹا؟" میں نے کچھ توقف کے بعد بھرپور انداز میں پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں تایا جان!"

"اور تمہارے پاپا کیسے ہیں۔" میں نے اپنے چھوٹے بھائی انیق کا پوچھا۔

"تایا جان ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ آپ کو یاد کر رہے تھے امی نے مجھ سے کہا کہ آپ کو فون کر کے بتا دوں۔" وہ ایک ہی سانس میں بتاتا چلا گیا۔

"کیا ہوا ہے انیق کو؟" بے اختیار ہی میرے وجود میں بے چینی کی سنسنی دوڑ گئی۔

"پتہ نہیں۔" وہی بچپن والی بے پروائی سے جواب دیا گیا۔

"گھر پر ہیں تمہارے پاپا۔"

"جی گھر پر ہیں لیکن سو رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں آج آؤں گا ملنے اپنی امی اور پاپا کو بتا دینا۔"

انیق میرا چھوٹا بھائی مجھے بہت عزیز ہے۔ اس میں اور مجھ میں چودہ سال کا فرق تھا۔ جب وہ پیدا ہوا تو میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ چار بہنوں میں رہتے ہوئے مجھے انیق کی آمد سے خوشی ہوئی۔ وہ میرے لیے بھائی سے زیادہ میرا کھلونا تھا جس سے میں خوب کھیلتا کبھی کندھوں پر بٹھا کر بازار کی سیر کروانے لے جاتا۔ کبھی اس سے جھوٹ موٹ کی کشتیاں لڑتا۔ کبھی اس کو سائیکل چلانا سکھاتا اور کبھی باغ میں لے جا کر اسے فٹ بال کھلاتا۔ وہ مجھ سے اتنا چھوٹا تھا کہ ہم دونوں کے مابین کبھی لڑائی یا ناراضی کی نوبت ہی نہ آئی تھی اور ویسے بھی اکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے اور چھوٹا ہونے کی وجہ سے میں نے انیق کے ساتھ ہمیشہ شفقت اور محبت کا برتاؤ ہی رکھا دوسرا اپنے تایا جی کے تحکمانہ رویے کی وجہ سے جسے میں سخت ناپسند کرتا تھا میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں کبھی انیق کی زندگی میں بے جا دخل اندازی نہیں کروں گا اور میں نے اپنا کہا پورا کر دکھایا یہ الگ بات ہے کہ سول سروس کی ملازمت نے مجھے اتنا مصروف اور بدل دیا کہ میں حد سے زیادہ اپنے قرابت داروں سے لاتعلق ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

انیق کے گھر گاڑی روک کر میں مین گیٹ کی طرف گیا تو ایک بیزار سی شکل والی ماسی اتق پر نگاہیں جمائے فرش دھونے میں مصروف تھی۔ اس کا یہ انداز صفائی غصہ دلانے کو کافی تھا۔ کیونکہ اس طرح فرش دھونے سے میرے سفید کڑک شلوار قمیص پر چھینٹے پڑ چکے تھے۔ اور راز کی بات بتاؤں ریٹائرمنٹ کے بعد ملازمین کی حرکات و سکنات پر غور کرنے کو بھی کافی ٹائم مل جاتا ہے۔

میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے رکنے کو کہا اور چھوٹے گیٹ سے سر جھکا کر اندر داخل ہو گیا انیق کا گھر لاہور کی ایک سادہ سی صاف ستھری کالونی میں واقع ہے۔ دس مرلے کا یہ گھر جب وہ تعمیر کر رہا تھا تو ان ہی دنوں میں ہم سب بھائی بہنوں نے اپنا آبائی گھر جو کے کرشن نگر میں تھا فروخت کیا بہنوں کے حصے دینے کے بعد میرے اور انیق کے حصے جو آیا وہ اس قدر کم تھا کہ میں نے احسان مندی کے تاثر سے وہ انیق کو ہی ہبہ کر دیا۔

مرکزی دروازہ کھلا تھا میں اندر داخل ہو گیا۔ لاؤنج میں عجیب سی ویرانی اور خاموشی سی تھی۔ میں بلاوجہ ہی کھانسا۔ آواز سن کر کچن سے میری بھابھی عاتکہ برآمد ہوئی۔

"السلام علیکم بھائی جان" وہ دوپٹہ صحیح کرتے ہوئے میرے قریب آگئی۔

"وعلیکم السلام۔" میں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"کیا حال ہے تمہارا۔" میں صوفے پر بیٹھ گیا۔

"میں تو ٹھیک ہوں بس آپ کے بھائی نے ہی پریشان کیا ہوا ہے۔" عاتکہ انگلیاں چٹخاتی ہوئی پریشان سی میرے سامنے والے صوفے پر آ بیٹھی۔

"کیا ہوا ہے انیق کو؟"

"رات کو سینے میں درد ہوا پہلے تو بتایا نہیں جب درد بڑھ گیا تو مجھے اٹھایا۔ میں نے ہمسائے کے لڑکے کو لے کر گاڑی میں بٹھایا ہسپتال لے کر گئے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ انہیں انجائنا کا درد ہوا تھا۔"

انیق بمشکل پچاس برس کا تھا۔ اسے اس تکلیف میں مبتلا ہونے کا سوچ کر ہی مجھے جھرجھری آگئی۔

"ہمسائے کو لے جانے کے بجائے تمہیں مجھے فون کرنا چاہیے تھا۔" میرے لہجے میں خود بخود درشتی در آئی۔

"آپ کا گھر اتنا دور ہے اور پھر ویسے بھی انیق نے منع کر دیا کہ بلاوجہ بھائی جان پریشان ہوں گے۔"

"اب کیسی طبیعت ہے اس کی؟" میں نے کچھ دھیما پڑتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ معمولی اٹیک تھا ویسے اس نے دوائیاں اور ٹیسٹ لکھ دیے ہیں۔ ابھی سو رہے ہیں۔"

"کیا بات ہے عاتکہ! کوئی پریشانی ہے انیق کو؟"

"میں نے آپ کو چائے تو پوچھی ہی نہیں آپ بیٹھیں میں چائے لاتی ہوں۔" عاتکہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی جیسے مجھے کچھ بتانا نہ چاہتی ہو۔

مجھے اپنے اوپر عجیب سی ندامت محسوس ہونے لگی میرا اپنا چھوٹا بھائی جو مجھے بہت عزیز تھا اس کے بارے میں میں جانتا تک نہ تھا کہ اسے کوئی پریشانی ہے اور اگر ہے تو کیا ہے اور ایک میرے تایا جی تھے جو ہمارے گھر کی ہر پریشانی ہر مسئلہ ہر تکلیف کو بغیر بتائے بغیر کہے جان جاتے تھے۔ مجھے بلاوجہ ہی تایا جی یاد آنے لگے۔

مجھے بیٹھے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ سامنے والے کمرے سے ہیڈ فون لگائے علی صاحب نمودار ہوئے مجھے دیکھ کر اس نے ہیڈ فون کانوں سے اتار کر گلے میں لٹکا لیا۔

"السلام علیکم تایا جان۔" وہ سلام کر کے بے نیازی سے چیونگم چباتا میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

علی کو میں کافی عرصے کے بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ بارہ تیرہ سال کا لڑکا تھا۔ چہرے پر وہی بچپن والی معصومیت کے

ساتھ ساتھ اکھڑپن بھی نمایاں تھا۔
"اسکول کیسا جا رہا ہے تمہارا؟" میں نے بات شروع کرنے کی غرض سے سوال کیا۔
"ٹھیک جا رہا ہے۔" وہی بے اعتنائی والا انداز۔
"کون سی کلاس میں ہو؟"
"میں 7th میں ہوں۔"
"آج چھٹی تھی اسکول سے؟" میں اسے آج گھر پہ دیکھ کر حیران تھا۔
"نہیں چھٹی تو نہیں تھی میں نے آج چھٹی کی ہے اسکول سے۔"
"کیوں کی ہے چھٹی؟" میں سمجھا اپنے باپ کی بیماری کے باعث اسکول نہیں گیا ہوگا لیکن یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔
"میرا آج میچ تھا گلی کے بچوں کے ساتھ کرکٹ کا اس لیے چھٹی کی ہے۔" اس نے بڑی بے خوفی سے اصل وجہ بتادی جیسے کہ اس مقصد کے لیے چھٹی کرنا کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے۔
علی کی باتوں میں مجھے بگڑے ہوئے ضدی بچوں والے تمام جراثیم نظر آگئے۔ پہلے میں نے نصیحت کے لیے منہ کھولا لیکن پھر میں خاموش ہوگیا کیونکہ مجھے لگا کہ ایسا کرنا اسے مجھ سے متنفر کرسکتا ہے۔
"اچھا باجیاں کہاں ہیں تمہاری؟" میں یہ تو جانتا تھا کہ انیق کی تین بیٹیاں ہیں اور پھر یہ علی صاحب تھے لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی بیٹیاں کتنی بڑی ہو گئی ہیں اور کون سی کلاس میں ہیں۔
"اقصیٰ باجی تو اسکول گئی ہیں۔"
"کون سی کلاس میں پڑھتی ہیں اقصیٰ باجی؟"
"وہ اسکول میں پڑھتی نہیں پڑھاتی ہیں۔" علی میری ناقص معلومات پر ہنس کر بولا۔
یہ انکشاف میرے لیے حیران کن تھا۔
"اچھا اور باقی دونوں؟"
"عائزہ باجی میڈیکل کے سیکنڈ ایئر میں ہیں اور عظمیٰ باجی ایف ایس سی میں ہیں۔"
اسی لمحے عاتکہ چائے کی ٹرے اور کچھ لوازمات لے کر کچن سے لاؤنج میں داخل ہوئی۔ چائے میرے سامنے میز پر رکھ کر خاموشی سے کپوں میں ڈالنے لگی۔ عاتکہ کے پورے وجود پر خاموشی اور فکرمندی کی چادر سی تنی تھی۔ "بچیاں کب آتی ہیں گھر میں؟" نے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے عاتکہ سے پوچھا۔
"تین بجے تک آجاتی ہیں۔" اس نے کباب کی پلیٹ میرے آگے کرتے ہوئے جواب دیا۔
"اقصیٰ نے کب سے اسکول میں پڑھانا شروع کیا ہے۔" میں نے علی کی دی ہوئی معلومات سے فائدہ اٹھایا۔
"بس ایم اے کرنے کے بعد فارغ تھی تو اسکول میں جاب کرلی میں نے اور انیق نے بھی اجازت دے دی کہ چلو مصروف رہے گی۔"
"کہیں رشتہ وشتہ نہیں کیا اس کا۔" اپنے اس سوال پر ایک لمحے کو میں خود بھی حیرت زدہ رہ گیا۔ مجھے اپنے انداز میں تایا جی کی بازگشت سنائی دی۔
عاتکہ کچھ لمحے کو خاموش رہی جیسے سوچ رہی ہو کہ بتاؤں یا نہ بتاؤں پھر بولی۔ "پچھلے سال عفت باجی نے اپنے سہیل کے لیے بات تو شروع کی تھی مگر پھر۔"
"پھر کیا؟" میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے عاتکہ سے پوچھا۔
"پھر جب سے انیق کی جاب ختم ہوئی ہے انہوں نے بات ہی نہیں چھیڑی۔" عاتکہ کی اس اطلاع سے یک لخت میرے ہاتھ میں کپ لڑکھڑا گیا چائے کے گرم گھونٹ نے صرف میری زبان کو نہیں جلایا بلکہ میرا پورا وجود سلگ سا اٹھا۔
"انیق کی جاب ختم ہوگئی۔" میں نے حیرت زدہ لہجے میں عاتکہ سے پوچھا۔ میں اپنے بھائی کے حالات سے اس قدر بے خبر تھا۔
"کب، کیسے؟" میں نے بے تابی سے عاتکہ سے پوچھا۔
"پچھلے سال۔"
"خدایا سال ہوگیا اس بات کو اور تم مجھے آج بتا رہی ہو۔" آپ اور بھابھی حج پر گئے ہوئے تھے۔ پھر جب

آپ آگئے تو انیق کہنے لگے کہ خواہ مخواہ آپ پریشان ہوں گے۔" عاتکہ دھیمے سے انداز میں بولی۔
میرے پاس اب خاموش ہوجانے کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ انیق نے اپنی ہر مشکل ہر تکلیف صرف مجھے پریشان نہ کرنے کی غرض سے چھپائی۔ اور میں اس کے حالات اس کی زندگی کے معاملات سے اس لیے دور رہا کہ کسی بے جا مداخلت کا مرتکب نہ ہو جاؤں۔ لیکن ان دونوں رویوں کی وجہ سے ہوا کیا کہ آج ہم دونوں بھائیوں میں اتنی دوری آچکی تھی کہ میں انیق کی زندگی میں آنے والے اتنے بڑے حادثوں سے بھی آگاہ نہیں تھا، حالانکہ آج کل دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے۔ ہمیں دنیا کے دوسرے کونے میں ہونے والے حادثے کی خبر تو چند سیکنڈ میں مل جاتی ہے۔ لیکن اپنوں کے ساتھ کیا ہوا یہ سب کچھ سرد رویوں کی نذر ہو کر کسی سرد خانے میں پڑا رہ جاتا ہے اور ایک وہ میرے تایا جی کا زمانہ تھا جب ذرائع ابلاغ نے اتنی ترقی بھی نہ کی تھی۔ لے دے کہ ڈاک کا نظام تھا یا کسی کسی کے پاس فون کی سہولت موجود تھی لیکن اتنے محدود ذرائع کے باوجود تایا جی اپنے بہن بھائیوں رشتہ داروں کے پل پل کی خبر رکھتے تھے۔ ہر غمی خوشی کے موقع پر سب سے پہلے پہنچ جاتے۔ بہن بھائی کے کسی بھی مسئلے میں اپنی خدمات سے لیس ہو کر حاضر خدمت۔
پھر تایا جی کی یادوں نے میرے وجود پر یلغار کردی۔
"کیسے ختم ہوئی ہے انیق کی جاب؟" میں نے ان یادوں سے دامن چھڑا کے عاتکہ سے پوچھا۔
"بینک کی نئی انتظامیہ آئی تو انہوں نے ملازمین کی چھانٹی کردی اور ملازمت سے فارغ ہونے والے لوگوں کے ساتھ گولڈن شیک ہینڈ کرلیا۔"
"چلو پھر تو انیق کو فائدہ ہوا ہوگا۔" میرے لہجے میں اطمینان در آیا۔
"جی پچیس لاکھ ملے تھے۔" عاتکہ نے میرے پوچھے بغیر ہی بتادیا۔
"تو پھر کوئی بزنس شروع کردیتا۔"
"ان کو تو کوئی تجربہ نہیں بزنس کا ایک دوبار پارٹنر

شپ کی اور دھوکہ کھایا۔ پیسے بھی برباد ہوئے اور پریشانی الگ۔"

"ارے تو میرے پاس آتا میں کیا سال بھر جج کے لیے چلا گیا تھا۔ مشورہ کرتا میں اسے اچھے لوگوں سے ملاتا اچھے تعلقات ہیں میرے بہت سے ملنے ملانے والے بزنس کرتے ہیں۔" اب مجھے انیق پر سچ مچ غصہ آنے لگا۔

"جی اسی وجہ سے انیق نے آپ کو نہیں بتایا۔" عاتکہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"اس وجہ سے؟" میں نے حیرانی سے عاتکہ کی جانب دیکھا۔

"آپ برا نہ مانیے گا دراصل آپ کا ملنا ملانا آپ کے تعلقات سب آپ کی حیثیت اور رتبے کے تھے۔ انیق کو ہمیشہ یہ احساس رہا کہ ہم جیسے کم حیثیت والے لوگ آپ کے معیار کے نہیں ہیں اسی لیے آپ ہم لوگوں سے ملنا جلنا زیادہ پسند نہیں کرتے۔" عاتکہ کا یہ انکشاف ایک بم کی طرح میرے سر پر پھٹا۔

"تو انیق یہ سوچتا ہے میرے بارے میں اور میں نے کیا سوچ کر اپنے آپ کو بہن بھائیوں سے دور رکھا اور وہ میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار رہے۔ یہ کیسی عجیب سی صورت حال تھی جو میرے پیش نظر تھی۔ اب اگر میں وضاحت کے لیے لاکھ تاویلیں پیش کرتا تو انہیں ماننا انیق اور عاتکہ کے لیے مشکل تھا۔ میرے ماہ و سال کے رویے اور چلن نے انہیں مجھ سے دور کرنے کے ساتھ ساتھ متنفر بھی کر دیا تھا۔ اب وہ کیسے مان یا جان سکتے تھے کہ میں نے کیوں اپنے آپ کو ان سے فاصلے سے رکھا۔ اور اب مجھے اس آیت کی تفسیر کہ "آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی کا رویہ اختیار کرو۔" بڑی آسانی اور دل میں اتر جانے کی حد تک سمجھ میں آچکی تھی۔

اور بار بار جگہ جگہ قرآن پاک میں رشتہ داروں سے حسن سلوک کی ہدایت کی وجہ بھی سمجھ میں آرہی تھی۔ میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر خاموش ہوگیا کہ اب باتوں سے نہیں عمل سے ثابت کرنے کا وقت تھا۔ اسی وقت علی نے آکر اطلاع دی۔

"ممی پاپا اٹھ گئے ہیں۔" میں عاتکہ کی رہنمائی میں کمرے میں داخل ہوا انیق بستر پر چادر اوڑھے لیٹا تھا اس کو دیکھ کر میرے دل کو بہت دھچکا لگا۔ یہ وہی گول مٹول انیق تھا جو کبھی میرے کندھوں پر چڑھا رہتا تھا۔ آج پیار پچکے ہوئے گال۔ آنکھوں میں پڑے ہوئے حلقے والے مریض کی صورت میں میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور اس کے بستر پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

"یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے تم نے نکو۔" میں بچپن میں انیق کو پیار سے کبھی کبھی نکو کہا کرتا ہے۔ جس سے وہ بہت چڑتا تھا۔

"بس بھائی جان اب کیا کہوں۔" وہ نقاہت سے مسکرا کر بولا۔

"تم جیسے جوان اگر بستر پر پڑ جائیں گے تو میرے جیسے ریٹائرڈ بڈھے کا کیا بنے گا۔" میں نے لہجے میں بشاشت پیدا کر کے کہا۔

میری بات کے جواب میں انیق نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

"ٹیسٹ وغیرہ کب کروانے ہیں انیق کے؟" میں نے عاتکہ سے پوچھا۔

"ڈاکٹر نے کل کا ٹائم دیا ہے۔"

"جاؤ اس کی فائل لے کر آؤ۔ میرا ایک دوست ہارٹ اسپیشلسٹ ہے۔ میں انیق کو اسے دکھاتا ہوں۔" عاتکہ فوراً "فائل لینے چلی گئی۔

"انیق اپنے آپ کو مضبوط کرو۔ زندگی میں مشکلات تو سب کو پیش آتی ہیں۔ لیکن یوں ہمت نہیں ہارتے۔ دل چھوٹا نہیں کرتے۔ اب ہمارے ابا جی کی زندگی کی مثال لو۔ بچپن میں یتیم ہو گئے۔ اتنے بڑے کنبے کو نامساعد حالات میں سنبھالا بچوں کی تعلیم بیٹیوں کی شادیاں سب کچھ سے انہیں بھی گزرنا پڑا لیکن۔۔۔"

"وہ اس لیے بھائی جان! کیونکہ وہ اکیلے نہیں تھے ان کے ساتھ ان کے بھائی کی سپورٹ تھی۔ مشکلات کے ساتھ ساتھ مجھے اکیلے پن کے احساس نے توڑ دیا ہے۔" انیق کا گلہ اس کی زبان پر آہی گیا۔

میں کچھ دیر خاموش رہا۔

"ٹھیک ہے تمہارا شکوہ بجا۔ لیکن اگر میں تم سے دور رہا تو تم نے کبھی مجھے میرے رویے کا احساس کیوں نہیں دلایا۔ تم کیوں نہیں میرے قریب آئے۔" انیق نے سر جھکا لیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"ارے ارے جوان آدمی روتے نہیں اگر تم روؤ گے تو مجھ داڑھی والے بڈھے کو بھی رونا آجائے گا اور نہ جانے کیوں یہ کہتے ہوئے میری آواز بھی رندھ گئی۔ اسی لمحے عاتکہ فائل لے کر آگئی ہم دونوں نے بمشکل بھیگی آنکھیں اس سے چھپائیں "چلو بھئی عاتکہ! اس کے کپڑے بدلواؤ میں اس کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جا رہا ہوں۔"

"نہیں نہیں بھائی جان! میں کل چلا جاؤں گا آپ کو تکلیف ہوگی۔"

"اوئے نکو کیا نہیں تیں لگا رکھی ہے جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" میرے لہجے میں خود بخود تایا جی والا جلال در آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

میں اور انیق گاڑی میں بیٹھے ڈاکٹر کی طرف جا رہے تھے۔ انیق نقاہت کے باوجود اپنی جاب کے چھوٹ جانے کی تفصیل علی کی خود سری۔ بزنس میں دھوکے بچیوں کی شادیاں اور نہ جانے کن کن موضوعات پر بات کر رہا تھا۔ میں گاڑی چلاتے ہوئے اس کی باتیں بھی سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ تایا جی کی روح میری اس تبدیلی پر یقیناً "مسکرا رہی ہوگی۔ اور آج مجھے اسلام میں میانہ روی کا اصول بھی سمجھ میں آیا۔ تایا جی اگر ایک انتہا پر مجھے محسوس ہوتے تھے تو میں ان کی ضد میں بالکل ہی دوسری انتہا پر جا کھڑا ہوا تھا۔

لیکن آج مجھے احساس ہوا کہ میرا ایسا رویہ کتنا غلط تھا اور اس کی وجہ سے میرے اپنوں کو کتنی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ انیق مسلسل بول رہا تھا۔ یہ اس کے سینے میں دبی ہوئی، گھٹی ہوئی باتیں تھیں جو شاید برسوں سے وہ میرے ساتھ کرنا چاہتا تھا۔ مجھے بتانا چاہتا تھا میرے ساتھ شیئر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے اس بے جا اصول کہ میں کبھی اپنے چھوٹے بھائی کی زندگی میں مداخلت نہیں کروں گا کے باعث اس کے اندر ہی جمع ہوتی گئیں اور آج میری ذرا سی محبت نے اس کی باتوں کے آگے بندھے ہوئے سارے بند توڑ دیے۔

"انیق زیادہ مت بولو۔ تمہارے لیے اچھا نہیں ہے۔ میں اب آتا جاتا رہوں گا۔" اس نے تشکر اور یقین بھرے انداز سے مجھے دیکھا اور سکون سے گاڑی کی پشت کے ساتھ سر ٹیک دیا۔

اس وقت وہ مجھے وہ چھوٹا سا نکو لگا جسے بچپن میں میرے یقین دلانے پر کہ یہ مذاق ہے "اس کا چہرہ ایسے ہی تشکر اور یقین سے بھر جاتا تھا اور اب مجھے اس کا یہ یقین ہمیشہ قائم رکھنا تھا۔

آمنہ مفتی

موسم کو اعلان دے

سردیوں کی اس دھندلی صبح آنولے کی جھاڑیوں پر کہرا لوٹ رہا تھا اور بچی کچی دودھ کے بلتوں ہے' سر اور کولہے پر مٹکے پگڈنڈی پر چلتی شہر کی طرف جا رہی تھی' جہاں نیسلے کا ملک کلیکشن سینٹر تھا۔ اوس آلودہ گھاس پر اس کے قدموں کے نشان یوں لگ رہے تھے کہ گویا کوئی سانپ مستاکے لہرا کے نکل گیا ہو۔

بچی نے بڑی وٹ پر کھڑے ہو کر مٹی کو ذخیرے میں گم ہوتے دیکھا اور پھر اپنا کنڑا اور خالی چھبی زمین پر رکھ کر خود بھی مرطوب گھاس پر بیٹھ گئی۔

"کتنے کانٹے چبھ گئے ہیں۔" اس نے اپنے کھردرے پڑتے ہوئے ہاتھ آنکھوں کے آگے پھیلائے۔ لمبی لمبی انگلیوں والے خوب صورت ہاتھ گلاب کے کانٹوں سے چھلنی ہو گئے تھے۔ چھبی میں اب بھی کتنی ہی پتیاں اور کانٹے پڑے تھے اور ایک لمبی ڈنڈی والا گلاب سب سے زیادہ سرخ' سب سے زیادہ حسین۔

اس نے یہ گلاب بڑی احتیاط سے اٹھایا اور گیلی اوس کے لمبے سے ہرے پتے میں لپیٹ لیا۔ وہ تصور ہی تصور دیکھ رہی تھی کہ جب وہ یہ پھول حسین شاہ کی میز پر سجائے گی تو ان بھوری خوب صورت' دل کھینچ لینے والی آنکھوں میں کتنی ممنونیت ہو گی۔

"ارے بشریٰ بی! تم کیوں اس قدر تکلیف کرتی ہو ہمارے لیے؟"

شہزادوں جیسے حسین و جمیل حسین شاہ نئے نئے فارم ہاؤس میں منتقل ہوئے تھے۔

سارے خاندان کا ریوں اور تانگوں کا کاروبار تھا۔ انار کلی سے پھیلتے پھیلتے فیروز پور روڈ اور اب ڈیفنس تک کتنے ہی آؤٹ لیٹ کھل چکے تھے۔ چھوٹے دونوں بھائی روپے بنانے کی مشین تھے مگر حسین شاہ کو خدا نے ناجانے کیوں ان کے ہاں پیدا کر دیا تھا۔ بے حد مرنجان مرنج' ملین مسکین اور رومانٹک سے حسین شاہ کو دیکھ کر آصف رضا میر اور "بھی بھی" کے دور کا اینٹا بھ بچن یاد آ جاتا تھا۔ ناجانے اب تک کیوں اکیلے بیٹھے تھے۔ چھوٹے بھائیوں کے بچے کالج میں پہنچ چکے تھے مگر یہ ابھی تک یوسف بے کارواں بنے اکیلے وونڈیاتے پھر رہے تھے۔

خدا نے حسین شاہ کو جی بھر کے حسن سے نوازا تھا۔ سوئی سوئی سی آنکھیں' بھورے بال' صندل کی ٹکیل جیسی پیشانی جسے بس دیکھتے ہی رہنے کو جی چاہے اور آواز ایسی کہ آنکھیں بند کر کے سنتے جاؤ' سنتے ہی جاؤ اور بس۔ اس کے آگے زمان و مکان کی سب وسعتیں سمٹ آئیں اور وقت کے ایک ایسے فریم آف ریفرنس میں چلے جائیں' جہاں دن اور رات کی تخصیص نہ ہو اور تھمے ہوئے وقت کے بڑے سے پتے پر حسین شاہ کی آواز کے موتی برسا کریں۔

یہ راتیں' یہ موسم یہ ہنستا ہنسانا
ہمیں بھول جانا' انہیں نہ بھلانا

اور بشریٰ کہیں سے گھومتی گھماتی اس فریم آف ریفرنس میں نکل آئی تھی۔ نہایت شستہ مزاج رکھنے والی بے چاری بشریٰ ایک ایسی ذرخیز ماں کی اولاد تھی' جہاں

دور کئی ایکڑ تک پھیلے کٹ فلاور روز تھے۔ تاحدِ نظر سرخ گلاب اور گلیڈی اولس، نرگس اور وائٹ لش فلرز، کھڑکی سے خوشبو سے لدی ہوائیں آتیں اور پچھی خدائے رحمٰن کی عظمت اور مہربانی کے احساس سے گنگ ہی رہ جاتی۔ مظاہر پرست بھی شاید اسی احساس کے اسیر ہوتے ہیں۔

مگر پچھی کے اس گولڈن پیریڈ کا توڑ، یوں اب ہوا جب حسین شاہ یہاں مستقل منتقل ہو گئے۔ اب اس کا یہاں رہنا تو "قطعاً" بے جواز اور معیوب ہو گیا۔ حسین شاہ کے دوست احباب ہر وقت ایک بلا مچا رہتا تھا اور یہ سب دوست 'شرابی، کبابی اور دیگر "سی" وغیرہ تھے۔ ایسی صورت میں پچھی کا فارم ہاؤس میں رہنا شہد کے چھتے کو پتھر مارنے کے برابر تھا۔ سات آٹھ مہینے یہاں رہ کر اب پچھی سے کرشن نگر کی گلیوں میں نہیں رہا جاتا تھا۔ تب اس نے ایک عجیب و غریب فیصلہ کیا، بنتی کے ہاں بطور پے انگ گیسٹ رہنے کا فیصلہ۔ داوی بہت بھڑ بھڑائیں۔ آپا بھی بہت چیخیں۔ جبیں ہوئے مگر اس کی دلیل مضبوط تھی۔ وہ کرشن نگر واپس جا کر دوبارہ غربت و افلاس کا پالا اپنے اور اپنے گھر والوں کے سر پر نہیں تان سکتی تھی۔

اور رہی بنتی..... تو اس کا کردار کیسا بھی کیوں نہ ہو، پچھی کے لیے وہ ایک ڈھال تھی اور یہاں رہ کر وہ فارم ہاؤس کی ہاؤس کیپنگ بھی کر سکتی تھی اور ڈیڑھ سو روپے دیہاڑی کے حساب سے پھولوں کے کھیتوں میں مزدوری بھی کر سکتی تھی۔ آج کل سیزن زوروں پہ تھا۔ پودے پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ شہر کے قریب ہونے کی وجہ سے لیبر مہنگی اور نایاب تھی۔ یہ چند دن ہی کمائی کے ہوتے ہیں، منشی دو سو روپے تک دینے پر تیار تھا۔ اس طرح ایک مہینے میں چھ ہزار آرام سے کمائے جا سکتے تھے۔

معاشی ضرورتیں انسان کو بہت بڑے بڑے سمجھوتے کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور یہ تو کوئی ایسا کام نہ تھا۔ بنتی کا دو کمروں کا گھر گاؤں کے سرے پر تھا۔ ایک کمرے میں بھائی اور بھابھی اور دوسرے میں بنتی اور بشریٰ۔

تہجد کے وقت کٹائی شروع ہوتی تھی۔ اوس میں بھیگے پھولوں کو کٹر سے ایک خاص لمبائی پر کاٹنا اور پھر پیکنگ۔ بس باقی پورا دن آپ کا اپنا۔

اور یہ دن تو بشریٰ کو لگتا تھا بس ویوے میں سما گئے ہیں۔ یوں شام ہو جاتی تھی اور حسین شاہ کی مخمور آنکھوں کا تصور لیے وہ اپنی کچی کوٹھری میں آپڑتی تھی۔ خیر حسن و عشق کے ان قدیم قصوں میں ایسا ہونا کوئی انوکھی بات نہیں۔ رانجھا بھی تو بھینسوں کا سرا بسا گوبر سمیٹتا ہو گا۔ یہ تو پھر بڑا لطیف اور شاعرانہ کام تھا۔

"بنتی..... بنتی..... میں اس دل کا کیا کروں؟" آسمان کا رنگ مدھم پڑ چکا تھا اور آس پاس کی زمین نم تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر تین اور لڑکیاں اور ایک بوڑھا جس کی ایک آنکھ 71ء کی جنگ میں ضائع ہو چکی تھی۔ اپنے کام میں مشغول تھے۔

"پچھی! ہوش کر جا، میں تجھے بتا رہی ہوں یہ عشق محبت کے چکر میں لوگ ہوتے مارے جاتے ہیں۔ تو آرام سے کام کر اور جہیز بنا، پھر میں تیری شادی منشی کے بھانجے سے کرا دوں گی۔ وکیل ہے، اپنی موٹر سائیکل ہے اور دھلے میں اپنا ذاتی فلیٹ۔" بنتی بے حد پریکٹیکل لڑکی تھی مگر آج کل پچھی کا پیٹ بھرا تھا، سو اس کے چالے کھوٹے ہو رہے تھے۔

"مگر اس دل کی ویرانی۔" پچھی نے آہ بھری اور تین خوب صورت لمبی ڈنڈی والے سرخ گلاب کٹر کٹ کر کاٹ کر اکٹھے ٹوکری میں ڈالے۔ بنتی نے غور سے اس میلو ڈرامیٹک لڑکی کو دیکھا اور دانت کچکچا کر بولی۔

"پچھی! پتا ہے حسین شاہ کتنا امیر ہے۔ اپنے جہاز ہیں پانی کے بھی اور ہوائی بھی۔ تو مر جے گی۔"

اور بشریٰ مر ہی تو گئی جب نیپکن کے کنارے ترپتے ترپتے حسین شاہ نے اچانک اسے پروپوز کیا۔ وہ پوری سوئی ہی انگلی میں گاڑ بیٹھی۔

"بشریٰ جی! ہماری زندگی میں بڑی تنہائی ہے۔ آپ

کے آنے سے بڑی دسراہٹ ہوگئی تھی۔ اب آپ کی والدہ سے سنا کہ آپ کی شادی ہو رہی ہے تو لگا کوئی عزیز بچھڑ رہا ہو۔"

تو سمجھے آپ یہ اماں کتو کا لگایا ہوا snore trop تھا۔ خرگوش نے گاجر کی مہک پالی تھی اور پھندے میں آچکا تھا۔ اب بس رسی کھینچنے کی دیر تھی۔

اور پھر ان دونوں کی شادی ہوگئی اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

اصولاً "تو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا مگر ہوا یہ کہ جب جلتی بجھتی شکو نے بشریٰ کو رخصت کیا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے اور رات کے سوا دو بجے بشریٰ جی کو سوتے سے جگا کر چیخ چیخ کر بے حال ہوتے حسین شاہ کو کمرے میں کسی گلگلی چیز کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔

"کیا چیز شاہ صاحب...!" اس نے خوف سے لرزتے ہوئے پوچھا۔

"بہت ہی گھگھی اور گلابی سی چیز۔" شاہ صاحب صوفے کی پشت پر اکڑوں بیٹھے چلا رہے تھے۔

"کوئی نام تو ہوگا اس کا۔"

"ہاہا... ہائے... ایسی چیزوں کے نام نہیں پوچھتے۔" شاہ صاحب نے ایک دلدوز چیخ ماری اور فجر کے وقت تک ماسی بناں اور اوپر کے کام والا لڑکا جیدا "گلگلی چیز" کو ڈھونڈتے رہے۔ ورنہ اب تو شاہ صاحب قطعاً "اپنا" آسن چھوڑنے کو تیار نہیں تھے کیونکہ ان کے خیال میں کام چور ملازم اس "چیز" کو کمرے میں ہی چھوڑ دیں گے۔

آخر کار یہ چھنگلی برابر چھپکلی کا پونگا کسی کونے سے برآمد کیا گیا اور جان خلاصی ہوئی۔

وہ ایک دن کے بعد ایک شام حسین شاہ اچھلتے کودتے کمرے سے برآمد ہوئے "وہاں کوئی لمبے بالوں والی نرم چیز تھی۔

"کیا چیز شاہ صاحب...!"

"شٹ اپ۔ کہا ہے نا ان چیزوں کے نام نہیں پوچھتے۔ جسٹ فائنڈ آؤٹ۔"

اور پھر کئی گھنٹے سرچ اینڈ کل آپریشن جاری رہا اور ایک ننھی سی چوہیا پکڑی گئی اس کی مونچھوں کو دیکھ کر حسین شاہ مطمئن ہوگئے کہ یہ لمبے بالوں والی نرم نرم چیز ہے۔

بس اب تو زندگی کا یہی طور تھا۔ چونچ والی چیز، پروں والی بھنبھناتی ہوئی چیز، رینگنے والی چیز وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام چیزیں ایک آدھ دن چھوڑ کر نا جانے کہاں سے حسین شاہ کے کمرے میں گھس آتی تھیں اور پھر گھنٹوں وہ صوفے کی پشت پر چڑھے لمبے لمبے بھاشن دیتے تھے۔

"یہاں ہوگی اونہہ ادھر دیکھو۔ ارے اُدھر تو دیکھا ہی نہیں۔"

بشریٰ بالکل نچڑ کر رہ گئی۔ دن رات کا آرام، کھانا پینا سب القط ہوا۔ زاہدہ سے ذکر کیا تو ایک دم اور ان سے توراں ہوگئیں اور لہجے میں گلیشیئر کی سردی لا کر بولیں۔

"سوواٹ! ایک چھوٹا سا فوبیا ہے۔ پلیز بلش... اب اتنا بھو نہیں۔ اتنے ڈیشنگ آدمی کی بیوی بن کر دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا۔"

دادی سن کر غرائیں۔ "بچھی! ناشکری نہ کر، یہ پوری لائن بیٹھی ہے تیرے پیچھے بیاہنے والی۔ خبردار جو بکواس کی۔"

شکو کی ہنسی ہی نہیں رک رہی تھی اور بلی کے سر سے مارے فکر کے دودھ کے بلٹوں جا پڑے اور سارا دودھ بڑی دت کی پھپھولی میں جذب ہوگیا۔

بشریٰ سر سر روتی جا رہی تھی اور مشی کا بھانجا اپنی موٹر سائیکل پر دھلے کو اڑا جا رہا تھا۔ ہاں کتو نے ضرور بڑی دردمندی سے بیٹی کو سمجھایا۔ "ان لوگوں کے لیے طلاق اور شادی کوئی مسئلہ نہیں۔ پچھلی مصیبتیں یاد کر اور آج کی تکلیف کا سوچ۔"

بس پھر بشریٰ کو سردیوں کی وہ صبحیں یاد آئیں، جب دوسروں کو ویلنٹائن ڈے رنگین بنانے کے لیے وہ کیسے اپنی انگلیاں فگار کرتی تھی اور اب وہ مزے سے پانچ سو کا فون کارڈ گلے شکووں میں اڑا دیا کرتی تھی۔

پس فوراً "تائب ہوئی اور گھر لوٹ آئی۔ حسین شاہ دو دن تو نارمل رہے پھر وہی مختلف النوع کی مخلوقات کا نزول شروع ہوگیا۔

بشریٰ نے دیکھا کہ حسین شاہ کے گھر والوں کو ان سے کچھ غرض نہ تھی بلکہ وہاں تو کسی کو کسی سے غرض نہ تھی۔ سب تنہا تھے، اکیلے۔ یہ ان کا خاندانی وصف تھا۔ ہر شخص اپنی بات کرتا تھا۔ اپنے بارے میں سوچتا تھا اور اپنی ذات میں محصور تھا۔ حسین شاہ بھی ایسے ہی انٹروورٹ تھے۔ سوائے اس وقت کے جب ان کے کمرے میں کچھ گھس آتا تھا۔

ماسی بناں کا کہنا تھا کہ جب تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ حسین شاہ نارمل تھے اور جتنے دن وہ میکے رہتی تھی، اتنے دن وہ بالکل ٹھیک رہتے تھے پھر یہ کیا تھا۔ اس کو ستانے کا کوئی انداز، کوئی نفسیاتی گرہ یا پاگل پن۔ سائیکاٹرسٹ کا نام لے کر بشریٰ کو زاہدہ کے ہاتھوں اپنی درگت بنوانا منظور نہیں تھا۔ ذہنی دباؤ بڑھتا گیا۔

☼ ☼ ☼

"اٹھو، جاگو۔ دیکھو یہاں کوئی چیز ہے۔" تاریکی میں ایک لرزتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"کیسی چیز؟"

"کوئی رینگنے والی پنجوں والی چیز۔"

"شی۔ چپ شاہ صاحب... بولیں مت۔"

"کیوں؟" حسین شاہ کی آواز میں خوف کی جگہ تشویش در آئی۔

"غور سے سنیں۔" بشریٰ کی آواز میں خوف تھا۔ اسے کچھ سنائی دے رہا تھا۔ کسی چیز کے رینگنے کی آواز پنجوں کی کرچ کرچ ایک لیلپاتی ہوئی جیبھ پر کسی حشرے کے چپکنے اور اس کے خارجی استخوان کے ٹوٹنے کی کڑکڑاہٹ، سب سنائی دے رہا تھا۔ خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور سارا بدن پسینے میں نہا گیا۔ یہ پنجے اور یہ بھوکی جیبھ اور یہ ننھی عیار آنکھیں یقیناً تھیں اس کمرے میں۔ ایک موجودگی ان چاہی موجودگی۔ اپنی غرض کو شکار ڈھونڈتی ہوئی ایک مخلوق کی موجودگی۔

خوف کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ خدشات کی کوئی تھاہ نہ تھی۔ اپنے ذاتی گھر کے اندر، اپنے کمرے کے بند دروازوں کے پیچھے وہ محفوظ نہیں تھی۔ چھت، دیواریں، فرش، بھاری دروازے سب بے کار تھے۔ ایک رینگنے والی حقیر چیز کے آگے بے بس جو کسی بھی وقت بغیر بتائے اس کے کمرے میں گھس سکتی تھی اور گھسی ہوئی تھی اور اگر اس کے دائرۂ اختیار میں ہوتا تو وہ اسے بھی اپنی برق سی لپکتی زبان سے چٹکا کر چٹ کر جاتی اور کیا ایسا ممکن نہیں تھا۔ قبل از تاریخ اس کے آباء یہ سب کرتے رہے تھے اور جب ہم اپنے آباء کے محیر العقول واقعات سے نشاۃ ثانیہ کی نوید لیتے ہیں تو کیا چھپکلیوں کی نشاۃ ثانیہ ممکن نہیں۔ Period۔

Go ing back to Jurasic

یہ سب اس نے افشاء کر دیا۔ حرف بہ حرف حسین شاہ سے کہہ دیا۔

"ہاں بچھی! بالکل درست۔ یہی خوف مجھے بھی ہے۔ ممکنات کی تو کوئی حد ہی نہیں۔" اب ان کی آواز میں اطمینان تھا۔ سکون، وہ سائیڈ ٹیبل یا صوفے پر چڑھنے کی بجائے بستر ہی پر بیٹھے تھے۔

"ڈھونڈیں اسے پلیز شاہ صاحب...!"

حسین شاہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر چپ ہوگئے۔ شاید اپنے سابقہ سرچ پروگرام یاد آگئے۔

"سنو بش...!" وہ کھنکھارے اور ذرا پست آواز میں بولے۔ "ہم دو ہیں اور وہ تنہا۔ خود ہی بھاگ جائے گی۔ lets sleep"

"ہاں ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔" بشریٰ بھی کتھارسس کے بعد کچھ مطمئن تھی پھر ان دخل در معقولات کرنے والی مخلوقات کی بدتمیزیوں پر تبصرے کرتے کرتے وہ دونوں نا جانے کب سو گئے اور پنجوں والی چیز رینگتی ہوئی کہیں اور چلی گئی اور اسٹڈی میں "سور فوبیاز" کی جلد کے اوپر "آئیے وہم کا علاج کریں" رکھی تھی۔

عمرہ بخاری

مکمل ناول

شادی کی ڈیٹ فکس ہوتے ہی اس نے سب سے پہلا فون انجی کو کیا تھا۔

"بہت مبارک ہو بھئی۔ اب تو تم بھی میرے شہر آجاؤ گی اور مزے کی بات یہ ہے کہ تم جوہر ٹاؤن میں اور میں ٹاؤن شپ میں یعنی بالکل قریب قریب ورنہ لاہور جیسا شہر اتنا پھیلا ہوا جیسے شیطان کی آنت ایک شہر میں رہنے کے باوجود ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"یہ ہماری پکی لگن تھی انجی! جو ہمیں ایک بار پھر قریب لے آئی ہے۔" شفق نے اک جذب کے عالم میں کہا تھا۔

"تو اور کیا ایک سال ہونے والا ہے ہمیں ملے ہوئے ورنہ کہاں وہ وقت تھا۔ ہم دن میں دو تین بار م

کرتے تھے۔" انجی نے بھی آہ بھر کر گزرے وقت کو یاد کیا۔

"انجی! میں سوچتی ہوں' کہیں مجھے بھی شادی کے بعد تمہارے جیسی سسرال اور شوہر نہ مل جائیں جو میکے آنے ہی نہ دیں اب دیکھو نا' شادی کا تمہارا یہ تیسرا سال ہے۔ پہلے دو سال تو میکے آتی رہیں مگر اب وہ اپنا اصل روپ دکھانے لگے ہیں تمہیں۔ میکے بھیجتے ہی نہیں۔"

"بس شوہر تو ایسے ہی ہوتے ہیں لیکن میرے ساتھ اس سال کچھ مجبوریاں بھی رہیں۔ پہلے ساس بہت بیمار رہیں پھر ان کا انتقال ہو گیا' جس کی وجہ سے اظہر بہت اپ سیٹ رہے' بچے بھی دادی کی کمی محسوس کرتے تھے۔ بڑی مشکل سے دوبارہ سے سب معمول پر آیا۔ اب تو میری حالت ہی دوسری ہے۔ ڈاکٹر نے سفر سے منع کر رکھا ہے۔"

"کیا؟" وہ زور سے چلائی۔ "ڈاکٹر نے تمہیں سفر سے منع کر رکھا ہے یعنی تم میری شادی پر نہیں آسکو گی؟"

"نہیں شفق! اگر تم اداس نہ ہو' میں ادھر لاہور میں تو تمہارے ولیمے کے فنکشن کو اٹینڈ کر لوں گی۔"

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ تمہارے ساتھ ایسی پرابلم تھی تو میں ڈیٹ آگے بڑھوا لیتی' خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم مجھے بتاؤ۔ کب تک فارغ ہو جاؤ گی۔ میں امی سے بات کرتی ہوں۔ تم میری شادی میں شریک نہ ہو' یہ کیسے ہو سکتا ہے انجی!"

"پاگل مت بنو شفق! آنٹی اتنی سی بات پر کبھی ڈیٹ تبدیل نہیں کریں گی۔"

"میں ضد کروں گی بھلا تمہارے بغیر خاک مزہ آئے گا انجی میری سب سے بہترین دوست ہی شادی میں شریک نہ ہو ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"میں تمہاری محبت کو سمجھتی ہوں' شفق! مگر تم بہت معصوم ہو' اصل میں ابھی عملی زندگی میں قدم نہیں رکھا۔ اس لیے ایسی نزاکتوں کو نہیں سمجھ رہیں مجھے بھی تمہاری شادی اٹینڈ نہ کر سکنے کا افسوس ہے مگر کر تو رہی ہوں۔ ولیمے کے فنکشن میں بھرپور شرکت کروں گی۔"

"ولیمے کے فنکشن میں بھرپور شرکت کا بھلا سوال! نہ مایوں' نہ مہندی' نہ ہی بارات ساری رونق تو انہی دنوں میں ہوتی ہے اور وہ آخری دن تو بس سب کھانا کھاتے ہیں اور اپنی اپنی راہ لیتے ہیں' بس میں کچھ نہیں جانتی امی سے بات تو ضرور کروں گی۔"

جس وقت وہ اپنی والدہ کے کمرے میں آئی۔ بھابھی بھی یہیں موجود تھیں اور امی سے کسی بات پر مشورہ چاہ رہی تھیں۔

"امی! پہلے میری بات تو سن لیں۔"

"کتنی بار کہا ہے شفق! جب بڑے بات کر رہے ہوں۔ درمیان میں مت بولا کرو۔ اب تو تمہاری شادی ہونے والی ہے' ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خود خیال کیا کرو۔" امی نے اچھا خاصا ڈانٹ دیا۔

"جی تو میں کہنے والی ہوں۔ مجھے ابھی شادی نہیں کرنا۔ آپ ڈیٹ آگے بڑھوا دیں۔"

"ہیں ہائیں! دماغ تو خراب نہیں ہو گیا تمہارا۔" امی تو اپنی جگہ سے اچھل ہی پڑیں مارے حیرت کے بھابی کا منہ بھی کھل گیا۔

"وہ ابھی میں نے انجی کو فون کیا تھا۔ ان دنوں ڈاکٹر نے اسے سفر سے منع کیا ہے۔ وہ شریک نہیں ہو سکے گی۔ میری اتنی پیاری اکلوتی دوست اس کے بغیر میں شادی کروا لوں۔ ایسی بے وفا نہیں ہوں۔"

"دیکھو ذرا اس لڑکی کو' دنیا نہیں کب اسے عقل آئے گی۔ ارے یہ کہاں لکھا ہے کہ سہیلی شامل نہ ہو تو نکاح نہیں ہو سکتا۔"

"بس امی! میں نے کہہ دیا ہے۔ جب تک انجی کو سفر کی اجازت نہیں مل جاتی۔ میں شادی نہیں کروں گی۔" بڑے آرام سے فیصلہ سنایا تھا۔

"یہ بات کرو ذرا اپنے ابا اور بھائی کے سامنے' اچھی طرح بتائیں گے وہ تمہیں۔ غضب خدا کا' سارے

خاندان میں بات پھیل چکی' ادھر لڑکے کے بھائی نے شادی میں شرکت کے لیے دوبئی اپنے آفس میں چھٹی کی درخواست بھی دے دی اور ادھر دلہن صاحبہ اس لیے ڈیٹ تبدیل کروانا چاہ رہی ہیں کہ وہ انجی صاحبہ تشریف نہیں لاسکتیں۔"

"آپ کو تو شروع سے ہی میری دوست سخت ناپسند ہے۔"

"اس میں پسند کرنے والی بات ہی کون سی ہے؟" بھابی نے ناک چڑھا کر اپنی ناپسندیدگی کا بھی اظہار کیا۔

"ہاں آپ کی اور امی کی رائے ہمیشہ اس کے لیے ایسی ہی رہی ہے اور کیوں نہ ہو' آخر آپ امی کی بھتیجی جو ہوئیں اور وہ باجی وہ بھی آپ دونوں کی ہی سگی ہیں۔ اکلوتی بہن کو بھی کسی قابل نہیں سمجھا۔"

وہ روہانسی ہو رہی تھی اور اس کی باتیں امی کا پارہ مزید چڑھا رہی تھیں۔

"سنو' سنو ذرا اس کی باتیں۔ کل کو شادی ہونا ہے اس کی اور بجائے اپنی غلطی ماننے کے یہ ہم سب کو غلط قرار دے رہی ہے۔ پتا نہیں تمہاری ساس سے کیا کہوں۔ ہم شادی کی ڈیٹ کس لیے آگے بڑھوا رہے ہیں۔ تمہارے ابا اور بھائی سے کیا کہوں۔ رشتہ داروں سے کون سا بہانہ بتاؤں اور انجی کم بخت! شکر کیا تھا چار سال پہلے جب اس کی شادی ہوئی تھی کہ چلو اب تمہارے سر سے اس کا بھوت اتر جائے گا۔ کیا معلوم تھا تمہارا بیاہ بھی اسی شرط پر ہو جائے گا۔"

"آپ لوگوں کو ہمیشہ اس بے چاری سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے حالانکہ وہ میرے ساتھ کتنی مخلص ہے اور بھیا کی شادی پر اس نے ہم سب کا کتنا ساتھ دیا تھا۔ کیسی رونق لگائی تھی۔ باجی کو تو ان دنوں بخار آرہا تھا۔ بستر سے اٹھنا تک محال تھا۔ یہ انجی ہی تھی جو میرے ساتھ ساتھ تھی۔"

اس کی بات پر بھابی کو بھی وہ سب یاد آ رہا تھا جو وہ بھولی کبھی نہیں تھیں۔ انجی کے قہقہے' ہنسی مذاق' وہاب سے حد سے بڑھی ہوئی بے تکلفی اور خود دلہن بنی بھابی پر بظاہر بے ضرر سے اعتراضات بھائی کو شادی کے دوسرے روز ہی اس لڑکی سے بے زاری ہونے لگی تھی جو سننے میں آرہا تھا۔ ایک ہفتے سے ادھر ڈیرا ڈالے ہوئے تھی اور اس کی چھوٹی نند شفق کی تو گویا اس میں جان تھی۔ ہاں اپنی پھوپھو یعنی ساس اور بڑی نند کی آنکھوں میں انہیں انجی کے لیے محبت یا اپنائیت کا کوئی رنگ دکھائی نہیں دیا۔ بڑی نند تو شادی کے چوتھے روز اپنے گھر اسلام آباد چلی گئی اب گھر میں شفق' پھپھو اور پھپھا جان ہوتے تھے یا پھر یہ دونوں نئے نویلے تو دولہا دلہن تھے اور وہ دیکھ رہی تھی انجی صرف شفق کی ہی دوست نہیں اس کے میاں وہاب سے بھی بہت بے تکلف ہے' وہاب بھی اس کے رکھ رکھاؤ اور ذہانت کے معترف ہیں وہ اکثر ارم کو مشورہ دیتی۔

"ارے بھابی! آپ نے اس سوٹ کے ساتھ وہ پرل کا سیٹ پہننا تھا ناں۔ کچھ اتنا خوب صورت لگتا۔" یا پھر۔

"آپ یہ نہیں وہ والی ساڑھی پہنئے دیکھئے گا میاں جی کتنی تعریف کریں گے پھر آپ میرا شکریہ ادا کرنا نہ بھولیے گا۔"

اور یہ سارے مشورے وہ وہاب کی موجودگی میں دیتی اور ارم کو غصہ اس پر آتا کہ وہاب بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تھے۔

ارم نے محسوس کیا کہ اسے خود کو نمایاں کرنے اور دوسروں کو کم تر ثابت کرنے میں مزہ آتا ہے۔ شادی پر شفق نے جتنے بھی کپڑے بنائے تھے' وہ سب انجی کے مشوروں اور اس کی پسند سے بنوائے گئے تھے' بری میں بھی مرضی اس کی چلتی جو ارم کی بڑی نند اور دوست صائقہ ساری تیاری پنڈی اسلام آباد سے نہ کر لیتیں۔ صائقہ اور ارم ہم عمر تھیں پھر آپس میں رشتہ داری بھی تھی تو ایک دوسرے کے ہاں پہلے سے آنے جانے کی وجہ سے وہ ارم کی پسند سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسی لیے بری اس نے بنوائی تھی۔

انجی شفق سے پورے چھ سال بڑی تقریباً ارم ہی کی ہم عمر تھی اور ارم کو ان دونوں کی دوستی پر حیرت تھی

اور اس کا اظہار اس نے پھپھو کے سامنے بھی کر دیا تھا۔

"ارے یہ شفق ہے ہی بے وقوف۔ تمہیں پتہ ہی ہے۔ صائقہ کی شادی ہم نے بہت جلدی کر دی تھی۔ شفق چھوٹی تھی۔ بہن کی کمی بہت محسوس کرتی تھی۔ یہ انجی لوگ ابھی دو تین سال پہلے ہمارے محلے میں شفٹ ہوئے تھے۔ بھائی کوئی نہیں۔ یہ پانچ بہنیں ہیں۔ شفق پہلے تو اس کی سب سے چھوٹی بہن کی دوست بنی تھی۔ وہ شفق کے ہی اسکول میں پڑھتی تھی۔ اسی کے لیے یہ ان لوگوں کے گھر جاتی تھی اور پتہ نہیں پھر کس طرح اس کی دوستی انجی سے ہو گئی اور یہ دوستی اتنی بڑھی کہ اب مجھے اس کی فضول کی محبت پر بے زاری ہونے لگتی ہے۔ میں تو اس لیے ان کے ہاں جانے سے منع نہیں کرتی تھی کہ گھر میں کوئی لڑکا تو ہے نہیں۔ لڑکیوں والا ہی گھر ہے ادھر گھر میں اس کا جی نہیں لگتا تو ادھر چلی جاتی ہے مگر یہ پتہ نہیں تھا یہ تو انجی کو جان کا روگ بنا لے گی۔ دن میں کئی کئی چکر اس کے گھر کے لگتے ہیں اور وہ بھی نہ دن دیکھتی ہے نہ رات جب جی چاہتا ہے منہ اٹھائے چلی آتی ہے اب وہاب سے کہہ کر شفق پر میں نے کچھ سختی کروائی ہے کہ ان کے گھر کا ماحول اب پہلے کا سا نہیں رہا۔ بڑی بہن نے پی آئی اے میں ایئر ہوسٹس کی جاب کر لی ہے۔ دوسری کسی آفس میں لگ گئی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں بہت ماڈرن دکھائی دینے لگی ہیں۔ یہ انجی پہلے بالکل سادہ سی ہوتی تھی مگر بہنوں کی دیکھا دیکھی اس کے بھی رنگ ڈھنگ بدل رہے ہیں اور شفق اس کا بہت اثر لیتی ہے۔ بس اسی لیے اب میں کچھ ڈر سی گئی ہوں۔"

اور آنے والے دنوں میں ارم نے دیکھا۔ پھپھو کا ڈر بے جا نہیں۔ انجی واقعی بڑی آزاد سی لڑکی تھی اور شفق کو اپنے ساتھ ساتھ لگائے رکھتی تھی۔ ہاں ارم نے جو رویہ اس کے ساتھ اپنایا۔ اس کے بعد اس نے ارم کے ساتھ زیادہ بے تکلف ہونے کی کوشش نہیں کی۔

ارم کی شادی کے دو ماہ بعد ہی انجی کی دوسرے نمبر والی بہن کی بھی اچانک شادی ٹھہری اور شفق نے گھر کے کام تو کروائے بازاروں کے بھی اس کے ساتھ خوب چکر لگائے یہاں تک کہ مہندی کے روز اسے تھکن سے بخار ہو گیا مگر انجی پھر بھی اسے اپنے ساتھ گھسیٹتی رہی۔

پھر ارم کی شادی کے ایک سال بعد جب انجی کی بات لاہور ٹھہری تو ارم اور پھپھو دونوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب تو شفق کی عقل بالکل سلب ہو چکی تھی' وہ صرف انجی کے اشاروں پر ہی چلا کرتی تھی۔ شادی میں شفق نے کام بھی خوب کیا اور بار بار اس کے گلے لگ کے روئی بھی بہت اور جب انجی کے دولہا کو شادی کے روز دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ کتنا سنجیدہ سا ہے۔ انجی بے چاری کیسے گزارہ کرے گی؟ سب لوگ اس کے دولہا کو سراہ رہے تھے۔ کچھ تو زبان میں کہہ رہے تھے۔

"انجی ایسے اچھے لڑکے کے قابل نہیں۔" لیکن شفق دوسرے انداز میں سوچتی اور دکھی ہوتی رہی۔

اور شادی کے تیسرے روز جب شفق اس کی جدائی میں رو رو کر پاگل ہو رہی تھی وہ ہنستی مسکراتی خوشبوؤں میں بسی اپنے دولہا کے ساتھ میکے آئی تھی۔ شفق کو اس کی آمد کی اطلاع ملی تو دوڑ کر اس کے گھر پہنچی اور بے ساختہ اس کے گلے لگ گئی۔

"ہائے شفو! کیا حال بنا لیا ہے میرے بغیر۔" انجی ہنسی پھر اپنے میاں سے بولی۔

"یہی وہ شفق ہے جس کے بارے میں میں نے بتایا تھا ناں میری محبت میں پاگل ہے۔"

"اچھا اچھا!" اس کے میاں نے دلچسپی سے دیکھا اور پھر بولا۔

"یہ بہت چھوٹی سی معصوم سی لڑکی ہے۔"

پتہ نہیں کیوں انجی کو پیاری سہیلی کے بارے میں میاں کی رائے کچھ پسند نہیں آئی بولی۔

"نہیں اتنی بھی چھوٹی نہیں۔ بس قد میں مجھ سے

چھوٹی ہے اور کچھ ہے یہ احمق سی' اسی لیے ایسی لگتی ہے۔"

شفق نے انجی کی بات پر کچھ زیادہ غور نہیں کیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ چاہ رہی تھی جادو کے زور سے اس کے میاں کو تو کہیں غائب کر دے پھر وہ ہو اور انجی ہو اور وہ اسے بتائے کہ اس کے بغیر یہ تین دن شفق نے کیسے گزارے ہیں۔ مگر انجی کہہ رہی تھی۔

"شفو! اس وقت تم اپنے گھر جاؤ۔ میں خود تم سے ملنے آ جاؤں گی۔"

"ہاں ابھی یہ دونوں ذرا گھومنے پھرنے جا رہے تھے۔ انجی اظہر بھائی کو اپنا شہر بھی دکھانا چاہتی ہے نا!" انجی کی چھوٹی بہن نے بتایا۔

"میں بھی چلوں؟" وہ پرجوش ہوئی کہ انجی اس کے بغیر کہاں جایا کرتی تھی۔

"نہیں۔ وہ میں اظہر کے ساتھ جا رہی ہوں نا۔ سمجھا کرو۔" اس نے میاں کو دیکھا پھر شفق کے کان کے قریب جھک کر بولی۔

"میں آؤں گی تمہاری طرف بہت سی باتیں بتانا ہیں' بے چین ہوں تم سے ملنے کو۔ ابھی تم جاؤ۔"

اس کے انداز پر شفق مسکرائی اک فخر سا محسوس ہوا اکلوتی سہیلی پر' بات مجھ سے ہی تو شیئر کرے گی اور گھر آ گئی۔

"بڑی جلدی واپسی ہو گئی؟" ارم سامنے ہی بیٹھی میگزین دیکھ رہی تھی اتنی جلدی اس کی واپسی پر حیرت ہوئی۔

"انجی اپنے میاں کے ساتھ کہیں جا رہی تھی کہہ رہی تھی شام کو آؤں گی تمہاری طرف بہت سی باتیں بھی تو بتانی ہیں۔" شفق نے انجی کے انداز میں ہی بھابی کے سامنے دہرا کر انہیں چونکا دیا۔ شفق ان دنوں فرسٹ ایئر میں تھی۔ معصوم سادہ سی لڑکی جو انجی کی آنکھوں سے دیکھتی اس کے دماغ سے سوچتی آئی تھی مگر اب انجی بیاہتا تھی نئی نئی دلہن جس نے اپنے تجربات مزے لے لے کر کسی سے بیان کرنے تھے۔

"نہیں' ایسا نہیں ہونا چاہیے۔" ارم نے سوچا اور ایک لمحے میں فیصلہ بھی کر لیا۔

پھر جب انجی ان کے ہاں آئی تو اس نے دونوں کو اکیلے بیٹھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس پر دونوں ہی جز بز ہو رہی تھیں یہاں تک کہ جب انجی نے شفق سے کہا۔

"آؤ تمہارے کمرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" تب بھی ارم ان کے ساتھ کمرے میں چلی آئی' بد مزہ ہو کر انجی جلد ہی اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کھانے پر روک لیتیں۔" اس کے جانے کے بعد پھپھو نے کہا تھا۔

تب اس نے آہستہ آہستہ سب کچھ پھپھو کے سامنے کہہ دیا! واقعی۔ انجی سے ایسی نزاکتوں کے احساس کا خیال ہی فضول تھا۔ ارم نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔

"اب وہ آئے گی تو آپ اسے صاف لفظوں میں سمجھا دیجیے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! میں ضرور اس سے بات کر لوں گی۔"

پھر دوبارہ انجی ان کے ہاں تب آئی جب شفق کے بے حد اصرار پر امی کو اسے اور اس کے میاں کو کھانے پر بلانا پڑا۔ میاں کے سامنے وہ چپڑ چپڑ سب سے بولنے والی بڑھ بڑھ کر مشورے دینے والی انجی خاصی سنبھل کر بیٹھی رہی۔ اگلے روز ہی ان کی واپسی ہو گئی اور شفق نے ایک بار پھر اسے آنسوؤں کی دھند میں رخصت کیا۔

اس کے بعد انجی شادی کے تین ماہ بعد آئی وہ دوسرے جی سے تھی اور حال سے بے حال ہو رہی تھی۔ اس کا کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

ان دنوں ارم کا چھوٹو بیمار ہوا تو اس نے شفق کو اپنے پاس اسلام آباد بلوا لیا کہ چھوٹے سے بیمار بچے کے ساتھ گھر بار دیکھنا اس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

گزرے تین سالوں میں وہ بہت کم رابطے میں رہیں مگر شفق ان لوگوں میں سے تھی جو محبت کرتے ہیں تو آخری سانس تک نبھاتے ہیں۔ وہ بھی انجی کو بھلا نہیں سکی اور شہریار کا رشتہ آنے پر جب اسے پتہ چلا یہ لوگ لاہور سے آئے ہیں تو وہ چونک گئی اور پھر اس نے اس رشتے کے حق میں کتنی ہی دعائیں کر ڈالیں صرف اس لیے کہ یہ رشتہ سہیلی کے شہر سے آیا تھا وہ اسی شہر چلی جاتی تو ایک بار پھر ملنے کی امید پیدا ہو جاتی۔

امی ابا بھیا ارم بھابی سب ہی کو یہ رشتہ پسند آیا تھا۔ مختصر فیملی تھی۔ شہریار اس کی والدہ اور بڑا بھائی جو سعودیہ میں مقیم تھا پھر شہریار کی جاب بھی اچھی تھی اور بھیا بتاتے تھے وہ ہنس مکھ اور خوش اخلاق لڑکا ہے۔

"ہماری شفق ابھی لاابالی مزاج کی مالک ہے۔ اس کے لیے ایسا ہی شوہر مناسب رہے گا جو خوش مزاج اور باتوں کو نظرانداز کر دینے والے مزاج کا مالک ہو۔"

"مجھے تو شہریار کی والدہ بہت اچھی لگی ہیں۔ نرم لہجے میں بات کرتی ہیں۔ پڑھی لکھی اور روشن خیال ہیں۔" یہ رائے ارم نے دی تھی۔

"ہاں واقعی بے حد معقول خاتون ہیں۔" امی بہو کے خیالات سے متفق تھیں وہ چپ چاپ سب سنے جاتی۔

پھر زیادہ دن نہیں گزرے رشتے کے لیے ہاں کر دی گئی۔ اس نے سب سے پہلے انجی کو فون کیا اور آج پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ فون اظہر نے اٹھایا۔

"مجھے انجی سے بات کرنا ہے۔" سلام دعا کے بعد اس نے کہا تھا۔

"انجی آپ کا مطلب انجم صاحبہ!" بڑی سنجیدگی سے وضاحت چاہی گئی۔

"اف کتنی روکھی پھیکی بات کرتا ہے یہ شخص حالانکہ میں نے بتایا بھی ہے شفق بات کر رہی ہوں۔ یقیناً جانتا ہے شفق ان کی بیگم انجم صاحبہ کی قریبی دوست ہے مگر مجال ہے جو حال احوال ہی پوچھ لیں۔" انجی لائن پر آ چکی تھی۔ اس نے جوش کے عالم میں تازہ خبر سنائی ساتھ ہی اس کے میاں کی شکایت بھی لگا دی۔

"ارے یہ شوہر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اب تو تم خود خیر سے بیگم بننے جا رہی ہو لگ پتہ جائے گا۔"

"اللہ نہ کرے جو وہ ایسے روکھے سڑے مزاج کے مالک ہوں۔"

"بس شفو! یہ تو مقدروں کے کھیل ہیں ورنہ تمہیں پتہ ہے۔ میں کتنی زندہ دل غضب کی سیر سپاٹے کی شوقین ہوا کرتی تھی جب تک سارے بازار کا راؤنڈ نہ لگا لوں۔ بالوں کا کلپ تک نہیں خریدتی تھی اب یہ حال ہے۔ ایک اسٹور پر جا کر کھڑا کر دیتے ہیں اور آرڈر ہوتا ہے۔ آدھے گھنٹے میں شاپنگ مکمل کر کے آؤ۔ میں ادھر نیچے کے پاس گاڑی میں بیٹھا ہوں۔"

"ہائے پھر تم کیا کرتی ہو؟" اسے بھی انجی کی عادت کا پتہ تھا۔ اس ظلم پر پریشان ہو کر چلا اٹھی۔

"ماننا پڑتی ہے۔" انجی نے آہ بھری۔

"اتنی فرمانبردار ہو گئی ہو!"

"ارے نہیں بھئی۔ اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ان کے ساتھ تو میں نے ایک بار ہی جانا ہوتا ہے۔ ویسے اکیلی تو میں جتنے میں دس چکر بازار کے لگا لیتی ہوں۔" انجی نے قہقہہ لگایا اس کی بھی جان میں جان آئی۔

"انجم! میں چائے کا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ اظہر کی آواز سیل پر بخوبی سن رہی تھی۔

"چائے ہی ہے نا کوئی دوا تو نہیں کہ ٹائم آگے پیچھے ہو گیا تو جان کے لالے پڑ جائیں گے۔ بنا رہی ہوں۔" انجی نے زمانے بھر کی بیزاری لہجے میں سمو کر میاں جی کو جواب دیا پھر بولی۔

"اچھا شفو! جی تو نہیں چاہ رہا مگر یہ ازدواجی زندگی کے مسئلے۔ جب تک چائے نہیں حلق سے اترے گی انہیں سکون کہاں آئے گا۔ بند کرتی ہوں پھر فرصت سے بات کریں گے۔"

"بے چاری انجی یہ اظہر تو پہلے دن سے ہی سب کو اکھڑ اور خشک مزاج لگا تھا۔ شکر ہے بھائی بتا رہی ہیں۔

شہریار بہت خوش اخلاق ہے۔" مگر شہریار کے بااخلاق ہونے کی اتنی خوشی نہیں تھی جتنا اظہر کی بداخلاقی پر رنج تھا۔ وہ رات جب تک سو نہیں گئی۔ انجی کی ویران ناکام ازدواجی زندگی کے بارے میں سوچتی رہی۔

☆ ☆ ☆

اس کی بات پکی ہوئی تو کچھ ہی دنوں کے بعد شادی کی ڈیٹ کا تقاضا بھی ہونے لگا۔ اصل میں شہریار کی والدہ کو اپنے بڑے بیٹے کے پاس جانا تھا۔ ان کا ارادہ تقریباً چھ ماہ وہیں رہنے کا تھا اور جانے سے پہلے وہ شہریار کا گھر بسانا چاہتی تھیں۔

امی ابا نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس روز وہ بھابی اور امی سے ادھر ادھر کی بہت سی باتیں بڑی اپنائیت اور بے تکلفی سے کرتی رہیں۔ انہوں نے بھابی کو شہریار کی پسند ناپسند کے بارے میں بتایا اور بری کے لیے شفق کی رائے معلوم کرنا چاہی۔

"آنٹی! آپ جو بھی بنائیں گی۔ ہمیں پسند ہوگا۔" ارم نے کہہ دیا۔ وہ جانتی تھی شفق کو ان باتوں کا کچھ اتنا سینس نہیں۔ پہلے انجی کی رائے چلتی تھی۔ اب وہ بھابی کے ساتھ جا کر امی کے مشورے سے خریداری کیا کرتی تھی۔

"اتنی بھی کیا جلدی ہے۔" ان کے جانے کے بعد شفق نے اعتراض کیا۔

"تمہیں اپنے گھر جانا ہے بیٹا! جتنی جلدی ہو جائے اچھا ہے۔"

"اچھا تو پھر میں ریڈ کلر کا غرارہ بنواؤں گی۔" جھٹ ضد چھوڑ کر فرمائش کر دی۔

"ریڈ کلر شہریار کو پسند نہیں ہے ابھی ابھی آنٹی جا کر گئی ہیں۔" ارم نے بتایا۔

"میں ریڈ غرارہ ان کے لیے نہیں اپنے لیے بنوا رہی ہوں۔" انداز اطلاع دینے کا سا تھا ارم کو ہنسی آ گئی جبکہ امی کچھ جز بز ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگیں پھر بھابی سے بولیں۔

"سمجھاؤ اسے اور یہ بات اچھی طرح اس کے دماغ میں ڈال دو۔ جو کچھ شہریار کو پسند نہیں وہ جہیز میں شامل نہیں ہوگا۔"

"اچھا اور جو وہ صاحب فرما دیں مجھے شفق پسند نہیں تو کیا مجھے بھی کٹ کر دیا جائے گا۔"

"اوہو! احمق لڑکی! اب اس گھر میں تھوڑے دن کی مہمان ہو۔ میں تمہیں سخت سست سنانا نہیں چاہتی مگر تم ہو کہ برابر میرا بلڈ پریشر ہائی کر رہی ہو۔ عقل کے ناخن لو۔ اب تمہیں ایک گھر سنبھالنا ہے۔"

"ہاں تو سنبھال لوں گی۔ یہ کوئی مشکل تھوڑا ہی ہے۔ کون سا گھر سر پر اٹھا کر رکھنا ہے۔" اس نے شانے اچکائے امی سر جھٹک کر کچن میں چلی گئیں۔

"پلیز بھابی! آپ کو پتہ ہے۔ مجھے ریڈ کلر اچھا لگتا ہے اور دلہن تو سجتی ہی ریڈ کلر میں ہے بس آپ امی کو سمجھائیں۔ بنوا دیں مجھے ریڈ غرارہ۔"

"شفق! دلہن اپنے دلہا کے لیے ہی سجتی سنورتی ہے نا۔ تو اگر دولہا کو ہی روپ نہ بھائے تو کیا فائدہ۔"

"کیوں نہ بھائے، دیکھیے گا کتنا اچھا لگے گا مجھ پر یہ کلر۔"

"مگر اسے یہ کلر پسند ہی نہیں ہے۔ پہلی ہی اسٹیج پر اس کی بات رد کرو گی۔ وہ کیا سوچے گا۔"

"ہاں بس آپ تو چاہتی ہیں میں ساری عمر اس کے اشاروں پر ناچتی رہوں مگر یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ آخر میں بھی انسان ہوں میری اپنی بھی تو کوئی سوچ ہے۔ یوں ذرا ذرا سی بات پر پابندی نہیں نہیں۔ مجھے انجی نہیں بننا۔"

"یہ انجی کا ذکر کہاں سے آ گیا اور کیا ہوا ہے تمہاری انجی کے ساتھ۔ میں نے تو اسے شادی کے بعد خوش باش ہی دیکھا ہے۔"

"ہونہہ خوش باش اس سڑیل بد مزاج کے ساتھ یہ تو حوصلہ ہے میری پیاری انجی کا جو ماں باپ کی عزت کی خاطر سب کچھ چپ چاپ سہے جا رہی ہے۔" اس

نے آہ بھری۔

"اچھا! اگر انجی جیسی لڑکی خود کو بدل سکتی ہے اپنے گھر کو بچانے کے لیے شوہر کی مرضی کے مطابق ڈھل سکتی ہے تو پھر تم کیوں انکاری ہو رہی ہو؟"

"کیا مطلب ہے آپ کا! انجی جیسی لڑکی! میری دوست کوئی ایسی ویسی نہیں ہے۔"

"ہاں ہاں سرخاب کے پر لگے ہیں اس کی دوستی میں۔ تم بھی کس کے ساتھ سر کھپا رہی ہو ارم! ساری دنیا میں خرابی ہو سکتی ہے مگر انجی میں نہیں' پتہ نہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے اور میری بات کان کھول کر سن لو۔ ایک شہر میں رہنے کا یہ مطلب بالکل نہیں کہ تم وقت بے وقت انجی کے گھر میں گھسی رہو یا اسے اپنے ہاں آنے کی دعوتیں دیتی رہو۔ اگر شہریار یا اس کی والدہ نے مجھ سے اس سلسلے میں شکایت کی تو یاد رکھنا۔ میں بالکل لحاظ نہیں کروں گی تمہارا کھل کر ان کا ساتھ دوں گی۔"

"آپ ہاں بھی کہیں تب بھی مجھے پتہ ہے ساری دنیا کی مائیں بیٹیوں کی سائیڈ لیتی ہیں اور آپ۔" وہ سر جھٹک کر ریسور رکھنے لگی۔

"ارم! تمہیں اس کے ساتھ سر کھپانے کی بالکل ضرورت نہیں بس جہیز کے کپڑوں میں ایک بھی ریڈ کلر کا جوڑا نہیں بنے گا۔ ہاں بعد میں میاں کو راضی کر کے چاہے بیسیوں بناتی رہے۔"

امی ہدایات جاری کر کے پھر کچن میں چلی گئیں۔ وہ پیر پٹختی اپنے کمرے میں آ گئی۔ ایک دو روز اس بات کا سوگ منایا پھر عادت کے مطابق بھول گئی۔

☆ ☆ ☆

اور جب شادی کی تاریخ رکھی گئی۔ سب سے پہلا فون انجی کو کیا۔ اس کا جواب سن کر سخت مایوسی ہوئی۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا آج کل اس حالت میں ہو۔"

"پہلے کوئی سیریس بات نہیں تھی۔ یہ تو ابھی ڈاکٹر نے سفر سے منع کیا ہے۔"

"ہائے میرے اللہ! کیا کوئی خطرے کی بات ہے؟"

وہ تو دہل گئی۔

"یہ نو مہینے خطرے کے ہی تو ہوتے ہیں۔ اب تم خود شادی شدہ ہونے جا رہی ہو۔ جب اس کنڈیشن سے گزرو گی تب پتہ چلے گا۔"

"انجی میں نے تو سوچا تھا۔ تمہیں پہلے ہی آنے کا کہوں گی۔ شادی ساری شاپنگ تمہاری پسند سے کروں گی مگر ہائے قسمت!"

"تو اور کیا مجھے بھی تمہاری شادی کا بڑا انتظار تھا مگر سب کچھ اپنے اختیار میں کب ہوا کرتا ہے۔" انجی نے بھی آہ بھری۔

پھر اس کے جہیز کی ساری تیاری امی اور بھابی نے کی درمیان میں صائقہ نے بھی اسلام آباد سے ایک دو چکر لگائے اور ان کی مدد کی۔ شفق کی رائے ان تینوں میں سے کسی کے لیے کچھ خاص معتبر نہ تھی اور یوں بھی وہ لباس کے معاملے میں ہمیشہ دوسروں کی پسند پر ہی انحصار کرتی آئی تھی۔

شادی کی تقریب انجی کے بغیر کس قدر پھیکی اور ادھوری سی تھی یہ شفق ہی جانتی تھی۔ مہندی کی شام بھی انجی کا فون آیا اور جب وہ دلہن بنی سیج پر اس کے خوب صورت ماحول میں بیٹھی تھی تب بھی انجی نے اسے یاد کیا مگر ان ہی نے خود ہی کال ریسیو کی اور اسے بات بھی نہیں کرنے دی۔

بارات میں زیادہ لوگ نہیں تھے اور جب وہ لاہور اپنے گھر میں آئی تو یہاں بھی سکون کا احساس تھا۔ اس کا کمرہ بڑی سادگی کے ساتھ سیٹ کیا گیا تھا۔

"تو بھلا لگتا ہے یہ نئی دلہن کا کمرہ ہے۔ کچھ تو چمک دمک کوئی ہار پھول مگر کچھ بھی نہیں سجایا۔ اسے بھاری پردے' دبیز قالین' قیمتی شو پیس متاثر نہیں کر سکے۔ اپنے محلے میں ہر لڑکے کی شادی پر جو اس کی دلہن کے لیے کاغذی پھولوں' چمک دمک والی پنیوں سے جو مسہری تیار کی جاتی تھی وہ اسے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی جب وہ دلہن بن کر سسرال میں اترے گی تو ایسا کچھ بھی نہیں ہو گا۔

"ٹی پنک غرارہ سیٹ میں وہ بہت اچھی لگ رہی

ہے۔" یہ سب نے کہا تھا مگر دل سے ریڈ غرارہ نہ پہن سکنے کا دکھ کم نہیں ہو سکا تھا۔ یہ تو امی کی وجہ سے میں ضد نہیں کر سکی مگر اب پوچھوں گی شہریار صاحب سے وہ دل میں تہیہ کر کے آئی تھی۔ مگر شہریار اتنی پیاری تیچر والا اور اتنا اچھا ہو گا یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔ بات پکی ہونے کے بعد ایک دو بار فون پر بات تو ہوئی تھی مگر تب اس نے حال احوال پوچھا اور بس مگر یہ جو رویہ تھا اس نے منٹوں میں شفق کو اسیر کر لیا تھا۔

صبح وہ موتیوں کے کام والا نیلا سوٹ پہنے بڑی مطمئن اور مسرور بیٹھی چائے کے گھونٹ لے رہی تھی۔

"ناشتا بھی تو کرو نا۔ یہ اتنا کچھ تمہارے اعزاز میں ہی سجایا ہے ورنہ میں تو ناشتے میں ایک گلاس دودھ' سلائس اور فرائی انڈا لینے کا عادی ہوں۔"

"کیا آپ ایسا سڑا ہوا ناشتا کرتے ہیں اور پلیز اب مجھے مجبور نہ کیجیے گا کہ میں بھی ایسا ناشتا کروں۔"

"نہیں بھئی میں بیگم صاحبہ کو بھلا کس طرح مجبور کر سکتا ہوں۔ آپ کا جو جی چاہے ناشتے میں لیں۔ حکم کریں گی تو ایک دن بازار سے حلوہ پوری دوسرے دن نان چھولے تیسرے دن نہاری پر اکتفا چوتھے دن مری پائے۔ پانچویں دن۔"

"بس بس رہنے دیں۔ یہ آپ شوہر حضرات صرف باتیں ہی کرتے ہیں ورنہ اپنی مرضی کے بغیر بیوی کا سانس بھی لینا پسند نہیں کرتے۔"

"اوہ میرے خدا! کس قدر غلط فہمیاں پال رکھی ہیں دل میں کس قسم کے شوہر حضرات کو دیکھتی رہی ہو اور کہاں ملیں ایسی بیویاں جن کی سانسوں کی آمدورفت پر بھی پابندی تھی۔"

"اب آپ اپنی مثال ہی لیجیے۔" تیکھی نظروں سے شہریار کو دیکھا وہ تو اچھل پڑا۔

"میری مثال ایک رات کی دلہن اور یہ کیا کہہ رہی ہے۔"

"مجھے کتنا شوق تھا۔ شادی کے روز ریڈ غرارہ پہنوں مگر آپ نے پابندی لگا دی۔"

"اوہ!" اس نے ہونٹ سکیڑے۔

"بہت زور دیا میں نے مگر امی اور بھابی نہیں مانیں۔ کہنے لگیں۔ جب شہریار کو ہی یہ کلر پسند نہیں تو پھر تم کیوں پہنو گی یعنی کہ یہی مطلب ہوا نا کہ اب میری پسند ناپسند ختم ہو چکی ہے جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہو گا۔"

"اوہو بندہ! مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ ریڈ آپ کا فیورٹ کلر ہے اصل میں بچپن میں چاچیوں' ماموں کو اسی کلر کو پہنے عجیب سا میک اپ کیے دلہن بنے خوف ناک صورت حال میں دیکھا ہے۔ وہ صورتیں میرے ذہن پر نقش ہو چکی ہیں' نہیں چاہتا تھا کہ میری بیوی بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی بن جائے۔ یار! دنیا میں اتنے خوب صورت کلر ہیں پھر یہ چیختا چلاتا کلر ہی کیوں؟ اب کل تم ٹی پنک پہنے اتنی خوبصورت لگ رہی تھیں کہ نظریں ہٹانا مشکل تھا۔ ہر بندہ تمہیں سراہ رہا تھا اور میں خود کو خوش نصیب تصور کر رہا تھا کہ تم میری شریک حیات جو بن گئی تھیں۔" شہریار نے کچھ یوں سراہا کہ وہ اپنا گلہ اور دکھ بھول ہی گئی۔

"مجھے لگتا ہے ابھی تک بچپنا بہت ہے تم میں۔" جب وہ اس موضوع کو بھول کر اورنج جوس لینے کی تیاری کر رہی تھی شہریار نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

"ہاں تو ماں کے آنگن سے اٹھ کر ادھر آئی ہوں۔ بی اے کے پیپر دے کر ابھی کمر سیدھی کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ رشتہ طے ہو گیا۔ اپنے گھر کی سب سے چھوٹی بیٹی پہلے لاڈ اٹھانے کو امی اور بابا تھیں پھر بھابی بھی آ گئیں تو میں کہاں سے سوبر ہوتی اور ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔"

"اچھا اس کا مطلب ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چانسز ہیں۔" وہ شرارت سے مسکرا کر بولا۔

"اچھا میں ذرا انجی کو فون کر لوں۔"

"انجی یہ کیا نام ہے اور پتہ بھی نہیں چل رہا۔ محترمہ ہیں کہ محترم۔"

"انجم نام ہے۔" انجی کا مذاق اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ سنجیدگی سے وضاحت کی۔

"چلو نام بتا کر تو معاملہ اور بھی گمبھیر کر دیا ہے۔"

"او ہو دوست ہے میری' اسی شہر میں بیاہی ہوئی ہے۔"

"اچھا کمال ہے اس شہر میں۔" اس نے آنکھیں پٹپٹا کر حیرت کا اظہار کیا کہ اسے شفق کا ایک دم سے خفا ہو جانا مزہ دے گیا تھا۔

اس نے شہریار کے انداز کو دیکھا ضرور مگر اس وقت انجی یاد آ رہی تھی دوسری کوئی بات کیے بغیر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی' آنے والی ملازمہ تھی اور شہریار کی والدہ کا پیغام لائی تھی وہ ان دونوں کو بلا رہی تھیں۔

"کچھ مہمان آئے ہیں جی۔ اصل میں اسی لیے بلایا ہے۔" وہ وضاحت کر رہی تھی۔ شہریار نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ساتھ لے کر چل پڑا۔

"انجی کو فون" وہ بس سوچ کر رہ گئی۔ پارلر جاتے ہوئے اس کی جٹھانی نے ہی ضروری سامان ساتھ رکھا اور اس میں اس کا سیل فون نہیں تھا۔

تیار ہو کر وہ میرج ہال پہنچی۔ اس کے میکے سے ارم' بھائی' بھیا اور باجی کچھ ہی دیر پہلے فیصل آباد سے سیدھے ادھر ہی پہنچے تھے۔ اس کی ساس نے انہیں فریش ہونے کو کہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی۔ انجی کیوں نہیں آئی؟ اسے تو اب تک ضرور پہنچ جانا چاہیے کہتی تو یہی تھی۔ ٹاؤن شپ' جوہر ٹاؤن کے بالکل برابر میں ہے پھر اتنی دیر' ابھی بھائی یا باجی ادھر آتی ہیں تو کہتی ہوں انجی سے رابطہ کرنے کی کوشش کریں۔ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ شہریار آ کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"تمہیں پتا ہے تم کتنی خوب صورت لگ رہی ہو اور ساتھ ہی کسی گہری سوچ میں گم' یقیناً" میرے بارے میں ہی سوچ رہی تھیں نا!"

"نہیں وہ انجی ابھی تک نہیں آئی۔"

"او ہو! کون ہیں یہ محترمہ جو میرے حق پر ڈاکہ ڈال رہی ہیں۔ یاد رکھو پرنسس! اب تمہاری سوچوں پر صرف ہمارا قبضہ ہونا چاہیے۔"

"مگر اس وقت مجھے انجی کی فکر ہو رہی ہے اس کی طبیعت بھی اچھی نہیں ہے نا۔"

شہریار کے کچھ کہنے سے پہلے مہمان اسٹیج کی طرف آنے اور ان دونوں سے ملنے لگے۔ اس کی نگاہیں ساری تقریب میں انجی کو ڈھونڈتی رہیں مگر وہ نہیں آئی اور اسے اب کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ خدا خیر کرے۔ اس کے ساتھ کہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گیا۔

میرج ہال سے گھر آتے اسے رات کے دو بج گئے۔ میکے والے وہیں سے رخصت ہوئے شہریار سے یہ وعدہ لے کر کہ وہ دونوں کل فیصل آباد آئیں گے۔

"صبح پہلے میں انجی کی طرف جاؤں گی۔ اس نے اپنا ایڈریس تو لکھوایا تھا اگر ایڈریس ادھر ادھر بھی ہو گیا ہے تو فون کر کے دوبارہ پوچھ لوں گی۔"

وہ یہ ارادہ کر کے لیٹی تھی مگر ابھی صبح کے سات ہی بجے تھے کہ اس کی ساس نے دروازہ بجا کر جگا دیا۔

"بیٹا! تمہاری امی طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے کل لاہور نہیں آ سکیں' ان کی وجہ سے تمہارے ابا کو بھی فیصل آباد رکنا پڑا۔ وہ منتظر ہوں گے۔ آپ دونوں جلدی سے ناشتا کر کے نکلنے کی تیاری کرو۔"

اور اسے امی [illegible] پتا چلا کیا ہوتے [illegible] انجی وہ نہیں آئی اور میں نے اس کے نہ آنے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ وہ سیل تلاش کرنے لگی۔ مجھے کم از کم اسے فون تو کر لینا چاہیے۔ سیل پتہ نہیں کدھر تھا اس نے پی ٹی سی ایل کو استعمال میں لاتے ہوئے سوچا مگر بیل ہوتی رہی۔ کسی نے اٹھایا نہیں' ابھی شاید وہ سو رہے ہوں گے۔ مایوس ہو کر ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

☼ ☼ ☼

فیصل آباد وہ ایک دن ہی ٹھہرے کہ شہریار کے بھائی اور بھابی کو واپس سعودیہ جانا تھا۔ شہریار نے ابا سے وعدہ کیا۔ ہم جلد ہی دوبارہ آئیں گے اور پھر بہت سے دن رکیں گے۔

"میں اتنے ڈھیر سارے کپڑے لے کر آئی تھی۔ آپ نے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ ہمیں ایک ہی روز ٹھہر کر واپس آ جانا ہے۔"

"تم نے اس بارے میں مجھ سے کچھ پوچھا ہی کب تھا۔"

"مگر بتانا تو آپ کا فرض تھا ویسے بھی یہ پروگرام آپ نے اور آپ کی امی نے بنایا تھا مجھے تو بس یہی کہا گیا تیار ہو جاؤ اور میں تیار ہو گئی۔ اتنے شوق سے میں یہ سارے کپڑے لے کر آئی تھی۔"

"یہ سب وہاں بھی تو پہنا جا سکتا ہے۔" اب کہ شہریار خاصا سنجیدہ ہو رہا تھا۔

"وہاں پہن کر کسے دکھاؤں گی۔ یہاں تو میری اتنی ساری سہیلیاں ہیں۔ باجی بھی ابھی یہیں موجود ہیں بھالی اور امی ہیں۔"

شہریار نے گہری سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا اور کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ پھر باقی کا جو ایک گھنٹہ وہ یہاں ٹھہرے، خاموش ہی رہا اور راستے میں بھی اس نے کوئی بات نہیں کی۔ شفق بہت تھکی ہوئی تھی۔ اس کی خاموشی کو محسوس نہیں کیا کچھ ہی دیر بعد سیٹ کی بیک سے سر ٹکا کر سو گئی۔ آنکھ جب ہی کھلی جب وہ گھر کے پورچ میں گاڑی لانے کے بعد اس کا شانہ ہلا رہا تھا۔

"اوفوہ! اتنی جلدی لاہور آ بھی گیا۔"

"جی اب باقی کی نیند بستر پر پوری کر لیجیے گا۔"

وہ دروازہ کھولے منتظر تھا اسے اترنا پڑا اسی طرح نیند میں جھومتی جھامتی اپنے کمرے تک آئی اور شہریار کی آمد سے پہلے ہی بستر پر گر کر پھر سونے کی تیاری کرنے لگی۔ وہ بیگ لے کر اندر آیا اسے بیڈ پر دراز پا کر ٹھٹکا۔

"شفق! امی اپنے کمرے میں ہماری منتظر ہیں۔ انھیں سلام تو کر لو۔"

"اوہو!" اسے جھٹکا لگا۔

"ہائے وہ کنوارپنے کا زمانہ اپنی مرضی کے دن اور راتیں۔" بڑے برے موڈ کے ساتھ وہ اٹھ بیٹھی۔

امی واقعی منتظر تھیں اور ظاہر ہے سلام کر کے فوراً تو اپنے کمرے کو روانہ نہیں ہوا جا سکتا تھا انہیں وہاں کچھ دیر بیٹھنا بھی تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح ناشتے کے بعد اس نے ایک بار پھر انجی سے رابطہ کیا تھا اور اس کا یہ کہنا میں اس وقت فیصل آباد میں ہوں اس کے لیے کسی جھٹکے سے کم نہیں تھا۔

"کب گئیں تم فیصل آباد؟"

"میں تو رات ہی وہاں سے آ رہی ہوں اور آج صبح پانچ بجے پہنچی ہوں۔"

"مگر کیوں انجی! میں نے ولیمہ کے روز بھی تمہارا اتنا انتظار کیا پھر بعد میں بھی تمہیں فون کرتی رہی۔ تمہارا کوئی جواب مجھے موصول نہیں ہوا۔ آخر بات کیا ہے؟"

"کیا بتاؤں شفق! بہت پریشان ہوں ڈاکٹر نے سیزیرین کا کہا ہے۔ امی کو پتہ چلا تو فیصل آباد لے آئیں کہ لاہور میں پھر میری دیکھ بھال کون کرتا۔ بس دعا کرنا میرے لیے۔"

"اللہ تمہیں صحت دے انجی! میرے حصے کی خوشیاں بھی تمہیں مل جائیں۔"

اس نے پورے خلوص سے کہا بظاہر اخبار دیکھتے شہریار نے اس دعا پر سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر سر جھٹک کر دوبارہ اخبار دیکھنے لگا۔

"تم ادھر لاہور ہی میں رہتیں میں جو آ گئی ہوں۔ میں تمہاری خدمت کرتی۔"

"ارے نہیں شہریار بھلا کیوں منع کرتے وہ ایسے تنگ دل نہیں ہیں۔"

"بالکل میں ان دو تین روز میں ہی ان کو جان گئی ہوں۔" شہریار کو ہنسی آ گئی جسے چھپانے کو اخبار چہرے کے آگے کر لیا۔

انجی پتہ نہیں کیا کیا بتاتی رہی فکر مندی سے اس کے چہرے کے زاویے بنتے اور بگڑتے رہے۔

"بس کرو اب ورنہ تمہارا چہرہ بالکل ہی بگڑ جائے گا۔" اس نے احساس دلایا تو وہ گھور کر رہ گئی۔

"انجی فیصل آباد چلی گئی ہے۔" رابطہ منقطع کر کے اس نے اپنی جانب سے بڑی اہم اطلاع دی تھی۔

"تو کوئی بات نہیں۔ فیصل آباد کوئی یورپ میں تھوڑا ہی ہے۔ جب تمہارا جی چاہے گا جا کر مل لینا۔"

"پتہ نہیں کیا لکھا ہے ہماری قسمت میں۔ میں فیصل آباد تھی تو وہ لاہور میں لاہور آئی ہوں تو وہ ادھر۔"

"اب اگر آپ مناسب سمجھیں تو کہیں آؤٹنگ کا پروگرام بنایا جائے۔"

"پلیز اس وقت جی نہیں چاہ رہا۔" مگر جب یہی بات شہریار کی والدہ نے بھی ان دونوں سے کہی تو اسے تیار ہونا پڑا۔

☼ ☼ ☼

ہنی مون پیریڈ پھر شہریار کی والدہ کی سعودیہ روانگی جب وہ انجی سے ملی تب اس کی شادی کو پورے دو ماہ ہو رہے تھے اور انجی کا دوسرا بچہ بھی دو ہی ماہ کا ہو رہا تھا۔ شفق نے اس ننھی گڑیا کے لیے خوب شاپنگ کی تھی۔

انجی کے ہاں جانے کے لیے وہ دل سے تیار ہوئی تھی اور خوشی اس کے ہر انداز سے چھلک رہی تھی۔

"بہت بچپنا ہے تم میں۔" یہ بات اکثر شہریار کہتا تھا اور آج بھی کہہ رہا تھا۔

"اس میں بچپنے والی کیا بات ہے؟" اس نے شانے اچکائے۔

"تو اور کیا بات ہے بھئی۔ کبھی تم میرے لیے تو اس طرح تیار نہیں ہو سکیں۔"

"آپ کا اور میرا ساتھ دو ماہ کا ہے جبکہ انجی کی اور میری دوستی بہت پرانی ہے۔"

"یعنی جب میرا اور تمہارا ساتھ بھی اتنا ہی پرانا ہو جائے گا تب تم میرے لیے بھی یونہی تیار ہوا کرو گی۔"

"یہ تو اس وقت کے تعلقات پر منحصر ہو گا۔" وہ ہنسی۔

"ویسے تب کتنا عجیب سا لگے گا نا جوان بچوں کی ماں اور ایسی تیاری۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ وہ جھینپ کر رہ گئی۔ سر جھٹک کر گجرے پہننے لگی۔

"ویسے یار! مجھے میک اپ میں لت پت، شوخ شوخ رنگوں میں لپٹی خواتین کچھ زیادہ اچھی نہیں لگتیں اور تمہیں تو ان چیزوں کی عادت بھی نہیں۔ سادہ ہی بہت پیاری لگتی ہو۔"

"مگر مجھے میک اپ کرنا کھلے کھلے شوخ رنگ پہننا بہت بہت اچھا لگتا ہے۔"

"او خدایا! شفق کم از کم گولڈ کا یہ اتنا بھاری سیٹ پہن کر تو مت جاؤ۔"

"تو کیا میں نے یہ لاکر میں رکھنے کے لیے بنوائے ہیں۔ یہ پہننے کے لیے ہی ہوتے ہیں جناب!"

وہ بس گہری سانس لے کر رہ گیا کہ جانتا تھا۔ یہ وہ معاملات ہیں جن میں شفق اس کی بالکل نہیں چلنے دے گی۔

انجی کی رہائش ان کے گھر سے دور نہیں تھی ایڈریس بھی مشکل نہیں تھا جب وہ دونوں اس کے ہاں پہنچے۔ وہ چھوٹی بچی کو سلانے کے بعد اب بڑے والے بیٹے کو تیار کر کے فارغ ہوئی تھی۔ اسمارٹ، سانولی سلونی، بڑی بڑی کالی آنکھوں والی انجی جس کے سیاہ چمکدار بال بے حد لمبے تھے۔ وہ یقیناً کچھ دیر پہلے نہائی تھی۔ بالوں کو ڈھیلی سی چوٹی کی صورت دے کر کمر پر گرا دیا گیا تھا ہونٹوں پر لپ اسٹک شاید آنکھوں میں کاجل ڈالا تھا یا اس کی آنکھیں ویسے ہی اتنی کالی تھیں۔ اس نے ایپل گرین سوٹ پہن رکھا تھا جس پر ہم رنگ موتیوں اور دھاگے کا انتہائی نفیس کام تھا۔ گلے میں ہلکا سا گولڈ کا لاکٹ، کانوں میں خوب صورت ڈیزائن کے چھوٹے چھوٹے ٹاپس بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں ایک انگوٹھی اور بازو میں نازک سی چار چوڑیاں۔

وہ تو انجی کی گرویدہ پہلے اس سے ملے بغیر ہی آ گیا تھا مگر اسے دیکھ کر خوش گوار حیرت کا احساس ہوا وہ بالکل یہ توقع نہیں رکھتا تھا۔ شفق جیسی کچھ کچھ بےوقوف اور جذباتی سی لڑکی کی دوست اس سے بالکل ہی مختلف اور اتنی پُروقار شخصیت کی مالک ہو گی۔ شفق جاتے ہی خوشی سے چیخ کر اس کے گلے لگ گئی تھی۔

اس نے مسکرا کر شفق کے گال پر بوسہ دیا اور شادی کی مبارک باد دی تھی۔
"ہائے انجی! تم کتنی کمزور ہو رہی ہو مجھے لگتا ہے کسی نے بھی تمہاری ٹھیک طرح سے کیئر نہیں کی تم خواہ مخواہ ہی ادھر چلی گئیں یہاں میں ہوتی تمہاری دن رات خدمت کرتی۔"
شفق بولتی رہی اس کے بیٹے کو گود میں بٹھا کر بار بار اس کا منہ چومتی رہی جبکہ انجی شاید شہریار کی وجہ سے جھجک رہی تھی۔
"تمہارے وہ سڑیل میاں دکھائی نہیں دے رہے؟"
شفق نے آگے کو جھک کر کچھ دھیمے لہجے میں پوچھا۔ شہریار کو اس کا یوں کہنا اچھا نہیں لگا مگر فی الحال وہ بولنا نہیں چاہتا تھا۔
"تمہیں پتہ ہے۔ بزنس مین ہیں اور بزنس مین کو اپنے بزنس کے آگے کچھ بھی عزیز نہیں ہوتا۔ شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔"
"اوہ تم نے بتایا نہیں۔ میں تمہاری عزیز ترین سہیلی شادی کے بعد پہلی بار اپنے میاں کے ساتھ آ رہی ہوں۔"
"بتایا تھا شفو مگر میں ان پر دباؤ تو نہیں ڈال سکتی نا!" اس نے رسان سے کہا۔
"واہ کیوں نہیں ڈال سکتیں اب تم میرے گھر آ رہی ہو اور یہ میرے صاحب آفس جانے کا موڈ بنائے بیٹھے ہوں، میں تو قیامت اٹھا دوں، کبھی نہ جانے دوں کیوں شہریار؟"
"واہ اور اسے بھی لی تو کس بات پر" شہریار نے انجی کی طرف دیکھا اس نے بھی نگاہ اٹھائی۔ دونوں ہی مسکرا دیے یقیناً شفق کے بچپنے پر یا اس کی سادگی پر۔
"اچھی گڑیا تو دکھاؤ۔ میں تو اس کے لیے اتنی ساری شاپنگ کر کے آئی ہوں بچی جب پتہ چلا کہ تمہارے ہاں بیٹی ہوئی ہے انجی! تو میں بتا نہیں سکتی مجھے کتنی خوشی ہوئی، یہ بتاؤ بچی ہے کس پر تم جیسی ہے یا تمہارے سڑے ہوئے میاں جیسی۔"
انجی نے پھر شہریار کی جانب دیکھا اور اسے متوجہ پا کر شرمندہ ہو گئی۔
"آؤ تمہیں اس کے پاس لے چلتی ہوں۔ سو رہی ہے نا ابھی۔" اس نے دھیرے سے کہا اور شفق کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"ٹھہرو نا یہ سب تو اٹھا لوں آخر بے بی کے لیے ہی لائی ہوں۔" ہاتھ چھڑا کر وہ پیکٹس سمیٹنے لگی۔
ڈرائنگ روم سے دونوں بیڈ روم میں آ گئیں۔ لگتا تھا آج انجی کی کام والی ماسی نہیں آئی تھی۔ ڈرائنگ روم تو صاف تھا مگر کمرے کی حالت ابتر ہو رہی تھی۔
خیر اس نے توجہ نہیں دی جا کر بچی کے کاٹ پر جھک گئی۔ "آرام سے اسے جگا نہ دینا۔ جاگتی ہے تو بہت شور مچاتی ہے اور مجھے یہ بتاؤ کیسا ہے وہ تمہارا میاں دیکھنے میں تو بہت اچھا لگ رہا ہے تم نے بتایا تھا اسے سنجیدہ مزاج، ذمے دار خاموش طبع لڑکیاں اچھی لگتی ہیں حالانکہ اس کے اپنے مزاج میں تو مجھے اظہر والی سنجیدگی محسوس نہیں ہوئی۔"
"شکر ہے خدا کا اظہر بھائی سے بالکل مختلف مزاج ہے۔ اب میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ کتنی شوخ سی زندہ دل ہوا کرتی تھیں اور اب کیسی سنجیدہ سی دکھائی دے رہی ہو، نہ وہ زیور نہ لباس کا کلر نہ میک اپ، اب مجھے دیکھو تو شہریار کو یہ سب پسند نہیں مگر مجھے منع بھی نہیں کرتے۔ دیکھو کتنی تیاری سے آئی ہوں۔" اس نے اپنے شاکنگ پنک کلر کے سوٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہنس کر کہا۔
"تمہارا یہ سوٹ مجھے بہت اچھا لگا بنوایا ہے یا خریدا ہے؟"
"باجی اسلام آباد سے لائی تھیں۔ تمہیں پسند آیا۔ تم لے لو۔"
"ہاں میرے سسرال میں ایک شادی ہے، اظہر کو تو تم جانتی ہو۔ کنجوس مکھی چوس جتنی قیمت کا یہ سوٹ لگ رہا ہے خریدنا تو دور کی بات وہ تو قیمت سن کر ہی بے ہوش ہو جائیں گے پھر یہ کلر بھی انہیں پسند نہیں آئے گا بس میں تم سے لے کر پہن لوں گی پھر واپس کر

دوں گی۔"
"میرے جہیز اور بری میں ایک سے بڑھ کر ایک جوڑے ہیں تم میری طرف آؤ گی تو سب دکھاؤں گی بس پھر جو بھی پسند آئے لے لینا۔"
"چلو یہ ٹھیک رہے گا اور یہ بتاؤ میاں کو زیادہ سر تو نہیں چڑھا لیا میری طرح۔"
"ارے انجی! شہریار تو خود ہی اتنی سویٹ نیچر کے مالک ہیں کبھی رعب ڈال کر بات کرتے ہی نہیں اور میری ہر بات ماننا تو جیسے اپنا فرض سمجھتے ہیں۔"
"زیادہ خوش ہونے کی بات نہیں بے وقوف شادی کے شروع دنوں میں اسی فیصد مرد ایسے ہی ہوا کرتے ہیں مگر سال گزرتا نہیں اپنا اصلی روپ دکھانا شروع کر دیتے ہیں۔"
"میرا نہیں خیال شہریار ایسے ہو سکتے ہیں۔"
ان میں باتیں ہو رہی تھیں کہ انجی کے کام والی ماسی آ گئی۔
"رکھی! تم صفائی رہنے دو ویسے بھی فرش تو صاف ہی ہیں۔ بس آج کچن کا کام سمیٹ دو۔"
"ٹھیک ہے بی بی جیسے آپ کی مرضی۔" اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا ویسے بھی کچن کا کام کرنے کی صورت میں اسے بھی کچھ نہ کچھ حصہ ملنے کی امید تھی۔

"میں نے بازار سے حلیم، چکن کڑاہی اور بریانی منگوائی ہے۔ کھیر بھی لا کر فریج میں رکھ دی ہے۔ تم سلاد اور رائتہ بنا لو۔ اس کے بعد منی کو بھی دیکھ لینا۔ بہت تنگ کرتا ہے۔ ضد پر آتا ہے تو بہلانا مشکل ہو جاتا ہے اسے یہاں قریبی دکان سے چاکلیٹس اور ٹافیاں دلوا دو۔ آرام سے بیٹھ جائے گا۔ میں اپنے مہمانوں کو اٹینڈ کر لوں۔" انجی نے بیڈ روم کی بکھری چیزوں پر کوئی توجہ نہیں دی۔ آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ لپ اسٹک دوبارہ لگائی پھر مڑ کر رکھی سے بولی۔
"پہلے کولڈ ڈرنک اور پھر چائے تو ڈرائنگ روم میں رکھ جاؤ۔ لو باتوں میں مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ ہائے شفو! کیا سوچتا ہو گا تمہارا میاں۔"
وہ جلدی سے رکھی کو ایک بار پھر ہدایت کر کے ڈرائنگ روم کی جانب بڑھی اندر کا منظر کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھا۔ ان لوگوں کا لایا فروٹ کمرے میں بکھرا ہوا تھا اور اس کا بیٹا موسمی اور سیب ہوا میں اچھال کر کھیل رہا تھا۔
"او منی!" اس کی آواز بہت اونچی ہونے لگی تھی پھر شہریار کا بروقت خیال آنے پر دبالی۔
"میں نے تو آپ کے صاحب زادے کو بہت منع کیا ہے مگر یہ مانتا ہی نہیں۔" شہریار اس کی سرگرمیوں کو یقیناً "انجوائے" نہیں کر رہا تھا۔
اتنی دیر میں سیب ایک شوپیس پر لگا اور وہ گر کر کرچیوں میں تبدیل ہو گیا۔ انجی نے بند ہونٹوں سے بچے کو بہت کچھ کہا پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر دھکیلنے لگی۔ بچے نے پوری آواز سے رونا اور چلانا شروع کر دیا۔ وہ بری طرح ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا اور انجی کے قابو سے باہر ہو رہا تھا خیر اس نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ اسے باہر لے جانے میں کامیاب ہو گئی۔
کھانا کچھ زیادہ پُرلطف نہیں تھا مگر انجی کی باتیں اور اس کی توجہ اس کمی کو پورا کر رہی تھیں۔ وہ کتنی محبت سے ایک ایک ڈش پیش کر رہی تھی اور پھر اس کی باتیں، شہریار بار بار چونک جاتا تھا۔ آج کے دور میں شوہر کے رنگ میں رنگ جانے والی، اس کی آنکھ کے اشارے سے مزاج کا اندازہ لگانے والی عورتیں بھی انہیں دل سے اصرار کیا تھا اور انجی نے وعدہ کیا تھا وہ ضرور آئے گی۔
"تمہاری دوست سے مل کر مجھے بہت حیرت ہوئی ہے۔" واپسی پر وہ کہہ کر شفق کو حیران کر رہا تھا۔
"کیوں حیرت کیوں ہوئی ہے۔ اتنی اچھی تو ہے بے چاری چھوٹے بچوں کی وجہ سے زیادہ اہتمام نہیں کر سکی مگر وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ آج بے چاری کی کام والی بھی اتنی دیر سے آئی۔ پتہ نہیں اس نے یہ سب کس طرح کیا ہو گا۔"
"اوہو! میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ وہ طبیعت میں، عادات میں تم سے بالکل مختلف

ہے "بہت ذمہ دار اور سمجھ دار محسوس ہوئی ہے مجھے۔"

"ہائے سچ! مجھے تو پہلے ہی پتہ تھا۔ انجی سے مل کر آپ بھی اس کے گرویدہ ہو جائیں گے۔"

"بچے نے بے چاری کو اچھا خاصا شرمندہ کر دیا۔ میں تو کب سے اسے منع کر رہا تھا مگر وہ سن ہی نہیں رہا تھا۔"

"چھوڑیں، بچے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انجی بتا رہی تھی۔ باپ کا بہت لاڈلا ہے، بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ تھوڑا سے کسی بات پر ٹوکتے ہیں نہ انجی کو زیادہ روک ٹوک کرنے دیتے ہیں۔"

"یہ رویہ تو بہت غلط ہے۔" وہ دونوں انجی کی باتیں کرتے ہی گھر تک آئے اور گھر آ کر بھی کئی روز تک ان کے درمیان انجی کا ذکر رہا۔

"تم بھی انجی کی طرح لائٹ کلر پسند کرو نا اور جیولری بھی ویسی ہی خرید لو۔" ایک روز شہریار نے کہا تو اسے انجی کی بات یاد آ گئی۔ شوہر کی ہر بات مان کر اسے سر پہ چڑھا لینا۔ جب یہ بات یاد آئی تو اس نے جھٹ نفی میں سر ہلا دیا اور بولی۔

"ہر کسی کی اپنی پسند ہوتی ہے اور پھر یہ لائٹ سے کلر، یہ سادہ سا روپ، یہ انجی کی اپنی پسند تھوڑی ہے۔ یہ تو اس کے میاں کی ضد ہے۔"

"ضد تو تم کہہ رہی ہو ناں انجی نے تو اپنی ازدواجی زندگی کے سکھ کی خاطر اسے خوشی سے اپنا لیا ہے۔"

"ہونہہ خوشی! اپنا آپ مار کر بھی کبھی کسی کو خوشی ملی ہے۔" اس نے لپ اسٹک ڈریسنگ ٹیبل پر پٹخی، شہریار خاموش ہو گیا۔

✿ ✿ ✿

انہوں نے انجی کو اپنے ہاں انوائٹ کیا۔ "کھانا ہم کسی اچھے ریسٹورنٹ میں جا کر کھائیں گے۔" شہریار نے رائے دی۔

"لو یہ کیا بات ہوئی گھر بلائیں پھر یہاں سے کھانا کھلانے کسی دوسری جگہ لے جائیں۔ میں خود سب کچھ گھر میں بناؤں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے پھر مجھے لسٹ بنا کر دے دو۔ ابھی جا کر سب لے آتا ہوں۔"

"آپ اکیلے کیوں، میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔"

"تم جا کر کیا کرو گی اتنے سیر سپاٹوں کے بعد بھی تمہارا جی نہیں بھرا۔"

"نہیں مجھے اچھا لگتا ہے بس میں کسی اچھے سے اسٹور سے خود یہ سب خرید لوں گی۔"

"اچھا بابا! چلی چلو لیکن اب کوئی کام والا سوٹ پہن کر شوخ سی لپ اسٹک مت لگا لینا۔"

"توبہ ہے۔ آپ کو بھی ناں ہر بات پر اعتراض کی عادت ہوتی جا رہی ہے۔ اب میری نئی نئی شادی ہے کپڑے تو میرے پاس ایسے ہی ہوں گے ناں، کچھ ہلکے کام والے کچھ بھاری کام والے۔"

"پھر تم نئے لے لو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کسی روز انجی کے ساتھ جا کر شاپنگ کر لوں گی۔" اس بات پر شہریار نے اطمینان سے سر ہلایا کہ یقیناً انجی اس کی بہت بہتر راہنمائی کر سکتی تھی۔

تین گھنٹے میں سامان خرید کر باہر سے کھانا کھا کر وہ دونوں گھر آئے تو شہریار سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا جبکہ وہ سیل لے کر لاؤنج میں بیٹھ گئی اور انجی سے باتیں کرنے لگی۔ اپنے اور شہریار کے درمیان کپڑوں پر ہونے والی باتیں بھی بتائیں اور یہ بھی کہ اب وہ انجی کے ساتھ بازار جا کر کچھ سادہ سے کپڑے خریدنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

"تم نے خوامخواہ گھر پر سب ارینج کر لیا کہیں باہر ہی کھانا کھا لیتے اب تم تو پکانے میں ہی لگی رہو گی۔"

"تم بھی میرے پاس کچن میں ہی آ جانا اور یہ دونوں میاں صاحبان اور بچے لاؤنج میں بیٹھیں گے۔"

"ہاں مگر تم پہلے مجھ سے پوچھ تو لیتیں۔"

"اچھا چلو اب تو میں سب کچھ لے آئی ہوں۔"

"کیا کیا لائی ہو؟" انجی نے پوچھا۔

"فش، چکن، بیف، کوفتے، رائس۔" وہ ایک ایک کر کے سب گنوانے لگی۔

"اتنا کچھ تم کیسے پکاؤ گی؟"

"ارے انجی! میری جان! تم میری فکر نہ کرو۔ تم تو چار سال پہلے بیاہ کر چلی گئی تھیں۔ تمہیں نہیں پتہ اس عرصے میں میں تو کھانا بنانے میں ماہر ہو چکی ہوں۔ میرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں۔ تم کھاؤ گی تو داد دو گی۔ ہاں بس ایک بات کا دکھ ہے۔ شہریار کو ہوٹلنگ کا بہت شوق ہے۔ وہ گھر کے کھانے کچھ خاص رغبت سے نہیں کھاتے حالانکہ میرے پکائے کھانوں کی ہر کوئی تعریف کرتا ہے۔"

"اس روز میرے گھر کا کھانا تو انہیں اچھا لگا تھا ناں؟" انجی کو وہ سب بتا تو چکی تھی پھر بھی وہ دوبارہ پوچھ رہی تھی۔

"ہاں ہاں تیز مرچ مسالے انہیں پسند ہیں۔"

اور انجی نے سوچا اسے کہتے ہیں قسمت۔ مجھے گھومنے پھرنے کا باہر کھانا کھانے کا کتنا شوق ہے مگر میرے میاں کے نزدیک گھر کی پرسکون لائف چھوڑ کر باہر کے ہنگاموں میں پناہ لینا وقت اور پیسے دونوں کا ضیاع ہیں۔

"شادی کے شروع دنوں میں کبھی کھانا باہر کھایا تھا اب تو ترس ہی گئی ہوں۔ اب موقع مل رہا تھا تو اس شفق کی بچی نے مجھ سے پوچھے بغیر فیصلہ کر کے ضائع کر دیا۔ آج ایک چکر پارلر کا لگا لینا چاہیے۔ اسکن کچھ رف ہو رہی ہے۔ نئے جوتے بھی لینے چاہئیں ساتھ میچنگ بیگ اور نیل پالش کا لائٹ مگر خوب صورت سا کلر اور جاتے ہوئے پھولوں کا خوب صورت سا بکے لے جاؤں گی۔ باقاعدہ گفٹ لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یوں بھی ان کی شادی کو ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ سب کچھ تو ہو گا ان کے پاس۔"

ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ ڈور بیل بجنے لگی۔

"اوہو! کون آ گیا؟" دروازہ کھولا تو برابر میں رہنے والے احسان صاحب کھڑے تھے۔

"السلام علیکم بھابی!" چہرے پر مسکراہٹ انداز میں بے تکلفی تھی۔

"ارے احسان بھائی! کیسے ہیں آپ؟" بڑے دنوں کے بعد شکل دکھائی۔

"آئیے نا! باہر ہی کیوں کھڑے ہیں۔ پلیز اندر آ جائیں۔"

"وہ بھابی! آپ کو تو پتہ ہے میری بیوی کا۔" وہ کھسیا کر ہنسے اور انجی کے چہرے پر ایک دم سے ہمدردی کا تاثر لو دینے لگا۔

"میں دراصل یہ پوچھنے آیا تھا۔ دو انڈے ہوں گے۔ وہ آج بیگم نے جو کچھ بنایا ہے نا۔ حلق سے اترنا مشکل ہو رہا ہے۔"

"اوہ!" انجی نے افسوس میں ہونٹ سکیڑے پھر بولی۔ "خوش نصیب ہیں روحانہ بھابی کہ شوہر کو پسند کا کھانا نہ ملا تو پڑوس سے انڈا لینے چلے آئے۔ کبھی اگر میرے میاں جیسے ہوں نا۔" سر جھٹکا، ایک بار پھر افسوس میں اوہ کیا اور بات ادھوری چھوڑ کر کچن میں چلی گئی۔ واپس آئی تو انڈے ہاتھ میں تھے اور وہ کہہ رہی تھی۔

"آئیے نا احسان بھائی! میں آپ کو کھانا بنا دیتی ہوں۔"

"جی تو چاہتا ہے بھابی مگر میری بیگم!" عجیب بے چارگی کا احساس دلاتا لہجہ تھا کسی ناپسندیدہ ہستی کا ذکر اور مظلومیت کی انتہا۔

"چلیے ادھار رہا۔ ویسے مجھے بہت ترس آ رہا ہے آپ پر۔ آپ اس وقت بھی آملیٹ لیں گے۔ اتفاق سے آج میں نے سالن نہیں بنایا ورنہ آپ کو ضرور دیتی۔"

احسان مشکور سا چلا گیا یہ سوچتا ہوا کس قدر خوش نصیب ہے اس عورت کا شوہر۔ یہ خیال نہیں آیا پوچھ ہی لے۔ شوہر گھر آنے والا ہو گا۔ ابھی تک سالن نہیں بنایا اسے کیا خالی روٹی پیش کرے گی۔

✿ ✿ ✿

شفق نے انجی کے لیے بھرپور تیاری کی تھی وہ دو

دن پہلے سے ہی کچن میں مصروف ہو گئی تھی اور شہریار بھی پوری دلچسپی لے رہا تھا اور اس شام اسکائی بلیو ساڑھی جس پر سلور ستاروں کا ہلکا سا کام تھا، سلور جیولری پہنے وہ تین سالہ بچی کے ساتھ شوہر کے بغیر ہی چلی آئی تو دونوں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

"اظہر بھائی نہیں آئے؟" شفق نے پوچھ ڈالا۔
جواب میں پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر دوڑ گئی۔

"ہر شخص شہریار نہیں ہوا کرتا۔ میری جان! کہ تم نے کہیں چلنے کو کہا اور تیار ہو گیا۔ قدر کرنا سیکھو اس کی۔"

"اوہو، آج تو انہیں آنا چاہیے تھا۔ تم اصرار کرتیں۔" شفق نے اس کی بات نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"تم کچھ سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہر بات میں ضد کیوں شروع کر دیتی ہو۔ ہماری دوست آ گئیں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے۔" شہریار نے شفق سے زیادہ انجی کو تسلی دی تھی جو یوں اکیلے چلے آنے پر رنجیدہ بھی (غالباً)

"ممّا! آپ تو کہتی تھیں۔ چاکلیٹ لے کر دوں گی۔" اس کے بیٹے کا موڈ بگڑنے لگا۔

"آئیے اندر چلیے۔" شہریار کو خیال آیا۔ وہ ابھی تک گیٹ پر ہی کھڑے تھے۔ کتنی بری بات ہے مہمان کو اندر بٹھانے کے بجائے یہیں کھڑے کھڑے سوال و جواب شروع کر دیے جائیں۔ یہ شفق بھی نا بس پوری احمق ہے۔

"ممّا! چاکلیٹ!" اس کا بیٹا اب پیر پٹخنے لگا۔

"او ہو نا، آنٹی دلاتی ہیں تمہیں چاکلیٹ۔" شفق نے بڑھ کر اس عام سی صورت والے سڑیل مزاج بچے کو گود میں بھر لیا اور لگاتار کئی بوسے بھی دے ڈالے۔

"بڑی والی چاہیے۔" اگلی فرمائش ہوئی۔

"وہ بھی ملے گی۔ پتا ہے مجھے بھی چاکلیٹ کا بڑا شوق ہے اور یہ تمہارے انکل بالکل نہیں کھاتے۔ میں بھی تمہاری طرح ضد کر کے لیتی ہوں۔" وہ بچے کو گود میں اٹھا کر کچن کی جانب بڑھتے ہوئے بتا رہی تھی۔

"پتا نہیں کب سدھرے گی۔ یہ شفو۔" اس کی باتوں پر شرمندہ انجی ہو رہی تھی۔

"آئیے۔" شہریار اسے لے کر ڈرائنگ روم کی جانب بڑھا اور بولا۔ "آپ جیسی دوست کی محبت اسے نہیں بدل سکی تو اب کیا بدلے گی۔ پتہ ہے۔ کبھی کبھی تو میں اس کی بچکانہ فرمائشوں پر حیران ہو جاتا ہوں۔"

"دراصل گھر میں چھوٹی ہے نا اور سب ہی خوب لاڈ پیار بھی کرتے تھے اور جہاں تک میرا تعلق ہے تو جناب ہم تو زمانے کی ٹھوکروں میں پل کر جوان ہوئے ہیں اور آج تک اچھے دنوں کی امید پر ہی جی رہے ہیں۔"

"آپ اتنی مایوس کیوں ہیں انجی! ان شاء اللہ آپ بہت اچھا وقت بھی دیکھیں گی۔"

"میں مایوس نہیں ہوں شہریار صاحب! اور اب اپنی دوست کو خوش دیکھ کر تو میں سب بھول ہی گئی ہوں۔"

"انجی! بچی کو کیوں نہیں لائیں۔ کس کے پاس چھوڑ آئی ہو؟" شفق بچے کو گود میں اٹھائے چلی آئی تھی اور اس وقت بچے کے ہاتھ میں چاکلیٹ کا پیکٹ تھا۔

"وہ ہماری ایک رشتے کی خالہ آئی ہوئی ہیں۔ ان ہی کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔ یہ ایک شیطان کیا کم ہے، توبہ شہریار صاحب! کیا بتاؤں آپ کو صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ میرے کام ختم ہونے میں نہیں آتے۔ بس میری عادت ہے ہر چیز کو ہر وقت درست جگہ پر دیکھنا چاہتی ہوں جب تک گھر کا کونہ کونہ چمکا نہ لوں۔ کچن کی ہر شے ٹھکانے پر نہ رکھ لوں۔ مجھے چین ہی نہیں آتا۔"

اور شہریار کو یاد آ گیا آج صبح شفق نے اس کی تین شرٹیں پریس کر کے اسٹینڈ پر ہی چھوڑ دی تھیں اور اس کے ٹوکنے پر کہا تھا۔

"اوہو آپ ہر بات کو سر پر کیوں سوار کر لیتے ہیں۔ دودھ بوائل کرنے کے لیے رکھا تھا۔ پہلے یہ کام کر لوں دودھ خراب ہوا تو زیادہ نقصان ہو گا اور کچن میں چلی گئی

تھی۔

"انجی! تمہاری صحت بھی ٹھیک نہیں۔ تم پہلے پوری طرح صحت یاب تو ہو جاؤ گھر کے کاموں کا کیا ہے۔ یہ تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ یوں خود کو ہلکان مت کیا کرو۔" شفق نے ہمدردی سے کہا تھا۔

"تمہیں نہیں پتہ جن لوگوں کے مزاج میں نفاست ہو انہیں ہر چیز کو جگہ پر رکھے بغیر چین نہیں آتا۔ میرا تو اپنا مزاج یہی ہے مگر یہ جو تم ہو نا۔" اس نے شفق کی جانب انگلی سے اشارہ کیا وہ ہنس پڑی اور بولی۔

"میں خود بھی کوئی پھوہڑ عورت نہیں ہوں جناب مگر آپ کو چونکہ بیٹھے بیٹھے حکم دینا ہوتا ہے اس لیے حد کر دیتے ہیں۔"

"اب کل ہی کی لے لو۔ رات کو مجھے اخبار میں ایک اداریہ دیکھنا تھا اور وہ اخبار جو اسی روز کا تھا ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملا۔"

"میں نے کہا تو تھا، وہ ملازمہ کا بیٹا ملازمت کی تلاش میں ہے کبھی کبھی وہ اس کے لیے اخبار لے جاتی ہے شاید وہی لے گئی ہو گی۔"

"شاید!" انجی چونکی "شفو تمہیں یہ پتہ ہی نہیں کہ تمہاری ملازمہ تمہارے گھر سے کیا کیا لے کر جا رہی ہے۔ توبہ حد ہوتی ہے لاپروائی کی، پتہ ہے عورت اپنے شوہر کے گھر کی امین ہوتی ہے۔ ایک ایک چیز کی نگران تم ملازمہ پر نظر رکھا کرو ان لوگوں کو ذرا سی ڈھیل ملنے کی دیر ہے۔ بس چلے تو پورے گھر کا صفایا کر کے چلتے بنتے ہیں۔"

"اللہ نہ کرے اور یوں بھی یہ تو بڑی ہی بھلی مانس، دکھوں کی ماری غریب سی عورت ہے۔" انجی نے ہنس کر شہریار کی جانب دیکھا اور بولی۔

"دیکھا وہی بات یہ جتنی بھی ہوتی ہیں انتہائی خود کو مظلوم بنا کر پیش کرتی ہیں اور میں تو ملازمہ رکھنے کے سرے سے خلاف ہوں یہ تو آج کل صحت اجازت نہیں دیتی اس لیے مجبوری ہے۔"

"ماما اور چاکلیٹ چاہیے۔" اتنی دیر میں اس کا بیٹا ایک پیکٹ ختم کر چکا تھا۔

"بری بات بیٹا!" انجی نے پیار سے بیٹے کو سمجھایا مگر بچے پر اس پیار کا الٹا اثر ہوا۔ نیچے لیٹ کر ٹانگیں چلانے اور چیخنے لگا۔

"اچھا اچھا میں ابھی اور لا دیتی ہوں۔" شفق نے اٹھ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ایک بار پھر اسے لے کر باہر نکل گئی ساتھ میں انجی کو بھی آنے کو کہا۔

"کیا کچھ بنا لیا ہے لاؤ میں کچھ ہیلپ کروں تم نے خوامخواہ گھر پر یہ سب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ آرام سے کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا کھا لیتے۔"

"تمہارے لیے یہ سب کر کے مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے انجی! دیکھو ذرا میں نے کیا کیا بنا لیا ہے۔"

"شہریار کو تم سے بہت شکایتیں ہیں؟" رازداری سے پوچھا۔

"نہیں بالکل بھی نہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو شکایتیں تو نہیں کہنا چاہیے بس انہیں سنجیدہ مزاج بیوی کی آرزو تھی حالانکہ خود یہ خاصے خوش مزاج ہیں مگر چاہتے تھے بیگم گھریلو قسم کی ہو۔ اسے شاپنگ کا کریز نہ ہو۔ سجنے سنورنے میں بھی اعتدال سے کام لے وغیرہ جبکہ مجھے گھومنا پھرنا رات کو دیر تک جاگ کر باتیں کرنا، دن میں دو دو بار لباس تبدیل کرنا ساتھ میں میچنگ جیولری استعمال کرنا اچھا لگتا ہے کہ یہی تو دن ہیں میرے۔ میں جانتی ہوں میری زندگی سے یہ دن لوٹ کر تو نہیں آئیں گے۔"

"بالکل ٹھیک کر رہی ہو تم۔ یہ مرد تو ہر بات میں اپنی ہی چلانا چاہتے ہیں۔" انجی نے اسے سمجھایا پھر ڈشز چیک کرنے لگی۔

پھر شفق کے بہت منع کرنے کے باوجود ٹیبل انجی نے سیٹ کی۔ اس کے اصرار پر بولی۔

"تم بس میرا بیٹا سنبھال لو۔ میرے لیے یہی بہت ہے۔ بچی صبح سے جو بچوں کے ساتھ لگتی ہوں تو شام ہو جاتی ہے۔"

"چلو پھر ٹھیک ہے اسے میں دیکھ لیتی ہوں شفو آنٹی کے ساتھ دوستی کرو گے نا!" وہ بچے سے باتیں کرنے لگی۔

اسے اکیلے ٹیبل سیٹ کرتے دیکھ کر شہریار نے ہیلپ کی کوشش کی مگر اس نے منع کر دیا۔

"مجھے اس کی عادت نہیں اظہر بھی ایسے کسی کام کو کرتے جو نہیں ہیں اب آپ ہاتھ بٹائیں گے۔ مجھے بڑا عجیب سا لگے گا۔"

اس نے ٹیبل سیٹ کر کے دونوں کو آواز دی۔ پھر دونوں کو کھانا بھی خود ہی پلیٹوں میں نکال کر دیا بلکہ شہریار کو کھانے کے دوران بھی بار بار پوچھتی رہی۔ مختلف ڈشز اس کی جانب بڑھاتی رہی' جب اس نے پانی کے گلاس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو جھٹ پانی انڈیل کر دیا۔

"یہ کباب تو اور لیں نا۔ اچھا چاول نہیں تو یہ روٹی لے لیں۔" وہ کتنی توجہ دے رہی تھی۔ شفق نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا اس وقت بھی وہ بچے کو کھانا کھلانے میں مصروف تھی۔ شہریار کی طرف تو خیر اس طرح کا دھیان اس نے کبھی نہیں دیا تھا۔ آج تو اس کی اپنی پلیٹ بھی ٹھنڈی پڑی ہو رہی تھی۔

شفق اچھا کھانا بناتی تھی مگر شہریار کو آج کھانے پر جو بہت مزہ آیا اس کی وجہ اس کا اچھا کھانا پکانا نہیں۔ انجی کا توجہ سے سب کچھ پیش کرنا تھا۔

"بہت خوش نصیب ہے انجی کا میاں!"

اور جب رات کے ساڑھے دس بجے وہ دونوں اپنی گاڑی پر انجی اور اس کے بچے کو ڈراپ کرنے گئے تھے اظہر صاحب گھر آ چکے تھے۔ بچی کو دودھ کا فیڈر بنا کر پلانے کے بعد اب وہ دو روز پہلے بنائے گئے دال چاول فریج سے نکال کر گرم کرنے کے بعد کھانے بیٹھے تھے۔

"اظہر بھائی! ہم نے تو آپ دونوں کو انوائٹ کیا تھا پھر آپ کیوں نہیں آئے؟" شفق پوچھ رہی تھی جبکہ شہریار کو یہ سانولا قدرے فربہ سنجیدہ سے چہرے والا مرد بالکل اچھا نہیں لگا تھا انجی کے ساتھ تو بالکل سوٹ نہیں کرتا۔

"بس کچھ کام تھا اس لیے آ نہیں سکا۔ میری طرف سے بہت بہت معذرت ویسے بھی جہاں انجی چلی جائیں میری ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اکیلی ہی کافی ہوتی ہیں۔"

پتہ نہیں یہ تعریف تھی یا کیا تھا شفق نے تائید میں سر ہلایا جبکہ انجی گھر آتے ہی بہت سنجیدہ ہو گئی تھی اور لب بھینچے کھڑی تھی۔ اس نے ان دونوں کو اندر آنے کو بھی نہیں کہا۔ یہاں تک کہ شفق نے جانے کی اجازت چاہی بچے کو انجی کی گود میں دیا کہ وہ گاڑی میں ہی سو گیا تھا اور خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں آ بیٹھی۔

"عجیب سا ہے انجی کا شوہر!" شہریار نے تبصرہ کیا۔

"ہے نا' میں تو خود ہی کہتی ہوں وہ انجی کے قابل ہی نہیں۔ بس انجی کے گھر والوں نے ایک بوجھ کی طرح اسے سر سے اتار پھینکا کہ اوپر تلے یہ پانچ بہنیں ہیں' بھائی کوئی ہے نہیں۔ جو رشتہ آیا ہاں کر دی۔ یہ نہیں دیکھا انجی کتنی اونچی سوچ رکھنے والی' کتنی خوب صورت اور منفرد سی لڑکی ہے اور یہ اظہر مجھے تو شادی کے روز بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ انجی کی قسمت کی خرابی پر میں تو بہت روئی تھی مگر انجی میں بہت صبر ہے اپنے دکھ کسی سے نہیں کہتی' ادھر میرے میکے میں تو سب ہی سمجھتے ہیں کہ انجی بہت خوش قسمت ہے۔"

بات ہو انجی کی تو شفق گھنٹوں بول سکتی تھی اور یہاں تو سننے والا بھی پوری طرح متوجہ اور اس سے متفق تھا۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز دن کے گیارہ بجے کے قریب جب شفق چھوٹے موٹے سب کام نمٹا کر وارڈ روب سیٹ کرنے کے خیال سے اٹھی تھی کہ انجی کا فون آ گیا وہ کہہ رہی تھی ابھی ابھی سو کر اٹھی ہوں اور پہلا کام یہی کر رہی ہوں۔

"ارے اتنی لیٹ گیارہ بج رہے ہیں۔"

"ہاں بس وہ اصل میں بچے بھی لیٹ اٹھتے ہیں تو میں سوچتی ہوں یہی وقت ہے پھر تو سارا دن گھر سیدھا کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا تم بتاؤ میاں جی گھر پر ہیں یا چلے گئے۔ لو وہ تو صبح آٹھ بجے ہی نکل کھڑے ہوتے ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ ناشتا تو تم ہی بنا کر دیتی ہو گی۔"

"ظاہر ہے انجی! میں تو صبح چھ بجے بستر چھوڑ دیتی ہوں۔"

"ہاں ہاں یہ سب تو کرنا پڑتا ہے یہ بتاؤ۔ کل میرے جانے کے بعد کیا باتیں ہوئیں۔ کچھ میرا ذکر بھی ہوا کہ نہیں۔" اس کے انداز میں بلا کا تجسس تھا۔ اسی وقت ڈور بیل ہونے لگی۔ شفق کا دھیان بٹ گیا بولی۔

"کچھ خاص نہیں ہم لوگ اصل میں تھکے ہوئے تھے تو جلدی سو گئے۔"

"شہریار کو میری تمہاری دوستی پر اعتراض تو نہیں ہے؟" انجی نے پھر بات نکالی۔

"وہ انجی باہر گیٹ پر کوئی ہے۔ میں پھر بات کروں گی۔"

☆ ☆ ☆

کچھ دنوں کے بعد میکے جانے کا اتفاق ہوا شہریار کو تو ایک دن رہنا تھا اسے چھوڑ کر اگلی صبح واپس آ جانا تھا جبکہ اس کا ارادہ تین چار روز ٹھہرنے کا تھا کہ قریبی کزنوں میں شادی تھی۔ میکے آتے ہی وہ مہمان بن کر بیٹھنے کے بجائے بھابھی کے پاس کچن میں آ گئی۔

"لائیے بھابھی! میں کچھ ہیلپ کرواتی ہوں۔"

"ارے نہیں شفق! کام کوئی اتنا زیادہ نہیں ہے ہاں تم یہ بتاؤ کیسی گزر رہی ہے؟ میرا خیال ہے شہریار تو بہت اچھے مزاج کا ہے۔ تمہارا بہت خیال بھی رکھتا ہو گا؟"

"بس بھابی! سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ بیوی کی ہر بات میں مین میخ نکالنے والے۔" اسے انجی کی بات یاد آئی اور اسی کے انداز میں دہرا بھی دی۔

"ابھی تمہاری شادی کو عرصہ ہی کتنا ہوا ہے۔ ہر شخص کا اپنا مزاج ہوتا ہے ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھنے اور اس میں ڈھلنے میں وقت تو لگتا ہے۔"

"بڑی مشکل سے منایا ہے انہیں کہ مجھے تین چار روز کے لیے فیصل آباد چھوڑ دیں۔"

"یہ تو اس کی محبت ہوئی نا۔ تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا۔"

"کہاں بھابھی! مرد بڑے مطلبی ہوتے ہیں۔" اسے انجی کے پڑھائے سبق یاد تھے۔

"گئی تھیں اپنی دوست انجی کی طرف؟" بھابی نے اسے سمجھانے کا کام پھر کسی وقت پر اٹھاتے ہوئے موضوع بدلا۔

"ارے لو ایک بار قریب ہی تو رہتی ہے ابھی کل بھی آئی تھی۔ اسے ایک شادی میں جانا تھا۔ میرے کچھ ڈریسز لے کر گئی ہے۔"

"تمہارے؟ مگر کیوں اس کے پاس کمی ہے کیا اور تمہارے بالکل نئے والے تو لے نہیں گئی جو تم نے ابھی پہنے بھی نہیں ہوں۔"

"ہاں وہی تو مگر پھر کیا ہوا وہ میری دوست ہے۔"

"شہریار کو پتا ہے؟" ارم نے پوچھا۔

"لو اس میں انہیں بتانے والی کیا بات ہے اور اگر پتہ چل بھی جاتا ہے تو وہ کیا برا مانیں گے۔ وہ تو خود انجی سے اتنے متاثر ہیں۔" چمچہ ارم کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

"شہریار کے ساتھ جاتی ہو اس کے گھر' جتنی دیر وہاں رہتی ہو وہ بھی ادھر ہی رہتا ہے یا تمہیں ڈراپ کر کے آ جاتا ہے؟"

"اب تو شہریار کی بھی بہت دوستی ہو گئی ہے۔ اصل میں متاثر تو وہ پہلی ملاقات میں ہی ہو گئے تھے۔ اب تو جتنی باتیں مجھ سے ہوتی ہیں اتنی ہی ان سے ہوتی ہیں۔"

"اور اس کا میاں کیا۔ اس سے بھی شہریار کی دوستی ہو گئی ہے؟"

"وہ گھر ہوتا ہی کہاں ہے آپ کو نہیں پتا بھابی! انجی بہت دکھی عورت ہے اس کی گھریلو زندگی بہت ڈسٹرب ہے' مجال ہے جو اس کا میاں گھر کو ذرا سا بھی وقت دے' پتہ نہیں کہاں کہاں پھرتا رہتا ہے۔ اگر بڑا بزنس مین ہوتا تو گھر میں بھی خوش حالی دکھائی تو دیتی مگر وہاں پرانے سے برتن' اڑے رنگوں کی بیڈ شیٹس۔ بس ہر شے میلی میلی۔ یہ تو انجی کی ہمت ہے چپ چاپ لب

"انجی جیسی بیوی اور تمہارے بارے میں کیا کہتے ہیں شہریار؟" ارم بہت سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔

"میرے بارے میں" وہ زور سے ہنسی "کہتے ہیں بہت بچپنا ہے تم میں لاپروا بھی ہو اور بچوں کی طرح ضد بھی کرلیتی ہو۔"

"تعریف بھی تو کرتے ہوں گے۔" ارم ہنسی وہ اس کا ساتھ نہیں دے سکی۔

"پتا ہے انہیں میرا کام والے کپڑے پہننا برائٹ کلر کی لپ اسٹک استعمال کرنا بالکل پسند نہیں اور آئی شیڈو سے تو جیسے انہیں الرجی ہے۔ کہتے ہیں انجی سے ہی سبق سیکھو۔ یقین نہیں آتا۔ تم لوگ اتنی پرانی دوست ہو تمہارے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"انجی تو ہمیشہ شوخ کلر استعمال کرتی تھی بلکہ ضرورت سے زیادہ بھڑکیلے کپڑے پہنتی تھی۔"

"ہاں میں تو خود حیران ہوئی جب وہ ایک بدلے ہوئے روپ میں سامنے آئی۔"

"اس نے ملنے سے پہلے تم سے پوچھا تھا کہ شہریار کو کیا اچھا لگتا ہے اور کیا پسند نہیں؟"

"اس نے کیا پوچھا تھا۔ میں نے خود ہی سب کچھ بتایا تھا۔ آپ کو پتہ ہے انجی سے میں بھلا کچھ چھپا تھوڑی سکتی ہوں۔"

"دیکھو شفق! میں جانتی ہوں۔ تمہارے دل میں جو محبت انجی کے لیے ہے' وہ میرے لیے نہیں ہے مگر تم میری پھپھو زاد بہن بھی ہو اور نند بھی' میں تمہارے لیے بھی برا نہیں سوچ سکتی۔ تم سے جو بھی کہوں گی۔ غور سے اور ٹھنڈے دل سے سننا۔ کچھ عورتوں کو نمایاں رہنے اور دوسروں پر چھا جانے کا شوق ہوا کرتا ہے۔ میں نے آج سے بہت سال پہلے جب میں بیاہ کر

بھیا نے اچانک انٹری دی۔

"بس سب کچھ تیار ہے۔" بھابی جلدی جلدی بولیں اور اسے برتن ٹیبل پر رکھنے کو کہا۔

پھر مصروفیت میں یہ بات مکمل کرنے کا اس روز موقع نہیں ملا۔

اگلے روز کچھ مہمان چلے آئے۔ پھر شادی کا فنکشن' ارم جو بات کرنا چاہتی تھیں موقع نہیں مل رہا تھا مگر یہ بات دل سے نکلی نہیں تھی۔

جب وہ شہریار کے ساتھ واپسی کے لیے تیار تھی تو بس ارم اتنا ہی کہہ سکی۔

"انجی کی طرف کم جایا کرو۔ اپنے گھر کی جانب اور شوہر کی جانب توجہ دو۔"

اور بھلا اتنی سی بات کا انجی کی دیوانگی پر کیا اثر ہو سکتا تھا جبکہ وہ یہ بھی جانتی تھی ارم بھابی شروع سے ہی انجی کو ناپسند کرتی ہیں۔

لاہور پہنچتے ہی اس نے انجی کو اپنی واپسی کی اطلاع دی۔

"میری طرف آؤ ناں بلکہ میں آج دوپہر کو آجاؤں گی کھانا بھی مل کر کھائیں گے۔"

"سچ انجی! میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے۔ آجاؤ بہت سی باتیں کرنا ہیں۔"

"وہ شہریار کو تو اعتراض نہ ہو گا کہ اتنے دنوں کے بعد بیگم آئی اور سہیلی بھی آ ٹپکی ہے۔"

"ارے وہ کوئی گھر میں تھوڑی بیٹھے ہیں۔ آفس گئے ہیں۔"

"آفس یعنی آج بھی آفس ہے انہیں تمہارے آنے کی کوئی خوشی نہیں ہے۔"

"خوشی تو ہے مگر جاب بھی تو ضروری ہے ناں انجی!"

[illegible] سے بکھرا گھر سمیٹنا تھا ملازمہ تو آتی تھی مگر صرف جھاڑو پوچا لگاتی تھی۔ باقی ڈسٹنگ بھی کرنا تھی۔ شہریار کے بہت سے میلے کپڑے بھی رکھے تھے۔ استری کے لیے بھی اس نے نکالے تھے۔ سب سے ابتر حال میں کچن تھا۔ وہ جلدی جلدی سب سمیٹ رہی تھی۔ جب انجی آئی۔ کچن سمٹ چکا تھا مگر وہ رف سے حلیے میں تھی اسے نہانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

"ہائے شفو! کتنا یاد کیا میں نے تمہیں۔" وہ بچی کو گود میں لیے بچے کی انگلی تھامے اس کے سامنے تھی۔" ذرا ٹیکسی والے کو فارغ کرو اور تمہارے کپڑے بھی واپس لے آئی ہوں ٹیکسی میں کالا بیگ ہے۔ اس میں رکھے ہیں۔ وہ بیگ بھی اٹھا لانا۔"

"مما! بسکٹ چاہئیں۔" بچہ ضد کر رہا تھا وہ ٹیکسی والے کی جانب لپکی۔

اس سے فارغ ہو کر آئی۔ بچہ مسلسل شور کر رہا تھا۔ اس کے لیے بسکٹ نکالے۔ انجی کو بتانے کے لیے بہت سے قصے تھے مگر اس نے بھی تو فنکشن اٹینڈ کیا تھا اور وہ بھی بہت کچھ بتانے کے لیے بے چین تھی۔ اس کے قصے شفق سے کہیں زیادہ سنسنی خیز تھے۔

"پتہ ہے وہاں ایک میجر صاحب تو مجھ پر عاشق ہی ہو گئے۔ بس جدھر میں' ادھر ہی میجر صاحب' یہ جو تم سے ڈریسز لے کر گئی تھی۔ میں بتا نہیں سکتی مجھ پر کتنے اچھے لگے۔ کتنی خواتین نے تو مجھ سے اس بوتیک کا نام پوچھنا چاہا۔ میں نے کہہ دیا۔ رہنے دیں ضروری نہیں جو مجھ پر جچ رہا ہے وہ آپ پر بھی جچے۔ بس شفو! کیا بتاؤں اس جواب پر کیسے منہ نکل آئے تھے ان کے بڑا مزہ آیا۔"

"اظہر بھائی نے بھی تعریف کی؟" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

جواب میں انجی نے منہ بنایا اور بولی۔

"تو کہیں اچھا نہیں لگا؟" اسے حیرت ہوئی تھی۔

"جو ہر وقت تعریف ہی کرے پھر اس کی بات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ تمہاری ابھی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھو گی۔ بس تم ذرا ان میجر صاحب کی تو سنو' ہائے بس شفو! یہ مرد بھی ناں ہوں گے چالیس کے قریب۔ بیوی بھی اسمارٹ سی کیوٹ سے بچے مگر جہاں میں وہاں ان کی پیاسی نگاہیں۔ سچی تم ہوتیں تو دیکھتیں بڑا مزہ رہا۔"

"اظہر بھائی بھی تو وہیں ہوں گے انہوں نے میجر صاحب کی تم پر نگاہ کو محسوس نہیں کیا مرد تو اس معاملے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ مرنے مارنے پر بھی اتر آتے ہیں؟"

"کیا شہریار نے ایسا کچھ کیا؟" وہ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے پوچھنے لگی۔

"ہاں جب ہم لوگ ہنی مون کے لیے کاغان گئے تھے ناں تو کئی بار بس میری وجہ سے ان کا جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اچھا تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بنا لاؤں۔"

"صرف چائے نہیں بھلکڑ لڑکی! تمہیں بتایا تو تھا۔ ہم لوگ دیر سے سو کر اٹھتے ہیں' چھوٹی کو تو فیڈر بنا دیا تھا۔ بیٹے کو تو بھوکا ہی لے آئی تھی۔ اسی لیے تو اب بسکٹ کے لیے ضد کر رہا تھا۔"

"ہائے انجی کیسی ظالم ماں ہو تم!" اس نے بچے کے گال پر بوسہ دیا۔

"مجھے پتا تھا اپنی خالہ کی طرف جا رہا ہے۔ اس لیے ناشتا نو پرابلم۔"

"ہاں میں لنچ میں اچھا سا تیار کرلوں گی۔"

"لنچ پر تمہارے میاں صاحب بھی ہوں گے۔"

"ہاں بھئی ظاہر ہے وہ تو ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے پھر لنچ ہمیں باہر ہی جا کر کرلیں گے۔"

"نہیں نہیں انجی اتنے دنوں کے بعد تو گھر آئی ہوں

شہریار نے کہا تھا آج کوفتے بناؤں گی تو اب مجھے اچھا نہیں لگتا کہ وہ گھر آئیں اور میں کہوں کچھ بنایا ہی نہیں۔ پھر کبھی چل کر کھائیں گے۔"

"میں تو مہمان ہوں میزبان تم آپ تم جو بھی جہاں بھی کھلاؤ گی چپ کر کے کھالوں گی۔"

انجی کی باتوں کے دوران ہی اس نے وارڈ روب سیٹ کی۔ شہریار اپنی نفاست پسندی کا ڈھنڈورا بھی تو خوب پیٹتا تھا۔ مگر اتنے دن میں مجال ہے جو کچھ بھی ٹھکانے پر رہا ہو۔

انجی قصے سناتی رہی۔ وہ کمرہ سیٹ کرتی رہی بیڈ شیٹ تبدیل کر کے جب وہ لاؤنج میں آئی۔ انجی بھی ادھر آگئی۔ لاؤنج وہ انجی کی آمد سے پہلے سیٹ کر چکی تھی مگر بچنے کا اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اسے ایک بھرپور لنچ کی تیاری کرنا تھی۔ بہت کچھ تو بازار سے منگوانے والا تھا۔ اس کے لیے انجی نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔

"بچوں کو تم دیکھو۔ میں بس یوں گئی اور یوں آئی۔" انجی جھٹ کھڑی بھی ہوئی۔ اس نے لسٹ تھمادی۔

واقعی انجی نے بڑے پھرتی دکھائی۔ ایک گھنٹے میں لدی پھندی واپس آگئی۔

"اتنا کچھ؟" وہ ٹھٹکی اس نے یہ سب نہیں منگوایا تھا۔ شاید وہ اپنی شاپنگ بھی ساتھ ہی کر آئی ہے۔ یہی سوچ کر اس نے سوال نہیں کیا۔

"لو بھئی شفو! میں نے تو تمام پیسے جو تم نے دیے تھے خرچ کر ڈالے۔ یہ سوچ کر کہ روز روز تمہیں پریشانی نہ اٹھانی پڑے۔" اس نے سب سے پہلے دو تین طرح کے بسکٹس کے پیکٹ اور پھر چاکلیٹ کے پیکٹ نکالے۔ پھر آئس کریم پیک کی باری آئی۔ موسمی فروٹ اور آخر میں اس کی مطلوبہ چند اشیاء۔ بیٹے کو چاکلیٹ اور اس کی پسند پوچھ کر بسکٹ پکڑائے خود فروٹ لے کر بیٹھ گئی۔

"آؤ ناں تم بھی۔ بہت میٹھی ہے۔" اس نے موسمی کا مزہ لیتے ہوئے اسے بھی دعوت دی مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا۔

وہ کوفتوں کا مسالہ بنا چکی تھی مگر وہ بھی ٹیبلی رائس، چکن کڑاہی کے مسالے کی تیاری ابھی باقی تھی۔ شامی کباب کا قیمہ بھی ابھی ابھی چولہے پر رکھا تھا۔ دو تین طرح کے سلاد بھی بنانا تھے بیٹھے میں تو چلو انجی جو آئس کریم لائی ہے وہی چل جائے گی۔

اس کا خیال تھا سلاد کے لیے وہ انجی سے کہہ دے گی مگر اس کی بچی نے نیند سے جاگ کر رونا شروع کیا تو پھر انجی کو سوائے اسے سنبھالنے کے کچھ بھی ہوش نہیں رہا۔

"یہ میرے دونوں بچے بھی ناں مجھ پر پڑے ہیں۔ غصے سے خوب چیختے چلاتے ہیں۔" انجی بچی کو کاندھے سے لگا کر تھپکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"اور اظہر بھائی کیا وہ غصے میں شور نہیں ڈالتے؟"

"ارے وہ پورا گھنا آدمی ہے۔ مجال ہے جو کبھی اپنے جذبات کا اظہار کرے۔ بس چپ چاپ جو کہوں گی 'مانتا چلا جائے گا اور یار! میرے خیال میں شوہروں کی رائے کو زیادہ اہمیت دینا بھی نہیں چاہیے۔ اب آج مجھ سے فرمار ہے تھے۔ آج مٹر پلاؤ کھانے کو جی چاہ رہا ہے میں نے کہا۔ میں تو اپنی دوست کی جانب جا رہی ہوں بازار میں بہترے کھانے ملتے ہیں جو کھانے کو جی چاہے کھالیا کریں' بس شفو! تمہیں تو پتہ ہے گھر میں مجھ سے بڑی دو بڑی بہنیں تھیں اور دونوں ہی کوکنگ کی شوقین۔ ایسے میں میرے لیے کہاں گنجائش رہ جاتی تھی پھر میری امی خود بھی کھانا بنانے اور گھریلو کاموں میں مصروف رہنے کو ترجیح دیتی تھیں مجھے تو بس گھومنے پھرنے کا شوق رہا ہے۔ خواہش تھی جیون ساتھی بھی ایسا ملے گا' اسے تو اپنے بزنس سے ہی فرصت نہیں اور بزنس بھی کیسا؟ آمدن گزارے لائق اور خواری ہر وقت کی میں تو کہتی ہوں یہ کام چھوڑ کر کوئی دوسرا شروع کر دو اور نہیں تو اسپیئر پارٹس کی دوکان ہی کھول لو کہ بزنس بھی وہ اسی کا کرتے ہیں مگر فرماتے ہیں۔ یہ سب اتنا آسان نہیں 'بھاڑ میں جاؤ۔ جہنم میں جھونکو مجھے کیا۔" انجی شاید تصور میں شوہر کو سامنے پا رہی تھی

اسی لیے تلخ ہو رہی تھی۔

"اچھا تم اپنا موڈ مت خراب کرو۔ یوں جل کڑھ کر تو اپنی صحت برباد کر لو گی۔ پلیز انجی! میری خاطر اور اپنے ان معصوم بچوں کی خاطر آخر انہیں تم کو ہی دیکھنا ہے۔ اپنی صحت اچھی نہیں ہو گی تو ان کی دیکھ بھال کیسے کر پاؤ گی۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔"

بچی سو چکی تھی وہ اسے لٹانے کے لیے اندر چلی آئی واپس آ کر فریج سے جوس کا پیکٹ نکالا اور گلاس میں ڈال کر پینے لگی۔

"ماما! مجھے بھی دو۔" اس کا بیٹا کچن کے سامنے لاؤنج میں ہی بیٹھا پرانے میگزین سے کھیل رہا تھا جوس دیکھ کر فوراً ادھر آیا۔

"اوہو ایک تو تم بھی نایاب کی طرح مجھے کھاتا پیتا نہیں دیکھ سکتے" انجی کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ اس لیے پینے بیٹھ گئی تھی نہیں پیتی۔ تم پی لو ہو جاؤ خوش۔" انجی نے گلاس اس کے قریب پٹخ دیا۔

"انجی! او انجی! ایسے کیوں بولتی ہو تم اور لے لو نا۔" اس نے منانا چاہا۔

"کیسے لے لوں۔ تم بھی کیا سوچو گی؟"

شفو نے آگے بڑھ کر فریج کھولا اور دوسرا گلاس بھر کر اسے تھمانے کے بعد پھر کام میں مصروف ہو گئی۔ انجی جوس پینے کے دوران بھی اسے اپنی زندگی کے دکھوں کے بارے میں بتاتی رہی وہ سن سن کر افسردہ ہوتی رہی۔

شہریار گھر آیا۔ اس کے سامنے کچن میں دو خواتین موجود تھیں ایک اس کی بیوی جس کے بال بکھرے تھے کپڑے ملگجے اور پاؤں میں باتھ روم سلیپر تھے اور دوسری بہترین تراش خراش کا فٹنگ والا اسٹائلش سوٹ پہنے لائٹ میک اپ کیے ہوئے سامنے تھی اور اس کے پیروں میں جوتی بھی بہت اچھی تھی۔ اس کے چہرے پر نرم مسکراہٹ تھی اور شہریار کی گاڑی کی آواز سنتے ہی وہ سلاد بنانے کی تیاری میں بہت کچھ اپنے آگے رکھے چھری ہاتھ میں لیے بیٹھی گاجر چھیل رہی تھی جبکہ شفق اس کی کہانی سن سن کر افسردہ سے چہرے کے ساتھ سامنے تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟ کب آئیں؟" شہریار نے بہت اخلاق سے پوچھا۔

"میں اچھی ہوں بس آج آپ لوگوں سے ملنے کو جی چاہا تو چلی آئی حالانکہ جانتی تھی یہ کتنے دنوں کے بعد میکے سے آئی ہے۔ آپ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ وقت گزارنا پسند کریں گے مگر پھر بھی بس رہا نہیں گیا۔"

"کیسی بات کرتی ہیں آپ۔ یہ آپ کا اپنا گھر ہے اور ہمیں تو خوشی ہوتی ہے جب آپ ہمارے گھر آتی ہیں۔"

"تو اور کیا مگر یہ مسلسل ایسی ہی باتیں کر کر کے مجھے غصہ دلاتی ہے۔"

"غصے میں آنے والی بات نہیں ہے شفق! یہ تو تمہارا رویہ ہے جو اس گھر سے ان کی اجنبیت کے احساس کو ختم کر سکتا ہے۔" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا اور شفق اثبات میں سر ہلانے لگی۔

انجی کا بیٹا تو لاؤنج میں ٹی وی پر کچھ دیکھتے بلکہ چینل سرچ کرنے میں مصروف تھا کمرے میں آیا تو اس کی بیٹی بیڈ پر سو رہی تھی۔ فیڈر قریب ہی اوندھا پڑا تھا اور دودھ نپل سے ٹپک کر نفیس چادر بھگو رہا تھا تکیے کے پاس پیمپر کا پیکٹ جبکہ بیڈ پر ہی اس کا بیگ ادھ کھلا رکھا تھا سائیڈ ٹیبل پر بھی کچھ اشیاء دھری تھیں۔ اس نے بے اختیار شفق کو آواز دے ڈالی۔

وہ آئی تو بولا "یہ کیا پھیلاوا ہے؟ تم یہ سب سمیٹ کر ایک طرف رکھو۔ انجی تو مہمان ہے تم اسے یہ سب رکھنے کی جگہ بتاؤ اور پلیز بچی اٹھ جائے تو بیڈ شیٹ چینج کر دینا۔ یہ دیکھو فیڈر سے دودھ ٹپک گیا ہے۔"

اگرچہ دودھ بہت معمولی مقدار میں گرا تھا مگر شہریار کی نفاست پسند طبیعت پر گراں گزر رہا تھا۔

"آپ تو معمولی سی بات کا بتنگڑ بنا لیتے ہیں جہاں چھوٹے بچے ہوتے ہیں وہاں یہ سب تو ہوتا ہی ہے۔" وہ ابھی ابھی انجی کی مظلومیت کے قصے سن کر ہی تو

آ رہی تھی اسی لیے شہریار کا یہ سب کہنا اسے انجی کی ذات پر تنقید لگا تھا اور چپ نہیں رہ سکی تھی۔

”میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے صرف بیڈ شیٹ چینج کرنے کی درخواست ہی تو کی ہے نا!“ ایک تو تھکن دوسرا شفق کا میلا کچیلا حلیہ تیسرا خوامخواہ اس کا منہ پھلا کر بولنا جس پر وہ ہمیشہ اسے ٹوکتا تھا آج غصہ دلا گیا۔

”آپ کو اچھا ہی نہیں لگا کہ میری دوست یہاں آئے۔ وہ بے چاری تو پہلے ہی اتنے دکھی ہے۔“ شفق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”فضول کے اندازے مت لگایا کرو‘ وہ بہت نفیس لڑکی ہے۔ ایسے لوگوں کو میں ذاتی طور پر بھی پسند کرتا ہوں آئندہ یہ بات مت کرنا کہ مجھے اس کا یہاں آنا پسند نہیں۔“

وہ سیل فون بستر پر اچھال کر واش روم کی جانب بڑھ گیا۔

شفق گہری سی سانس لے کر باہر آ گئی۔ سب کچھ تقریباً تیار تھا صبح سے باتیں بناتی انجی اب سلاد بنانے بیٹھ گئی تھی مگر وہ کچھ انجی کی باتوں میں کچھ شہریار کے رویے میں ایسی الجھی کہ اسے چینج کرنے اور ہلکا پھلکا سا تیار ہو جانے کا خیال ہی نہیں آیا اور انجی نے بھی اسے یہ احساس نہیں دلایا جب وہ دوبارہ کچن میں آئی۔ انجی بڑی سستی سے سبزی کاٹ رہی تھی اسے دوسری چھری اٹھانا پڑی۔

”کیا کہہ رہے تھے شہریار؟“ یہ سوال ایسا تھا جس کی توقع شفق بہرحال نہیں کر سکتی تھی اور اب تو جو کچھ شہریار نے کہا تھا۔ وہ انجی سے کہنے والا تھا ہی نہیں۔ ابھی وہ خاموش ہی تھی کہ انجی بولی۔

”بہت دنوں کے بعد ملے ہو نا‘ بے تاب تو ہو گا تمہارے لیے۔“ یہ سب کہتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سا تناؤ اور لہجے میں گہری ٹھنڈک تھی‘ جسے شفق نے اس لیے محسوس نہیں کیا کہ انجی کا یہ کہنا اسے شدت سے احساس دلا رہا تھا۔ شہریار نے جو کہا بہت غلط کہا۔ وہ اتنے دنوں کے بعد ملے ہیں آج اکٹھے لنچ کر رہے ہیں مگر شہریار نے اس بات کو بالکل بھی دھیان میں نہیں رکھا۔ اسے میں ہمیشہ احمق لاپروا اور غیر سنجیدہ دکھائی دیتی ہوں وہ چپ چاپ سلاد کے لیے چیزیں بناتی رہی۔ انجی بھی اسی کام میں مصروف کن انکھیوں سے اس کا چہرہ پڑھتی رہی۔

اس روز وہ شہریار کے ساتھ پہلے سے زیادہ بے تکلف تھی۔ اس کے مشاغل‘ کالج لائف کی باتیں‘ اس کی پسند ناپسند سب براہ راست ڈسکس کرتی رہی۔ کھانے کی میز پر پہلے ہی کی طرح اس نے دونوں کو خود کھانا سرو کیا۔

اس کے لیے وہ کچن میں شفق کی پیشانی پر بوسہ دے کر کہہ چکی تھی۔

”میں جانتی ہوں میری جان! تم بہت تھک گئی ہو۔ بس کھانا کھاتے ہی ریسٹ کرو اور ہر اوکھی بوکھی سوچ کو ذہن سے نکال دو۔“

آخری بات پر شفق نے چونک کر سر اٹھایا تھا تو اس کی پچپن کی سہیلی اس کی درد آشنا‘ بات کے بغیر ہی سمجھ گئی تھی۔ وہ انجی سے لپٹ گئی انجی اس کی پشت پر تھپکی اور اب وہ اسے اور شہریار کو بار بار کھانا نکال کے دے رہی تھی اور بہت اصرار سے کھلا رہی تھی۔

شفق کچھ تو تھک گئی تھی۔ کچھ اسے انجی کی بات نے یہ احساس دلایا تھا کہ آج اتنے دن کے بعد ملنے کی وجہ سے شہریار کا انداز اس کے لیے بے تابی لیے ہوئے ہونا چاہیے تھا‘ وہ چپ چپ سی تھی اور اس کی یہ چپ شہریار کو غصہ دلا رہی تھی۔ شرمندہ بھی کر رہی تھی کیسی ال مزاج لڑکی ہے اسے احساس نہیں انجی مہمان ہے اور اس کی خاطر اس کا فرض ہے تاکہ وہ بے چاری ہمیں ایک ایک ڈش اٹھا کر پیش کرتی رہے‘ بکھرے بال‘ صبح کا ڈھلا ہوا چہرہ‘ رات کو پہنے گئے کپڑے اسے اور بھی غصہ دلا رہے تھے کھانے کے بعد شفق برتن سمیٹ کر کچن میں چلی گئی اور وہ دونوں باتیں کرتے رہے پھر اس کا بیٹا کسی بات پر ضد کرنے لگا۔ شفق اسے اٹھا کر لان میں لے آئی۔ اس کے ساتھ کھیلتی رہی۔ وہ دونوں باتیں کرتے رہے۔ اس کا خیال تھا۔ انجی کھانا کھا کر چلی جائے گی مگر وہ ایسے خیال میں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ شفق نے کپڑے نکالے اور نہانے کے ارادے سے باتھ روم میں گھس گئی کہ انجی کو شہریار کمپنی دے رہا تھا نا۔

نہا کر نکلی تو شہریار اس کو اپنی اسکول اور کالج کے زمانے کی تصاویر دکھا رہا تھا دونوں خوب انجوائے کر رہی تھے ڈارک پرپل سوٹ جس پر ملٹی کلر سے کڑھائی کی گئی تھی پرپل کا شیڈ دیتی ہی لپ اسٹک لگائے جب وہ سامنے آئی دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”اوں ہوں یہ کون سا کلر پہن لیا ہے تم نے‘ پلیز اتنے بھی ڈارک کلر مت پہنا کرو۔“

وہ بلاشبہ اپنی گوری رنگت میں اس کلر کے ساتھ بہت نمایاں ہو رہی تھی شہریار کی نظروں میں ستائش ابھری ہی تھی کہ انجی کے جملے نے اس کی بھی سوچ بدل دی۔

”واقعی میرا خیال ہے انجی ٹھیک کہتی ہے یہ کلر کچھ عجیب سا ہے۔“

”میں تبدیل کر کے آتی ہوں۔“ وہ تو فوراً شرمندہ ہو جانے والوں میں سے تھی۔

”اب رہنے دو‘ پہلے ہی تمہارے نہانے میں گھنٹہ لگا کر نکلی ہو تو اب چینج کرنے چل پڑو‘ مجھے تو تم ہر رنگ میں اچھی ہی لگتی ہو۔ میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ دوسرے تمہیں میری نظر سے تھوڑی دیکھتے ہیں۔ لباس شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے اور یہ وہ کلر ہے جو گنواروں میں خوب پہنا اور پسند کیا جاتا ہے۔“

”وہ انجی میں نے تو...“ شہریار کے لبوں پر انجی کی بات سن کر آنے والی مسکراہٹ نے اسے روہانسا کر دیا وہ وضاحت میں کیا کہنا چاہ رہی تھی اسے بھول ہی گیا۔

”اچھا۔ اب اچھی سی چائے تو بناؤ۔ ہم تمہارے انتظار میں بیٹھے تھے ورنہ میں اس وقت چائے لے لیتی ہوں۔“

وہ اثبات میں سر ہلا کر کچن میں چلی آئی۔

”چلو آج چائے کہیں باہر چل کر پیتے ہیں۔“ وہ کچن میں گئی ہی تھی کہ انجی کو خیال آیا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“ شہریار نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ انجی شفو کو آوازیں دینے لگی۔

”چائے رہنے دو۔ ہم کہیں باہر چل کر پیتے ہیں۔“

وہ ہمیشہ شام کی چائے اپنے بیڈ پر بیٹھ کر پورے سکون کے ساتھ پینا پسند کرتی تھی مگر انجی کی خواہش کو رد نہیں کر سکی اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تم میرے بیٹے کے کپڑے چینج کرو۔ میں بچی کو دیکھ لوں۔“ انجی اس کے بیڈ روم کی جانب بڑھ گئی وہ بچے کے کپڑے لینے اندر آئی تو انجی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے میک اپ میں مصروف تھی۔ تیار ہو کر پورے آدھے گھنٹے میں باہر آئی۔

☼ ☼ ☼

وہ کبھی بھی ایک دوسرے سے جھڑپ کے بعد روٹھے نہیں تھے بات ہوتی اور ختم ہو جاتی اور آج ایسا کچھ خاص ہوا بھی تو نہیں تھا مگر اس کا جی بھی اچاٹ سا تھا اور شہریار بھی بے گانگی برت رہا تھا۔ انجی کو فون پر بتایا تو بولی۔

”مردوں کو نخرے دکھانے کی عادت ہوتی ہے ایک دو روز گزرنے دو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے کیا تم روٹھ جاؤ تو منانا ہے پھر سے لا کر بھی گانا گا کر۔“

”میں کبھی روٹھی ہی نہیں ہاں گانے تو وہ ویسے بھی مجھے دیکھ کر گاتے رہتے ہیں اور گجرے بھی لے آتے ہیں۔“

”اچھا‘ تم اسے بہت اچھی لگتی ہو؟“ چند لمحوں انجی ان کی ازدواجی زندگی کو کرید کرید کر پوچھتی رہی اور شفق نے کبھی بھی اس سے کوئی بات کب چھپائی تھی۔

شہریار کی خفگی نے اسے نڈھال کر دیا تھا وہ زیادہ دن سہہ نہیں سکی اور اسے بخار ہو گیا۔

”اچھا ہے مر جاؤں جب انہیں پروا ہی نہیں میری تو میں جی کر کیا کروں۔ جب مر جاؤں گی پھر تو یاد کریں گے پھر مجھے پکاریں گے مگر تب میں کہیں نہیں ہوں گی جب تک جئیں گے اپنی زیادتی کا احساس انہیں کچوکے لگائے گا۔“ وہ کیا کیا سوچتی اور روتی رہی شہریار گھر آیا اس نے اپنی طبیعت کی خرابی کے بارے میں نہیں

بتایا۔ معمول کے مطابق کھانا تیار کرتی رہی۔ مچھلی پر لگاتے اسے چکر آیا۔ ڈش تو ٹیبل پر رکھ دی مگر توازن برقرار نہیں رکھ سکی اور خود فرش پر آگری۔
"شفق!" شہریار تیزی سے اس کی جانب لپکا۔ ہاتھ لگایا تو اس کا جسم انگارے کی مانند لگا۔
"کیا کروں؟" اس نے اپنے بازوؤں میں بے ہوش شفق کو پریشانی سے دیکھتے ہوئے سوچا، پھر ذہن میں سب سے پہلے انجی کا خیال آیا۔ اس کو کال کیا۔ شفق کی حالت بتائی۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی آرہی ہوں اور یہیں قریب ہی ناہید کلینک ہے۔ آپ اسے لے کر وہیں پہنچیں میں ابھی ادھر آؤں گی اور ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ دوبارہ گھر آئے تو انجی ان کے ساتھ تھی اور شفق ہوش میں تھی۔
"یہ کیا حماقت ہے شفو! تمہیں بخار تھا تو تم نے شہریار کو بتایا کیوں نہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اتنی شدید ناراضی، ارے جہاں محبت ہوتی ہے وہاں تو بڑی سے بڑی بات نظر انداز کردی جاتی ہے۔ تم ایک فضول سی بات کو دل سے لگا کر بیٹھی رہیں۔ قدر کرو اپنے میاں کی ایسے اچھے انسان تو چراغ لے کر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔"
"انجی! بچے کہاں ہیں اور اظہر بھائی نے تمہارے یوں آجانے پر برا تو نہیں مانا؟"
"اظہر پشاور گئے ہیں ان کی واپسی اب ایک ہفتے سے پہلے تو مشکل ہی ہوگی بچوں کی فکر نہ کرو۔ وہ ہیں نا ہماری ایک رشتہ دار۔ بے چاری بیوہ اور لاچار سی ہیں۔ وہ آئی ہوئی ہیں بچے انہی کے پاس ہیں۔ وہ بہت اچھی طرح سنبھال لیتی ہیں۔ تم بس اپنی فکر کرو۔"
"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" اسے نقاہت بہت تھی۔ بولنا مشکل ہورہا تھا۔
گھر آکر شہریار نے اسے سہارا دے کر گاڑی سے اتارا اور بیڈ روم میں لے گیا۔ اسے لاؤنج میں رک جانا چاہیے تھا مگر وہ پیچھے چلی آئی تھی اور شہریار نے اس کی موجودگی کے باوجود شفق کا بوسہ لے کر اسے اپنی بے تابی اور پریشانی کے بارے میں بتایا تھا پھر انجی سے بولا۔
"آپ پلیز اس کے لیے سوپ اور دلیہ وغیرہ بنا دیں۔"
"نہیں، نہیں انجی تم تکلیف مت کرو۔ ابھی بخار کم ہوگا تو میں خود بھی بنالوں گی۔"
"اوہو! دوست ہے تمہاری۔" شہریار نے اسے تکلف سے سمجھایا۔
انجی کو کچن میں آنا پڑا اور کچن کے کاموں سے اس کی ہمیشہ جان جاتی تھی وہ اکثر کھانا بازار سے منگواتی یا ملازمہ سے پکواتی۔ اسے وہی غنیمت لگتا اور پھر یہ وہ خاتون جن کی عمر پچاس پچپن کے قریب تھی اظہر کی رشتہ دار تھیں جب وہ آجاتیں۔ اسے بڑی سہولت ہو جاتی۔ کھانا بنانے سے تو بالکل ہی جان چھوٹ جاتی اور بچوں کو بھی بھروہی دیکھتیں۔
"پتہ نہیں کس طرح کا سوپ بنانا چاہیے۔" اس نے کچھ دیر سوچا پھر فریج سے چکن نکال کر ڈھیر سارے پانی میں نمک اور کالی مرچ کے ساتھ ڈال کر چولہے پر چڑھا دیا۔
"اب چائے بھی چاہیے [illegible] بازار سے جوس لے لیجیے مجھے ملازمہ بتا گیا ہے پتہ نہیں پتی کدھر ہے۔"
کوفت کے عالم میں چائے تیار کی شہریار خود چلا آیا تھا اس نے ہی سیٹ کی اور اندر لے گیا انجی اب بھی اس کے پیچھے تھی۔ چائے کے ساتھ شفق نے دو بسکٹس لیے دوائی اور تھوڑی دیر میں سو گئی۔
اس روز بھی چند روز پہلے کی طرح انہوں نے ڈھیروں باتیں کر ڈالیں اور پتہ نہیں کب آپ سے وہ دونوں تم پر آگئے۔ ایک صوفے پر برابر میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے اور تبصرے کرتے رہے۔ شفو کی آنکھ کھلی بخار ہلکا تھا شہریار اور شفق دونوں انجی کے شکر گزار تھے اور شہریار اسے ڈراپ کرنے جا رہا تھا۔
"پتہ نہیں رات میں کچھ کھانے کو ہے بھی یا نہیں!" شفق نے نقاہت کے ساتھ کروٹ بدلتے ہوئے سوچا تھا پھر دوسرا خیال یہ آیا۔ انجی کے ہاں کھانا کھا کر ہی آئے گا یا شاید نہ بھی کھائے کہ مجھے بخار ہے اور گھر میں اکیلی ہوں شاید انجی ساتھ ہی کھانا بھی کردے۔ مگر شہریار بہت جلدی آگیا اور کھانا اس کے ساتھ نہیں تھا۔
"وہ فریج میں دیکھیں۔ میرا خیال ہے دوپہر میں جو بنایا تھا موجود ہی ہوگا۔"
"نہیں وہ تو میں نے اور انجی نے کھا لیا تھا۔ خیر تم فکر نہ کرو۔ میں سینڈوچ بنالیتا ہوں۔"
شہریار اس کے پاس بیٹھا دوا بھی پلائی کھانا بھی کھلایا مگر کچھ کمی سی تھی۔ یا شاید اس کی توقعات ہی زیادہ تھیں۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز انجی شام کو ان کے ہاں آئی تھی اور شہریار یقیناً پہلے سے اس کی آمد کے بارے میں جانتا تھا منتظر تھا اور خاصا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔ شفو کو ہلکا بخار ابھی باقی تھا۔ انجی آئی اور اس نے خوب انصاف کیا۔ اس نے شفق کو کمرے میں جاکر آرام کرنے کو بھی کہا مگر شفق تیار نہیں ہوئی۔
[illegible] کی باتیں کی تھیں اور وہ بس ایک جانب بیٹھی مسکرا رہی تھی۔
"تم شہریار کا خیال نہیں رکھتیں شفق! اتنے دنوں کے لیے میکے جاکر بیٹھ گئیں اب آئی ہو تو ذرا سی بات کو دل سے لگایا اور بیمار پڑ گئیں۔ دیکھو بے چارہ کتنا کمزور ہو رہا ہے۔"
"ایسی باتوں کو یہ نہیں سمجھتی۔" شہریار نے شکوہ کیا۔
وہ چونک کر اس کی صورت دیکھنے لگی، آخر کیوں یہ بدگمان ہوا جاتا ہے میری محبت میں کبھی بھی کمی نہیں رہی اس کا جی گھبرانے لگا۔
شہریار کی انجی سے کی گئی چھوٹی سی شکایت اس کی دل کی دنیا میں ہلچل مچا رہی تھی شاید وہ ابھی کہہ دے گا میں تو مذاق کر رہا تھا شفق کی محبت کو ناپنے کا تو کوئی پیمانہ ابھی تک ایجاد ہی نہیں ہوا مگر ایسا نہیں کہا اور وہ چپ چاپ بیٹھی منظر میں موجود ہونے کے باوجود منظر سے غائب ہوتی چلی گئی۔
اس کا بخار صبح تک اتر گیا اس نے اٹھ کر ناشتا بنایا کچھ ادھورے کام سمیٹے۔ شہریار تیار ہو کر ٹیبل پر آیا تو اس کی پسند کا ناشتا، پراٹھا اور آملیٹ اس کے سامنے رکھا مگر پتہ نہیں وہ کس سوچ میں گم تھا۔ توجہ ہی نہیں دی۔ چپ چاپ ناشتا کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
"دوپہر میں کیا بناؤں؟" اس نے پوچھا تھا۔
"اوہ ہاں یاد آیا آج دوپہر میں میرے لیے کچھ نہ بنانا۔ میں لیٹ آؤں گا۔ او کے جان! آج شام کی چائے پر ملاقات ہوگی اور دیکھو تم کاموں میں مت لگی رہنا۔ اپنا خیال رکھنا۔ کہیں پھر بیمار نہ پڑ جانا۔"
اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
شہریار کے جانے کے بعد ابھی وہ ناشتے کے برتن سمیٹ رہی تھی کہ شہریار کی امی کا فون آگیا۔ وہ بتا رہی تھیں۔
"ٹھیک ایک ہفتے کے بعد پاکستان آرہی ہوں پورا ایک ماہ اپنی بچی کے پاس رہوں گی۔ ابھی تو میں نے تمہارے چاؤ بھی نہیں پورے کیے۔"
شہریار کی والدہ بہت سویٹ نیچر کی مالک تھیں اس لیے ان کی آمد کا سن کر اسے خوشی ہوئی تھی۔
ہر وہ خبر جو اس کے لیے اہم تھی اسے انجی کے ساتھ شیئر کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی مگر آج کل انجی کی نجانے کیا مصروفیات تھیں جب بھی فون کرتی جواب موصول نہیں ہوتا تھا۔ میسج کیے تو بھی ابھی تک انجی نے بات نہیں کی تھی۔ شاید اس کے میاں آج کل گھر پر ہوتے ہوں گے مگر یہ بھی کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ کال ہی ریسیو نہ کی جائے۔
شام کو شہریار آیا تو اس نے انجی کی طرف چلنے کا کہا۔
"کیوں خیریت؟" وہ پوچھنے لگا۔
"اتنے دن ہوگئے اس سے ملے ہوئے۔"
"تم میں اور انجی میں کوئی قدر بھی تو مشترک نہیں میری سمجھ میں نہیں آیا پھر تم اس سے ملنے کو بے چین کیوں رہتی ہو؟"

”وہ میری دوست ہے۔“ اس نے کچھ احتجاج کے رنگ میں یاد دلایا۔

”بہرحال آج نہیں، تمہیں پتہ ہے لیٹ آرہا ہوں۔ تھکا ہوا ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے پھر کل چلیں گے۔“ وہ جھٹ مان گئی۔ کل آئے گی تو دیکھیں گے۔ وہ کمپیوٹر کے سامنے جا بیٹھا اب تو اس سے کچھ کہنا ہی فضول تھا۔

☆ ☆ ☆

شہریار کی والدہ کی آمد پر شفق کے میکے والے بھی ملنے آئے تھے۔ رات کو کھانا کھا کر بھیا اور شہریار لاؤنج میں بیٹھ گئے تھے جبکہ شہریار کی والدہ شفق کی امی اور بھابھی ارم شہریار کی والدہ کے بیڈ روم میں آگئے تھے۔

”ہائے کیا تھا آج انجی بھی ہوتی تو۔“ اس نے بڑی مسرت سے ذکر کیا تھا۔

”کیا وہ یہاں آتی رہتی ہے؟“ ارم نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں ہاں اکثر، پتہ ہے شہریار بھی اسے بہت پسند کرتے ہیں بلکہ اب تو کہتے ہیں۔ اس کی پسند ناپسند تم سے زیادہ مجھ سے ملتی جلتی ہے۔“

وہ بہت جوش کے ساتھ ارم کو بتا رہی تھی اسی وقت نبیلہ بیگم (شہریار کی والدہ) نے اس کی امی سے بات کرتے ہوئے ان دونوں کی طرف یونہی دیکھا تھا مگر شفق کے جوش اور جواب میں ارم کی سنجیدگی نے حیران سا کیا۔ ارم کرید کرید کر کسی انجی کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور شفق اپنے مخصوص الھڑپن سے بتائے چلی جا رہی تھی۔

”کون ہے یہ انجی؟“ انہیں بھی تجسس ہوا۔

”وہاں فیصل آباد میں ہمارے محلے میں رہتی تھی۔“ ارم نے کہا۔ شفق نے نفی میں سر ہلایا اور بولی۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں بھابھی آپ۔ وہ صرف ہماری محلے دار نہیں۔ میری بہت اچھی دوست ہے۔ بس جی یک جان دو قالب والا حساب ہے۔“

”تم بھی جاتی ہو اس کے ہاں؟“ ارم نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

”آں ہاں بالکل۔“

”اکیلی جاتی ہو؟“

”نہیں اکیلی کیوں شہریار کے ساتھ؟“

”اچھا انہیں کیوں اعتراض نہیں ہوتا تمہاری سہیلی کے ہاں جانے پر۔“

”میں نے کہا نا۔ اب وہ صرف میری سہیلی ہی نہیں ہے۔ شہریار بھی اسے بہت پسند کرتے ہیں اور بچی! وہ ہے بھی اتنا پیار کرنے والی کہ کبھی کبھی تو میں اس کی محبتوں پر شرمندہ سی ہو جاتی ہوں۔“

نبیلہ بیگم کو دونوں کے رویوں پر حیرت تو ہوئی مگر انہوں نے دخل نہیں دیا، ایک بار پھر اس کی امی سے باتیں کرنے لگیں۔

”ہم سب چلیں گے کل انجی کے ہاں۔ کتنی حیران ہو گی نا۔“ وہ سب کو دیکھ کر شفق خیالوں میں ہی اس کی حیرت پر مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”نہیں ہم صرف ملنے [illegible]“ ارم نے صاف انکار کر دیا۔

”اچھا پھر میں اسے یہاں بلا لیتی ہوں۔ کل کھانے پر کہتی ہوں آجائے۔“

”دیکھ لو بلا کر۔ میرا خیال ہے وہ نہیں آئے گی۔“

”کیوں بھلا۔ وہ کیوں نہیں آئے گی میں ابھی فون کرتی ہوں اور سب کی آمد کے بارے میں بتاتی ہوں۔“

”کسے فون ہو رہا ہے؟“ اب کے شفق کی امی نے پوچھا۔

”امی! انجی کو بلانے لگی ہوں۔“ وہ نمبر ملاتے ہوئے اک جوش کے ساتھ بولی۔

”انجی! یہ ابھی تک تمہارے سر سے انجی کا بھوت نہیں اترا۔“ اس کی امی کے انداز میں بھی کچھ کچھ ارم والا ہی تاثر تھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ انجی سے بات کرنے لگی۔ وہ اسے ان سب کی آمد کے بارے میں بتا رہی تھی

اور کل آنے کو کہہ رہی تھی۔

”ہائے دیکھو۔ انجی! ابھی تو پہلے ہی کہہ رہی تھیں نہیں آؤ گی مگر میں نے پورے وثوق سے کہا تھا تم آؤ گی۔“

”اوہو اچھا چلو ٹھیک ہے کل شام یہ سب تو چلے جائیں گے شہریار کی امی تو ہیں ہیں نا۔ تم ان سے ملنے آجانا۔ بہت خوش ہو گی تم ان سے مل کر۔ بہت اچھی نفیس خاتون ہیں۔ جیسی خواتین شہریار کو اچھی لگتی ہیں نا جیسی تم ہو تاں بالکل ویسی۔“

اس بات پر ارم پھر چونکی تھی اور اس نے کچھ افسوس کے ساتھ شفق کو دیکھا تھا۔

”وہ کل تو اس کے میاں کے کچھ دوست انوائٹڈ ہیں۔ وہ نہیں آسکے گی۔“

”اچھا پھر اس سے کہنا تھا ہم سب ابھی آرہے ہیں۔“ ارم کا انداز استہزائیہ تھا۔

☆ ☆ ☆

ان لوگوں کی واپسی کے اگلے روز انجی آرہی تھی اور شفق بڑے جوش سے کچن میں لگی تھی اس کے لیے نجانے کیا کیا تلاش کر رہی تھی۔ شہریار کو اس نے ایک لمبی لسٹ تھمائی تھی اور اس نے بغیر ناک بھوں چڑھائے سب سامان لا دیا تھا۔

انجی آئی تو ارم کی باتوں کی روشنی میں نبیلہ بیگم نے بہت گہری نظر سے اسے دیکھا تھا۔ سانولی سلونی، جاذب نظر نقوش والی اور بہت لمبے بالوں والی عورت اسے لڑکی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی طراری اور چہرے کے نقوش میں بھول پن نام کو نہیں تھا اس کے مقابلے میں شفق گوری چٹی قد میں اس سے کم بہت بھولپن لیے الھڑ سی لڑکی تھی جس کی آنکھوں میں روشنی اور سچائی کا تاثر تھا اور جو محبتیں بانٹنے کی عادی دکھائی دیتی تھی۔

انجی آکر نبیلہ بیگم سے بہت ہی محبت اور عقیدت سے ملی تھی۔

”مجھے بہت اشتیاق تھا آپ سے ملنے کا بہت تعریفیں سنی تھیں میں نے آپ کی۔“

اس دوران وہ نبیلہ بیگم کے تاثرات کا بھی جائزہ لے رہی تھی اور اسے لگا اس کے الفاظ اور انداز نے انہیں کچھ خاص متاثر نہیں کیا۔

”اچھا کس سے سنی تھیں تعریفیں؟“ انجی کو اس سوال کی توقع نہیں تھی کہ خوشامد وہ چیز ہے کہ جس کی کی جائے پھر اسے اس طرح کے سوالوں کا ہوش نہیں رہتا۔ وہ اس سلسلے میں شفق کا نام لینے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی بولی۔

”شہریار صاحب نے اور بھلا کون آپ کی تعریفیں کر سکتا ہے؟“ شفق اس کے بچے میں مگن تھی اور انجی نے دھیرے سے کہا تھا۔

”اچھا، شہریار سے بھی بے تکلفی ہو چکی ہے۔“ وہ ارم کے چہرے کے تاثرات کو ذہن میں لا کر یہ سوال کر گئی تھیں۔

”جی جی آپ کے بیٹے آپ ہی کی طرح بہت اچھے انسان ہیں۔ آنٹی اور آنٹی! آپ نے کلر بہت خوب صورت پہن رکھا ہے بہت سوٹ کر رہا ہے آپ پر۔“

نبیلہ بیگم دس سال ایک اسکول کی پرنسپل رہی تھیں۔ اس دوران مختلف مزاج کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا تھا خوشامد کرنے والوں کا تو ایک باقاعدہ گروہ تھا تو وہ انجی کو کیسے نہ پہچانتیں۔ وہ یہ سوچ رہی تھیں کیا اس کی عادت ہی ایسی ہے یا یہ صرف میرے ساتھ ایسا کر رہی ہے مگر کیوں اسے مجھ سے کیا مفاد ہو سکتا ہے۔

”کیسی لگیں میری والدہ؟“ شہریار ٹرے میں کوک کے گلاس رکھے چلا آیا تھا سب سے پہلے انجی کو پیش کرتے ہوئے پوچھا تھا اور اس کی امی ایک بار پھر چونکی تھیں شہریار کبھی کسی کام کو تو شادی سے پہلے ہاتھ لگاتا تھا نہ اب ان دو تین روز میں انہوں نے ایسا دیکھا تھا۔

”آپ کیوں لے آئے۔ میں لا رہی تھی۔“ شفق نے شرمندہ ہو کر کہا تھا۔

”تمہیں اتنا ہوش ہی کہاں ہے؟“

یقیناً شہریار کا انداز قابل گرفت تھا نبیلہ بیگم تو عجیب سے آئی تھیں، بظاہر اپنائیت دکھانے والی اس لڑکی

کے سلیقے سے متاثر ہوتی جاتی تھیں اور اب بھی وہ اس کے بچوں کو سنبھالنے میں لگی تھی۔

"جان! اپنے آپ کو بدلو۔ خصوصاً جب بزرگ گھر میں ہوں پھر تو ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔" انجی نے کیسی نرمی سے سمجھایا تھا اور وہ کتنی شرمندہ دکھائی دینے لگی تھی۔

"صبح سے تمہاری خاطر کچن میں گھسی ہوئی ہے۔" نبیلہ بیگم بے اختیار کہہ سکیں۔

"ہاں وہ تو اس کے حلیے سے لگ رہا ہے۔"

انجی کچھ تمسخر سے ہنسی تو شہریار نے تیز سی نگاہ اس پر ڈالی نبیلہ کو حیرت ہوئی' اتنے اچھے کپڑوں میں تو بھی وہ سادہ چہرے کے ساتھ بھی وہ انجی سے کہیں زیادہ بھی سلونی اور پیاری لگ رہی تھی۔

شفق کچن میں گئی۔ نبیلہ کا خیال تھا۔ انجی بھی اس کے پیچھے چلی جائے گی اور کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائے گی مگر یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ یہیں بیٹھی رہی اور ان سے باتیں کرتی رہی۔ درمیان میں شہریار بھی بولتا رہا آخر نبیلہ ہی یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں ذرا شفق کو دیکھ لوں۔ اکیلی لگی ہوئی ہے۔"

"عجیب ہے تمہاری دوست۔ اسے تمہارا خیال ہی نہیں ہے۔"

"وہ کہتی ہے گھر میں یہی سب کر کے میں تھک جاتی ہوں یہاں آکر کچھ آرام کرنے کو جی چاہتا ہے اور ایک راز کی بات بتاؤں آنٹی! اسے گھر کے کاموں میں بھی کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ اب بھی کھانا یا تو بازار سے منگوا لیتی ہے یا گھر میں ایک رشتے کی نند ہیں وہ بنا لیتی ہیں۔"

"مجھے لگتا ہے اسے بچوں کی دیکھ بھال میں بھی دلچسپی نہیں۔" انہوں نے رائے دی۔

"ہاں اسے گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔ وہ جاب بھی کرنا چاہتی تھی مگر قسمت نے برا کیا بے چاری کے ساتھ۔ شوہر بالکل الٹ مزاج کے ملے ہیں اسے۔ انہیں انجی کے جذبات اس کے احساسات کی بالکل پروا نہیں ہے۔"

"ڈاکٹر آنی رہتی ہے ادھر؟"

"جی ہاں میکہ تو فیصل آباد میں ہے۔ ادھر میرے پاس آجاتی ہے۔ کبھی کبھار ہم بھی چلے جاتے ہیں ویسے زیادہ تو یہی آتی ہے کہتی ہے تمہارے گھر آکر بہت سکون ملتا ہے۔ بہت اچھی دوست ہے میری۔" ابھی وہ باتیں کر رہی تھیں کہ انجی چلی آئی۔

"آنٹی! آپ کیا کرنے لگی ہیں۔ مجھے بتائیے میں کر دیتی ہوں۔" وہ جو برتن خشک کرنے میں لگی تھیں۔ انجی نے ان کے ہاتھ سے کپڑا اور گلاس لے لیا۔

انجی ادھر آئی تو پیچھے ہی شہریار بھی چلا آیا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

اور جو نظارہ ٹیبل پر نبیلہ بیگم نے دیکھا وہ تو انتہائی حیران کن تھا۔ کتنی محنت سے یہ سب شفق نے بنایا تھا مگر وہ بے چاری تو اب پس منظر میں تھی اور انجی بڑھ بڑھ کر شہریار اور اس کی والدہ کو کچھ نہ کچھ پیش کر رہی تھی۔ آج والدہ کو متاثر کرنے کی کوشش میں وہ شفق کی پلیٹ میں کچھ ڈالنا اور اصرار کر کے کھلانا بھول گئی تھی۔

"ہائے آنٹی! کتنا لذیذ کباب اور رائتہ لیکن شفق تم نے پودینے کی چٹنی نہیں بنائی۔ وہ تو ضرور بنانا چاہیے تھی۔" اس نے ٹیبل پر بیٹھنے کے بعد دوسری بار شفق کو ٹوکا تھا۔

"یہ کیچپ لے لو نا!" شفق جلدی سے بولی تھی۔

"ہونہہ رہنے دو۔ گلا خراب ہو جاتا ہے۔"

"میٹھے میں کیا بنا ہے' یہ میرا بیٹا تو پوچھے لے نہیں رہا۔"

"گاجر کا حلوہ بنایا ہے میں نے۔ شہریار کو بھی بہت پسند ہے۔"

"اوہو کسٹرڈ نہیں ہے۔" انجی سخت پریشان دکھائی دینے لگی۔

"شفق! کسٹرڈ بناؤ۔" شہریار نے جھٹ حکم دیا اور اس نے بھی تعمیل میں دیر نہیں کی۔ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھ جاؤ شفق!" نبیلہ بیگم کو انجی کا انداز غصہ دلا

رہا تھا مگر شہریار کا یوں کہنا اور بھی تپا گیا۔

"صبح سے بچی لگی ہوئی ہے' تھک گئی ہے۔ کسٹرڈ میں بنا دیتی ہوں۔"

"ہائے میری اچھی آنٹی! آپ کیوں تکلیف کریں گی۔ آپ پلیز بیٹھ جائیں۔ میں خود بنا لیتی ہوں۔" وہی پیار بھرا انداز' کتنی میٹھی زبان' کتنی نفیس عورت' بڑی بڑی آنکھیں' لمبے بال۔

"مم' میں...!" شفق ابھی تک کھڑی تھی اور کچن میں جانے کو پرتول رہی تھی۔ اس کے برابر ہی تو نبیلہ بیگم کی چیئر تھی۔ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے چیئر پر بٹھا دیا۔

اور انجی جو کہہ رہی تھی۔ وہ خود بچے کے لیے کسٹرڈ بنا لیتی ہے۔ اب بڑے آرام سے بچے کو چاول کھلا رہی تھی اور وہ کھا بھی رہا تھا۔

"یہ سب کیا ہے۔ یہ عورت شفق کے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہے اور شہریار اس سے اتنا متاثر کیوں دکھائی دے رہا ہے؟" نبیلہ بیگم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور وہ یہ بات سمجھنا بھی چاہتی تھیں۔ میٹھے میں گاجر کا حلوہ تھا جسے شفق نے بہت محنت سے بنایا تھا اور اس حلوے کو انجی اور شہریار نے چکھا تک نہیں۔

"شہریار! آپ کو تو گاجر کا حلوہ بہت پسند ہے۔" شفق اس کے انکار پر کہہ رہی تھی۔

"آج دل نہیں چاہ رہا۔" وہ ٹیبل سے اٹھ گیا اور شفق کا چہرہ بھی اتر گیا۔

"ارے ایسا منہ کیوں بنا لیا۔ اب اس کا موڈ نہیں رات کو کھا لے گا اور اگر میرے نہ کھانے پر خفا ہو تو میں یہ پورا ڈونگا ساتھ لے جاؤں گی۔ کتنے ہی دنوں تک کھاتی اور تمہیں یاد کرتی رہوں گی۔" شفق کھل سی گئی اس بات پر۔ جبکہ وہ لاتعلق سی بیٹھی رہیں۔

"دیکھیے ناں آنٹی! کتنی ذرا سی بات پر منہ پھلا لیتی ہے۔ مرد بھلا کہاں برداشت کرتے ہیں ایسی باتوں کو۔" شہریار کسی کام سے ادھر آیا تو وہ آنٹی سے کہہ رہی تھی۔

"کم عمر اور بھولی ہے مگر دل کی بہت سادہ اور سچی ہے"

پھر سب سے بڑھ کر یہ انجی! کہ شریف عورتوں نے سارے ناز نخرے اپنے میاں کو ہی دکھانا ہوتے ہیں۔" پتہ نہیں انہیں کیا ہوا کہ لہجہ بھی سخت ہو گیا۔

"آؤ انجی! تمہیں کچھ نیا دکھائیں۔" شہریار کہہ رہا تھا اور شفق برتن سمیٹ رہی تھی۔

واپسی پر اسے شہریار ڈراپ کر رہا تھا۔

"کیا تم اکیلے لے کر جاؤ گے شفق نہیں جائے گی؟" نبیلہ بیگم کو کہنا پڑا۔

"شفق کچن سمیٹ رہی ہے اور یہ قریب ہی تو گھر ہے اس کا میں بس ابھی ڈراپ کر کے آ رہا ہوں۔"

"جی آنٹی! یہاں قریب ہی گھر ہے۔ کیا کروں مجھے رکشہ ٹیکسی میں سفر کرتے ڈر لگتا ہے۔"

وہ سوچ کر رہ گئیں آخر آئی بھی تو رکشہ یا ٹیکسی سے ہی ہے۔

شہریار کہہ کر گیا تھا یوں گیا اور یوں آیا مگر اب ایک گھنٹہ ہونے کو تھا۔ شفق تو سب سمیٹ کر کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کے ارادے سے لیٹ گئی تھی۔ ان سے رہا نہیں گیا۔ اس کا نمبر ملایا اور وہ کہہ رہا تھا۔

"امی! راستے میں کچھ دوست مل گئے ہیں۔ اس لیے لیٹ ہو رہا ہوں۔ کچھ دیر سے آؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔" اور انہوں نے انجی کے بیٹے کی آواز سنی تھی۔ وہ اپنی ماں سے کچھ کہہ رہا تھا۔

"کہاں ہے شہریار کیا انجی کے گھر پر نہیں؟" پس منظر میں شور تھا۔ وہ یقیناً گھر سے باہر کسی جگہ پر ہیں۔ اگر ہیں تو اس نے جھوٹ کیوں بولا۔ "کیا اس کے دل میں کوئی چور ہے؟" ارم کا انجی کے بارے میں اکتاتے ہوئے لہجے سے بات کرنا اور کرید کرید کر پوچھنا یاد آنے لگا۔

وہ اپنے کمرے میں آکر لیٹ تو گئیں مگر سوچ اس قدر پراگندہ ہو رہی تھی کہ سو نہیں سکیں۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز صبح ناشتے کی ٹیبل پر ہی کہا۔

"آج شام کو انجی کی طرف چلیں گے۔"

"وہ انجی کی طرف آج شام نہیں اصل میں اس سے پوچھ کر ہی پروگرام بنانا پڑتا ہے کیا پتہ اس کا شوہر آج شام گھر ہی ہو۔"

"کیا مطلب شہریار تمہارا؟ کیا تم اس کے شوہر کی موجودگی میں اس کے گھر نہیں جاتے۔"

"دراصل میں آنٹی! وہ انجی کا جو شوہر ہے ناں وہ کچھ دوسرے مزاج کا بندہ ہے۔ اسے نہیں پسند کہ انجی زیادہ میل جول رکھے۔"

"تو انجی کو اپنے شوہر کی پسند ناپسند کا خیال رکھنا چاہیے 'اب اگر شہریار کو یہ سب ناپسند ہوتا تو تم ایسا کرتیں؟ نہیں کبھی نہیں۔" انہوں نے پورے یقین سے کہا تھا۔

شفق نے انجی کو فون کیا اور آنٹی کے آنے کے بارے میں بتایا تو وہ بولی۔

"تم آنٹی کو فون دو۔ میں خود بات کروں گی۔" اور ان سے بولی "بھلا بیٹی کے گھر آتے ہوئے ماں کو اجازت کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ آپ ضرور آئیں۔ میں منتظر رہوں گی۔"

"بس امی! آپ بھی ناں ابھی کل ہی تو ملاقات ہوئی ہے انجی سے۔ آج آپ اس کے ہاں جانے کو تیار ہو گئیں۔ وہ بھی کھانے کے ٹائم پر۔ اس بے چاری کو کتنی محنت کرنا پڑے گی۔" شہریار کچھ کوفت کے عالم میں کہہ رہا تھا۔

"تو کیا ہوا۔ کل شفق نے بھی تو اس کے لیے سارا دن برباد کیا تھا۔" انہوں نے یاد دلایا۔

"اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔" ماں کی بات اسے اچھی نہیں لگی۔

"اور اس کے گھر ایک عورت ہے جو بچے بھی سنبھالتی ہے کھانا بھی بناتی ہے۔"

"آپ سے کس نے کہا سارا کام وہ خود ہی کرتی ہے۔" "لگتا ہے بہت آنا جانا رہتا ہے تمہارا؟"

ماں کے انداز پر وہ چونکا کچھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ بولیں۔

"اس کا شوہر پسند نہیں کرتا تو تم لوگ آنا جانا کم کر دو نا"

اور وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔

انجی ان کے ہاں آکر ڈرائنگ روم تک تو کبھی محدود نہیں رہتی تھی' سیدھی لاؤنج میں آتی بیڈ روم میں بھی جھانکتی' کچن کے بھی چکر لگتے مگر وہ جب بھی اس کے ہاں جاتے انہیں ڈرائنگ روم میں ہی بٹھاتی۔ ہاں شفق اس کے پیچھے آتی ضرور مگر شروع شروع میں اب وہ اسے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھنے کو کہتی تھی۔

آج بھی ایسا ہی تھا وہ لوگ جاکر بیٹھے ہی تھے کہ انجی کے ہاں رہنے والی خاتون چلی آئیں۔

"ارے شفق! آج بڑے دنوں کے بعد چکر لگایا۔ شہریار صاحب جب بھی آتے ہیں۔ میں آپ کا ضرور پوچھتی ہوں۔"

نبیلہ نے چونک کر شفق کو دیکھا اور اسی وقت انجی تیزی سے شفق کو کوئی بات سنانے لگی تھی اس کا انداز ایسا تھا کہ نبیلہ بیگم کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتی تھیں۔ کیا شفق نے خاتون کی بات سنی ہی نہیں۔

"اچھا بھابھی جی! اب میں چلتا ہوں۔" ایک جوان مرد جس کے چہرے پر جھجک کا تاثر تھا۔ آکر اس سے اجازت طلب کر رہا تھا۔

"ہائے ابھی سے چلے بھی بڑا ہی افسوس ہوتا ہے آپ کی گھریلو لائف پر آپ جیسے مرد تو چراغ لے کر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ کیسی عورت ہے جس نے آپ کی قدر نہیں کی۔ ہمیشہ گھومنے میں رہتی ہے"

پتہ نہیں کس کی بات ہو رہی تھی اور اس مرد سے بہت گہری ہمدردی جتائی جا رہی تھی۔

"ذرا ٹھہریے چند اندر آیئے۔" وہ اسے لے کر اندر گئی نبیلہ بیگم بھی اٹھ کر پیچھے آ گئیں۔

"یہ گاجر کا حلوہ ہے' بڑی محنت سے بنایا ہے میں نے' لے جائیے کھائیے گا آپ کی صحت بہت کمزور ہو رہی ہے پتہ نہیں یہ کیسی بیویاں ہوتی ہے جنہیں اپنے شوہر کی صحت کی بالکل فکر نہیں ہوتی۔ میں تو انجم روزانہ دودھ کے ساتھ حلوہ گرم کر کے دیتی ہوں۔"

"بھابی! بہت شکریہ بڑی مہربانی۔ حلوہ اس نے

ہوا ہے۔ گرم دودھ کے ساتھ روزانہ دے بھی دیتی ہے ۔ آپ بیہ رہنے دیں۔" وہ بہت شکر گزار ہوتا چلا گیا۔

"کون تھا یہ؟" نبیلہ بیگم نے پوچھا۔

"رشتے میں دیور ہوتے ہیں۔" اب اس کے انداز میں اس مرد کے لیے لاپروائی سی اتر آئی تھی۔ وہ شفق کا دیا گاجر کے حلوے کا ڈونگا واپس فریج میں رکھ رہی تھی اور نبیلہ اس کے کچن کی ابتر حالت کو دیکھ رہی تھیں۔ اس تمام نہاد دیور سے جو گفتگو اس نے کی تھی اور اس کے جانے کے بعد جو انداز اس کے لیے اپنایا تھا۔ اس نے نبیلہ پر بہت کچھ عیاں کر دیا تھا۔ وہ واپس ڈرائنگ روم میں آئیں اور شہریار اور شفق کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

"تم نے انجی کا باقی گھر بھی دیکھ رکھا ہے؟" وہ شہریار سے مخاطب تھیں۔

"نہیں میں ڈرائنگ روم تک ہی آتا ہوں۔"

"تو آج دیکھو اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ تمہیں شفق جیسی سگھڑ سلیقہ شعار بیوی ملی ہے۔"

وہ جواب میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ابھی ابھی خاتون نے جس طرح اس کا بھانڈا پھوڑا تھا۔ اسے کچھ نہ کہنا ہی مناسب لگا۔ ویسے انجی کے لیے ماں کا یہ انداز اسے اچھا نہیں لگا۔

"ارے آپ لوگ ادھر کیوں آ گئے؟ چلیے ناں اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔"

انجی انہیں لاؤنج میں کھڑے دیکھ کر بوکھلا سی گئی تھی کہ یہاں ہر طرف کچھ نہ کچھ بکھرا ہوا تھا وہ خاتون جلدی سے آگے بڑھ کر چیزیں سمیٹنے لگیں۔ نبیلہ نے منع کر دیا بولیں۔

"رہنے دو ہم ادھر ہی بیٹھ جاتے ہیں۔"

وہ واپس آ کر بیٹھے تو انجی کا بیٹا شہریار سے بولا۔

"چاچو! آج پھر آئس کریم کھانے جائیں گے کل بڑا مزہ آیا تھا۔" نبیلہ تو چونکیں مگر ان کے ساتھ ساتھ اس بات نے شفق کو بھی حیران کر دیا۔ شہریار نے بچے کو جواب میں کچھ نہیں کہا۔ خود کو اخبار میں گم کر لیا۔ شفق کچھ سوچ کر اٹھ کھڑی ہوئی کچن میں آئی تو انجی کچھ چیزوں کی لسٹ بنا رہی تھی۔

"کل میرے گھر سے آپ لوگ کس وقت واپس آئے تھے؟ کیا راستے میں دیر لگی تھی؟"

"نہیں نہیں۔ تمہیں تو پتا ہے دس پندرہ منٹ کی ڈرائیو ہے۔ ہم سیدھے گھر ہی آئے تھے۔ وہ شہریار کو ہمیں ڈراپ کرنے کے بعد کوئی مل گیا ہو گا ناں۔ اس لیے دیر ہو گئی ہو گی۔"

وہ خواہ مخواہ کی وضاحتیں دے رہی تھی اور ادھر نبیلہ بچے کو اس کے ساتھ کھیلنے کے بہانے ڈرائنگ روم سے باہر لے آئی تھیں اور پوچھ رہی تھیں۔ وہ آئسکریم کھانے کہاں گیا تھا۔ کیا وہ پہلے بھی انکل کے ساتھ ریسٹورنٹ جاتے رہتے ہیں۔

"ہاں مگر کبھی کبھی۔ جب میں بہت زیادہ ضد کروں تب ورنہ تو ماما مجھے اور ثریا کو پھوپھو کے پاس چھوڑ کر چلی جاتی ہیں۔"

انجی نے اکثر چیزیں بازار سے ریڈی میڈ منگوائیں اور لسٹ شہریار کو تھمائی۔ ان سے کہنے لگی۔

"محلے کے کسی لڑکے کو بھیجوں گی تو اپنا ہی پرانا ہو گا۔ یہ سب کچھ ذمہ داری سے لے آتے ہیں۔"

"پہلے بھی منگواتی رہتی ہو؟"

"ارے نہیں نہیں آنٹی! آپ پوچھ لیں شفو سے۔ یہ ساتھ ہی تو آتی ہے۔ کبھی بھیجا ہے میں نے آپ کے بیٹے کو بازار؟"

کچن میں اس کے رشتے کی نند کام نمٹا رہی تھی۔ وہ ان دونوں کے پاس بیٹھی شیریں میں ڈوبی گفتگو سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر دیکھ رہی تھی ساس بہو دونوں ہی بہت چپ چپ ہیں اور اس کی بات کو زیادہ دھیان سے نہیں سن رہیں پھر یہ بھی ہوا کہ نبیلہ نے اس کی بات کاٹ کر شفق کو کوئی قصہ سنانا شروع کر دیا۔

آج ٹیبل پر پہلے سے زیادہ آئٹمز رکھے گئے تھے۔ یقیناً" یہ اہتمام نبیلہ کے لیے تھا مگر انہوں نے صرف گھر کے بنے ویجی ٹیبل رائس تھوڑے رائتہ کے ساتھ لیے۔

"امی یہ فش بھی لیں ناں۔ اس علاقے میں ادھر اس دکان کی فش بہت مزے کی ہوتی ہے۔"

شہریار نے کہا اور انہوں نے سر اٹھا کر بیٹے کو دیکھا۔

"تم آتے رہتے ہو ادھر یہ فش کی دعوت اڑانے؟" انداز ایسا تھا کہ انجی اور وہ دونوں گھبرا گئے انجی پہلے سنبھلی اور بولی۔

"ارے شفق! تم کچھ لے ہی نہیں رہیں۔ میری جان اتنا اہتمام میں نے تم ہی لوگوں کے لیے تو کیا ہے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" شفق نے بے حد رکھائی سے کہا تھا۔

"اچھا پھر کچھ میٹھا ڈال دوں؟"

"میں نے کہا ناں۔ بھوک نہیں ہے۔ تم یہ تکلف مت کرو۔"

اب کے اس کا انداز شہریار کو بہت برا لگا کڑے تیوروں کے ساتھ اس کی جانب دیکھا مگر وہ متوجہ کب تھی۔ تھوڑا جھک کر نبیلہ نے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔

"ارے آنٹی! آپ نے تو کچھ لیا ہی نہیں۔"

"میں بازار کی پکی اشیاء نہیں کھاتی۔ پہلے میں خود اپنے ہاتھ سے پکاتی تھی۔ اب اللہ نے دونوں بہوئیں بھی گھر گرہستی کو سنبھالنے والی دی ہیں۔"

انجی اٹھ کر بیٹے کی فرمائش پر اندر سے کچھ لینے گئی تو شہریار بولا۔

"اس نے اتنا سب کچھ آپ ہی لوگوں کے لیے منگوایا ہے مگر پتا نہیں آپ دونوں اتنے نخرے کیوں کر رہی ہیں۔"

"تم تو کھا رہے ہو ناں بس کھاتے جاؤ اور جھوم جھوم کے اس کی تعریفیں کرتے جاؤ۔"

نبیلہ نے بنا کسی لحاظ کے بری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ شفق اب بھی سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ بہت سی باتیں بہت سے منظر واضح ہو رہے تھے۔

کمال ہے وہ یہ سب کچھ اب تک کس طرح نظر انداز کرتی آئی تھی مجھ سے بے وقوف عورت بھی زمانے میں کوئی نہیں ہو گی۔

"چلیں آنٹی!" آخر حوصلہ جواب دے گیا۔

"ہاں ہاں چلو۔" وہ بھی جھٹ سے بولیں۔

"وہ چائے بنانے گئی ہے۔" شہریار نے یاد دلایا۔

"پتہ نہیں بنانے گئی ہے یا بازار سے منگوانے گئی ہے۔" انہوں نے تمسخر اڑایا پھر بولیں۔

"ایسی کام چور عورتیں ان ہی مہمانوں کو پسند کرتی ہیں جو بنا کچھ کھائے پیے ہی اٹھ جائیں۔ میرا نہیں خیال وہ زیادہ اصرار کرے گی۔"

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔

"مجھے حیرت ہے شفق! تم جیسی سلجھی ہوئی لڑکی کی دوستی انجی جیسی عورت سے کیوں ہو گئی؟" واپسی پر گاڑی میں بیٹھی وہ یہ صرف شہریار کو سنانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

"کسی کے بارے میں اتنی جلدی رائے قائم نہیں کر لینی چاہیے۔" وہ چپ نہیں رہ سکا۔

"میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ اسکول میں جاب کی ہے ان گنت بیسیوں لوگوں سے واسطہ رہا تھا اور اس کے علاوہ بھی یہاں تک پہنچتے پتہ نہیں کتنے چہروں کو دیکھا اور پڑھا ہے میں نے انجی کو پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔"

اس دوران شفق بالکل خاموش اور بے حد تھکی تھکی سی تھی اس نے بحث میں کوئی حصہ نہیں لیا لیکن جس طرح شہریار کھل کر انجی کی طرف داری کر رہا تھا اس کا دل لہو لہو ہو رہا تھا۔

"غلطی میری ہی ہے۔ میں نے ہمیشہ اس کے سامنے انجی کی شخصیت کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ وہ میری دوست تھی۔ مجھے اچھی لگتی تھی مگر میں نے شہریار کے دل تک اس کا راستہ بنانے کی حماقت کیوں کی اور میں اب تک پتہ نہیں کیوں نہیں آنکھیں بند کرکے دونوں پر اعتبار کیوں کیا؟ وہ اس کے ساتھ اکیلی آؤٹنگ پر جاتی ہے۔ شہریار اکثر اس کے گھر بھی جاتا رہتا ہے۔ دل میں چور ہے۔ اسی لیے تو کبھی مجھ سے ذکر نہیں کیا۔"

"اترو بیٹا گھر آ گیا ہے۔" وہ اتنی الجھی ہوئی تھی کہ

اسے پتا ہی نہیں چلا نبیلہ کی آواز پر وہ گہری سانس لے کر تھکے تھکے انداز میں گاڑی سے اتر آئی اس کے انداز کو شہریار نے حیرت سے دیکھا۔

"کیا ہوا؟ جب تم انجی کے ہاں گئی تھیں بالکل ٹھیک تھیں' شاید انہی کی باتوں نے تمہیں ہرٹ کیا ہے۔"

"پتہ نہیں وہ ایسا کیوں کہہ گئی ہیں حالانکہ ہمیشہ انہیں ہر ایک کے ساتھ کھلے دل کھلی باہوں سے ملتے دیکھا ہے مگر انجی کے لیے ان کا رویہ میرے لیے بھی حیران کن ہے۔"

جواب میں وہ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ آنٹی کی رائے سے بالکل متفق ہے انہوں نے انجی کے بارے میں جو کہا ہے اسے دل سے مانتی ہے مگر دل کا بوجھ اتنا تھا کہ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا' سامنے کھڑا یہ شخص اسے خود سے بڑھ کر پیارا تھا۔ بہت مان تھا اس پر اور اس نے کیا کیا اس پر ایک دوسری عورت کو ترجیح دے کر اسے اپنی نظروں میں دو کوڑی کا کر دیا۔

شہریار بستر پر لیٹتے ہی سو گیا اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بستر سے اٹھی اور باہر آ گئی۔ شاید آنٹی جاگ رہی ہوں۔ وہ ان کے کمرے میں آئی وہ واقعی جاگ رہی تھیں اور بستر پر لیٹنے کے بجائے سنگل صوفے پر بیٹھی کسی سوچ میں گم تھیں۔

"میں آ جاؤں آنٹی!"

"آؤ بیٹا! تم ابھی تک سوئیں کیوں نہیں؟" وہ ان کے پیروں کے قریب کارپٹ پر بیٹھ گئی سر ان کی گود میں رکھا اور ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔

"نہیں بیٹا! روتے نہیں ہیں' زندگی میں بہت سے ایسے مقام آتے ہیں جب لگتا ہے زندگی بہت بوجھل ہو رہی ہے۔ ہم اس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہیں مگر پھر یہ وقت گزر جاتا ہے۔ زندگی پھر سے رواں دواں ہو جاتی ہے بس بیٹا! ذرا عقل سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور تم مت گھبراؤ۔ تم اکیلی نہیں ہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"مگر میرا سب کچھ ختم ہو گیا۔ شہریار نے ایک دوسری عورت کو مجھ پر ترجیح دے کر مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے۔"

"تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟ بیوی کی قدر جو مرد کو ہوا کرتی ہے۔ تم جان لو کہ اس کی نگاہ جوہر شناس ہے ہی نہیں مگر ہم اسے کیچڑ میں ہاتھ بھی نہیں ڈالنے دیں گے۔"

"کیا میں شہریار پر اپنے شک کا اظہار کر دوں؟"

"نہیں' اس طرح اسے جو جھجک ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔ میں اس وقت بستر پر لیٹ کر سونے کے بجائے تمہارے ہی بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"کیا انجی اپنے میاں سے طلاق لے کر شہریار سے شادی...؟" اس سے آگے سے بولا نہیں گیا۔

"میرا نہیں خیال' اس طرح کی عورتیں صرف اور صرف مردوں کو اپنی طرف متوجہ رکھنے کی متمنی ہوتی ہیں۔ یہ بات تو وہ خود بھی جانتی ہے۔ شہریار اس کے بچوں کو بھی نہیں اپنا سکتا اور وہ اپنے بچے تو کسی طرح نہیں چھوڑ سکتی۔"

"وہ شہریار کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ مجھ سے یہ بھی برداشت نہیں ہو رہا۔"

"میں نے کہا نا بیٹا! بہت عقل سے کام لینا ہو گا' میرا خیال ہے۔ ہمیں انجی پر بھی یہ ظاہر نہیں کرنا چاہیے کہ ہم اس کی سیاہ شکل دیکھ چکے ہیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆ ☆ ☆

صبح شہریار کے آفس جانے کے بعد انہوں نے شفق کے میکے فون کیا۔ کچھ دیر اس کی امی سے بات کرنے کے بعد ارم سے بات کروانے کو کہا اور حال احوال دریافت کرنے کے بعد انجی کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

"کیا ہوا آنٹی! آپ اس کے بارے میں مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہیں؟"

"بہت دخل بڑھ گیا ہے اس کا میری بہو کے گھر میں۔ یہاں تک کہ اب تو شفق بھی کھٹکنے لگی ہے۔"

"شہریار بھائی بھی اس کا دم بھرنے لگے ہیں کیا؟"

"ہاں یہی بات تو پریشانی کی ہے۔"

"آنٹی! مجھے وہ کبھی بھی اچھی نہیں لگی۔ جب میں بیاہ کر اس گھر میں آئی تو وہ میرے میاں سے تو بے تکلف تھی ہی۔ ان کے سامنے مجھے تو تبھی بہت تھی خود کو عقل کل ثابت کرنے کے چکروں میں رہتی تھی اور آپ تو جانتی ہیں مرد ایسی عورتوں سے اگر وہ بیوی نہ ہو تو بہت متاثر ہو جاتے ہیں مگر میں بے وقوف نہیں تھی' وہ مجھ سے کہتی ارے بھائی! یہ کیسا کلر پہن لیا ہے آپ نے۔ اور میں پورے اعتماد سے کہتی دل یہ کالے کلوٹے لوگوں پر لگتا ہے۔ مجھ پر تو ہر کلر جچتا ہے۔ ہاں تم کبھی بھول کر بھی نہ پہننا۔ کبھی میرے بنائے کسی کھانے پر اعتراض کرتی تب بھی میں ایسا ہی جواب دیتی اور آخر اس نے میرے سامنے آنا ہی کم کر دیا۔ مگر شفق بہت نادان ہے اور پھر وہ اس کی دوستی پر ایمان بھی لا چکی ہے۔"

"تمہاری باتوں سے مجھے ایک تسلی تو ہوئی ہے کہ وہ جو بھی کر رہی ہے صرف اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کر رہی ہے۔ شہریار میں اس کی دلچسپی دوسری طرح کی نہیں ہے۔"

"پھر بھی آنٹی! آپ نگاہ رکھیے۔"

واقعی ارم کا مشورہ معقول تھا اور پھر شہریار کا دل بھی تو اس کی جانب مائل محسوس ہوتا تھا۔

☆ ☆ ☆

شفق دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھی جب انجی کا فون آ گیا۔ وہی بے تکلف اور پیار بھرے انداز' شفق نے اسپیکر آن کیا اور سیل فون لے کر نبیلہ کے پاس آ بیٹھی۔

"ہائے شفق! تمہاری ساس تو مجھے بہت ہی تیز عورت لگتی ہے۔"

نبیلہ کے اشارے پر اس نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"اس سے ذرا دور دور رہا کرو اور سنو زیادہ خدمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ جتنی جلدی واپس چلی جائے اچھا ہے۔ ویسے گھر جا کر میرے بارے میں کوئی بات تو نہیں ہوئی۔"

"نہیں وہ جلدی سو گئی تھیں۔ اچھا انجی میں کھانا بنا رہی تھی۔ شہریار آنے والے ہوں گے۔"

"کیا بنا رہی ہو؟"

"قیمہ مٹر۔"

"ہوں میری فیورٹ ڈش۔" کوئی اور وقت ہوتا تو شفق جھٹ اپنے ہاں آنے کی دعوت دے ڈالتی مگر آج اس نے ایسا نہیں کیا۔

"اچھا شفق! تم یقین رکھو میں ابھی آئی ہوں۔" وہ فون سے فارغ ہوئی نبیلہ کے ذہن میں نجانے کیا آئی۔ اٹھ کھڑی ہوئیں اور آدھے گھنٹے کے بعد وہ انجی کے بیٹے کے ساتھ موجود تھیں۔

"آپ انجی کی طرف گئی تھیں۔ کیا وہ آپ کے ساتھ آئی ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ نہیں صرف اس کا بیٹا! خاصا ضدی اور بڑا ہٹ دھرم بچہ ہے خیر اس کی یہی عادتیں ہمارے لیے سودمند رہیں گی۔"

شفق سمجھی نہیں مگر اتنا بھروسہ تھا وہ جو کریں گی غلط نہیں ہو گا اور جب شہریار گھر میں داخل ہوا' بچہ دھاڑیں مار کر رو رہا تھا اور چاکلیٹ کی فرمائش کر رہا تھا۔

"کیا انجی آئی ہیں؟" اس کے بیٹے پر نظر پڑتے ہی وہ پوچھنے لگا۔

"نہیں میں اس کی طرف گئی تھی۔ بچے نے رو رو کر گھر سر پر اٹھا رکھا تھا۔ یہ بھی ضد پر غصہ کیے جا رہا تھا۔ اسے میں لے آئی۔"

"یہ بہت ضدی بچہ ہے۔ اسے کیوں لے آئیں۔ میں دوپہر میں ریسٹ کا عادی ہوں اور یہ اپنے باپ کی کاپی۔" شہریار کے انداز میں بچے کے لیے بے زاری ہی بے زاری تھی اور اسے نبیلہ نے پہلی کامیابی سمجھا تھا۔

"پلیز اسے خاموش تو کروائیں۔ شفق سے کہیں۔ وہ اسے بہت اچھی طرح ہینڈل کر سکتی ہے۔"

"شفق اس وقت کھانا بنا رہی ہے۔"
"انکل مجھے چاکلیٹ کھانی ہے اور اسی ریسٹورنٹ میں آئس کریم بھی کھانے چلیں نا!"
"چپ خاموش۔ خبردار جو ایک لفظ بھی بولے۔" ڈنڈا پھوٹنے کے ڈر سے وہ دھاڑا۔ بچہ پھر سے گلا پھاڑنے لگا۔

آج کا لنچ بھی برباد ہوا اور ریسٹ بھی کہ بچے نے بیٹ بال کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ لاؤنج میں کھیل رہا تھا۔ بال بار بار ان کے کمرے کے دروازے پر لگ رہی تھی پھر اچانک شور بند ہو گیا۔ اس نے شکر کا کلمہ پڑھا اور کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔

جب نبیلہ بچے کو لے کر دوپہر میں ہی انجی کے ہاں پہنچیں تو وہ خاصی حیران ہوئی۔
"آپ گرمی میں شام کو آجاتیں آپ۔"
"دراصل میں شہریار گھر آگیا ہے۔ یہ روتا ہے تو اسے غصہ آتا ہے۔ بڑا مروا ہے۔ بچوں کے رونے کو ہی برداشت کرتے ہیں۔ مگر دوسرے کے بچے کی ضد بس طیش دلا دیتی ہے۔"
"ہاں ماما انکل تو بہت گندے ہیں انہوں نے مجھے چاکلیٹ بھی نہیں دلائی۔"
شہریار نے اسے مارا نہیں تھا مگر نبیلہ سارے رستے ہی سمجھاتی آئی تھیں۔ گھر جا کر کہنا انکل نے مارا ہے۔
انجی کے چہرے کا تاثر واضح طور پر بدلا۔ پھر وہ ہنسی اور بولی۔
"آپ اندر تو آئیں نا۔"
"کیا گڈو کے پپا گھر پر ہیں؟" انہوں نے گاڑی دیکھ کر پوچھا۔
"جی ہاں سو رہے ہیں۔"
"چلو ٹھیک ہے میں پھر کبھی آؤں گی انجی! تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ تمہارے بچے بھی بہت پیارے ہیں۔"
وہ واپس آگئیں۔ شفق سونے کے لیے کمرے میں گئی تھی۔ وہیں بیٹھی تھی۔ وہ بھی اس کے برابر بیٹھ گئیں آہستہ آہستہ سب بتانے لگیں۔

☆ ☆ ☆

اگلے روز جو شہریار گھر آیا انجی کے دونوں بچے اس کے گھر پہنچے تھے پتا چلا انجی اور شفق بازار گئی ہیں۔ بچی رو رہی تھی [illegible] ٹی وی پر اپنے پسندیدہ کارٹون دیکھ کر شور کر رہا تھا۔ کارپٹ پر بسکٹوں کا چورا، تکیے بکھرے تھے، کشن، اخبار سب فرش پر تھے۔
گھر آتے ہی ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ بے حد نفیس طبیعت کا مالک تھا اور اتنے شور اور ابتری سے اسے سخت الجھن ہوتی تھی۔
"امی! یہ سب کیا ہے۔ کتنا گند ڈال دیا ہے اس نے۔"

"میں کس کس کو دیکھوں؟ یہ سب اس نے انجی کے سامنے ہی کیا ہے۔ وہ تو عادی ہے اس کی اس نے اپنے گھر کی حالت اس سے بھی ابتر ہوتی ہے۔ میں سمیٹا یہ سب ایسے بس بازار جانے کی جلدی تھی۔"
"بچوں کو تو گھر چھوڑ آتی۔"
"وہ اس کی رشتے کی نند [illegible] دوسرے عزیز کے ہاں گئی ہے۔ بچوں کو یہاں چھوڑ گئی۔"

"توبہ جو بیاہی ہے اور گلے میں ڈھیر لڑکا اپنا نصیب ہے۔"
اس نے دانت پیس کر بچی پر تبصرہ کیا اسی وقت بچے نے کسی ڈرامائی سین پر نعرہ بلند کیا اور ریموٹ اٹھا کر مارا۔
"اوئے بدتمیز آرام سے۔" شہریار نے ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آف کر دیا۔
"انکل مجھے دیکھنا ہے۔" وہ عادت کے مطابق فرش پر لیٹ کر ہاتھ پیر پٹخنے لگا۔
نبیلہ کچن میں جا کر شفق کو فون کر چکی تھیں کہ وہ واپس آئیں۔ شہریار سے بچہ ریموٹ لینے کی کوشش میں تھا اور وہ دے نہیں رہا تھا۔
"شہریار بیٹے! اب کمرے میں مت چلے جانا۔ یہ

آفت بچے مجھ سے نہیں سنبھالے جاتے کچھ مدد کرو۔

"امی! میں ابھی تھکا ہوا آیا ہوں۔ میں کیا کروں؟" وہ جھلایا۔

"تم تو ان کے گھر جاتے رہتے ہو۔ تم سے تو کچھ مانوس ہوں گے۔"

"میں نے کبھی انہیں زیادہ لفٹ نہیں کرائی کالے کالے بچے مجھے اچھے نہیں لگتے۔"

"اچھا میرا خیال کر کے ہی بیٹھ جاؤ۔" وہ بددلی سے بیٹھ گیا پھر بولا۔

"کھانے میں کیا بنا ہے۔ میں چینج تو کر آؤں پھر کھانا کھاتے ہیں۔ یہ موڈ بھی شاید بدل جائے اور اس چڑیل کے منہ میں فیڈر ہی ڈال دیں۔"

"کھانا تو شفق بنا کر نہیں گئی۔ بس وہ انجی کو جلدی تھی بولی۔ اگر ایک دن وقت پر کھانا نہیں ملے گا تو کیا ہو جائے گا۔ اصل میں اس کا میاں تو بے نا بھلا مانس ...؟"

"اب کیا ہوا کھاؤں۔ شفق کو نہیں پتہ تھا میں آفس سے آنے والا ہوں۔"

"بس بیٹا! کسی کا بہت اثر لیتی ہے۔"

"کسی اچھی بات کا بھی اثر لے لے۔"

"کون سی اچھی بات کہہ کر آ سکے ہر مرد کے آگے پیچھے پھرتا ہے اس کی بیوی کے خلاف ورغلاتا یا اپنے شوہر کی پروا نہ کرنا۔ ہر کسی کے سامنے اس غریب کا مذاق اڑانا جو اس کے آرام کی خاطر محنت کرتا ہے۔"

ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ شفق کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ نبیلہ نے بچے کے ہاتھ میں پکڑا کھلونا کھینچ لیا۔ وہ پھر سے چلانے لگا۔ ساتھ ہی ڈر کر بچی بھی رونے لگی۔

"چپ کر جاؤ ورنہ اٹھا کر باہر پھینک دوں گی۔" وہ دھاڑا تھا اور انجی ٹھٹک گئی تھی پھر تیزی سے اندر کی جانب لپکی روتی ہوئی بچی کو سینے سے لگایا بیٹے کا ماتھا چوما۔

"جب سے آئے ہو شہریار بچوں پر ناک بھوں چڑھا رہے ہو۔ سچ ہے مرد پرائی اولاد برداشت نہیں کر سکتا۔"

"نن نہیں یہ غصہ ہی بہت کرتا ہے۔" وہ کچھ شرمندہ سا ہو اور اٹھ کر چینج کرنے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

یہ دونوں انجی کو کھانے پر روکتی رہیں مگر وہ رکی نہیں بچوں کو لے کر واپس چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

تیسرے روز جب نبیلہ اس کے بیٹے کو لینے جا رہی تھیں تو شفق نے کہا تھا۔ "وہ ناراض ہو کر گئی ہے اب نہیں بھیجے گی۔"

"ترائی کرنے میں کیا حرج ہے؟" وہ چلی آئیں۔ انجی واش روم میں گر گئی تھی گھٹنے پر بہت چوٹ آئی تھی۔ اس سے تو پیروں پر کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔

"تمہاری نند کو بھی ان ہی دنوں میں جانا تھا۔" وہ بڑبڑائیں۔

"بس آنٹی! سب مطلب پرست ہیں۔" وہ کراہی۔

"تم اٹھو چلو میرے ساتھ جب تک ٹھیک نہیں ہو جاتیں۔ میرے گھر ہی رہو۔"

"مگر آنٹی۔" وہ ہچکچائی۔

"کوئی اگر مگر نہیں بس چلو۔" وہ تینوں کو زبردستی لے آئیں۔ انجی ملگجے لباس میں اور بغیر میک اپ کے تھی۔ نبیلہ نے الماری سے اس کے واسطے عمدہ سے جوڑے اٹھائے تھے۔

میک اپ کے بغیر اس کا سانولا رنگ بہت گہرا سا نظر لگ رہا تھا۔ مسکارے اور آئی پنسل کے استعمال کے بغیر آنکھیں بھی گہرے سائز نہیں دکھ رہی تھی کیا جاتی ہونٹ اور بھی برا تاثر چھوڑ رہے تھے۔ وہ تکلیف میں تھی۔ یہاں آ کر نبیلہ نے اسے اپنے بیڈ روم میں لٹایا۔ میک اپ کے بغیر وہ کیسی لگتی ہے۔ وہ خود بھی جانتی تھی۔ خیال تھا شہریار کی آمد سے پہلے وہ میک اپ کر لے گی اس کی پینٹنگ تو نبیلہ آنٹی نے کی تھی وہ ایسا کچھ بھی نہیں لائی تھیں نہیں شفق سے لے لوں گی مگر شفق پتہ نہیں کہاں مصروف تھی۔

شہریار کی گاڑی کی آواز اس نے سن لی تھی اور وہ بڑی بے چینی محسوس کر رہی تھی عام سے کاٹن کے کپڑے الجھے بکھرے بال بے رونق چہرے۔ افسوس شفق کہاں مر گئی ہے اسے بے تحاشا غصہ آیا اسی وقت اس کے بیٹے کے زور زور سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔

"امی! امی!" شہریار چلا رہا تھا آپ آج پھر اس مصیبت کو اٹھا لائی ہیں۔ "پتہ نہیں اس کالے کلوٹے میں آپ کو کیا کشش محسوس ہوتی ہے چپ کر جا منحوس!" اب وہ بچے سے مخاطب تھا۔

"بھئی نہیں اس کی ماں بھی آئی ہے۔ تمہارے بیڈ پر سو رہی ہے۔" نبیلہ نے ہنس کر کہا تھا۔

"میرے بیڈ پر کیوں میں نے شفق سے پہلے بھی کہا تھا اسے میرے کمرے میں مت ڈالا کرے عجیب سی اسمیل آتی ہے اس سے۔"

"میرا خیال ہے انجی بچوں کو کم کم ہی نہلاتی ہے شاید اس لیے۔" اس خیال کا اظہار نبیلہ نے کیا پھر اس کے بچے کو پیار سے چپ کرانے لگیں۔

"مجھے کچھ سکون چاہیے۔" کچھ اپنے نام کا ایک تھا۔ اندر انجی غصے میں بل کھا رہی تھی۔

"میرے بچوں کے لیے اتنی نفرت ہے شہریار کے دل میں۔ کیسے کیسے نام دیتا ہے انہیں اور میری پہلی محبت اپنے بچے ہیں۔ بہت پیار کرتی ہوں میں اپنے بچوں سے۔" تیز تنفس کے ساتھ سیل اٹھایا اور میاں کو کال کرنے لگی شہریار کے گھر کا ایڈریس بتا کر جلد آنے کو کہا تھا۔

باہر اس کا بیٹا اب بھی رو رہا تھا۔ شفق نے شاید اسے پانی کا گلاس لا کر دیا تھا۔

"نہیں پیوں گا نہیں پیوں گا۔"

"مت پیو مرو ہماری طرف سے۔ شہریار اب آواز نکالی اور شفق پلیز! اس آفت کو یہاں سے اٹھاؤ۔ دیکھو آرام سے اٹھانا۔ جاگ گئی تو گھر سر پر اٹھا لے گی۔ آج میری طبیعت ٹھیک نہیں فلو ہو رہا ہے میں بس ایک کپ چائے لے کر سونا چاہتا ہوں۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھا تھا اسی وقت لنگڑاتے ہوئے انجی لاؤنج میں آئی تھی۔

"ارے یہ انجی ہے یا اس کا بھوت۔" وہ ٹھٹھکا۔

"بیٹا ادھر آؤ میرے پاس۔ فون کیا ہے میں نے تمہارے پپا کو۔ ابھی آرہے ہیں پھر ہم اپنے گھر چلیں گے راستے میں تم جو کہو گے۔ تمہارے پپا تمہیں دلائیں گے۔"

وہ شہریار کی طرف دیکھے بغیر بہت سپاٹ انداز میں شاید اسے ہی سنانے کو بچے سے کہہ رہی تھی۔

"انجی تم بھی آئی ہو۔ میں سمجھا بچے ہی ہیں اور یہ تمہیں ہوا کیا طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" انجی نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں شفق سے بولی۔

"بیٹی کو مجھے دو اور آنٹی کے کمرے میں رکھا میرا بیگ بھی لے آنا۔ ان کے پپا آتے ہی ہوں گے۔"

"انجی تم لوگ کھانا کھا کر جانا۔"

"نہیں آنٹی! شکریہ۔ اس کے پپا سے کہا ہے میں نے ٹویاز ارسے لیتے آئیں گے پھر ہم نے اپنے بیٹے کو اس کی پسند کے کھلونے بھی دلوانے ہیں۔"

"اچھا تو بچوں سے پیار کرتا ہے تمہارا میاں چلو یہ بھی غنیمت ہے۔ میں سمجھی جیسے تم پر توجہ نہیں دیتا ایسے ہی شاید بچوں کو بھی اگنور کرتا ہے۔"

"نہیں نہیں آنٹی! اپنے بچوں میں تو جان ہے ان کی کوئی ان کے سامنے ان کے بچوں کو کچھ کہہ کر تو دیکھے اور میرا بھی بہت خیال رکھتے ہیں۔ اب تو میں نے بھی سوچ لیا ہے۔ انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی بس میں میرے بچے اور ہمارے سر کا سائبان اظہر۔" یقیناً اس نے یہ سب شہریار کو سنایا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد اظہر آگیا۔ شہریار نے آج پہلی بار اسے دیکھا۔ اچھا خاصا معقول شخص تھا کم از کم اس سے تو بالکل مختلف جو کچھ انجی بتاتی رہی تھی۔ آتے ہی بیٹی کو پیار کیا پھر بیٹے کو گود میں لے لیا۔

"چلیے گھر چلتے ہیں۔" انجی اس کے بے حد قریب کھڑی تھی اور یہ عام سی بات بھی بڑے خاص انداز میں شاید شہریار کو کچھ جتانے کے لیے کہہ رہی تھی۔

"کھانا کھا کر جاتے آپ لوگ۔" نبیلہ نے کہا مگر انجی کسی طور تیار نہیں تھی۔

"لو اتنے بھلے مانس شوہر کے لیے یہ عورت کیسے کیسے الفاظ استعمال کرتی رہی ہے۔" نبیلہ نے ان کے جانے کے بعد کہا تھا۔

"جی آنٹی! انجی کو ہمدردی سمیٹنے کی ہمیشہ سے عادت ہے۔" آج شفق بھی چپ نہیں رہ سکی تھی۔

"گھر میں کیسا سکون ہو گیا ہے، بچے تو گھر کی رونق ہوا کرتے ہیں مگر اس کے بچے تو آفت ہیں۔" یہ نبیلہ تھیں۔

شہریار نے شفق سے دوا کے لیے کہا اور پھر سے کمرے میں چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

شہریار کو فلو ہوا پھر بخار نے آلیا تین دن تک وہ آفس نہیں جا سکا اور ان تین دنوں میں ان دونوں نے اسے کمرے میں اکیلا نہیں چھوڑا۔ ایک کام کے لیے اٹھتی تو دوسری آ بیٹھتی۔ وہ اسے انجی کو کال کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھیں اور شہریار ایسے موقعے کی تلاش میں تھا بھی نہیں۔ ان تین دنوں میں صرف پہلے روز ہی اس نے انجی کے بارے میں سوچا تھا۔ "کیا میں بچوں سمیت اسے قبول کر سکتا تھا؟ یہ میں کس طلسم میں گرفتار ہو رہا تھا۔ میں جو ہمیشہ خود کو بہت سمجھدار سمجھتا رہا، مجھے کیا ہو رہا تھا؟" وہ خود پر حیران تھا اور بس۔

تیسرے دن وہ آفس گیا اور وقت پر واپس آیا۔ شام میں ان دونوں سے کہیں باہر لنچ کے لیے کہہ رہا تھا اور انہوں نے انکار نہیں کیا۔

بہت دن گزر گئے۔ انجی کا فون بھی نہیں آیا اور شفق خود سے کال کرتی۔ اب تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اور جس روز ڈاکٹر نے شفق کو امید سے ہونے کی خوش خبری دی تھی۔ وہ بے اختیار رو پڑی تھی۔

"شفق! کیا ہوا ابھی کیا تم خوشی سے رو رہی ہو؟"

"نہیں آنٹی! میں شہریار کے بارے میں سوچ رہی تھی اگر آپ نہ آتیں اور یہ مسئلہ حل نہ کرتیں تو آج یہ خبر۔ عورت کتنی بے اماں ہے۔"

وہ جواب میں تسلی نہیں کر سکیں بس اس کا سر سینے سے لگا کر تھپکنے لگیں۔ پھر اسے خود سے الگ کیا اور بولیں۔

"بیٹا حدیث ہے۔ عورت اپنے مرد کے سامنے دوسری عورت کی تعریف نہ کرے۔ مگر دوسری بہت سی باتوں کی طرح ہم نے کبھی اس بات پر بھی غور نہیں کیا۔ اس کی حکمت سے ناواقف ہی رہے۔ میں مانتی ہوں بہت زیادہ قصور شہریار کا ہے مگر کیا کریں بیٹا کہ یہ معاشرہ مرد کا معاشرہ ہے عورت کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہے ورنہ آنسو اور پچھتاوے ہی رہ جاتے ہیں۔"

☼ ☼ ☼

جب ان کے ہاں پہلی بیٹی ہوئی تو شہریار نے بہت چہکتی ہوئی آواز میں ماں کو یہ خوش خبری سنائی تھی۔

"کیسی ہے وہ؟" فطری اشتیاق کے ساتھ پوچھا تھا۔

"بہت پیاری بالکل شفق جیسی۔" اور جہاں ماں مطمئن ہوئی تو وہیں ایک آسودہ سی مسکراہٹ شفق کے ہونٹوں پر بھی سج گئی۔

تقریباً ڈیڑھ سال بعد ہی وہ پوتی کو دیکھنے پاکستان آ سکی تھیں۔ وہ گاڑی میں ہی انہیں بتا رہا تھا۔

"بہت ہنس مکھ بچی ہے اور تمیزدار بھی۔"

"اچھا! انجی کے بچوں کی طرح گلا پھاڑ پھاڑ کے تو نہیں روتی؟" وہ پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں نہیں امی! وہ میری اور شفق کی بیٹی ہے بھلا ایسی کیسے ہو سکتی ہے؟"

"چلو شکر ہے تمہیں ہیرے کی قدر تو ہوئی۔"

"کیا مطلب امی؟" اس نے ان کی جانب دیکھا اور جواب مل گیا۔

"میں بھٹک گیا تھا امی اور مجھے آج تک حیرت ہے کیا تھا اس عام سی عورت میں؟"

"بیٹا! میں نے آج تمہیں اس لیے یہ یاد دلایا ہے کہ اب تم بھی ایک بچی کے باپ ہو۔"

"امی! میں یہ غلطی کبھی دہرانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ شکر ہے کہ شفق اس بات سے ناواقف ہے۔" وہ یہ کہتے کہتے رک گئیں۔

وہ بات جو دو سال سے شہریار پر ظاہر نہیں کی گئی جسے شفق چپکے سے برداشت کر گئی ہے۔ کیا شہریار کو بتادوں۔

انہوں نے کچھ دیر سوچا پھر فیصلہ کیا نہیں شہریار کو بتا دیا تو پھر وہ اپنی محبتوں کے اظہار میں جھجک کا شکار ہو جائے گا اسے اسی غلط فہمی میں رہنے دو کہ شفق کچھ نہیں جانتی۔ وہ تمہاری بے وفائی سے ناواقف ہے۔ اسی میں شفق کی بھلائی ہے۔ گھر قریب آچلا تھا۔

"امی! شفق نے گھر کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ تمام فرنیچر نیا ڈلوایا ہے۔ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ آپ دیکھیں گی تو خوش ہو جائیں گی۔"

انہیں وہ شفق یاد آگئی تھی جس کی دنیا بس لٹنے کو ہی تھی اور شوہر مل جانے کے بعد بھی وہ اس کی واپسی پر بے یقین تھی۔

سدرۃ سحر عمران

دل تجھے ڈھونڈ کے لایا

دھاڑ کی آواز کے ساتھ دروازہ کھل کر اس سے زیادہ زوردار آواز ہی کے ساتھ بند ہوا تھا۔ ہدیہ کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔

"یہ تمہارے بھائی صاحب خود کو سمجھتے کیا ہیں؟ جب دیکھو لفظوں میں رعب جھاڑتے رہتے ہیں۔ زیادہ ہی چھے خان بننے کا شوق ہے تو اسے اپنے بہن بھائیوں تک محدود رکھیں۔ خدا کی قسم اور حق کر نازل ہو جاتے ہیں۔ میں جہاں جاؤں، جو مرضی پہنوں، انہیں کیا تکلیف ہے؟"

حسب توقع منشاء حیات آفت کی طرح نازل ہوئی تھی۔ ہدیہ نے بے چارگی سے اپنے نامکمل اسائنمنٹ کو دیکھتے ہوئے فائل بند کر دی۔ اب اسے دو ڈھائی گھنٹہ تک "منشاء نامہ" ہی سننا تھا۔

"یہ نہیں کرنا، وہ نہیں کرنا، یہاں نہیں جانا، وہاں نہیں جانا۔ بڑے آئے بادشاہ سلامت کہیں کے۔ میں نے تو کبھی اپنے ڈیڈ سے ڈانٹ نہیں کھائی تو تمہارے بھائی صاحب کیا چیز ہیں۔"

ہدیہ جو آج تک اپنے "بھائیوں" کی شاندار پرسنالٹی، بارعب شخصیت پر فخر کرتی آئی تھی۔ منشاء حیات کو اسی شاندار شخصیت میں ہزاروں خامیاں نظر آتی تھیں اور اس زور و شور سے ان کی خامیاں گنواتی تھی کہ اس کا سارا فخر ڈانوا ڈول ہونے لگتا۔

"سمجھا دینا انہیں اپنی زبان میں منشاء حیات کوئی ہدیہ یا لائبہ نہیں ہے جو ان کی ہدایت پر احمقوں کی طرح سر ہلاتی رہتی ہیں۔"

ناولٹ

لوتی... اچھی بھلی فرمانبرداری پر "احمق" کا خطاب مل گیا تھا۔

"اور یہ سب تم بہنوں کی وجہ سے ہی ہے۔"

ایک نئی فرد جرم عائد ہوئی۔

"ایبا اور ناز بجوان سے بڑی ہو کر بھی یوں ڈرتی ہیں جیسے کچھ غلط کہہ دیا تو ہٹلر صاحب گردن مروڑ دیں گے اور وہ اسٹوپڈ نوفل... مجھے اگری تو کیا کرتا' ان کا سوال سنتے ہی الٹے قدموں واپس بھاگ گیا۔ ہونہہ' بزدل..." قصہ کیا تھا' اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا مگر پوچھنا مزید بھڑکانے کے مترادف تھا۔

"بچپن سے ہی میں نے ہمیشہ یہی ڈریسنگ کی ہے۔ اس کا اشارہ اپنی جینز اور ٹی شرٹ کی طرف تھا۔ شلوار قمیص تو میں نے کبھی ساتھ لگا کر بھی نہیں دیکھی۔ میں جس ڈریس میں ایزی فیل کرتی ہوں' وہی پہنوں گی نا۔ اور پاکستان میں لڑکیاں جینز اور شرٹ عام پہنتی ہیں پھر مجھ پہ ہی پابندی کیوں؟ میں تو یہی ڈریسنگ کروں گی جو مرضی کہتے رہیں۔" دھپ سے ایزی چیئر پر گرتے ہوئے اس نے بدتمیزی سے جاگرز اتار کر دائیں بائیں اچھالے۔

"اچھا بھلا کنسرٹ مس کروا دیا۔ عاطف نے پرفارم کرنا تھا آج تو۔ برسوں سے منت مشت کر رہی ہوں میں اور یہ ظرم خان پتہ نہیں کہاں سے نازل ہو گئے۔ اچھے بھلے اسلام آباد گئے ہوئے تھے ایک ہفتے سے۔ سکون ہی سکون تھا قسم سے۔ آج ہی آنا تھا' کل آجاتے۔ اس ایڈیٹ نوفل کو کب سے نکلنے کا کہہ رہی ہوں مگر اس کی تیاریاں ہی مکمل نہیں ہوتیں۔ اب کیا فائدہ ہوا اتنا تھوپڑا پکانے کا۔ کمرے میں گھسا اسٹڈی کر رہا ہوگا۔ کل ایگزیم جو ہے۔ ایگزیم نوفل کے ہیں اور پریشان بھائی جی ہو رہے ہیں۔ یہ تمہارے بھائی میں ساری خصوصیات "امریکہ" جیسی کیوں ہیں۔ ہر کسی کے کام میں مداخلت کرنا' ہر کسی کے مسئلے میں ٹانگ اڑانا۔ کتنا شوق ہے انہیں اپنی اہمیت جتانے کا۔" اصل واقعہ اسے اچھی طرح سمجھ میں آچکا تھا۔

کچھ دیر قبل ہی وہ اور نوفل، حریم آڈیٹوریم میں ہونے والے کنسرٹ میں جانے کے لیے نکلے تھے اور گیٹ سے داخل ہوتے ازرار شاہ پر نگاہ پڑتے ہی نوفل کے چھکے چھوٹ گئے تھے۔ ایک تو ازرار ویسے بھی میوزیکل نائٹ اٹینڈ کرنے کا مخالف تھا دوسرے آنسہ خشاء حیات کی ڈریسنگ۔ وہ اس وقت ٹائٹ جینز اور ٹاپ میں ملبوس تھی۔ جینز تو شاہ پاؤس میں لڑکے بھی شاذ و نادر پہنتے تھے کجا کہ لڑکیاں۔ ازرار شاہ کے ماتھے کی سلوٹوں میں اسٹاک ایکسچینج مارکیٹ کی طرح ایک دم ہی اضافہ ہوا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو تم؟" نوفل کے ہاتھ ہیوی بائیک کے ہینڈل پر ہی ساکت ہو گئے۔

لائٹ گرے تھری پیس میں ملبوس ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں سیل فون پکڑے ازرار شاہ نے بے حد چبھتی نگاہ بے نیازی سے ببل گم چباتی خشاء پر ڈالی تھی۔

"وہ... ہم..." نوفل سے فوری طور پر کوئی بات نہ بن پڑی۔

"ہم لوگ کنسرٹ میں جا رہے ہیں عاطف کے۔ کوئی اعتراض؟" اس کا انداز مزید تاؤ دلا گیا۔

"شرم نام کی کوئی چیز اگر تم میں موجود ہے تو اس کا استعمال بھی کر لیا کرو۔ زیادہ ماڈرن ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے خود کو۔ ایگزیم کی ڈیٹ شیٹ آچکی ہے ناں تمہاری۔ وہاں کسی عاطف کی پرفارمنس کی روداد نہیں لکھنی تم نے۔ جاؤ اپنے کمرے میں اور جا کر اسٹڈی کرو۔" اسے قطعی نظرانداز کرتے ہوئے اس نے سخت لفظوں میں نوفل کی کلاس لی تو وہ "سوری" کرتا الٹے قدموں ہی اندر بھاگا تھا۔ اس کے پیچھے ہی ازرار شاہ بھی۔ خشاء کو جتنا بھی غصہ آتا کم تھا۔

"اونہہ... جل ککڑا... سڑیل... کریلا... وہ بھی نیم چڑھا۔" وہ کینہ توز نظروں سے اس کی پشت کو گھورتی اپنے اور ہدیہ کے مشترکہ بیڈروم میں آگئی تھی۔

"سوری یار! وہ بھائیان اچانک ہی آگئے۔" نوفل بھی کان کھجاتا اس کے پیچھے آیا تھا۔

"واٹ سوری... تم تو بات ہی مت کرو مجھ سے۔ کب سے بکواس کر رہی ہوں نکل لو' تمہیں پتا ہوگا اس تیس مار خان نے آج ہی آنا ہے' اسی لیے جان بوجھ کر دیر کر رہے تھے۔ اب جاؤ' ان کے چرنوں میں جا کر۔ یہ جو بوتھا رکھا ہے نا لٹکا کر' اسی سے ملائی لے لو۔ مجھ سے بات بھی مت کرنا اب۔" بے حد غصے کے عالم میں اٹھ کر وہ واش روم میں جا گھسی تھی۔

"او گاڈ... یہ نیا کیسے پار لگے گی؟" ہدیہ نے بے ساختہ سر

تھاما تھا۔

"ایک مغرب ہے تو دوسرا مشرق۔ بہت غلط فیصلہ کیا ہے چاچو نے' اپنی بیٹی کے مزاج سے واقف ہونے کے باوجود۔" نوفل بھی پریشان تھا۔

اور جس نے یہ سارا گھر آگ بھڑکایا تھا' وہ اپنا ٹمپریچر قابو میں کرنے کے لیے شاور لینے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

خشاء حیات... حیات احمد شاہ کی اکلوتی دختر نیک اختر... جو کم از کم ازرار شاہ کو تو کہیں سے بھی "نیک" نہیں لگتی تھی۔ بارہ سال انگلینڈ جیسے ملک میں گزار کر وہ چھ سال پہلے اسلام آباد اور ڈیڑھ ہفتہ پہلے کراچی آئی تھی۔ والد محترم کا وہی روایتی جرم' پسند کی شادی۔ دو سال پہلے ہی ماں جی کی وفات پر ان کی بیس سالہ پرانی ناراضی ختم ہوئی تھی۔ تبسم سعید تھیں تو غیر خاندان سے مگر ان کی عادات و اخلاق کے سب چند دنوں میں ہی قائل ہو گئے تھے۔ فائزہ کو تو خصوصی غم تھا کہ ماں جی کی بے جا ناراضی کی وجہ سے وہ اتنا عرصہ اپنی پیاری سی دیورانی سے دور رہیں۔

دو سال پہلے حیات احمد اور تبسم شاہ کراچی "شاہ پیلس" آئے تو خشاء ان کے ہمراہ نہیں تھی۔ ان دنوں اس کا فائنل چل رہا تھا اور ویسے بھی اسے اپنے رشتے داروں سے کوئی خاص انسیت نہیں تھی' وہ اپنی دوستوں' بوائے فرینڈز میں ہی خوش باش تھی۔ حیات احمد اپنی بیٹی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے اپنے گھر کا ماحول بہت مذہبی رہا تھا مگر شادی کے بعد انگلینڈ میں گزارے بارہ سالوں میں وہ خاصے روشن خیال اور وسیع النظر ہو گئے تھے مگر "شاہ پیلس" کی اقدار و روایات آج بھی وہی تھیں۔ تبسم سعید ان کی یونیورسٹی فیلو اور بڑے باپ کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ شادی سے پہلے بھی وہ اکثر "شاہ پیلس" آتی رہتی تھیں۔ ان کے بے باک انداز اور ماڈرن لباس کو ماں جی نے کبھی پسند نہیں کیا اور جب حیات احمد نے ان سے شادی کا ارادہ ظاہر کیا تو ماں جی ششدر رہ گئیں۔

"احمد شاہ کی بہو... تبسم سعید... ناممکن... ہمارے گھر کی عورتوں کے سروں سے کبھی دوپٹہ بھی نہیں ڈھلکا اور میں پتلون پہننے والی کو بہو بنالوں۔ پھر وہ غیر ذات کی ہے۔" ان کا ملال عروج پر تھا مگر حیات احمد اپنی محبت سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ تھے۔

"میں ذات پات پر یقین نہیں رکھتا' وہ مسلمان ہے۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ماننے والی ہے۔ بس میرے لیے یہی کافی ہے۔"

"واہ میاں' بہت خوب... ایک پرائی لڑکی کے لیے ماں کو غلط ثابت کر رہے ہو۔ یہی سکھایا ہے تمہاری تعلیم نے تمہیں۔ تمہارا بھائی بھی تو ہے کتنا سکھی ہے آج فائزہ جیسی بیوی پا کر۔"

"فائزہ بھابھی بہت اچھی ہیں' آپ کی بھانجی ہیں مگر ماں جی! پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ مصباح اچھی ہوں گی مگر مجھے تبسم سے ہی شادی کرنی ہے۔" ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔ ماں جی قائل ہونے کے بجائے ناراض ہو گئیں۔

"ٹھیک ہے۔ اگر تم نے اپنی مرضی ہی کرنی ہے تو "شاہ پیلس" کے دروازے تم پر ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔"

اس وقت ہوا سے محض ان کی جذباتیت سمجھے تھے مگر آنے والے تین برسوں میں انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے قول میں کس قدر سچی تھیں۔ تبسم نے ہر طرح کے حالات میں ان کا ساتھ دیا تھا۔ "شاہ پیلس" سے بے دخل ہونے کے بعد انہوں نے اپنے سسر کی مدد لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے عزیز از جان بھائی اثبات احمد نے ہی ماں جی کے علم میں لائے بغیر ان کے لیے انگلینڈ جانے کا انتظام کیا تھا۔ وہاں پر دونوں نے جان توڑ محنت کی تھی۔ اولاد اکلوتی تھی اس لیے گزارا با آسانی ہو تا رہا۔ بارہ سالوں میں اثبات احمد کا "شاہ پیلس" سے رابطہ اگرچہ کم رہا مگر رہا ضرور تھا۔ چھ سال پہلے وہ پاکستان آئے تو اثبات احمد کے کہنے پر ہی یہیں کاروبار وغیرہ شروع کرنے کا ارادہ بنا لیا۔ تبسم ان کے ساتھ تھیں۔

مشاء کو کہ تیار نہ تھی مگر تبسم نے اسے قائل کر ہی لیا۔ "شاہ پیلس" کے رہن سہن کا دونوں کو ہی ادراک تھا، اس لیے پہلی بار وہ اسے دانستہ ساتھ نہیں لائے تھے۔ تبسم کو گھٹے گھٹے ماحول کے باوجود یہاں کی محبتوں کی فضا اچھی لگی تھی۔ ڈبل اسٹوری پورشن میں اثبات احمد اور وہاب احمد خاندان رہائش پذیر تھے۔

وہاب احمد، حیات احمد سے آٹھ برس چھوٹے تھے۔ ان سے چھوٹی فائقہ شادی کے بعد شوہر کے ساتھ قطر چلی گئی تھیں۔ ماں جی کی طبیعت کی خرابی پر وہ اور تبسم "شاہ پیلس" آئے تھے اور انہیں منا کر ہی دم لیا تھا۔ تبسم کے متعلق جو ان کے خیالات تھے، وہ ان سے قطعی مختلف ثابت ہوئیں لیکن یہ ان کی بدقسمتی ہی تھی، صرف دو ہفتوں بعد ماں جی داعی اجل کو لبیک کہہ گئیں۔

اثبات احمد کی پانچ اولادیں تھیں۔ صبیحہ اور نازش کی ماں جی کی وفات سے دو ماہ پہلے اکٹھے ہی شادی ہوئی تھی۔ وہ دونوں بیاہ کر سگے ماموں کے گھر گئی تھیں۔ ان سے چھوٹے ازرار شاہ جو ایم بی اے کے بعد ذاتی فیکٹری سے منسلک ہوگئے تھے پھر ہدیہ تھی۔ ایم اے اسلامیات کی اسٹوڈنٹ۔ اس سے چھوٹا نوفل جو پی ای کر رہا تھا۔ وہاب احمد کے دو جڑواں بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ جنید اور حیدر راس کے ایچ لیٹو ہی نہیں، کلاس فیلو بھی تھے۔ چھوٹی لائبہ میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی۔

وہ "شاہ پیلس" میں پہلی بار ہی آئی تھی۔ اس کے انداز میں نہ تجسس تھا اور نہ گرم جوشی۔ دو دن تک تو اس کا موڈ آف ہی رہا تھا مگر اسے سارے کزنز کی موجودگی میں اس کا خود ساختہ خول ٹوٹ ہی گیا۔ اس کی عادت اور مزاج تبسم جیسا بھی تھا اور حیات احمد جیسا بھی۔ جذباتی حیات احمد کی طرح تھی تو خوش اخلاق اور زندہ دل تبسم کی طرح۔

ازرار شاہ نام کے "بوتے" سے اسے پہلے دن ہی سے ڈرانے کی کوشش کی گئی تھی۔

"بھائیاں یہ پسند نہیں کرتے، وہ پسند نہیں کرتے۔"

وہ بور ہوگئی تھی اس قسم کے جملے سن سن کر۔ اور ان سے ملاقات تیسرے روز ان کی سنگاپور سے واپسی پر ہوئی تھی۔ اور ان سے مل کر وہ مزید مایوس ہوئی تھی۔

"یہ ان کے چہرے پر ایک ہی ٹائم کیوں فکس رہتا ہے؟" دوسرے دن ہی اس نے معصومیت سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ ان سے کچھ فاصلے پر ہی تو قالین دیکھنے میں مگن تھے۔ ہدیہ کا کھلا منہ بند نہیں ہو سکا تھا۔

"رئیلی... میں تو ان کا ایک ہی پوز دیکھ دیکھ کر بور ہوگئی ہوں۔ انسان میں کچھ تو تبدیلی ہونا چاہیے۔ یہ کیا کھا لیا، پی لیا، کام کیا اور سوگئے بھی بھلا مان گئے۔ ہونہہ بورنگ لائف اسٹائل۔" پاپ کیپ اچھالتے ہوئے وہ اپنا دائم کم کرنے کا تردد کیے بغیر بولی تھی۔

"آپ کا لیکچر ختم ہوگیا ہو تو براہ مہربانی بھی تشریف جا کر کریں۔ میں اس وقت کام کر رہا ہوں۔" بہ وقت انہوں نے اپنے لہجے کو قابو میں رکھا تھا۔

"مجھے بھی نظر آرہا ہے، اندھی نہیں ہوں میں۔" وہ منہ پھلا کر اٹھ گئی۔ اسے خوامخواہ میں رعب جھاڑنے والے مرد بالکل پسند نہیں تھے۔

ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا اسے یہاں آئے کہ حیات احمد، سسر کی طبیعت کی خرابی کا سن کر تبسم کے ساتھ انگلینڈ چلے گئے تھے۔ وہ بھی بہت مچلی تھی ان کے ساتھ جانے کے لیے مگر انہوں نے دانستہ اسے "شاہ پیلس" میں چھوڑا تھا اور اب دو ہفتوں سے وہ یہیں تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو گائز..." دھپ سے صوفے پر گرتے ہوئے اس نے ریڈیو سننے میں مصروف نوفل اور حیدر سے کہا تھا۔ وہ کچھ دیر قبل ہی سو کر اٹھی تھی۔

"ہائے بیوٹی فل لیڈی۔" حیدر خوشگواری سے بولا۔

"ہدیہ اپلیز... اسٹرانگ چائے۔" جھنکتی چوڑیاں نے باتوں میں چٹکیاں چلاتے ہوئے اس نے وہیں سے ہانک لگائی تھی۔

"ہائے میں مر گیا... اوئی میرے ربا... تو کنجا ہو جائے، بیڑا غرق۔" اچانک جنید آہ و بکا نے ان تینوں کو ہی چونکا دیا تھا۔

اسے لنگڑا تا دیکھ کر ہدیہ کچن سے بھاگی آئی۔

"کیا ہوا جنید!"

"ایکسیڈنٹ..."

"کس سے؟"

"وہ انور مسیح جو ڈا چمار کہیں کا... اندھے کو سائیکل چلانی آتی نہیں۔ منحوس سے میں نے کہا کہ پہلے چلانی تو سیکھ، تیرے ابے کی سڑک ہے جو بھینسے کی طرح ٹکرا تا پھر رہا ہے۔ اس پر پہلے پہلے دانت نکال کر بولا۔"

"باؤجی، اس کی بریکیں کہاں ہیں؟ ہائے میری ٹانگ..." وہ کشن پر ڈھیر ہوگیا۔

"ہائے ہدیہ ڈیئر! گلوکوز تو لے کر آؤ۔ مجھ میں تو بددعائیں دینے کی بھی سکت نہیں ہے۔"

"اب بس ماسے... چپ کر کے بیٹھو۔" نوفل نے لتاڑا۔

"کیا زیادہ درد ہو رہا ہے؟" مشاء آنکھیں پھاڑ کر اس کی ٹانگ دیکھنے لگی جس پر بقول جنید کے چوٹ آئی تھی۔

"نہیں، میرا تو بھنگڑا ڈالنے کا موڈ ہو رہا ہے۔" وہ جل کر بولا۔ "امی کہاں ہیں؟"

"چچی اور امی تو بازار گئی ہیں۔" ہدیہ سچ مچ گلوکوز لے آئی۔

"ہائے میری ماں بھی اس وقت گھر پر نہیں۔ میرا دکھ کون سنے گا۔"

"جنید... اب اگر تو نے بکواس کی تو میں تیرا گلا دبا دوں گا۔" نوفل نے ڈپٹا تو وہ

بڑے بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے

گنگنا تا کمرے میں چلا گیا۔ ہدیہ فرسٹ ایڈ بکس لیے اس کے پیچھے ہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میرا میگ کس نے اٹھایا ہے لاؤنج سے؟" اس نے ریلنگ سے آدھا نیچے لٹکتے ہوئے پوچھا تھا۔ سب لوگ لاؤنج میں مصروف تھے۔

"آؤ بیٹا! نیچے آجاؤ۔" اثبات احمد نے محبت سے کہا تو وہ نیچے آگئی۔

"کیا کر رہی تھیں؟" وہاب احمد بھی اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"کچھ نہیں چاچو۔ اخبار دیکھ رہی تھی۔ ہدیہ کہاں ہے؟"

"ہم یہاں ہیں جناب!" ہدیہ ٹرے سمیت کچن سے برآمد ہوئی۔

"ویری گڈ۔ میرا بھی چائے کا موڈ ہو رہا تھا۔"

"مگر یہ چائے تمہارے لیے نہیں ہے، بڑوں کے لیے ہے۔ تم پہلے کھانا کھاؤ، اس کے بعد دودھ..."

"اوہ... نو... میں دودھ نہیں پیتی۔"

"پھر بھی اتنی گوری ہیں۔" لائبہ کو حیرت ہوئی، وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"تائی امی! آپ جو پرپل سوٹ لے کر آئی تھیں، وہ میں نے ہدیہ کو دے دیا ہے۔ اس پر بہت سوٹ کرے گا۔" جان بوجھ کر ہی اس نے یہ قصہ چھیڑا تھا۔

"مگر وہ تو میں تمہارے لیے لائی تھی!"

"تائی تو تھیں مگر وہ کیا ہے کہ آنٹی! میں اس طرح کے ڈریسز میں ان ایزی فیل کرتی ہوں۔ یو نو میں خود کو بہت اوور محسوس کرتی ہوں اس طرح کے لباس پہن کر۔ آپ میرے لیے اسپیشلی لائیں، مجھے بہت اچھا لگا۔ بٹ سوری! آئی ایم ناٹ مائی چوائس۔" اپنی سی بولی جھلاتے وہ کن انکھیوں سے ازرار شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"اوکے بیٹا! کوئی بات نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"اور طیبہ چچی... آپ کے ٹراوزر شرٹ لاجواب ہیں۔ وہ میں پہن لوں گی۔" گویا احسان کیا تھا۔

"بیٹا! شلوار قمیص ہمارا اسلامی ہی نہیں، قومی لباس بھی ہے اور پھر لڑکیوں پر تو شلوار سوٹ ہی اچھا لگتا ہے۔" اثبات احمد نے رسانیت سے کہا تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تایا ابو! لیکن اب تو پاکستان میں بھی جینز شرٹ بہت عام ہے۔ یہ بھی تو اسلامی مملکت ہے۔"

"اپنی مشرقی روایات و اقدار کو چھوڑ کر ہم مغربی اطوار اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں تو یہ ہمارا احساس کمتری ہے کہ ہم اپنی چیز کو کمتر اور دوسروں کی چیزوں کو برتر سمجھتے

ہیں۔ دوسروں کی نقالی کرنے سے ہم ترقی یافتہ نہیں کہلانے لگیں گے۔"

"یہ تو آپ کہہ رہے ہیں نا ابو! کچھ لوگوں کو اپنے ملک کی ہر چیز میں خرابیاں نظر آتی ہیں۔ برٹش نیشنلٹی اتنی بھی قابل فخریات نہیں ہے کہ آپ ہر وقت اس کا حوالہ دیتے رہیں۔" ازرار شاہ کے سرد لہجے نے اس کا خوش گوار موڈ خراب کر دیا۔

"اگر آپ کا اشارہ میری طرف ہے تو مائنڈ اٹ مسٹر ازرار شاہ! میں نے کبھی اپنی برٹش نیشنلٹی کو ایکسپوز کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ آپ کی اپنی سوچ ہے۔"

"نہیں نہیں بیٹا! ازرار۔ کا اشارہ تمہاری طرف نہیں ہے۔" فائزہ نے جلدی سے بات سنبھالی۔

"میں ان کے اشاروں کو خوب سمجھتی ہوں۔" وہ جذباتی انداز میں یہ بات کہہ کر اٹھ گئی تھی مگر پیچھے سب کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

"دیکھ لیا ازرار میاں! افشاء بیٹی کتنا سمجھنے لگی ہے آپ کے اشاروں کو۔"

"چاچو! آپ بھی بس۔" وہ ان کی معنی خیز مسکراہٹ پر جھینپ سا گیا۔

"بھائی جان!" ہدیہ کی پکار پر وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آیا تو وہ اسٹور میں گھسی ہوئی تھی۔

"کیا بات ہے؟"

"افشاء کا میگزین نہیں مل رہا۔ آپ نے تو نہیں دیکھا؟"

"کون لایا تھا وہ میگزین۔" اس کا ماتھا پُر شکن ہو گیا۔

"وہ... افشاء ہی لائی تھی شام کو۔"

"تم لوگ کے ایف سی گئے تھے۔"

"ہاں گئے تھے پھر..." وہ سینے پر بازو لپیٹے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"میں تم سے بات نہیں کر رہا۔" بلیک نائٹی میں وہ زیادہ ہی بے باک لگی تھی۔

"مگر میں آپ ہی سے بات کر رہی ہوں۔ میرا میگزین۔" اس نے ہاتھ پھیلایا۔ کچھ دیر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ افشاء کا دل بے ساختہ دھڑکا تھا۔

"یہ رہا تمہارا میگزین۔ اٹھاؤ اسے۔ آئندہ اس قسم کے فضول اور بے ہودہ میگزینز تم اس گھر میں لائیں تو میں بہت بری طرح پیش آؤں گا۔" ٹیبل پر رکھا شاپر اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ غضب ناک انداز میں کہہ رہا تھا اور وہ... وہ تو آنکھیں پھاڑے اپنے ان گنت ٹکڑوں میں بٹے اس فلمی میگ کو دیکھ رہی تھی جسے اس نے ابھی فرصت سے دیکھا بھی نہیں تھا۔

"یہ گھر ہے کوئی فلمی اسٹوڈیو نہیں، یہاں اس قسم کی خرافات لانے سے قبل آئندہ سو مرتبہ سوچنا۔" وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

"یہ شخص اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ بڑا آیا مولوی کہیں کا۔" بے حد اشتعال کے عالم میں اس نے شاپر کمرے کے وسط میں الٹ دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بھائی پلیز۔" ہدیہ لپک کر اس کے سامنے آئی تھی جو اس کے کمرے کی طرف ہی آ رہا تھا۔ اپنا کارنامہ کچھ دیر پہلے ہی اس نے اس کے گوش گزار کیا تھا اور اب مزے سے واک مین سن رہی تھی۔ ازرار شاہ نے کبھی کسی کی اس حد تک بد تمیزی برداشت نہیں کی تھی۔ اپنے کمرے کا حشر دیکھ کر اس کا پارہ آسمان کو چھونے لگا تھا پورے کمرے میں یہاں سے وہاں فلمی میگ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ازرار شاہ کے کمرے کا حلیہ بتوا دینے کے لیے باہر آئی تھی اور بھائی [illegible]

"ہٹو تم سامنے سے۔ یہ لڑکی خود کو سمجھتی کیا ہے۔ لاڈلی ہو گی اپنے ماں باپ کی۔ اتنی بد تمیزی، اتنی خود سری۔" اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، تب ہی وہ کمرے سے باہر آئی۔

"کیا ہوا؟" وہ انجان بنی پوچھ رہی تھی۔

"تم..." اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کا کیا حشر کر دے۔

"افشاء! تم اندر جاؤ..." ہدیہ نے اسے دھکیل کر اندر کیا اور باہر سے دروازہ لاک کر دیا۔

"ہدیہ! دروازہ کھولو۔ میں ڈرتی نہیں ہوں تمہارے اس ہٹلر بھائی سے۔" وہ دروازہ بجانے لگی۔

"کیا ہوا ہدیہ!" فائزہ جو چھت پر تھیں پریشان ہو کر نیچے آگئیں۔

"کچھ نہیں امی! وہ بس..." ازرار شاہ کو واپس پلٹتے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ ازرار شاہ کا غصہ پورے خاندان میں مشہور تھا۔ افشاء حیات جانے کیوں

اس سے دوبدو مقابلے پر اتر آتی تھی۔ یہی بات اس نے فائزہ سے کہی تو وہ مسکرا دیں۔

"جیسا تمہارے ابو اور چاچو سوچ رہے ہیں نا تو ایسے ہی ازرار کے لیے افشاء جیسی لڑکی ہی سوٹ کرے گی۔ ازرار کا مزاج بہت کڑوا ہے، اسے اپنی منوانے کی عادت ہے۔ کوئی عام سی لڑکی آگئی تو تمہارے بھائی کا غصہ اور نخرا سہہ سہہ کر ختم ہو جائے گی۔ یہ مزاج، تمہاری دادی پر گیا ہے۔ وہ بھی ایسی ہی تھیں۔ اپنے بیٹے سے تیس سال دوری برداشت کرتی رہیں۔ آخر وقت میں ہی دل نرم ہوا۔ ازرار پیدا ہوا تو اس وقت میری گود میں سمیعہ تھی۔ نازش بھی چھوٹی ہی تھی، اس لیے ازرار کو تمہاری دادی نے ہی پالا۔ میں تو مطمئن ہوں کہ کوئی تو میرے بیٹے کو احساس دلانے والی آئی۔ وہ میرا بیٹا ہے مگر مجھے اس کی خامیوں کا احساس ہے۔"

"ایک سیر تو دوسرا سوا سیر ہے۔ ابھی مجھے تو مشکل ہی لگ رہا ہے۔" ہدیہ مایوسی سے کہہ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"نوفل! تمہاری دوست کی مس کال ہے۔" اس کا سیل فون ہاتھ میں لیے [illegible] سے اچھے نوفل کو پکارا تو وہ گھبرا کر پیچھے کو ہوا۔

"چلانا ضروری ہے۔ میں نے کیا اوپر سے ہی گزر جانا تھا۔ ابھی بڑی پسلی کریک ہو جاتی تو۔" سیل فون جھپٹ کر وہ نمبر ملانے لگا۔

"تو تم انسانوں کی طرح سیڑھیاں استعمال نہیں کر سکتے۔ نقل تو خیر کیا کہوں، عادتیں بھی بندروں جیسی ہیں۔"

"یہ دوست تمہاری ہے یا تمہارا ہے؟" جنید بائیک کی دھلائی موقوف کر کے ان کی طرف لپکا تھا۔

"تمہارا ہی ہے۔ یہ افشاء تو بس..."

"اچھا... لڑکے کا نام ہے... مجھے تو نہیں پتہ تھا۔" وہ معصومیت سے بولی تو نوفل کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا۔

"خدا کا واسطہ ہے آہستہ بولو۔ ورنہ بھائیان ابھی حشر اٹھا دیں گے۔" اس نے لان چیئر پر براجمان صحن کے پاس اخبار میں کھوئے ازرار شاہ کو دیکھا۔

"ہونہہ... اپنے بھائی کے ڈراوے مت دیا کرو تم مجھے۔ کیا خیال ہے کرکٹ کے بارے میں؟"

"بڑا نیک خیال ہے۔ لیکن بھائیان سے تم نہیں ڈرتی ہو گی مگر ہمیں تو اپنی عزت پیاری ہے نا!"

"ہاں ہاں پتا ہے مجھے۔ کتنی عزت ہے تمہاری۔ چلو جنید! تم مجھے باہر کی سیر ہی کرا لاؤ۔ ویسے تم نے کہا تھا کہ تم مجھے ڈرائیونگ سکھاؤ گے، کب سکھاؤ گے۔ سچ میں بور ہو رہی ہوں۔ ڈیڈ اور مام بھی آنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔"

"کیا ہوا؟ تمہارا دل نہیں لگ رہا یہاں؟"

"بالکل نہیں۔ جیل جیسی زندگی ہے یہاں پر۔"

"اگر ساری عمر یہیں رہنا پڑ گیا تو رہ لو گی؟" نوفل کے معنی خیز انداز نے اسے چونکا دیا۔

"توبہ کرو، میں اور ساری عمر یہاں!! اِٹس امپاسبل۔ ہاں اگر تمہارے بھائی صاحب اِدھر اُدھر ہوتے تو سوچا جا سکتا ہے۔ تم لوگوں کے ساتھ مزہ آتا ہے۔ میں نے تو ابھی تک پورا کراچی ہی نہیں دیکھا۔"

"تو ہم نے کون سا پورا کراچی دیکھ رکھا ہے۔" جنید نے منہ بسورا۔

"کیوں؟ تم تو لڑکے ہو!"

"صبح یونیورسٹی اور کالج۔ شام کو کوچنگ، رات کو گھر میں۔ دس بجے کے بعد باہر جانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔"

"او کے۔ اس وقت چھ بجے ہیں۔ ٹھیک سات بجے ہم سب۔ یعنی تم، جنید، حیدر، لائبہ اور ہدیہ۔ اگر آنٹی اور چچی جانا چاہیں تو وہ بھی، آؤٹنگ پر چل رہے ہیں اور رات بارہ ایک سے پہلے واپسی نہیں ہو گی۔"

"مگر..."

"نو مور آرگیومنٹس۔ کب کیسے اور کس طرح جانا ہے۔ یہ تم مجھ پر چھوڑو اور جا کر اچھی طرح ڈریس اپ ہو جاؤ۔"

"ایک گاڑی تو ابو کے پاس ہے اور دوسری بھائیان۔"

"ہم سوک پر جائیں گے۔" اس نے پورچ کی طرف نگاہ اٹھائی۔ نوفل اور جنید ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔

☆ ☆ ☆

گہری براؤن نشلی آنکھوں میں کرے لینس لگائے اس نے سیاہ گھنگھریالے بالوں میں ہیر برش پھیرتے ہوئے

اسکارف اوڑھتی ہدیہ پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔
"یہ آؤٹ لپ تو لگاؤ۔"
"نہیں نہیں' بس ٹھیک ہوں میں۔" وہ گھبرا گئی۔
"مگر مجھے تو ٹھیک نہیں لگ رہیں نا۔" اس نے لپ پنسل اٹھائی۔
"نہیں منشاء پلیز۔ بھائیان وہ تو..."
"پھر بھائیان... لائبہ! تم ادھر آؤ۔" لائبہ ورنہ بھی رہی تھی مگر دل بھی چاہ رہا تھا۔ اسے سراسیمہ دیکھ کر وہ خود ہی اس کے لائٹ پنک لپ پنسل سے آؤٹ لائن بنانے لگی۔ میک اپ کے نام پر ان کے پاس یہی ایک پنسل اور کاجل تھا۔
"ہاؤ کیوٹ۔ تمہیں میں آ کر دیکھتی ہوں۔" وہ ہدیہ سے کہہ کر باہر نکل آئی۔ نوفل کے کمرے میں جھانکا تو تینوں وہاں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ اسے ہنسی آ گئی۔
"بیچاری پریشان نہ ہوں' میں تم تینوں کو بور کھونے کے لیے نہیں لے جا رہی۔"
"بھائیان سے چابی لے لی تم نے؟" نوفل نے چھوٹتے ہی پوچھا۔
"وہی لینے جا رہی ہوں۔ میری سلامتی کی دعا کرنا۔" وہ کھکھلاتے ہوئے چلی گئی۔
"مجھے آپ کی گاڑی کی چابی چاہیے۔" وہ دستک دے کر اندر آئی تو وہ کمرے کے وسط میں کھڑا جانے کیا سوچ رہا تھا۔
"کیوں؟" پیشانی پر شکن ابھری۔
"مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔" اس کی بات پر وہ اس کی طرف پلٹا۔ بلیک ٹراؤزر اور پرنٹڈ شرٹ کے ساتھ مفلر گلے میں ڈالے وہ کہیں سے بھی "بیمار" نہیں لگ رہی تھی۔
"کیا ہوا ہے تمہیں؟" وہ اتنی آسانی سے "چھٹنے" والوں میں سے نہیں تھا۔
"یہ میں آپ کو نہیں ڈاکٹر کو بتاؤں گی۔ ٹھیک ہے' آپ جانے نہیں دے رہیں' ورنہ جنید کے ساتھ چلی جاتی۔ اب دے بھی دیں۔ اس طرح سوچتے رہے تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔"
اس نے کہا تو ازرار شاہ نے بادل نخواستہ سائیڈ ٹیبل سے چابی اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔
"ٹھیک ہے۔ ویسے ایک بات تو بتائیں۔ چلیں رہنے دیں' واپسی پر پوچھوں گی۔"
اتنی جلدی کامیاب ہونے کی خوشی کو چھپاتی وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

پہلے مزار قائد پھر کلفٹن کے بعد وہ آخر میں ڈنر کے لیے میکڈونلڈ آئے تھے۔ وہ تو خوش تھی ہی' ان چاروں کی مسرت بھی عروج پر تھی۔ بہت عرصے بعد بلکہ شاید زندگی میں پہلی بار انہوں نے اس طرح بھرپور انداز میں شام گزاری تھی۔
"واقعی' زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔" آئس کریم کا کپ تھامے نوفل ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"آپی! آپ ہمارے پاس رہ جائیں نا ہمیشہ کے لیے۔" لائبہ کو اس پر زیادہ ہی پیار آ رہا تھا۔
"ارے واہ' اس طرح کی بددعائیں مت دو مجھے۔"
"ویسے منشاء! تم نے بھائیان سے کیا کہا؟" ہدیہ کو کھد بد لگی ہوئی تھی۔
"یہ راز کی بات ہے۔" اس نے ٹال دیا اور رات کے ڈیڑھ بجے جب گاڑی پورچ میں آ کر رکی۔ تو فائزہ لان میں ہی ٹہل رہی تھیں۔
"آپی... ازرار بھی [illegible]
کے انتظار میں۔ نوفل [illegible] اچھل پڑی..."
"... میں نے ہی کہا تھا۔ آپ جائیں پلیز۔ آپ کے بیٹے سے میں نپٹ لوں گی۔"
"منشاء! تم نے بتایا نہیں تھا بھائیان کو؟" ہدیہ کا دل گھبرانے لگا تھا۔
"ان سے نپٹنا میرا مسئلہ ہے۔ تم لوگ پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ ابھی تو ہم نے سارے پل دوبارہ دہرانے ہیں۔" وہ لبوں پر پُراعتماد مسکراہٹ لیے سب سے آگے تھی۔ ازرار شاہ لاؤنج میں ہی ٹہل رہا تھا۔
"کہاں گئے تھے تم لوگ؟" اس نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا۔
"میں لے کر گئی تھی انہیں اور ہم ہی سائیڈ گئے تھے۔"
"وہاں کون سے اسپیشلسٹ بیٹھے ہیں؟" وہ سے گھورنے لگا۔
"ان سب کے ذہنوں کو فریش ہونے کے لیے اس قید خانے سے چند گھنٹوں کے لیے رہائی چاہیے تھی۔"

"ہدیہ' نوفل تم لوگوں نے پوچھا تھا مجھ سے؟"
"انہوں نے اپنے پیرنٹس سے اجازت لے لی تھی۔ آپ چاہیں لاکھ بڑے ہوں ان سے مگر پیرنٹس کی جگہ نہیں لے سکتے۔"
"سوری بھائی!" ہدیہ منمنائی تھی۔
"سوری فار واٹ؟ کوئی جرم کیا ہے تم نے؟ کوئی گناہ کیا ہے۔ محض ان کی انا کو تسکین دینے کی خاطر تم اپنے چند خوش گوار لمحوں کو جرم بنا دو گی۔"
"تم لوگ جاؤ اپنے کمرے میں۔" اس نے سب کو اشارہ کیا۔ سب جان بچی سو لاکھوں پائے کے مصداق فوراً ہی رفوچکر ہو گئے۔ منشاء تھوڑی دیر رک کر آگے بڑھی۔
"تم رکو۔" اس نے کہا تو وہ اطمینان سے اس کی طرف پلٹی۔
"تم کیا جتانا چاہتی ہو مجھ پر۔ میں غلط ہوں' میرے اصول غلط ہیں' میری سوچ غلط ہے یا...؟" ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسا کر وہ اس کے سامنے آیا۔
"آپ کے اصول غلط ہیں۔" وہ بات کاٹ گئی۔
"کیوں؟" تیکھے چتونوں سے اسے گھورا۔
"آپ دوسروں کو جینے کا ہنر سکھائیں' ان کی زندگی خود مت جئیں۔" کتنی بڑی بات وہ آسانی سے کہہ گئی تھی۔ اور وہ ... ازرار شاہ لب بھینچے وہیں کھڑا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

اس روز وہ تبسم کے کہنے پر اپنے ماموں کے ہاں آئی تھی۔ ماموں کے گھر کا ماحول اس کے لیے قطعی اجنبی نہیں تھا۔ مونس سے البتہ وہ پہلی بار ملی تھی۔ مونس اس کے ماموں کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور حال ہی میں ہاورڈ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر آیا تھا۔
"ملیوی! مجھے تو حیرت ہو رہی ہے تمہیں دیکھ کر۔ اتنی چھٹی سی ہوتی تھیں جب میں لاسٹ ٹائم تم سے ملا تھا۔ ایک دم سے اتنی بڑی ہو گئی ہو۔ امیزنگ۔" لہجے سے چہرے تک بار بار وہ اپنی حیرت کا اظہار کر رہا تھا۔
"ایک دم سے نہیں' آٹھ سالوں میں اتنی بڑی ہوئی ہوں۔ ہم آٹھ سال بعد مل رہے ہیں۔ تم تو ویسے ہی ہو لمبو اور کشتے۔ بس تھوڑے سے ہینڈسم ہو گئے ہو۔"
"صرف تھوڑا سا۔ ہم اچھاں بھی جاؤں' داستان چھوڑ جاتا ہوں۔"
"توبہ استغفار۔ اس میں اترانے کی کیا بات ہے۔ داستان چھوڑنا اچھی بات ہے کیا؟"
"میرے کہنے کا مطلب ہے..."
"تمہارے کہنے کا مطلب جو بھی ہو' میرے سمجھنے کا مطلب یہی ہے۔ اپنی وہ 'ہیاں' کتنی داستانیں چھوڑ کے آئے ہو؟" وہ معنی خیزی سے مسکرائی تو وہ بھی ہنس دیا۔
"اب ہر بات تو بتانے کی نہیں ہوتی نا!"
"منشاء! تم اسے چھوڑو۔ آؤ' آپی کی مووی دیکھتے ہیں۔" ماہین نے اس کو بور ہوتا دیکھ کر منہ چڑا کر اٹھ گئی مگر مونس کو اس سے باتیں کر کے مزہ آ رہا تھا' اسی لیے وہ بھی لاؤنج میں چلا آیا۔
"مووی بھی دیکھ لینا رات میں۔ ابھی تو وہ چار دن ادھر ہی ہو نا!"
"ارے نہیں بھئی... شام کو جنید آئے گا مجھے لینے۔ ہدیہ تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ وہیں دل لگا کر بیٹھ جانا۔"
"دل لگانے میں حرج کیا ہے؟" وہ اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے گہرے لہجے میں بولا تھا۔
"رات میں سمیعہ اپیا اور ناز بجو آ رہی ہیں۔ اسپیشلی مجھ سے ملنے۔ اب وہ یہاں مجھ سے ملنے آئیں اور میں یہاں رہ جاؤں' اچھا تو نہیں لگتا۔"
"صاف کہو نا تم یہاں رکنا ہی نہیں چاہ رہیں' بہانے کیوں بنا رہی ہو۔"
"ارے نہیں۔ سچ کہہ رہی ہوں بھئی۔"
"چلو جیسے تمہاری مرضی مگر شام تک تو یہیں ہو نا۔ لنچ کے بعد ساتھ چلو گی۔"
"آں... کون کون جائے گا۔ ماہین' فہد..."
"نہیں' صرف میں اور تم..." وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔
"سب چلتے ہیں نا۔ مزہ آئے گا۔"
"میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا۔ میں چیلنج کر کے آیا ہوں' تم نے کرنا ہے تو کر لو۔"
"ویسے مونس! تم کہیں سے بھی ڈاکٹر نہیں لگتے۔"
"تم نے اتنا ہینڈسم ڈاکٹر بھی دیکھا جو نہیں۔"
"اوہ... اتنی خوش فہمی۔"
"اسے خوش فہمی نہیں' خود شناسی کہتے ہیں۔" وہ اس کی آوارہ لٹ کھینچتے ہوئے باہر نکل گیا۔
"ماہین! تم بھی چلتیں نا!"

"جی نہیں، مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ کباب میں ہڈی بننے کا۔" وہ مسکرائی۔
"ارے نہیں یار! یہاں کوئی کباب نہیں ہے۔ میرا ابھی موڈ ہو رہا ہے آؤٹنگ کا۔"
"تو پھر چلی جاؤ مونس کے ساتھ۔ ممی جانے کب ایگزیبیشن سے واپس آئیں۔ اچھی بات ہے' تم جب تک چینج کر لو۔"
"چینج کرلوں یا ایسے ہی ٹھیک ہے؟" وہ سامنے لگے قد آدم آئینے میں خود کو دیکھنے لگی۔ وائٹ اسکرٹ اور لائٹ پنک شرٹ اس نے پہنا ہوا تھا۔
"اس ڈریس میں بھی اچھی ہی لگ رہی ہو۔ اگر چینج کرنے کا موڈ ہے تو کرلو۔" ماہین تنقیدی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہنے لگی۔ کچھ سوچ کر وہ چینج کرنے اس کے بیڈ روم میں چلی گئی۔
بلیک جینز پہ میرون کرتا پہن کر نیچے آئی تو مونس اسی کا انتظار کر رہا تھا۔
"چلیے... میں تیار ہوں۔" اس کی ستائشی نظریں خود پر محسوس کرکے اسے کہنا پڑا۔
"ہاں چلو۔" وہ سیل فون ٹیبل سے اٹھاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔
پی سی میں پُرتکلف ڈنر کے بعد وہ کافی سے لطف اندوز ہو رہی تھی جب اس نے فارمل ڈریسنگ میں ازرار شاہ کو ہال میں آتے دیکھا۔ وہ کسی شخص سے باتوں میں مگن تھا۔ پہلے سے ریزروڈ ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اچٹتی ہوئی نگاہ مگ میں انگلیاں پھنسائے ایک ہینڈسم سے لڑکے کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف فشاء حیات پر ڈالی تھی اور جانے کیوں نظریں اس کی سیاہ لٹوں میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ وہ اسے کافی حد تک آزاد خیال سمجھتا تھا مگر وہ اس حد تک لبرل ہوگی' یہ یقیناً ازرار شاہ جیسے شخص کے لیے باعث ندامت تھا۔ اس کے پورے خاندان میں کوئی لڑکی اتنی آزادی سے جینز پہنے ہوٹلنگ کرتی کبھی دکھائی نہیں دی تھی۔ ایک پل کو اس کا دل چاہا کہ وہ اسے دو تھپڑ لگا کر کھینچتا ہوا لے جائے۔
اس کی رگوں میں جس خاندان کا لہو دوڑ رہا تھا' اس خاندان کی کوئی عورت آج تک بنا حجاب کے باہر نہیں نکلی تھی اور یہ فشاء حیات... اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر ڈالے۔ تب ہی اس لڑکے نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ تھام کر کچھ کہا تھا اور ازرار شاہ کو وہاں پل بھر بیٹھنا دشوار ہو گیا۔ وہ اپنے کولیگ سے معذرت کرکے وہاں سے فوراً اٹھ گیا تھا۔
شاید کچھ دیر مزید رکتا تو خود پر قابو نہ رکھ پاتا۔

☆ ☆ ☆

"کون تھا وہ لڑکا؟" وہ سمیعہ کی بات پر بے ساختہ کھلکھلاتی ہوئی لابی سے گزر رہی تھی کہ معاً سیڑھیوں سے نکلتے ازرار شاہ نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے ریلنگ کی طرف دھکیلا تھا۔
"واٹ نان سینس۔" اس کے مسکراتے لب بھینچ گئے۔ "یہ کوئی طریقہ ہے کسی سے سوال کرنے کا؟"
"تم مجھے زیادہ طور طریقے مت سکھاؤ۔ سیدھی طرح جواب دو کہ وہ لڑکا کون تھا؟" سرخ نظروں سے اسے گھورتے ہوئے وہ حواسوں میں نہیں لگ رہا تھا۔
"ویسے تو میں آپ کو جواب دینے کی پابند نہیں ہوں لیکن پھر بھی بتا دیتی ہوں کہ وہ مونس تھا' میرا کزن۔" تپ اور غصے کی وجہ سے اس نے لہجہ حتی الامکان نارمل رکھا تھا۔ وہ سب لاؤنج میں بیٹھے تھے۔
"کزن [illegible]...؟"
"آپ کو اس سے کیا؟" وہ [illegible]
"اس کے خاندان کا تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا مگر تمہاری رگوں میں جس خاندان کا لہو دوڑ رہا ہے' وہاں نہ تو اس بے حیائی کی اجازت ہے اور نہ آتی...."
"جسٹ شٹ اپ مسٹر ازرار شاہ! خبردار جو آپ نے میری ممی کے خاندان کے متعلق ایک لفظ بھی مزید کہا۔" بے حد ترشی سے انگلی اٹھاتے ہوئے اس نے گویا وارننگ دی تھی۔
"اگر تم مجھے دوبارہ اس فلرٹ کے ساتھ نظر آئیں تو...." اس پر اس کی وارننگ کا کوئی اثر نہ ہوا۔
"ہاؤ ڈیئر یو۔ آپ کون ہوتے ہیں مجھ پر پابندی لگانے والے۔ میں جہاں...."
"فشاء...." فائزہ کی پکار پر اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔
"ہونہہ...." وہ تنفر سے سر جھٹکتے ہوئے پلٹی تو اس نے دوبارہ کلائی کھینچی۔
"ایک بات یاد رکھنا فشاء! میں اپنی بات دہرانے کا عادی

نہیں ہوں۔"
"میں بھی کسی کو اپنی لائف میں انٹرفیئر کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ بات آپ یاد رکھیے گا۔"
ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑا کر وہ سرعت سے مڑ گئی۔ وہ لب بھینچے اسے دیکھتا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

نائمہ ممانی کے سرد رویے کی وجہ سے وہ "سعید ولا" دوبارہ نہیں جانا چاہتی تھی مگر ازرار شاہ کی باتوں نے اس کے ذہن و دل میں آگ لگا دی تھی۔ اسے جلانے کی خاطر ہی وہ اکثر شامیں مونس کے ساتھ گزارنے لگی تھی۔ مونس جہاں اس کے التفات پر بے پناہ خوش تھا' وہیں ممانی اور ماہین اسے نظرانداز کرنے لگی تھیں۔ ممانی اسے خطرہ سمجھتی تھیں کیونکہ کافی سال پہلے ہی وہ اپنی ڈاکٹر بھانجی کا رشتہ مونس کے لیے طلب کر چکی تھیں' اس بات کو مونس نے قطعی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ ایک کھونٹے سے بندھ کر رہنے والا تھا بھی نہیں مگر فشاء حیات سے دوستی کے بعد وہ اپنی گزشتہ تمام دوستیاں فراموش کر چکا تھا۔ وہ فشاء میں غیر معمولی دلچسپی لے رہا تھا اور یہی بات ان کو ناگوار گزر رہی تھی۔ ماموں تو سعید مجبور یعنی اپنے والد کے [illegible] تھے اور بیوی کی نسبت وہ اپنی بھانجی سے کافی بے تکلف تھے۔
اس وقت بھی وہ ساحلِ سمندر پہ مونس کے سنگ چہل قدمی کر رہی تھی۔
"ڈوبتے سورج کا نظارہ کتنا رومینٹک ہوتا ہے نا! ماحول میں سحر سا طاری ہو جاتا ہے۔ مجھے زرد شامیں بہت اچھی لگتی ہیں مونس! یہاں آکر میں اپنا ہر غم بھول جاتی ہوں۔ میرے قدموں سے ہر لہر میری ساری کثافت پل میں دھو دیتی ہے۔" پاس سے گزرتے پل کو اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس اس تھکے تھکے چہرے والی لڑکی کی لو دیتی آنکھوں میں بے پناہ حزن تھا۔
"یہ لڑکی ضرور کوئی تھرڈ کلاس قسم کی افسانہ نگار ہے۔" مونس نے سرگوشی کی۔
"شٹ اپ۔" اسے ہنسی آ گئی۔ وہ دونوں اب کافی دور نکل گئے تھے۔
"پتہ نہیں کیوں' یہ اداس چہرے والی لڑکی مجھے بہت اچھی لگ رہی ہے۔" وہ اب بھی گردن موڑے اسے دیکھ رہی تھی۔
"تم اب اسے گھورنا بند کرو' وہ لڑکا خواہ مخواہ میں خوش فہمی میں مبتلا ہو جائے گا کہ اتنی خوب صورت لڑکی مجھے مڑ مڑ کر دیکھ رہی ہے۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھا۔
"ہر کوئی تمہاری طرح نہیں ہوتا۔"
"ویسے فشاء! تم اس روز ماہین سے کہہ رہی تھیں کہ تمہیں...."
"مجھے معلوم تھا تم مجھ سے یہ سوال ضرور پوچھو گے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر مسکرائی۔ "مجھے واقعی ذاتی طور پر نہ ہوٹلنگ پسند ہے نہ گھومنا پھرنا۔ تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہارے لیے ایموشنل فیلنگز رکھتی ہوں۔ میرا ایک الگ لائف اسٹائل ہے۔ درحقیقت میں جیو اور جینے دو کی پالیسی پر عمل کرتی ہوں۔ مجھے دوسروں پر بلاوجہ رعب جھاڑنے اور ہر بات میں اپنی رائے ٹھونسنے والے لوگ زہر لگتے ہیں۔ میں لبرل مائنڈ ضرور ہوں مگر ایک حد تک۔ یہ چیپ حرکتیں مجھے خود بھی پسند نہیں جو آج کل میں کر رہی ہوں۔ آئی مین۔ میں میل فرینڈشپ کی قائل تو ہوں مگر اس میں بھی حدود ہونی چاہئیں۔ اسلام آباد میں میرے بہت سے فرینڈز ہیں لیکن ہم سب ہمیشہ گروپ کی صورت میں آؤٹنگ اور ہوٹلنگ کرتے ہیں۔ تم پلیز کچھ غلط خیال مت کرنا۔ اس سب کی ایک وجہ ہے جو میں تمہیں وقت آنے پر بتاؤں گی۔ یو آر جسٹ فرینڈ۔ اوکے۔"
"یہ تو تمہاری تھنکنگ ہے۔ ضروری تو نہیں کہ میں بھی تم سے ایگری کروں۔"
"یو آر آل ریڈی انگیجڈ مونس! ویسے میں مل چکی ہوں۔ شی از ویری نائس گرل۔ پلیز اگر تم کچھ اور سوچ رہے ہو تو اس کو یہیں پہ ختم کر دو۔"
"یہ انگیجمنٹ ممانی کی چوائس ہے' میں...."
"دیکھو مونس! میں صاف بات کرنے کی عادی ہوں۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ کوئی میری مسکراہٹ کا غلط مطلب لے۔" وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔
"اوکے۔ تم ایسا نہیں چاہتیں تو نہ سہی۔" وہ اس کا موڈ بگڑنے کے ڈر سے فوراً بولا تھا۔
"ڈیئر گڈ۔ اب چلیں۔"
"چلو۔" اس کے انداز میں سابقہ گرم جوشی مفقود تھی۔

☆ ☆ ☆

عموماً وہ اسے باہر سے ہی اتار دیتا تھا مگر آج اس کے کہنے پر اپنی کرولا پورچ میں لے آیا تھا۔

"کل تیار رہنا جم جانے کے لیے۔ تمہاری ممبر شپ بھی وہیں کروا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چھ بجے تمہیں تیار ملوں گی۔ پک کر لینا۔" بے حد سرسری نگاہ لان میں تین کی چیئر پر نیم دراز ازرار شاہ پر ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

"اب اندر تک آ ہی گئے ہو تو کافی...."

"نہیں... پھر کبھی پی لوں گا۔ اوکے بائے۔" وہ گاڑی ریورس کرنے لگا۔

"بائے..." وہ گاگلز بالوں میں پھنساتی لان میں چلی آئی۔ ازرار شاہ بے حد چبھتی نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا جو جینز اور بلیک ٹی شرٹ میں ہمیشہ کی طرح جاذب نظر لگ رہی تھی۔ کرسی سے اٹھتے ہی خوابناک آنکھیں تمسخرانہ انداز میں اس پر اٹھی تھیں۔ وہ ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ پھنسائے اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

"امیزنگ۔ تمہیں تو دھشائی اور بے شرمی میں ایوارڈ ملنا چاہیے ــــ" وہ سلگتے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"اونہہ۔ اسے کہتے ہیں انگور کھٹے ہیں۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ازرار شاہ نے بے دردی سے اس کی کلائی موڑ دی۔

"یہ جو شخص ابھی "شاہ پیلس" میں آیا تھا اس کی اتنی اوقات نہیں ہے کہ تم اسے پورچ تک لے کر آؤ۔ آئندہ اس سے ملاقات کا شیڈول باہر طے کر لینا۔ یہ بات تم اسے سمجھا دو تو زیادہ اچھا ہے ورنہ میری زبان سے تم واقف ہی ہو۔"

"کلائی چھوڑیں میری۔ آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں۔ میں آپ کی بکواس اتنی خاموشی سے سن لیتی ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ جو بھی بکتے...."

"شٹ اپ۔" وہ دھاڑا۔

"آپ کس برتے پر مجھ پر اتنا حکم چلاتے ہیں۔ لگتے کیا ہیں آپ میرے؟" وہ جوابا" چیخی۔

"منشاء... ازرار کیا ہوا ہے؟" طیبہ ان کی تکرار سن کر کچن سے بھاگی آئی تھیں۔

"اپنی بھتیجی کو اچھی طرح سمجھا دیں کہ آزاد فضاؤں میں اڑنے کی خواہش میں اتنی بلندی پر بھی نہ جائے کہ ہمیں مجبوراً اس کے پر کاٹنا پڑیں۔" اسے ان کی طرف دھکیل کر وہ لیے لیے ڈگ بھرتا لان پار کر گیا تھا۔

"چچی! یہ شخص کوئی ذہنی مریض لگتا ہے۔ آپ لوگ اس کا علاج کیوں نہیں کرواتے۔ میرے ہر کام پر روک ٹوک نہیں کرتے۔ میں کیا پہنتی ہوں کیا کرتی ہوں کہاں جاتی ہوں تو یہ کہاں کے خدائی فوجدار ہیں۔ ہنس کے کہتے بھی ہیں یہ بائی گاڈ انفیلڈ۔ ہونہہ پڑھے لکھے جاہل۔ ہدیہ لوگوں کو دیکھا ہے آپ نے کیا زندگی ہے ان کی۔ جیسے دبے دبے اور گھٹے ہوئے ماحول میں رہتی ہیں وہ لوگ۔ گھر میں بھی ہر وقت دس گز کا ٹینٹ لے کر گھومتی ہیں۔ صرف ان کی بیک ورڈ تھنکنگ کی وجہ سے۔"

"تمہیں اپنا لائف اسٹائل ناپسند نہیں ہے منشاء! بھائیان ہمارے آئیڈیل ہیں۔ ان میں کوئی اخلاقی برائی نہیں ہے۔ وہ لڑکیوں کا باہر نکلنے پر پھرنا معیوب خیال کرتے ہیں۔ مائنڈ مت کرنا تم اتنی ٹائٹ جینز اور شرٹ پہن کر جانے کیسے اتنے مردوں کے سامنے آزادی سے گھوم پھر لیتی ہو۔" ہدیہ بھی طیبہ کے پیچھے چلی آئی تھی۔

"اف۔ اکیسویں صدی میں اتنی ٹیپیکل باتیں۔" وہ طنزیہ مسکرائی۔

"اکیسویں صدی ہے تو کیا ہوا۔ اسلام تو وہی چودہ سو سال پرانا ہے۔ یہ تبدیل نہیں ہوا ہے۔ اسلام میں عورت کو حجاب میں رہنے اور اپنی زیب و زینت چھپانے کی تاکید کی گئی ہے تو ہم بھائیان کو کیوں الزام دیں۔ زندگی کو محض انجوائے منٹ کی نذر بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ صرف بھائیان کے سخت رویے کی تلافی کے طور پر ہم تمہارا ساتھ دینے لگتے ہیں منشاء ورنہ سچ تو یہی ہے کہ ہم ایک آئیڈیل زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارے گھر میں اللہ کی ہر نعمت موجود ہے اور ہم ڈش کیبل کے بغیر بھی بہت آسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔"

ہدیہ بھی آج اپنی بھائی کی محبت سے مجبور ہو کر سب کہہ گئی تھی۔

"ہم سب بہن بھائی اعلا تعلیم یافتہ ہیں لیکن صرف دنیوی تعلیم کافی نہیں ہوتی۔ میں نے عالمہ کا کورس بھی کر رکھا ہے۔ لاعلمی الگ بات ہے مگر جان بوجھ کر گناہ کرنا تو...."

"اوہ گاڈ.... تم کیا گناہ ثواب کی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہو۔ بہت غلطی کی میں نے یہاں آ کر۔" وہ تاسف سے سر ہلاتی اندر چلی گئی۔

"بہت مشکل ہے منشاء حیات کو راہ راست پر لانا۔ بھائیان کی کوششیں بے کار ہی جائیں گی۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے لان کی گھاس پر ہی بیٹھ گئی۔

"تمہارے بھائی کا انداز غلط ہے، اس طرح زبردستی کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ منشاء مزاج کی تیز ہے۔ اس کے حکم چلانے پر چڑ جاتی ہے۔" طیبہ بھی اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

"ہاں، بھائیان کو بھی اپنے مزاج میں نرمی لانی ہوگی۔ ویسے منشاء ہے بہت کیوٹ۔ بھائیان کے ساتھ بہت سوٹ کرے گی۔ دونوں ساتھ کھڑے اچھے لگتے ہیں نا!"

"جب بھی ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، لڑتے جھگڑتے ہی ہیں۔ حسرت ہی ہے کہ کوئی اچھی بات بھی کر لیں۔"

"وقت آنے پر کر لیں گے چچی! اتنی جلدی کیا ہے؟" وہ ہنس کر بولی تو طیبہ بھی مسکرا دیں۔

☆ ☆ ☆

کشن پر نیم دراز وہ اپنا گلابی ہاتھ اخبار پر پھیلائے بہت نفاست سے کیوٹکس لگانے میں مگن تھی۔ قدرے فاصلے پر ہدیہ نماز عصر ادا کر رہی تھی۔ ناخنوں پر پھونک مارتے ہوئے اس نے فیروزی دوپٹے کے ہالے میں مقید اس کے چہرے پر سایہ فگن دراز پلکوں اور بھینچے لبوں کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ بہت دیر سے ہتھیلیاں پھیلائے دعا مانگ رہی تھی۔

"کیا مانگ رہی تھیں؟" وہ چہرے پر ہاتھ پھیر کر جائے نماز اٹھانے لگی تو منشاء نے شرارت سے پوچھا۔

"وہی جس کی طلب ہے۔ صبر، استقامت، ہدایت اور بخشش۔" وہ اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"تم اتنی دیر سے نماز پڑھ رہی ہو، تھکتی نہیں ہو؟"

"تم اتنی دیر سے نیل پالش لگا رہی ہو، تھکی نہیں؟"

"نہیں۔"

"تو جب تم کو اس بے کار سے مشغلے میں تھکن محسوس نہیں ہوتی تو پھر میں تو فرض کی ادائیگی کر رہی تھی۔"

"ابھی سے اتنی لمبی لمبی عبادتیں کرتی ہو؟"

"ابھی سے کیا مطلب؟"

"مطلب کہ ابھی تو بہت وقت پڑا ہے اللہ اللہ کرنے کے لیے۔"

"تم جانتی ہو کہ تمہاری زندگی کتنی ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر تم وقت کا حساب کس طرح لگا سکتی ہو۔ نماز سات برس کی عمر سے فرض ہے۔"

"مگر مجھے تو نماز نہیں آتی۔ میں نے کبھی پڑھی ہی نہیں۔"

"کتنے افسوس کی بات ہے منشاء! تم نے بچپن میں ہر وہ کام سیکھا ہوگا جس کی تمہاری ٹیچر نے ہدایت کی ہوگی۔ نہیں سیکھی تو ایک نماز۔ اصل تعلیم سے اس قدر غفلت اور دنیوی علم کو کتنا سیریس رہتی ہو۔ یہ لمبی چوڑی ڈگریاں تو آخرت میں کام نہیں آئیں گی۔"

"تمہیں دیکھ کر میرا بھی دل چاہ رہا ہے نماز پڑھنے کو۔ کیا تم مجھے نماز سکھاؤ گی۔"

"شیور۔ کیوں نہیں۔" ہدیہ بے ساختہ خوش ہوئی تھی۔ "لیکن اس کے لیے تمہیں شلوار قمیص پہننا ہوگی۔"

"پہن لوں گی۔" وہ دل سے کہہ رہی تھی۔ منشاء حیات کو سدھارنا اتنا مشکل بھی نہیں تھا۔ ہدیہ کو یہ جان کر خوشی ہوئی تھی۔

"لیکن تم ابھی کسی کو بتانا مت۔"

"ارے نہیں۔ مجھے کیا ضرورت ہے۔ یہ کیوٹکس اتار کر بھی نماز نہیں ہوتی۔" اس نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"اس کی وجہ سے ناخن گیلے نہیں ہوتے یعنی کہ وضو مکمل نہیں ہوتا۔"

"تم پہلے مجھے نماز سکھاؤ پھر میں یہ اتار دوں گی۔"

"کمرے میں آ جاؤ۔ میں تمہیں ایک کتاب دیتی ہوں، اس میں پوری نماز لکھی ہوئی ہے۔ تمہیں یاد کرنے میں آسانی رہے گی۔" ہدیہ اٹھی تو وہ بھی ساتھ ہی کھڑی ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"مما پلیز! اتنے دن ہو گئے ہیں آج کل آج کل کرتے۔ پورے چار ہفتے گزر گئے۔ نانو کا بائی پاس بھی ہو چکا ہے اب تو.... کیا کر رہے ہیں آپ لوگ وہاں پر۔ ریلی! میں بہت مس کر رہی ہوں۔ ڈیڈ کہاں ہیں، بات کروائیں ان سے میری۔" تبسم سے بات کرتے ہوئے وہ اداس ہونے لگی تھی۔

"ہاں، میں تو ٹھیک ہوں، مجھے کیا ہونا ہے۔ ویسی ہی ہوں جیسی آپ چھوڑ کر گئی تھیں۔ یہاں سب لوگ بہت

اچھے ہیں' بہت کیئرنگ اور لوونگ۔ تایا ابو' چاچو' فائزہ آنٹی' طیبہ چچی' نوفل' حیدر' جنید اور لائبہ۔ سب ہی سے بہت انڈر اسٹینڈنگ ہوگئی ہے۔ ہدیہ تو سب سے زیادہ اچھی ہے۔ بہت دوستی ہوگئی ہے میری اس سے۔"

وہ بات کرتے ہوئے ٹیرس تک آگئی تھی۔ اپنے کمرے کے پردے برابر کرتے ازدار شاہ کو اس کی ہلکی سی جھلک سی دکھائی دی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ اپنے بارے میں اس کے ریمارکس سننے کے لیے متوجہ ہوا تھا۔

"ہونہہ! ان صاحب کی تو بات ہی مت کریں مجھ سے۔ بہت توپ چیز سمجھتے ہیں خود کو۔ آپ کو پتہ نہیں کہاں سے اچھے لگتے ہیں۔ سچ کہہ رہی ہوں مما! ایک ان ہی سے میرے ستارے نہیں ملتے' ورنہ باقی سب تو بہت سوئٹ نیچر ہیں۔ لگتا ہے صبح ہی صبح اٹھ کر مرچیں چباتے ہیں۔ اچھا آپ مجھے کنفرم بتائیں آنے کا۔" وہ ریلنگ پر جھک گئی۔

"کیا... بقر عید تک... نہیں مما! بقر عید میں تو تین چار ہفتے ہیں ابھی۔ نہیں' دل تو لگتا ہے یہاں پر' آپ لوگ... آپ کی کمی کوئی پوری کر سکتا ہے مما؟ کہاں کرتی ہیں آپ۔ ڈیڈ کہیں باہر گئے ہیں؟ او کے پھر میں رات میں فون کروں گی۔ نانو اور ماموں کو سلام کہیے گا۔ او کے گڈ بائے۔" سیل آف کر کے وہ پلٹی اور سامنے کھڑکی میں سنجیدہ صورت لیے ازدار شاہ کو دیکھ کر پل بھر کو ٹھٹکی تھی پھر سر جھٹکتے ہوئے سیڑھیاں اتر گئی۔

"ہوگئی بات۔" ہدیہ کچن میں کٹلس بنا رہی تھی' وہ وہیں چلی آئی۔

"ہاں۔" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"کیا کہہ رہی تھیں' بیگم چچی؟"

"ابھی کنفرم نہیں بتایا آنے کا۔ بقر عید تک کہہ رہی تھیں۔ اس میں تو ابھی کافی ٹائم ہے۔"

"بہت مس کر رہی ہو؟" ہدیہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھری۔

"ظاہر سی بات ہے۔ فرسٹ ٹائم ان سے اتنا دور ہوئی ہوں۔"

"پیا دیس بھی تو سدھارو گی نا۔ وہاں کیسے رہو گی ان کے بغیر۔"

"فی الحال تو اس میں بہت ٹائم ہے۔ دیکھا جائے گا۔"

"شکر ہے تم نے یہ نہیں کہا کہ تمہیں شادی ہی نہیں کرنی۔"

"میں حقیقت پسند لڑکی ہوں۔ شادی تو ظاہر ہے ہونی ہی ہے۔"

"آئیڈیلزم پہ یقین رکھتی ہو؟"

"نہیں۔"

"صحیح کرتی ہو۔ آئیڈیل کون سا حقیقت میں مل جاتے ہیں۔ لان میں چلو' وہیں چائے پیتے ہیں۔" اس نے ٹرے میں کپ رکھے۔

"تم چلو میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

مونس کی شادی اچانک ہی طے پاگئی تھی۔ اس روز وہ "سعید ولا" میں آئی تو نائمہ ممانی نے بتاتے ہوئے کہا تھا کہ دو ہفتے بعد کی تاریخ رکھ دی گئی ہے۔

"ارے واہ... یہ تو زبردست نیوز ہے۔ کہاں ہے مونس... مجھے بتایا تک نہیں کمینے نے۔" وہ خوش دلی سے بولی تھی۔ نائمہ کتنی ہی دیر اس کے چہرے کے تاثرات جانچتی رہی تھیں۔

"وہ اور حرا شاپنگ کے لیے گئے ہیں۔"

"ہم آگئے ہیں۔" تب ہی حرا اور مونس ہدیہ کے پیچھے اندر داخل ہوئے تھے۔

"ہیلو منشاء ڈارلنگ! کیسی ہو؟" حرا اسے دیکھ کر خوش گواریت سے بولی۔

"ایک دم فرسٹ کلاس۔ کتنے تیز ہو تم لوگ۔ ہوا بھی نہیں لگنے دی اور شادی کے کارڈ تک چھپوا لیے۔ مونس اتنا بدتمیز ہے۔ روز تم میں ملتے ہیں اور ایک بار بھی نہیں بتایا۔" وہ حرا سے گلے ملتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"میں سرپرائز دینے کے موڈ میں تھا۔ کارڈ پسند آیا تمہیں؟ میں نے ہی چوائس کیا ہے۔" مونس سائیڈ ٹیبل سے کارڈ اٹھا کر اسے دکھانے لگا۔

"بہت خوب صورت ہے۔ کارڈز تم دونوں خود لے کر آنا' شاہ ہیلس' میں نہیں لے کر جا رہی۔"

"لے آئیں گے' تم بلاؤ تو سہی۔" حرا فوراً تیار ہوگئی۔

"ٹھیک ہے۔ آج تو میں خود ادھر آئی ہوئی ہوں۔"

"تم اب چائے لو گے یا کافی؟" نائمہ ممانی کی غلط فہمی

اس کے متعلق دور ہوگئی تھی' اس لیے آج ان کا موڈ قدرے بہتر تھا۔

"چائے ہی لے آئیں۔"

"تم کب بور کے لڈو کھا رہی ہو؟" حرا چیزیں سمیٹتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"وقت آنے پر کھاؤں گی۔"

"ویسے تمہارے کزن کو میں نے نادیہ کی شادی پر دیکھا تھا۔ اچھا خاصا ہینڈسم شخص ہے۔ بہت ریزروڈ سا لگ رہا تھا۔ کہیں ادھر ہی تو چانس..."

"ارے نہیں یار! اس سے شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں شادی ہی نہ کروں۔ انتہا ور شخص بے فہم ہے۔"

"پرسنالٹی تو زبردست ہے۔"

"نیچر کی بات کر رہی ہوں میں۔"

"ہاں' اس کا تو تمہیں ہی علم ہوگا۔" اس نے کندھے اچکائے۔

☼ ☼ ☼

"ہدیہ..." وہ ہاتھوں میں شرٹ لیے اس کے کمرے تک آیا تھا مگر وہ شاید نیچے تھی۔

"کیا ہوا بیٹا...؟" فائزہ اس کی آواز سن کر اپنے کمرے سے ہی بولی تھیں۔

"وہ ہدیہ سے کام تھا۔" وہ کمرے میں ہی چلا آیا۔

"کیا کام۔" فائزہ بستر پر نیم دراز چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

"یہ بٹن لگوانا تھا۔ آپ اتنی جلدی لیٹ گئیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" وہ کرسی کھینچ کر ان کے مقابل بیٹھ گیا۔

"یوں ہی ہلکا سا ٹمپریچر محسوس ہو رہا ہے۔"

"تو ڈاکٹر کو دکھا آئیں آپ' بلکہ ابھی تو نو ہی بجے ہیں۔ میں لے چلتا ہوں۔" وہ ان کی کلائی تھام کر پریشانی سے بولا تو وہ شفقت سے مسکرا دیں۔

"اب اتنی بھی طبیعت خراب نہیں ہے کہ میں اپنے بیٹے کو پریشان کروں۔"

"پریشانی کیسی امی! طبیعت خراب ہے تو ڈاکٹر..."

"ارے نہیں بیٹا! ڈسپرین لی ہے ابھی چائے کے ساتھ۔ اس سے ان شاء اللہ ٹھیک ہو جاؤں گی۔ یہ شرٹ مجھے دے دو' میں ہدیہ سے کہہ دیتی ہوں۔"

"میں خود ہی کہہ دیتا ہوں۔ آپ آرام کریں' ابو نیچے ہیں؟" وہ جانے کے لیے اٹھا۔

"ہاں' کچھ دیر پہلے ہی گئے ہیں۔ نوفل آیا نہیں ابھی تک؟"

"آ چکا ہے نیچے۔ آواز آئی تھی مجھے اس کی۔"

"منشاء اپنے کمرے میں ہے؟" اس بار انھوں نے پوچھا تھا۔

"آئی ڈونٹ نو۔ کمرے میں نظر تو نہیں آئی۔ ویسے موصوفہ کب تک یہاں رہیں گی؟"

"کیوں' تمہیں اس کا یہاں رہنا پسند نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

"نہیں' مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ویسے چاچو نے اپنی صاحبزادی کو حد سے زیادہ آزادی دے رکھی ہے۔ مجھے اس کا لائف اسٹائل بالکل پسند نہیں۔"

"انگلینڈ جیسے ملک میں بارہ سال گزارے ہیں انھوں نے۔ اب وہاں رہ کر تو لائف اسٹائل ایسا ہی ہونا تھا۔"

"پاکستان آئے بھی چھ سات سال ہو چکے ہیں انھیں۔ یہاں آ کر تو وہ چینج ہو سکتے ہیں۔ اسپیشلی لباس۔ وہ کہیں سے ہماری فیملی کی لڑکی نہیں لگتی۔"

"تمہیں تو کچھ زیادہ ہی شکایتیں ہیں اس سے۔ اس کا شوہر خود ہی سدھار لے گا اسے۔" وہ مخفی تیزی سے کہہ رہی تھیں۔ ازدار نے چونک کر انھیں دیکھا۔

"بے چارہ سر پکڑ کر ہی روئے گا جس کے بھی پلے پڑیں گی محترمہ کیونکہ وہ سدھرنے والی چیز تو ہیں نہیں۔"

کہنے کے ساتھ ہی وہ باہر نکل آیا۔ کاریڈور میں بنے اسٹڈی روم جو کہ زیادہ تر ہدیہ کے استعمال میں ہی رہتا تھا' کی لائٹ آن تھی۔

"اس کا مطلب ہے ہدیہ اسٹڈی میں ہوگی۔" وہ نیم وا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ جائے نماز پر دو زانو بیٹھی دعا مانگنے میں مصروف تھی۔ اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔ وہ خاموشی سے دیوار پر لگا کیلنڈر دیکھنے لگا۔ وہ کچھ دیر بعد وہ جائے نماز سمیٹ کر اٹھی تب وہ بولا تھا۔

"ڈیئر ہدیہ! تم..." وہ شرارت سے کچھ کہنے لگا تھا مگر گلابی پرنٹڈ لباس اور ہم رنگ دوپٹے میں اس گلابی چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ٹھٹک گیا۔ ہدیہ کے کپڑے پہنے وہ منشاء حیات تھی جو اسے دیکھ کر رنگ بدلتے چہرے اب گئی تھی اور اب وہ چہرے

کے گرد سے ہٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔ جبکہ ازرار شاہ... اس کی نظروں نے اس کے کھنچے چہرے پر سے ہٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ شلوار قمیص دوپٹے میں اس قدر مقدس اور پاکیزہ لگ رہی تھی کہ وہ اس کی ساری خطائیں بھولتا چلا گیا۔

"نہیں، مجھے باہر جانا ہے۔" کچھ دیر بعد اس کی نگاہوں سے بوجھل ہو کر وہ جانے کے لیے رستہ مانگ رہی تھی۔ وہ ایک دم حواس میں آیا تھا۔

"اوہ سوری... میں سمجھا کہ ہدیہ..." وہ ایک طرف پر ہوا تھا، وہ باد صبا کے جھونکے کی مانند پاس سے گزرتی چلی گئی لیکن تنہا نہیں، کمرے کی دہلیز پر ساکت کھڑے ازرار شاہ کا دل بھی اس کے ساتھ ہی ڈولتا چلا گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

محبت خواب کی صورت
نگاہوں میں اترتی ہے کسی مہتاب کی صورت

صرف ایک ساحر لمحے کا فسوں تھا اور ازرار شاہ کے من کی دنیا بدل گئی تھی۔ وہ جو منشاء حیات کو سخت ناپسند کرتا تھا، کل کی پوری رات اسے سوچتے ہوئے گزری تھی۔ ایک کمزور ساعت کی گرفت میں آ کر وہ اپنا دل گنوا بیٹھا تھا۔

پتا نہیں منشاء حیات اصل میں وہ تھی جو نظر آتی تھی یا وہ جس کی ایک جھلک نے اس کے وجود میں ہلچل مچا دی تھی۔ شام و سحر میں بے چینیاں سمو دی تھیں۔

"کیا اس شخص سے محبت ہو سکتی ہے جسے آپ سخت ناپسند کرتے ہوں۔" اس نے بے چینی سے سوچا۔

"ہاں، یہ محبت... محبت ایسے ہی تو ہوتی ہے۔ بہت اچانک، بے خبری میں ہی دل پر وار کر دیتی ہے۔" دل جواز دینے لگا۔

وہ محبت کے وجود سے منحرف نہیں تھا مگر کیا یہ ضروری تھا کہ وہ لڑکی منشاء حیات ہی ہوتی۔ کسی سے بھی محبت ہو سکتی تھی مگر منشاء سے ہی کیوں؟ منشاء حقیقت میں ہی دل کی "منشاء" کیوں بن رہی تھی؟

"بے چارہ سر پکڑ کر ہی روئے گا جس کے بھی گلے پڑیں گی محترمہ کیونکہ وہ بدلنے والی چیز تو ہیں نہیں۔" کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے فائزہ سے کہا تھا اور کچھ دیر بعد خود اپنا دل ہی بدل گیا تھا۔

"اوہ گاڈ... جو بھی ہوا، بہت غلط ہوا ہے۔" اس نے سر ہاتھوں پہ گرا لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

کف کے بٹن بند کرتا وہ فریش موڈ میں نیچے آیا تو مگر لاؤنج میں خوش گپیوں میں مصروف مونس رقاص پہ نظر پڑتے ہی اس کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ یہ شخص اسے زہر لگتا تھا۔ کیوں لگتا تھا، اس کا ادراک بھی ابھی ہی ہوا تھا۔ منشاء حسب معمول ٹراؤزر شرٹ میں ملبوس اس کی کسی بات پر بے ساختہ کھلکھلا رہی تھی۔ نوفل اور حیدر بھی وہیں موجود تھے اور تو اور طیبہ بیگم بھی۔ ان کے ساتھ باتوں میں مصروف وہ لڑکی شاید اس کی بہن تھی۔ وہ اتنا بدتہذیب تو نہیں تھا کہ بنا سلام دعا کے گزر جاتا مگر مونس اور منشاء کے قہقہوں نے اس کا موڈ غارت کر دیا تھا۔ وہ ان کی سمت دیکھے بغیر لاؤنج پار کر گیا۔

"یہ غالباً ازرار شاہ تھے۔" مونس اس کی شاندار پرسنالٹی سے مرعوب ہوا تھا۔ منشاء کو اس کا یوں پاس سے گزر جانا بہت کھلا تھا۔ وہ نوفل کی طرف دیکھنے لگی جو خجالت سے سر کھجا رہا تھا۔

"جی ہاں، پرنس آف ویلز بلکہ نہیں، پرنس آف شاہ پیلس۔" حیدر [illegible]

"واقعی نہیں تو پرنس والی تو البتہ بیز [illegible]" [illegible] میں سر ہلایا۔

"اوکے بھئی، بہت دیر ہو گئی۔ ہم اب چلتے ہیں۔ آپ لوگ پلیز ضرور آیئے گا۔" مونس جانے کے لیے اٹھ گیا۔

"ابھی بیٹھو نا، ڈنر کر کے جانا۔" طیبہ نے کہا تو منشاء نے بھی تائید کی۔

"ہاں، ابھی کچھ دیر ہی تو ہوئی ہے تمہیں آئے ہوئے۔"

"نہیں یار! ڈنر میں تو کافی ٹائم ہے۔ ابھی مجھے حرا کی فرینڈز کے گھر بھی جانا ہے۔ نوفل، حیدر ضرور آنا تم لوگ۔ اچھی کمپنی رہے گی تمہارے ساتھ۔"

"میں خود کھینچ کر لاؤں گی سب کو تمہاری شادی میں۔ تم فکر مت کرو۔"

وہ ان دونوں کو سی آف کر کے سیدھی کچن میں چلی آئی۔ جہاں ہدیہ برتن دھونے میں مصروف تھی۔

"یہ تمہارے بھائی میں اخلاقیات نام کی کوئی چیز ہے بھی کہ نہیں۔"

"اف..." ہدیہ نے تاسف سے سر ہلایا۔ "اب میرے معصوم بھائیوں سے کیا جرم سرزد ہو گیا۔"

"مجھ سے تو خیر انہیں پرخاش ہے ہی۔ شاید پچھلے جنم میں، میں ان کا قرض لے کر بھاگی تھی مگر میرے گیسٹ کے ساتھ اتنی بدتہذیبی... سلام کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اگر ہیلو ہائے کرتے وقت زبان گھل جاتی ہے تو کیے نہ ہی آتے، اتنی انسلٹ فیل کی میں نے۔"

"حیرت ہے۔ وہ ایسے..."

"اب تم بھی یہی کہو گی۔ وہ ایسے ہیں تو نہیں۔" وہ منہ بگاڑ کر بولی تو ہدیہ کی ہنسی چھوٹ گئی جسے اس نے فوراً کنٹرول کیا تھا۔ منشاء اسے گھورتے ہوئے باہر نکل گئی۔

پھر دیر تک اس کا موڈ آف ہی رہا تھا۔

کھانے کے بعد وہ کسی کام سے اپنے کمرے کی طرف آئی تو ازرار شاہ راستے میں ہی ٹکرا گیا۔

"یہ تمہارے کزن صاحب آج پھر تشریف لائے تھے۔"

"ہاں، لائے تھے پھر؟" اس کو تو پہلے ہی اس پر غصہ آ رہا تھا۔

"شاید تم بھول گئی ہو میں نے اس روز..."

"[illegible] میں ہوتے کہ میں انہیں زبانی یاد کر لوں۔"

"مجھے خود ہی موصوف سے بات کرنا ہو گی۔"

"شوق سے کیجیے۔ میرا دماغ کیوں کھا رہے ہیں۔"

"تمہارے پاس دماغ ہے؟"

"اب ہر کوئی آپ کی طرح بنا دماغ کے تو نہیں پھرتا۔" وہ تیز ہوئی۔

"تم..." اسے غصہ آیا تھا مگر لب بھینچ کر قابو پا گیا۔ اور "ہونہہ" کہتی کمرے میں گئی تھی پھر فوراً ہی واپس بھی آ گئی۔

"اخلاقیات تو آپ کو چھو کر نہیں گزریں مگر غلط فہمیاں پالنے کا بہت شوق ہے۔ میرا کزن آپ کو سلامی دینے نہیں، یہ کارڈ دینے آیا تھا۔" اس کے ہاتھ میں فیروزی رنگ کا نفیس سا شادی کارڈ تھما کر وہ سیڑھیاں اتر گئی تھی۔

"شادی کارڈ..." اس نے الجھے ہوئے انداز میں کارڈ کھولا۔

"ارے... یہ تو مونس کی شادی کا کارڈ ہے۔" اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی اور پھر اپنی غلط فہمی پر وہ زیر لب مسکرا دیا۔ من ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سمیعہ اپیا، ہدیہ کے لیے اپنے کسی رشتے کے دیور کا پرپوزل لائی تھیں اور جب سے آئی تھیں، اس کی تعریف میں رطب اللسان تھیں۔

"مجال ہے جو آج کل کے لڑکوں کی طرح کوئی اخلاقی برائی بھی ہو اس میں۔ انتہائی شریف..."

"بابرہ شریف کا رشتہ دار تو نہیں ہے۔" نوفل نے لقمہ دیا تھا۔ انہوں نے محض گھورنے پر اکتفا کیا۔

"آپ یقین کریں امی! ایسا بر تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے۔"

"یہ آؤٹ آف فیشن محاورہ ہے اپیا! آج کل چراغ کہاں ہوتے ہیں۔"

"نوفل! میں امی سے بات کر رہی ہوں، تم سے نہیں۔" وہ چڑ گئیں۔

"اپیا! آپ جانتی ہیں میں زیادہ دیر خاموش بیٹھوں تو میری زبان اکڑ جاتی ہے، اس لیے پلیز مجھے بھی اس گول میز کانفرنس میں اپنے نادر خیالات کے اظہار کا موقع عنایت فرمائیں۔ بندہ ناچیز ممنون و مشکور رہے گا۔"

"تم اپنے نادر خیالات پھر کبھی بتانا، ابھی اس کو لے جاؤ، کب سے آئس کریم مانگ رہا ہے بے چارہ۔"

"یہ بھینسے جیسا بے چارہ کہاں سے ہو گیا۔ ریئلی اپیا! اس جونیئر عدنان سمیع کو اٹھا کر میری ہڈیاں بددعائیں دینے لگی ہیں۔" اس نے نانی کی گود میں دبکے فاران کو دیکھ کر دہائی دی۔ جو کچھ زیادہ ہی صحت مند تھا۔

"امی! دیکھیں اس نوفل کے بچے کو، میرے بیٹے کو نظر لگا رہا ہے۔"

"یہ تو میری نظروں میں پورا ہی نہیں آتا اپیا! میں خاک اسے نظر لگاؤں گا۔"

"توبہ... کتنے برے ماموں ہو تم۔"

"کچھ دیر میں لے جاؤں گا اپیا! ابھی مجھے ذرا اپنی کمر سیدھی کر لینے دیں۔"

"تم کون سے ہل جوت کے آ رہے ہو؟"

"یونیورسٹی سے آ رہا ہوں اپیا! سر زیدی کی کلاس کسی ہل جوتنے سے کم نہیں ہوتی۔"

"ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ حسن ہر لحاظ سے پرفیکٹ

ہے۔ میں تو بہت پہلے سے ہی یہ چاہ رہی تھی مگر کل جب نادرہ آنٹی نے مجھ سے خود ہدیہ کے لیے کہا تھا تو مت پوچھیں۔"

"نہیں پوچھتے۔" اس سے رہا نہیں گیا۔

"میں تو کل سے ہی بے چین ہوں۔ ایم سی ایس کر رکھا ہے' کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی پوسٹ پر ہے۔ فیملی بھی مختصری ہے' دو بھائی ہیں اور ایک بہن۔"

"رشتہ تو اچھا ہی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اپنی بہن کے لیے لائی ہو مگر میں فی الحال کیا کہہ سکتی ہوں تمہارے ابو اور ازرار سے ذکر کروں گی۔ ناز بھی آجائی تمہارے ساتھ۔"

"بجو تو مجھ سے بھی زیادہ بے چین ہیں۔ آج عاطف بھائی اور وہ کہیں ڈنر پر انوائٹڈ تھے' اس لیے وہ دونوں ادھر چلے گئے۔ ویسے تو میں فون پر بھی ذکر کر سکتی تھی مگر مجھے پتہ تھا آپ زیادہ امپورٹنس نہیں دیں گی۔ آپ کا دل تو خالہ جی کے مصاحب کی طرف ہے' وہ بھی اچھا ہے مگر حسن کی تو بات ہی الگ ہے۔"

"سچ ہی کہہ رہی ہوں گی اپا! بہت مشکلوں سے یہ کسی کی تعریف کرتی ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ پچھلے ایک گھنٹے سے میں حسن میاں کی اتنی تعریفیں سن چکا ہوں کہ میرا اپنا دل مچل گیا ہے ان سے شادی کرنے کو۔"

"بدتمیز۔" فائزہ ہنسنے لگیں۔

"ویسے اپا! آپ کو اپنے بھائیوں کے سر پر سہرا سجانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ دوسروں کی بہنیں کتنی اچھی ہوتی ہیں۔ انہیں "دیر" کو گھوڑی پہ چڑھانے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔ ایک آپ اور بجو ہیں' کبھی ہماری شادی کا ذکر نہیں کرتیں۔ میں نے اتنے جملے ترتیب دیے کہ اپا جب مجھ سے میری شادی کی بات کریں گی تو میں یہ کہوں گا' وہ کہوں گا مگر ہائے نصیب۔"

"شاباش ہے تم پر۔ بڑے بھائی نے کبھی منہ سے بھاپ نہیں نکالی اور چھوٹے بھائی کا حال دیکھ لو۔" ان کو تو پتنگے لگ گئے۔

"میں ان کا بھی تو ذکر خیر ساتھ ہی کر رہا ہوں۔ وہ تو خود منہ سے کہیں گے نہیں۔"

"پہلے کوئی ڈھنگ کی نوکری تو کر لو' چھوکری بھی تب ہی ملے گی۔"

"رزلٹ آنے کی دیر ہے' نوکری تو ابھی ملی۔ بھائیاں کی فیکٹری کس مرض کی دوا ہے۔"

"تم تو مکینیکل انجینئرنگ کر رہے ہو نا!"

"تو کیا ہے' جب تک من پسند جاب نہیں ملتی' تب تک تو بھائیجان کے ساتھ ہی رہوں گا۔" اس نے ساری پلاننگ کر رکھی تھی۔

"ویسے امی! ازرار کے متعلق کیا سوچا ہے آپ نے؟"

"میں نے کیا سوچنا۔ تمہارے ابو اور چاچو طے کر چکے ہیں اس کی اور منشاء کی بات۔"

"کیا؟ منشاء... مگر وہ تو... ازرار سے پوچھا آپ نے؟"

"تمہارے ابو ہی پوچھیں گے۔ میں نے تو نہیں پوچھا۔"

"منشاء بہت اچھی لڑکی ہے مگر ازرار کے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ میرا نہیں خیال کہ ازرار اس پر آمادہ ہوگا۔"

"اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا۔ ہم سب کو تو منشاء بہت پسند ہے۔"

"ہاں' پسند تو مجھے بھی ہے مگر ازرار تو بہت موڈی اور اکھڑ سا ہے۔ نوفل سے بھی تو دو سال چھوٹی ہی ہے وہ' آپ....."

"ارے اپا! اتنا غصہ مت کیجئے۔"

"کیوں! اس میں کیا برائی ہے۔"

"برائی منشاء میں نہیں ہے مگر میں کسی اور سے کمٹمنٹ....." اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔

"کیا..... خبیث انسان..... تم تو زیادہ ہی پھر تیلے نکلے۔" انہوں نے اس کا کان پکڑ لیا۔

"امی کو بتا رکھا ہے میں نے..... کیوں امی....." اس نے کان چھڑایا۔

"ہاں' ذکر کیا تھا اس نے۔ اس کے دوست کی بہن ہے۔ فصیحہ نام ہے نا۔"

"جی.... اپا! آپ کو ملوا کر لاؤں گا۔ بہت اچھی نیچرل ہے۔ پسند آئے گی آپ کو۔"

"بہت اچھی لڑکی ہے۔" انہوں نے نقل اتاری۔

"سچ سچ کر رکھتا ہے ازرار تم لوگوں کو۔ اتنی بھی سختی نہ کرے تو تم تو آسمان پہ جا پہنچو گے۔"

"پلیز اپا! کان تو چھوڑیں۔ اچھا بھلا رشتہ ہاتھ سے نکل جائے گا' ورنہ....."

"میرے بیٹے کو آئس کریم ولوا کر نہیں لائے نا' بے چارہ ایسے ہی سو گیا۔"

"پھر بے چارہ....."

"دفع ہو تم یہاں سے۔"

"ہو ہی رہا ہوں۔" وہ دانت نکالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆ ☆ ☆

"میری بہنا بنے گی دلہنیا' بھیا راجہ بجائے گا باجہ۔"

دوسرے روز ہی نادرہ آنٹی باقاعدہ پروپوزل لے کر آئی تھیں اور ان کے رخصت ہوتے ہی حیدر اور جنید ٹیبل بجا بجا کر بے سرے راگ الاپ رہے تھے۔

"بھائی! اس سے آگے بھی تو گائیں نا۔" لائبہ اشتیاق سے کہہ رہی تھی۔

"آتا ہوگا تو گائیں گے نا۔ یہ تو ہم نے عاطف بھائی کے کزن کی شادی میں سنا تھا۔"

"میری بہنا بنے گی دلہنیا....." حیدر نے پھر تان اٹھائی۔

"بھیا راجہ بجائے گا باجہ....." جنید سر دھن رہا تھا۔

"قسم سے حیدر! تیری تو آواز بڑی زبردست ہے۔ کم از کم آج کل کے پاپ سنگرز سے تو اچھی ہی ہے۔"

"اچھا.... واقعی.... مجھے تو خود آج پتہ چلا ہے۔ تیرے کو..... میں یوں کیسے جیا..... کیسے جیا تیرے بن....." جوش میں اس نے ٹریک بدلا۔

"میں بتاتا ہوں صاحبزادے آپ کو کہ کیسے جیے....." اثبات احمد نے بالکل اچانک آکر اس کی گردن پر ہاتھ رکھا تھا۔

"ارے تایا ابو....." جنید اچھلا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ....." وہ مصنوعی غصے سے کہتے ان کے سامنے ہی بیٹھ گئے۔

ہدیہ جو ان کی بکواس نظر انداز کیے کونے میں کپڑا بچھا کر استری کر رہی تھی' خاموشی سے اٹھ کر اوپر چلی آئی۔ منشاء بیڈ پر اوندھی لیٹی اس کی کسی کتاب کے مطالعے میں مگن تھی۔

"کیا پڑھ رہی ہو؟" اس نے کپڑے وارڈ روب میں ہینگ کیے۔

"اسلام میں مزاح کا تصور' تمہارے ریک سے ہی لی ہے۔ ٹاپک انٹرسٹنگ تھا' اس لیے اٹھا لائی۔ تمہارے گیسٹ چلے گئے؟"

"ہاں' تم باہر کیوں نہیں آئیں؟"

"بس ایسے ہی' موڈ نہیں بنا۔"

"صدقے جاؤں میں تمہارے موڈ کے۔ کسی سے ملتی بھی موڈ کے مطابق ہو۔" ہدیہ ہنستے ہوئے اس کے ساتھ ہی ڈھیر ہو گئی۔

"کیسے لگے تمہیں وہ لوگ؟"

"اتنی جلدی میں کیا رائے دے سکتی ہوں۔ ایجوکیٹڈ فیملی ہے۔ فضول سوال جواب نہیں پوچھے۔ رائمہ کی ٹیچر کافی فرینڈلی ہے۔"

"اور اس کے بھائی کی....." اس نے شرارت سے لب دبا کر پوچھا۔

"مجھے کیا پتہ' میں کون سا ملی ہوں اس سے۔"

"گویا ملنے کی خواہش تو ہے۔"

"بکو مت۔" وہ جھینپ گئی۔

"کوئی تصویر وغیرہ نہیں لائیں وہ....."

"کون؟"

"تمہاری نند صاحبہ....."

"منشاء..... بہت بدتمیز ہو تم۔"

"بھئی' ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ جتنی کوالیفیز اپا گنوا چکی ہیں' اس حساب سے تو یہ پروپوزل فائنل ہی سمجھو۔"

"پھر بھی ابھی کیا پتا۔ ویسے تصویر تو وہ لوگ لائے تھیں۔"

"کہاں ہے؟"

"جنید اور حیدر ڈسکشن کر رہے تھے۔ وہیں ٹیبل پر پڑی ہوگی۔"

"میں دیکھ کر آتی ہوں بلکہ یہیں اٹھا لاتی ہوں۔ تم نے تکیے کے نیچے رکھنی ہوگی۔" سرعت سے اٹھ کر اس نے کتاب ٹیبل پہ رکھی۔ ہدیہ نے تکیہ ہی اسے کھینچ مارا تھا۔ بے ساختہ ہنستے ہوئے وہ بکھرے بالوں کو کیچر میں جکڑتی اس کے دوسرے وار سے قبل باہر سیڑھیوں کی طرف لپکی تھی۔

"آ..... آ..... اوف....." بے حد مشکلوں سے اس نے عجلت میں اوپر آتے ازرار شاہ سے زوردار ٹکر سے بچاؤ کے لیے دونوں ہاتھ آگے کیے تھے' وہ بھی فوراً سائیڈ پر ہوا تھا۔ نتیجتاً وہ سیڑھیوں پہ اوندھی گری اور نیچے لڑھکتی چلی گئی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا تھا کہ ازرار شاہ اسے سہارا

بھی نہ دے سکا۔
"منشاء..." وہ چلایا۔ بدحواسی میں سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اس کے ہاتھ سے سیل فون بھی گر گیا۔
"ممی..." تکلیف کی اذیت سے وہ بے اختیار چلائی تھی۔ سیڑھیوں کا کونا اس کے ماتھے پر لگا تھا۔
"کیا ہوا... کیا ہوا؟" سب اس کی چیخ سن کر سیڑھیوں کی طرف بھاگے آئے۔
"منشاء... منشاء..." ازرار آخری سیڑھی پر اوندھی گری منشاء پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ماتھے سے نکلتا خون فرش کو داغ دار کر رہا تھا۔ اس نے جیب سے رومال نکال کر اس کے ماتھے پر رکھا۔
"کیا ہوا منشاء کو؟" ہدیہ گھبرا کر کمرے سے نکلی اور اسے بے ہوش دیکھ کر اس کے حواس جھنجھنا گئے۔
"خون بہت بہہ رہا ہے۔ اس کا سر اونچا کرو۔ حیدر بینڈیج لے کر آؤ جلدی سے۔" اس نے ششدر و حیران کھڑے چہروں سے جھنجلا کر کہا تھا۔ سب جیسے یک دم ہی ہوش میں آئے۔
"امی... امی..." ہدیہ چیختی ہوئی نیچے اتری۔ آنسو بے اختیار گالوں پر پھسلتے چلے گئے تھے۔ طیبہ اور فائزہ دونوں کچھ دیر پہلے ہی محلے میں کسی کے گھر گئی تھیں۔
"بھائیان... ڈاکٹر اصغر کے کلینک لے جائیں منشاء کو..." جنید نے کہا تو ازرار نے اس کے ماتھے پر ہدیہ کا دیا ہوا دوپٹہ باندھ کر اسے ہدیہ کی مدد سے اپنی سوک میں ڈالا۔ حیدر بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ازرار تیزی سے گاڑی بھگا لے گیا۔
"یہ شور کیسا ہے۔" واش روم میں شاور لیتے اثبات احمد ان کا شور سن کر جلدی سے الٹے سیدھے کپڑے پہن کر باہر نکلے۔
"ابو... وہ منشاء..." ہدیہ کو سیڑھیوں سے بہتے خون کو دیکھ کر شدت سے رونا آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

آدھے گھنٹے بعد ان کی واپسی ہوئی تھی۔
تمام جملہ افراد لاؤنج میں بیٹھے بے چینی سے ان کی آمد کے منتظر تھے۔
"بھائیان آگئے۔" گاڑی کی آواز سب سے پہلے ہدیہ کو ہی سنائی دی تھی۔ وہ باہر نکلی تو ازرار پورچ میں سوک پارک کر رہا تھا۔ منشاء اگلی سیٹ پر اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ اس کے ماتھے پر سفید پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بازو اور ٹانگ پر بھی چند خراشیں آئی تھیں۔
"منشاء... میری جان..." فائزہ سب سے پہلے اس کی طرف بڑھیں۔
"آنٹی..." وہ ان کا سہارا پا کر ان کے گلے لگ کر بے اختیار رونے لگی تھی۔ وہ لوگ ایک بار پھر حیران رہ گئے تھے۔ ازرار کے اندر کی طرف بڑھتے قدم وہیں ساکت ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھوں پر وہ نرم لمس پل بھر کو سرسرایا۔
"بیٹا! سیڑھیوں سے کیسے گر گئیں تم؟"
"آپ کے بیٹے نے مجھے جان بوجھ کر گرایا۔" اس نے روتے ہوئے بتایا۔
"کیا...؟" اس کے منہ سے بھی بے ساختہ نکلا۔ سب اسے متاسف نظروں سے دیکھنے لگے۔
"ازرار! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی بیٹا! تمہاری ناپسندیدگی کا ہم سب کو علم ہے مگر تم..."
"ابو..." وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر حیرانی کے باعث الفاظ گڈمڈ ہو گئے۔
"بچے نہیں ہو تم، اٹھائیس سال کے میچور شخص ہو۔ تم سے ایسی بچکانہ حرکت کی امید نہ تھی۔" وہاب صاحب بھی اس کو لتاڑنے لگے۔ فائزہ بھی کچھ گھور رہی تھیں اور وہ اس آفت کی پرکالہ سے ہمدردی بھلا کر ایڑھیوں کے بل پلٹا۔
"تم... تم ثابت کیا کرنا چاہتی ہو؟ میں نے گرایا ہے تمہیں؟ مجھے کیا ضرورت تھی ایسا کرنے کی۔" اس نے فائزہ کے ساتھ لگ کے آنسو بہاتی منشاء کی کلائی ایک جھٹکے سے کھینچی تھی۔
"ہاں، آپ نے گرایا ہے مجھے۔" اس نے اپنی بڑی بڑی سمندر آنکھیں اس پر جمائیں۔ "آپ کو پتا تھا میں گرنے لگی ہوں پھر بھی آپ جان بوجھ کر سامنے سے ہٹ گئے۔" سب کے سپاٹ چہروں پر پل بھر کو مسکراہٹ بکھری تھی مگر وہ ان کی طرف متوجہ ہی کب تھی۔
"کیا آپ مجھے گرنے سے بچا نہیں سکتے تھے؟ اب کیسے بھاگ کر کلائی پکڑی ہے، اس وقت نہیں پکڑ سکتے تھے؟" اس نے کلائی چھڑائی۔
"واہ... کیسے مزے سے سارا قصور میرے سر منڈھ دیا۔ تم خود اندھوں کی طرح بھاگی آرہی تھیں۔"

"میں اندھوں کی طرح بھاگی آئی تھی مگر آپ کی تو ہیڈ لائٹس آن تھیں۔ میرا اتنا خون ضائع کروا دیا۔"
"میں نے کروایا ہے، غلطی تمہاری تھی..."
"بس..." وہاب احمد نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔
"بہت ہو گیا، اب اندر چلو۔ طیبہ! منشاء کے لیے ایپل شیک بنواؤ۔"
"جی اچھا۔" طیبہ اثبات میں سر ہلا کر اندر پلٹ گئیں۔
"چاچو! ان سے کہیں کہ مجھ سے ایکسکیوز کریں۔" سب کی ہمدردیاں اپنے ساتھ دیکھ کر وہ چہکنے لگی۔
"واٹ... سوری میں اور وہ بھی تم سے کروں۔" وہ اچھلا۔
"جی آپ... سوری کریں وہ بھی مجھ سے۔ چاچو کہیں نا ان سے!"
"چلو ازرار! سوری کرو منشاء سے۔"
"چاچو! آئی سوئیر، غلطی..."
"غلطی جس کی بھی تھی، خون تو میرا ضائع ہوا ہے نا۔"
"خون ضائع ہونے کا اتنا غم ہے تو بندروں جیسی حرکتیں بھی مت کیا کریں۔"
"دیکھیں تایا ابو! انہوں نے مجھے بندر بنا دیا۔ آپ میری سائیڈ کیوں نہیں لے رہے۔"
"ازرار... سوری کر لو بیٹا!" اثبات احمد نے مسکراہٹ چھپائی۔
"سوری!" لٹھ مار انداز میں کہا گیا۔
"اونہہ..." وہ اسے منہ چڑا کر پلٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی سب ہی اندر چلے گئے اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔
جانے کتنے روپ تھے اس لڑکی کے۔ کبھی انتہائی سنجیدہ اور مدبر نظر آتی اور کبھی بالکل بچی بن جاتی۔ کبھی جینز شرٹ پہن کر ہوٹلنگ کرتی اور کبھی نیک بی بیوں کی طرح دوپٹہ اوڑھے دعا مانگتی نظر آتی۔
اس کا ہر روپ حیران کن تھا تو اس سے محبت بھی حیرت ہی تھی اس کے لیے۔
ہارنا اس کی فطرت نہیں تھی مگر اسے لگ رہا تھا کہ اس کی محبت اسے ضرور ہرا دے گی۔ اسے ایک بار پھر خود پہ غصہ آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

صرف تین دن ہی وہ ڈاکٹر اصغر کے پاس بینڈیج کے لیے گئی تھی اور اس کے اگلے دو دن بعد ڈاکٹر اصغر کا پرپوزل اس کے لیے آگیا۔ ڈاکٹر اصغر محلے دار ہونے کے ساتھ ازرار شاہ کے اچھے دوست بھی تھے۔
وہ ٹریک سوٹ میں ملبوس حیدر، جنید، نوفل اور ہدیہ کے ساتھ کرکٹ کا شوق فرما رہی تھی جب ڈاکٹر اصغر اپنی والدہ اور بہن سمیت "شاہ پیلس" میں تشریف لائے۔
"ارے واہ... آپ تو بہت نائس ڈاکٹر ہیں۔ پیشنٹ کے گھر عیادت کے لیے آئے ہیں۔ میرا زخم تو ٹھیک ہو چکا ہے۔ ہاں نشان ابھی باقی ہے۔" اس نے ماتھے پر ہاتھ پھیرا جہاں سنی پلاسٹ کی بینڈیج حیدر نے ہی کی تھی۔
"سفید کرولا سے انہیں نکلتے دیکھ کر ہی وہ فیلڈنگ چھوڑ کر بھاگی آئی تھی۔
(آپ کا زخم تو ٹھیک ہو چکا ہے مگر میرے دل پر جو چوٹ لگ گئی ہے وہ) ایش گرے تھری پیس پہنے وہ گہری نظروں سے مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔
"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ ٹھیک ہو گئی ہیں۔"
"ہاں۔" وہ دلکشی سے ہنسی۔ "آپ لوگ آئیں نا۔ السلام علیکم آنٹی! ہیلو پریٹی گرل۔" وہ اب ان کے عقب میں کھڑی مسز شیرازی اور نادیہ کی طرف متوجہ ہوئی۔
"وعلیکم السلام، جیتی رہو۔" وہ جواباً تولتی نظروں سے دیکھ رہی تھیں، مسکرا کے آگے بڑھیں۔
"ہائے۔" نادیہ نے بھی مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ حیدر اور جنید ڈاکٹر اصغر سے مل رہے تھے۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر طیبہ چچی کو ان کے پاس بھیجا اور خود کچن میں چلی آئی۔
"مجھے تو کوئی گڑبڑ لگ رہی ہے۔" ہدیہ نے چھوٹتے ہی کہا۔
"کیا مطلب؟ یہ ہمارے گھر میں بم وغیرہ رکھنے آئے ہیں۔"
"میں سیریس ہوں۔"
"وہ تو تم ہمہ وقت رہتی ہو۔ اب میں ہر وقت تمہاری طرح سنجیدہ بی بی تو نہیں رہ سکتی۔"
"پتہ نہیں تم کب سدھرو گی؟"
"کوئی سدھارنے والا ملے بھی تو..." وہ فریج کا جائزہ لینے لگی۔
"بھائیان کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اچھی طرح

سدھار دیں گے تمہیں۔"
"نیک خیال ہے لیکن پہلے وہ خود تو سدھر جائیں۔"
"کیوں کیا خرابی ہے ان میں۔ اتنے اچھے تو ہیں۔"
"ان کے نٹ بولٹ کچھ زیادہ ہی کسے ہوئے ہیں۔ تھوڑے ڈھیلے کرنے کی ضرورت ہے۔"
"اچھا... حیدر کو بلواؤ' کباب اور اسنیکس وغیرہ تو ہیں۔ نمکو اور بسکٹس بھی موجود ہیں۔ مٹھائی اور سموسے وغیرہ لے آئے۔"
"ایں... تم نے کیا دعوت کی تھی ان کی؟" کیبن کھولتے ہوئے وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔
"پہلے ان کو کولڈ ڈرنک سرو کر دو' اوپر پڑی ہوئی ہے۔ گلاس نکالو کیبنٹ سے۔"
"ارے واہ... میں کیوں جاؤں۔ حیدر سے کہہ دو' میرے تو سسرال والے آ جائیں تو بھی نہ جاؤں ویٹرز کی طرح سیوا کرنے۔"
"شاید تمہارے سسرال والے ہی ہوں۔" ہدیہ کو صاف لگ رہا تھا' اس لیے جل کر بولی۔
"تو ہوا کریں۔ ہیں... کیا بکواس کی تم نے؟ یہ لمبی ناک والے ڈاکٹر اسفر تمہارے خیال میں میرا پرپوزل لے کر آئے ہیں؟" وہ کیبنٹ کھول کر گلاس نکالنے لگی۔
"لگ تو یہی رہا ہے۔"
"میں اس کی مونچھیں نہ شہید کر دوں' اگر اس نے ایسا سوچا بھی تو۔ کتنے چیپ ڈاکٹر ہیں تمہارے محلے کے۔ میں تو انہیں خاصا شریف سمجھتی تھی۔"
"تمہارے ساتھ انہوں نے کیا بدمعاشی کر دی' پرپوزل ہی تو لے کر آئے ہیں۔"
"یہ بات ہے تو یہ لو۔ خود ہی سارا کام کرو' میں جا رہی ہوں اوپر۔" وہ جل کر باہر نکل آئی۔
"کون آیا ہے۔" سیڑھیوں سے اترتے ازرار شاہ نے اسے ساگاہی تو دیا۔
"میرے سسرال والے۔"
"ہیں..." اس نے گھورنا چاہا مگر وہ سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہدیہ کے اندازے کی درستی نے اس کا موڈ مزید آف کر دیا تھا۔

"یہاں تو کسی سے ہنس کر بات کیا کر لیں' لوگ خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اچھے بھلے سوبر اور ڈیسنٹ سے ڈاکٹر لگے تھے مجھے۔ دو دن ان سے ہیلو ہائے کیا کر لی' ان کے گھر پرپوزل بھجوا دیا۔ اس طرح تو یہ ہر روز کسی نہ کسی کو پرپوز کرتے ہوں گے۔"
"نہیں۔ ان کی ممی کہہ نہیں رہی تھیں کہ اتنے سالوں سے وہ انہیں شادی کے لیے منا رہی ہیں' اب مانے ہیں تو منشاء بیٹی کو رخصت کروا کر ہی دم لوں گی۔ چاہے مجھے بار بار ہی کیوں نہ آنا پڑے۔ مجھے اپنے بیٹے کی خوشی کے لیے سب منظور ہے۔"
"ارے واہ... ان ہی کا راج ہے نا جیسے' میری مرضی زیادہ امپورٹنٹ ہے یا...."
"تمہاری مرضی... لیکن اس پرپوزل کو ریجیکٹ کرنے کی وجہ؟"
"ان کی ناک ضرورت سے زیادہ لمبی ہے۔"
"واٹ... یہ ریزن دو گی تم ابو کو؟"
"نہیں' بس مجھے پسند نہیں۔"
"تو پھر کون پسند ہے؟"
"کوئی نہیں۔"
"سچ سچ بتاؤ' کسی سے محبت وغیرہ تو نہیں ہے؟" ہدیہ جانے کیا اگلوانا چاہ رہی تھی اس سے۔
"کہاں' نہیں ہے مجھے کسی سے...." بے حد تیزی سے اس نے ہدیہ کی بات کاٹی تھی مگر سامنے لان میں کین چیئر پر دراز اخبار کے عمیق مطالعے میں مصروف ازرار شاہ پر نگاہ پڑتے ہی اس کی زبان گنگ ہوئی تھی۔ دھڑکنوں میں ایک پل کو ارتعاش سا پھیلا تھا مگر اگلے ہی پل وہ سنبھل گئی۔
"اگر ایسا کوئی معاملہ ہوتا تو میں نے تم سے چھپانا تھا کیا۔" اگلی بات اس نے بہت آہستگی سے کی تھی۔
"تو پھر ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر اسفر کا پرپوزل ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہے۔" ہدیہ جان بوجھ کر اسے تنگ کر رہی تھی۔ حالانکہ ڈاکٹر اسفر کی والدہ سے تو کل ہی اثبات احمد نے معذرت کر لی تھی۔
"تمہیں پرفیکٹ لگ رہا ہے تو تم کر لو۔ میرا دماغ کیوں چاٹ رہی ہو۔" کن انکھیوں سے ازرار شاہ کا جائزہ لیتی وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ سیاہ کاٹن کے شلوار قمیص میں ٹانگ پر ٹانگ جمائے وہ اطمینان سے بیٹھا تھا اس کے قاتل سراپے نے منشاء حیات کا دل پھر پل بھر کے لیے کھینچا تھا۔

"منشاء آپی! چاچو کا فون ہے انگلینڈ سے۔" اسی پل ننھی نے دروازے سے جھانک کر اطلاع دی تو وہ سر جھٹکتی لاؤنج کی طرف لپکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ہدیہ کی بچی! چلو نا میرے ساتھ' مجھے شاپنگ کرنی ہے۔ صرف چار دن رہ گئے ہیں مونس کی شادی میں۔" وہ تیسری بار اس کا دماغ کھانے آئی تھی۔
"سوری۔ میرا بالکل موڈ نہیں ہے خوار ہونے کا۔ شام کو ابا آ رہی ہیں' تم ان کے ساتھ...."
"مشورے کا شکریہ۔" اس نے منہ بناتے ہوئے اس کے سارے نوٹس سمیٹنے شروع کر دیے۔
"منشاء... منشاء... میرا ٹیسٹ ہے صبح پلیز۔"
"مجھے کچھ نہیں پتا' تم اس وقت میرے ساتھ چل رہی ہو۔"
"ہدیہ..." دفعتاً ازرار نے اسے پکارا۔
"جی بھائی...." وہ فوراً اٹھ کر باہر نکل گئی۔ واپس آئی تو منشاء اسٹڈی سے نکل کر بیڈروم کی طرف جا رہی تھی۔
"منشاء...." اس نے پکارا مگر وہ ان سنی کر کے کمرے میں غائب ہو گئی اور اندر جا کر دروازہ لاک کر لیا۔
"منشاء! چلو میں تیار ہوں۔"
"مجھے نہیں جانا کہیں بھی۔ تم جا کر ٹیسٹ یاد کرو۔"
"منشاء! جلدی کرو' بھائیان ہم سب کو شاپنگ کے لیے لے جا رہے ہیں۔"
"تو جاؤ تم لوگ۔ تم سب میں' میں کب سے شامل ہو گئی۔" وہ سخت متنفر ہو رہی تھی۔
"منشاء پلیز۔" اس نے آخری کوشش کی۔
"ہدیہ... میں گاڑی اسٹارٹ کر رہا ہوں۔ دو منٹ میں نیچے آ جاؤ۔ نیچے سب تیار ہیں۔"
"بھائیان! آپ لوگ جائیں۔ منشاء نہیں جا رہی تو...."
"میں نیچے ویٹ کر رہا ہوں' دو منٹ کا مطلب ہے دو منٹ۔"
اثبات احمد کے کہنے پر وہ سب کو شاپنگ کے لیے لے جا رہا تھا' ورنہ خود سے تو کم ہی ایسی فرمائشیں پوری کرتا تھا۔ ہدیہ اس کے سختی سے کہنے پر آ تو گئی مگر دل ابھی بھی منشاء میں اٹکا ہوا تھا۔
"کیا تھا جو میں اس کی بات مان لیتی۔ اب میں تو جا رہی ہوں۔"
"تمہیں ٹیل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ضروری نہیں کہ ہمیشہ اس کی ہی مانی جائے۔" وہ اسکارف درست کرتی کاریڈور میں آئی تو فون پر نمبر ڈائل کرتے ازرار شاہ نے اسے لب چباتے دیکھ کر ٹوکا۔
"یہ آپ کہہ رہے ہیں بھائیان...." بے ساختہ لبوں سے پھسل گیا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔
ڈالمن مال سے بھرپور شاپنگ کے بعد انہوں نے پی سی میں پرتکلف ڈنر کیا۔ ازرار نے پہلی بار اپنے کزن بھائیوں کے ساتھ اس طرح انجوائے کیا تھا۔ وہ اس روز بے حد خوش تھا۔
"تمہاری ایک بات میں نے مانی ہے اور میری ایک بات تمہیں ماننا ہو گی۔" منشاء کے لیے پارسل کا آرڈر کرتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ ہدیہ پورے رستے اسے مس کرتی رہی تھی بلکہ وہ کیا' سب ہی مس کر رہے تھے۔
"منشاء ہوتی تو یوں ہوتا۔ زیادہ مزہ آتا۔ اسے یہ کلر پسند ہے۔ اسے یہ ڈش اچھی لگتی ہے۔" سارے وقت وہ اسی قسم کے جملے سنتا آیا تھا۔
رات کے پونے گیارہ بجے اس نے سوک "شاہ پیلس" کے گیراج میں پارک کی تھی۔ سب ہی اپنی اپنی شاپنگ سنبھال کر نیچے اترے تو اس نے ایک بڑا پیک آخر میں اترتی ہدیہ کی طرف بڑھایا۔
"بھائیان! یہ آپ...." وہ سمجھی کہ یہ ازرار شاہ کی شاپنگ ہے۔ منشاء کے لیے اس نے جیولری کے سوا کچھ نہیں لیا تھا کیونکہ اس کی چوائس بہت مشکل تھی۔
"یہ تم اپنی اس موڈی فرینڈ کو دے دینا۔"
"آپ...." اسے بے طرح مسرت ہوئی تھی۔ "آپ نے منشاء کے لیے شاپنگ کی' ہم تو سمجھے تھے کہ آپ اینڈ میں اپنے لیے کچھ خریدنے گئے ہیں۔"
"یہ بس... اب اچھا تو نہیں لگتا نا۔"
"آپ اسے خود کیوں نہیں دے دیتے؟"
"میں...." وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ "وہ مجھ سے.... چلو ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے۔"
سب سے آخر میں وہ اندر آیا تھا۔ منشاء چند گھنٹے قبل کی خفگی بھلائے بہت اشتیاق سے ان کی شاپنگ دیکھ رہی تھی۔

"واہ نوفل.... تمہاری چوائس تو اسے وان ہے۔ میں تو تمہیں ایویں سمجھتی تھی۔"

"اپی! میری فراک بھی تو دیکھیں' ساڑھے تین ہزار کی ہے۔" لائبہ کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔

"ہاں' بہت زبردست ہے۔ بہت سوٹ کرے گی تم پر۔"

طیبہ نے سب کو چائے سرو کی تو وہ موڈ نہ ہونے کا بہانہ کر کے اٹھ گئی۔ اس کے خیال میں وہ لوگ ضرور اس کے لیے بھی نہ کچھ لے کر آتے مگر کسی نے بھی اس کے لیے کچھ نہیں خریدا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کو تکلیف تو ہوئی تھیں۔ اس نے بہن بھائی کی محبت نہیں دیکھی تھی مگر "شاہ پیلس" میں آنے کے بعد اس کی بہت سے رشتوں سے آشنائی ہوئی تھی۔ صرف ایک شخص کو چھوڑ کر وہ ان سب کو دل سے چاہنے لگی تھی۔

ازرار شاہ سے اس کا کیا تعلق تھا؟ یہ خود اسے بھی معلوم نہیں تھا۔

جلیک نائٹی پہن کر وہ بال سمیٹ رہی تھی' جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

"سوری ہدیہ.... شام میں مجھے جانے یوں غصہ آگیا تھا۔ میں ایسی ہی ہوں۔ پل میں تولہ پل میں ماشہ۔" وہ مسکرا کر پلٹی مگر پیچھے ہدیہ نہیں' ازرار شاہ کھڑا تھا۔

"آپ...." اسے حیرت ہوئی تھی۔ اور وہ اسے نائٹی میں ملبوس دیکھ کر قدرے گڑبڑا گیا تھا۔

"یہ تمہارے لیے۔" بیڈ پر شاپنگ بیگ رکھ کر وہ وہاں رکا نہیں۔

"یہ...." اس نے سرعت سے آگے بڑھ کر شاپنگ بیگ کھولا۔ ایک پیکٹ میں میرون اور بلیک کمبینیشن کا بے حد نفیس شلوار سوٹ تھا تو دوسرے میں لائٹ پنک کلر کا ان سلا سوٹ جس پر ہلکا کام اور ستارے لگے ہوئے تھے۔

"دیکھ لی اپنی شاپنگ بلکہ سچ کہوں تو میں بھی ابھی دیکھ رہی ہوں۔" اس وقت ہدیہ چلی آئی۔

"بھائیان نے بالکل اینڈ میں تمہارے لیے شاپنگ کی۔ ہم تو سمجھے تھے کہ وہ اپنے لیے لینے گئے ہیں مگر یہ تو ابھی کچھ دیر پہلے ہی پتہ چلا کہ وہ تمہارے ڈریسز لینے گئے تھے۔ ویسے فرسٹ ٹائم انہوں نے کسی کے لیے کچھ خریدا ہے۔" وہ مسکرائی۔ "کیا ہوا' تمہیں پسند نہیں آئے؟"

"نہیں تو کچھ نہیں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ ڈریس دونوں ہی لاجواب تھے مگر انہیں ازرار شاہ نے اس کے لیے خریدا تھا' کیوں؟

"لائٹ آف کر دو۔ مجھے نیند آرہی ہے۔"

ہدیہ الجھ سی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ تمہارے بھائی' ان پر تو میری ہر بات سے اختلاف فرض ہے گویا۔ اتنا مزہ آنے گا مایوں کے فنکشن میں۔ چلو تم لوگ۔" زرا اور سبز ازار شرٹ میں وہ خفگی سے بالوں کا اونچا سا جوڑا بنائے مسکارا لگانے میں مگن تھی۔

"بھائیان اس طرح کی غیر اسلامی رسموں کے خلاف ہیں مشعل!" وہ اسے سمجھا کر تنگ آگئی تھی۔

"یہ تمہارے بھائی کیا دنیا سے انوکھے مسلمان ہیں یا یہ خود کو کچھ زیادہ ہی نیک سمجھتے ہیں۔ باقی لوگ بھی تو مسلمان ہی ہیں۔"

"نام کی مسلمانیت کس کام کی مشعل! سب لوگ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ مہندی اور مایوں ہندوانہ ثقافت اور غیر شرعی رسمیں ہیں پھر بھی سب مایوں مہندی ضرور کرتے ہیں۔" "ڈھول بجانا' ٹھمکے لگانا' ناچنا گانا۔ کیا اس کے بغیر شادی نہیں ہو سکتی؟"

"یہ سب انجوائے منٹ کے لیے کرتے ہیں یارا"

"زندگی انجوائے منٹ کا نام نہیں ہے۔ گناہ و ثواب سے آگاہی کے باوجود بار بار گناہ کرنا' جان بوجھ کر گناہ کرنا۔ یہ کیسی مسلمانیت ہے؟ آج کل کی شادیاں نمود و نمائش کا ذریعہ ہیں۔ لوگ یہ کہیں گے' وہ کہیں گے۔ اس ڈر سے ہم فقط نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ یہ لوگ کون ہوتے ہیں؟ ہم جیسے ہی ہیں سب۔ جزا و سزا کا فیصلہ لوگوں کی منشاء کے مطابق نہیں' اپنے اعمال کے مطابق ہوتا ہے۔ تو ہم لوگوں کے ڈر سے اپنی عاقبت کیوں برباد کریں۔ اپیا اور بجو کی شادی ہم نے بالکل سادگی سے کی تھی مشعل! تم اس وقت نہیں آئی تھیں مگر چاچو چاچی سے پوچھنا کہ ایک پھلجھڑی تک نہیں چھوڑی تھی ہم نے۔ بس مسجد میں نکاح ہوا اور دوسرے روز ولیمہ۔ نہ تصویریں بنوانے دیں بھائیان نے اور نہ مووی جبکہ مووی بنانا تو فیشن بن گیا ہے۔ میرے یہ سب کہنے کا مقصد یہ نہیں کہ ہم دوسروں کو خود سے کمتر سے دین سمجھتے ہیں لیکن مشعل آج یہی ہے کہ ہمیں بھی اس

دنیا یا اس کی باتوں کا خوف لاحق نہیں ہوا۔ ہم نے ہمیشہ وہی کیا جو ہمیں کرنا چاہیے' وہی جو ایک سچے مسلمان کو کرنا چاہیے۔"

"یار! تم تو بہت الجھا رہی ہو۔ اب میرا موڈ بھی ختم ہو گیا ہے مایوں پر جانے کا۔" اس نے ٹشو سے لپ اسٹک رگڑ دی۔

"ارے نہیں' تم جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ میری وجہ سے...."

"نہیں' اب موڈ نہیں رہا۔ میں مونس سے ایکسکیوز کر لیتی ہوں۔" وہ سیل فون اٹھا کر باہر نکل گئی۔

✡ ✡ ✡

"کیا ہو گیا ہے تمہیں' اپنے جاہل اور بیک ورڈ کزنز کے بیچ آ کر تم بھی ان کی طرح ہو گئی ہو۔ گناہ و ثواب یہ کن چکروں میں پڑ گئی ہو۔ مجھے تو شروع سے پھپھو سے اختلاف رہا کہ انہوں نے محبت کی تو ایک بیک ورڈ اور ٹیپیکل مائنڈ فیملی کے شخص سے اور اب تم بھی ان میں رہ کر ان ہی جیسی ہو گئی ہو۔ میں تم سے اسی لیے کہہ رہا تھا کہ تم ہمارے گھر میں آ جاؤ...." مونس کا موڈ بے حد خراب ہو رہا تھا۔ کل مایوں کے فنکشن میں تو اس نے بہانہ بنا لیا تھا مگر آج مہندی میں بھی اس نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔

"مونس پلیز' تم جانتے ہو نا کہ میں کتنی موڈی لڑکی ہوں۔ میرا موڈ بالکل نہیں ہے فنکشن اٹینڈ کرنے کا اور ویسے بھی میں وہاں آ کر کروں گی کیا۔ نہ مجھے گانے آتے ہیں نہ ڈھولک بجانی۔"

"مجھے اور حرا کو مہندی ہی لگا دینا۔"

"تو اب میں تم دونوں کو مہندی لگانے کے لیے اتنی دور آؤں اور وہ بھی...."

"کیا پہلے نہیں آتی رہی ہو تم؟"

"ٹھیک ہے میں دیکھتی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں تم نہیں آؤ گی۔"

"جب جانتے ہو تو اصرار کیوں کر رہے ہو؟"

"گو ٹو ہیل۔" اس نے چڑ کر لائن ڈسکنکٹ کر دی تو ریلنگ پر جھکی منشاء مسکرا دی۔

"کیا ہوا' تم جا کیوں نہیں رہیں۔" ازرار شاہ نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے پوچھا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے وہ مایوں اور مہندی کے فنکشن کے لیے اتنی پرجوش ہو رہی تھی۔ اسپیشل ڈریس بھی بنوائے تھے مگر کل بھی وہ اپ سیٹ ہی نظر آئی تھی اور آج بھی جانے کا امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔

"بس میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔

"مونس بیسٹ فرینڈ رہ چکا ہے تمہارا اور تم اس کو...." اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا مگر منشاء نے چڑ کر بات کاٹ دی۔

"میری مرضی۔ میں جاؤں یا نہ جاؤں آپ سے مطلب۔" اور وہ دو دو سیڑھیاں پھلانگتی نیچے اتر گئی۔ لاؤنج میں آئی تو حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ سامنے ہی حیات احمد اور تبسم' طیبہ وغیرہ سے گلے مل رہی تھیں۔

"مما! آپ.... ویل.... امیزنگ.... آپ لوگ...." وہ بھاگتی ہوئی تبسم کی باہوں میں جا سمائی۔

"کیسا لگا سرپرائز؟" انہوں نے فرط مسرت سے اس کی پیشانی چومی۔

"سو نائس۔ آئی ایم ریئلی سرپرائزڈ۔"

وہ دونوں بالکل اچانک ہی آئے تھے' اسی لیے "شاہ پیلس" کے سب ہی مکین خوشی کے ساتھ حیرت میں مبتلا ہوئے تھے۔

"ہدیہ بیٹا! فٹافٹ شاندار سے ڈنر کا اہتمام کرو۔ تم لوگ فریش ہو جاؤ۔" تبسم' اثبات احمد ہدایات جاری کر رہے تھے۔

"منشاء! آپ یہاں ہیں بیٹا! ہمارا خیال تھا کہ آپ اپنے ماموں کی طرف ہوں گی۔ آج غالباً مونس کی مہندی ہے۔" حیات احمد اسے بازو کے گھیرے میں لیے صوفے کی طرف بڑھے۔

"پہلے ارادہ تھا ڈیڈ! پھر بدل گیا۔"

"السلام علیکم چاچو۔" ازرار ابھی ابھی نیچے آیا تھا۔

"کیسے ہو ینگ مین!" حیات احمد نے اسے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اپنے سب بھتیجے بھتیجیوں میں انہیں ازرار شاہ سے کچھ زیادہ ہی محبت تھی۔

"الحمد للہ بالکل خیریت سے ہوں۔ آپ سنائیں۔"

"ہم کیا سنائیں بیٹا! زیادہ وقت تو انکل کے ساتھ گزرا۔"

"اب کیسی طبیعت ہے سعید انکل کی۔" فائزہ نے

تبسم سے پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ اب تو بہت بہتر ہیں پہلے سے۔"

"کون کون آیا ہے انگلینڈ سے۔" طیبہ نے سب کو کولڈ ڈرنک سرو کی۔ ہدیہ ٹرالی کھینچے آ رہی تھی۔

"افتخار بھائی اور بچے ہی آئے ہیں۔ بھابھی کی اپنی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور پاپا بھی ابھی وہیں پر ہیں۔"

"اور ہماری بیٹی کا سنائیں' زیادہ تنگ تو نہیں کیا اس نے آپ کو؟" حیات احمد کے دائیں طرف ازرار شاہ تھا تو بائیں طرف وہ چپکی ہوئی تھی۔

"ڈیڈ...." وہ ٹھنکی۔

"ارے نہیں بھئی۔ ہماری بیٹی تو بہت پیاری اور سیدھی سادی بچی ہے۔"

"جلیبی کی طرح سیدھی ہیں۔" ازرار شاہ نے سرگوشی کی۔

"اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے گھورا۔

"اوں ہوں.... اچھے بچے لڑتے نہیں ہیں۔" حیات احمد نے ٹوکا۔

"ڈیڈ! میری سب سے بہت بنتی ہے' ان کے سوا۔" اس نے ازرار شاہ کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں بھئی؟"

"جس سے بنی چاہیے' اسی سے نہیں بنتی۔" نوفل نے لقمہ دیا۔

"بس ایسے ہی ڈیڈ! ہم دونوں کے ستارے نہیں ملتے۔" وہ کھلکھلائی۔

"ارے.... یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔" حیات احمد بھی ہنسنے لگے۔

"میں چینج کر کے آتی ہوں۔" تبسم اٹھیں تو وہ بھی ساتھ ہی اٹھ گئے۔

منشاء کے گلابی لبوں سے مسکان چپک کر رہ گئی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس کے دائیں رخسار میں پڑنے والے بھنور میں ازرار شاہ کو کتنی ہی بار اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

✡ ✡ ✡

"منشاء! تم نے (ناخن) نیلز وغیرہ کاٹنے ہیں تو ابھی کاٹ لو کیونکہ کل یقیناً عید الاضحی کا چاند نظر آ جانے کا امکان ہے۔" وہ دراز سے کیوٹکس نکال رہی تھی جب ہدیہ نے اندر جھانکا۔

"تو اس کا میرے نیلز سے کیا تعلق ہے؟"

"دس روز تک بال اور ناخن وغیرہ تراشنا جائز نہیں ہے۔"

"اچھا چلو ٹھیک ہے۔"

"منشاء! تم تیار ہو گئی ہو۔" شیفون کی بلیو ساڑھی میں ملبوس تبسم کہتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔

"تقریباً تیار ہی ہوں۔ ہدیہ! تم ابھی تک ایسے ہی گھوم رہی ہو۔"

"میں نے بس کپڑے ہی چینج کرنے ہیں۔"

"ہاں' تمہاری تیاری کا پتا ہے مجھے۔"

"منشاء! یہ آپ ہو میری جان...." اس پر نگاہ ڈالتے ہی ان کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ میرون اور بلیک کمبی نیشن کے شلوار قمیص میں وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہی تھی۔

"اچھی لگ رہی ہوں نا۔" تین گز کا دوپٹہ لہراتے ہوئے وہ کھلکھلائی۔

"آئی کانٹ بیلیو اِٹ۔ آپ نے فرسٹ ٹائم یہ ڈریسنگ کی ہے۔ آپ کو تو الجھن ہوتی ہے نا ایسٹرن ڈریسز سے۔" وہ بے یقین تھیں۔

"کبھی کبھی ٹرینڈ بدلنا چاہیے۔"

"یہ اتنا خوب صورت ڈریس آپ نے خود چوائس کیا ہے؟"

"یہ...." وہ ہدیہ کی طرف دیکھنے لگی جو شرارت سے مسکرانے لگی تھی' اسی کے اصرار پر اس نے یہ لباس زیب تن کیا تھا۔

"یہ سیکرٹ ہے ماما! پھر کبھی اوپن کروں گی۔ آپ ایئر رنگز تو پہن لیں۔"

"مائی پریٹی ڈول۔ بہت کیوٹ لگ رہی ہو۔" بے ساختہ اس کی پیشانی چوم کر وہ اسے جلدی آنے کا کہہ کر باہر نکل گئیں۔

"میں تو اتنی کانفیڈنٹ ہوں' آج مما کے سامنے پزل کیسے ہو گئی۔ سیدھی طرح بتا دیتی کہ ازرار نے گفٹ کیے ہیں۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو کر پرفیوم اسپرے کرنے لگی۔

"ازرار شاہ...." دل بے ساختہ دھڑکا تو جلدی سے دوپٹہ سمیٹ کر باہر نکل آئی۔ سامنے ہی وہ اپنے کمرے سے باہر

نکل رہا تھا۔ وائٹ کاٹن کے کلف زدہ شلوار قمیص اور بلیک کشمیری شال کندھوں پر ڈالے وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔
"جس طرح وہ اسے دیکھ کر ٹھٹکی تھی 'اسی طرح وہ بھی اسے دیکھ کر وہیں ساکت رہ گیا۔ چند پل یونہی خاموشی سے سرکے تھے۔
"لائبہ... امیری چادر اٹھالاؤ لاؤنج سے۔" فائزہ کی پکار پر وہ ایک دم ہوش میں آئی تھی۔ آوارہ لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑستی وہ تیزی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔
"تھینک یو مقشاء..." اس کی گمبھیر آواز اس کے عقب میں کوئی تھی مگر وہ رکی نہیں۔

☼ ☼ ☼

بارات اور ولیمہ کے روز مقشاء نے اسی کے لائے کپڑے پہنے تھے اور تمام وقت اس کی گہری نظروں کے حصار میں رہی تھی۔ یہ تین چار دن سب کے لیے بہت حیران کن تھے کہ دونوں کے درمیان معمولی سی جھڑپ بھی نہیں ہوئی تھی۔
جنید اور حیدر آج کل شدومد سے بکروں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ نوفل ایسے کاموں سے جھجکتا تھا مگر وہ دونوں سارا سارا دن بکرا منڈی چھانتے رہتے مگر کوئی بکرا ان کے معیار پر پورا نہ اترتا۔
اس وقت بھی وہ تھک ہار کر یونہی بے نیل ومرام واپس لوٹے تھے۔
"یہ تم لوگ بکرا تلاش کر رہے ہو یا اپنے لیے دلہن۔ کمال ہو گیا۔ چار دن میں ایک بکرا نہیں خرید پائے۔" انہیں شیک کے گلاس تھماتے ہوئے ہدیہ نے آج بھی تاڑنا فرض سمجھا۔
"یہ جنید کا بچہ اسے کوئی بکرا پسند ہی نہیں آتا۔ کسی کے دانت پسند نہیں آتے تو کسی کی آنکھیں۔ کسی کا کلر پسند نہیں آتا تو کسی کی باڈی لینگوئج۔" حیدر خود بےزار ہو چکا تھا۔
"تم نے بکرے کو مقابلۂ حسن میں بھیجنا ہے یا اس کی قربانی دینی ہے؟"
"دس دس ہزار کے بکرے ہیں وہ بھی کم سے کم۔ اب قیمت بھی اتنی ادا کرنی ہے اور بکرا بھی ڈھنگ کا نہ ہو۔"
"کل دیکھیں گے۔"
"صرف پانچ چھ دن رہ گئے ہیں عید میں۔ قربانی کے جانور کی جتنی خدمت کرواتنا ثواب ملتا ہے اور تم دونوں کو کوئی بکرا ہی پسند نہیں آرہا۔ بہت خوب۔"
"لے آئے بکرے۔" مقشاء کچھ دیر قبل ہی نہا کر آئی تھی۔ بال تولیے میں سمٹے ہوئے تھے۔
"ہاں' یہ دو بیٹھے ہیں۔ اس بار ہماری ہی قربانی دے دینا۔" حیدر جلا بھنا بیٹھا تھا۔
"وہ 'چھنو' دیکھی تھی تو نے۔" اس کے آف موڈ سے بے خبر وہ کسی بات کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔ "جس کا مالک نا رہا تھا۔ 'چھنو کی آنکھ میں ایک نشہ ہے۔'" حیدر کو بھی ہنسی آگئی۔

☼ ☼ ☼

"مقشاء! یہ تمہارے ماتھے پر کیا ہوا ہے۔" تبسم اس نشان کو دیکھ کر چونکیں۔
"یہ... وہ چوٹ لگ گئی تھی۔" اس نے حیات احمد کے ساتھ بیٹھے ازرار شاہ کو دیکھا جو اس کو دیکھ رہا تھا۔
"چوٹ... کیسے...؟" وہ پریشان ہی تو ہو گئیں۔
"بس ایسے ہی۔ آپ چھوڑیں اسے' مہندی لگوائیں مجھ سے۔" وہ ہاتھ میں کون لیے بیٹھی تھی۔ صبح عید تھی اور اسی کے سلسلے میں چاند رات کی تیاریاں جاری تھیں۔ طیبہ اور فائزہ کچن میں تھیں تو ہدیہ لائبہ کو مہندی لگانے میں مصروف تھی۔
"نہیں رہنے دو۔"
"کیا ہے مما! مجھ سے کوئی مہندی نہیں لگوا رہا۔"
"میرے لگا دو۔" حیدر نے ہتھیلی پیش کی۔
"سچ میں لگا دوں۔" وہ جوش سے کہتی اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔
"اور کسی نے لگوانی ہے۔" پندرہ منٹ میں ایک ٹکیہ اور اس کے گرد نقطے بنا کر اس نے اعلان کیا۔ "دیکھو کتنی اچھی لگائی ہے۔"
"لاؤ' میں تمہارے لگاتا ہوں۔" بالکل اچانک ہی ازرار شاہ نے کہا تھا۔
"آپ..." وہ ایک دم چپ ہوئی۔ "آپ کو لگانی آتی ہے؟"
"کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔"
"کوئی نہیں' میں نے ہاتھ خراب نہیں کروانا۔"
"لگوا لو بیٹا!" تبسم نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ چند لمحے

سوچ کر اس کے پاس رکھے کشن پر آکر بیٹھ گئی۔
"اچھی لگایئے گا' نہیں کپڑے ٹکوڑے بنا دیں۔"
"مسٹر اینڈ مسز حیات! آپ کو اثبات احمد صاحب اپنے روم میں یاد فرما رہے ہیں۔" طیبہ چچی نے لبوں پر پھیلی معنی خیز مسکراہٹ سے ہدیہ اور نوفل دونوں کو چونکایا تھا' حیات احمد اور مسز حیات "فوراً" ہی اٹھ گئے۔
"اوف... یہ کوئی ڈیزائن ہے۔ لگتا ہے کاکروچ ڈانس کر رہا ہے۔" شاندار ڈیزائن دیکھتے ہی مقشاء کا منہ بن گیا۔
"ایک منٹ رکو تو... تمہارا نام لکھتا ہوں۔"
"ایم... اے..." ابھی اس نے اتنا ہی لکھا تھا کہ ہدیہ نے اس کا ہاتھ چھڑا لیا۔
"بس اتنا کافی ہے۔"
"ارے بھئی... پورا نام تو لکھنے دو۔"
"بھائیان! آپ نے غور نہیں کیا' نام پورا ہے۔ ایم... اے۔" اس نے دیدے گھمائے تو وہ ایک لمحے کو چونکا اور دوسرے پل مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

"واٹ..." اس کے ہاتھ سے کشن چھوٹ گیا۔ "کیا کہا تم نے پھر سے کہنا۔" خونخوار تیور لیے وہ اس کی طرف پلٹی۔
"میں نے کہا ہے "بھائی جان" ذرا سائیڈ پہ ہو جائیں۔ میں کپڑا بچھا دوں۔ بیڈ شیٹ خراب ہو جائے گی مہندی سے۔"
"یہ "بھائی جان" کسے کہا تم نے؟"
"آنسہ مقشاء حیات کو اور کسے؟" دانت بدستور نکل رہے تھے۔
"میں گلا دبا دوں گی تمہارا۔"
"تمہارے ہاتھ خراب ہو جائیں گے۔"
"یہ کپڑے ٹکوڑے خراب ہوتے ہیں تو ہو جائیں۔"
"اوں ہوں... بری بات... بھائیان نے اتنی محبت سے مہندی لگائی ہے۔"
"محبت... تمہارے بھائیان کو پتہ بھی ہے محبت کا؟"
"کیوں' میرے بھائیان کو محبت کا کیوں نہیں پتہ؟" اس نے تیزی سے کہا۔
"اچھا چھوڑو' مجھے سونے دو۔"
"جیسے آپ کا حکم بھائی جان..."
"یہ تم فضول بکواس کیوں کر رہی ہو؟"
"بکواس... میری صاف گوئی کو تم بکواس کہہ رہی ہو۔ کل سے آپ اس عہدے پر فائز ہو رہی ہیں میڈم۔"
"کیا مطلب۔"
"مطلب یہ کہ آج بڑوں کی میٹنگ میں یہی طے ہوا ہے کہ کل یعنی عید کے روز تمہیں بھائیان کے نام کی انگوٹھی پہنا دی جائے گی۔"
"کیا... میری منگنی اور وہ بھی تمہارے اس بلا کو خان بھائی سے... امپاسبل۔"
"کیا برائی ہے بھائیان میں؟"
"اچھائی کیا ہے؟"
"کوئی ایک ہو تو گنواؤں بھی۔ ڈیشنگ' ذہین' ہینڈسم' ویل ایجوکیٹڈ' ویل مینرڈ..."
"اس آخری بات سے مجھے اختلاف ہے۔ ویسے بھی مجھے کوئی شوق نہیں ہے کسی ہٹلر کے پلے بندھنے کا۔"
"اب کیا ہو سکتا ہے' اب تو بات فائنل ہو گئی ہے۔"
"خواہ مخواہ' مجھ سے پوچھا تک نہیں اور بات فائنل ہو گئی۔"
"ڈاکٹر اسفر کا پرپوزل ابھی تک موجود ہے۔ بھائیان کے دوست ہیں۔ بھائیان نے مجھ سے ذکر کیا تھا۔"
"منہ دھو رکھو... ڈاکٹر اسفر..." اس نے چادر چہرے تک کھینچ لی۔ آنکھیں بند کرتے ہی چھم سے اس دشمن جاں کا چہرہ آنکھوں میں اتر آیا تھا۔
"کیا مصیبت ہے؟" اس نے آنکھیں کھول دیں۔
"کیا ہوا؟"
"کچھ نہیں۔" وہ کروٹ بدل گئی پھر ساری رات کروٹیں بدلتے ہی گزری تھی۔

☼ ☼ ☼

"عید مبارک ڈیڈی!" نماز عید سے واپسی پر وہ بھاگ کر حیات احمد کے گلے جا لگی۔ "عید مبارک مائی ڈول۔"
"ارے واہ... ہماری بیٹی تو بالکل پری لگ رہی ہے۔" اثبات احمد نے اسے دیکھتے ہی کہا جو سفید چوڑی دار پاجامہ سوٹ اور بڑے سے دوپٹے میں پری ہی لگ رہی تھی۔
"میری عیدی..." اس نے گوری ہتھیلی پھیلائی جس پر سرخ مہندی رچی ہوئی تھی۔
"عیدی بھی ضرور ملے گی پہلے قربانی کے کار ثواب سے

فراغت پالیں۔ آپ لوگ اندر جاؤ بیٹا! وہاب اور نوفل قصائی کو لے کر آتے ہوں گے۔" بکرے وہ لوگ دو دن پہلے ہی لائے تھے جو پچھلے صحن میں بندھے ہوتے تھے۔ حیدر اور جنید آتے ہی ان کی سیوا کرنے بھاگ گئے تھے۔

"میری عیدی۔۔۔" اس نے اندر آکر نوفل کے کان کھانے شروع کر دیے۔ اپنی زندگی کی پہلی عید وہ اس طرح اپنے رشتوں کے ساتھ منا رہی تھی۔

"معاف کرو بابا! آج جمعرات نہیں ہے۔"

"نوفل کے بچے۔"

"کہاں ہیں؟"

"سو چیپ۔ عیدی نکالو فوراً" ۔ ورنہ میں ابھی نبیحہ صاحب والا بھانڈا پھوڑ دوں گی۔"

"اے۔۔۔اے۔۔۔چیپ۔۔۔بھائیاں آرہے ہیں۔"

"تو آنے دو۔۔۔میں ڈرتی ہوں ان سے۔"

"آپ ڈرتی کہاں ہیں آپ تو ڈراتی ہیں۔"

"نو ڈائیلاگ پلیز۔ سیدھی شرافت سے عیدی نکالو کنجوس۔"

"خدا کو مانو یار! بے روزگار بچہ ہوں۔ عیدی لینے کے دن ہیں دینے کے نہیں۔"

"سب پتا ہے مجھے بیٹا جی!"

"نوفل۔۔۔سیو نوفل۔۔۔" فائزہ ازرار کے ساتھ ہی اندر داخل ہوئی تھیں۔

"وہ نادرہ آپا کا فون آیا ہے' وہ لوگ آج ہی منگنی کی رسم کرنا چاہ رہے ہیں۔"

"مگر انہوں نے تو اکیس تاریخ بتائی تھی نا۔"

"ہاں لیکن اچانک آج کے مبارک دن کا ہی ارادہ بن گیا۔ اپنے ابو کو بتا دو بیٹا باہر' دو دو منگنیاں ایک ساتھ ہوں گی۔" وہ کہنے کے ساتھ ہی کچن میں چلی گئیں۔

"دوسری منگنی کس کی ہے؟" ازرار نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے۔ آپ کی منگنی اور کس کی۔"

"میری۔۔۔" بے ارادہ ہی اس نے منشاء کو دیکھا تھا جو نظریں چرا کر باہر نکل گئی تھی۔

"جی ہاں' آپ کی اور منشاء صاحب کی منگنی۔"

"کیا۔۔۔ تم سچ کہہ رہے ہو۔" اسے خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

"آف کورس۔ میں اس قسم کے سنگین مذاق نہیں کرتا۔ ویسے ابو امی تو آپ کے ساتھ زیادتی۔۔۔"

"زیادتی؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"تو اور کیا۔۔۔ آپ کی بنتی تو ہے نہیں منشاء سے۔"

"وہ پہلے کی بات ہے۔"

"او۔۔۔ہو۔۔۔"

"زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ مسکراہٹ چھپاتا لاؤنج پار کر گیا۔ دل میں یک دم ڈھیروں گلاب کھل اٹھے تھے۔ اثبات احمد اور فائزہ دو ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کی منگنی کا ذکر تو کر چکے تھے مگر یہ خبر نہیں تھی کہ وہ لڑکی منشاء حیات ہی ہوگی۔

"کیا منشاء اس نئے رشتے پر آمادہ ہو گئی ہے؟" وہ نئی الجھن میں پڑ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

تبسم ابھی کچھ دیر قبل ہی اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھیں۔

وہ جو کل سے جملے ترتیب دے رہی تھی کہ ان سے خفگی کا اظہار کر کے صاف انکار کر دے گی۔ ان کے پوچھنے پر کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ لفظوں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا اور [illegible]

"جیتی رہو۔۔۔ ہمیشہ خوش رہو۔۔۔" وہ اپنی لاڈلی اور ضدی بیٹی کی فرمانبرداری پر نہال ہی تو ہو گئی تھیں۔

"کچھ دیر میں لائبہ تمہیں لینے آ جائے گی۔ میک اپ وغیرہ درست کر لو۔ ہدیہ کو بھی تیار کر دینا۔ اس کے سسرال والے بھی رسم کرنے آ رہے ہیں۔"

ان کے جانے کے بعد وہ پہلی بار دل لگا کر اس شخص کے لیے تیار ہوئی تھی جسے کل تک وہ سخت ناپسند کرتی آئی تھی۔

"مجھے ہتھکڑیاں پہنانے کے چکر میں تھیں اور خود پھنس گئیں محترمہ!" ہدیہ اس کا میک اپ کرتے ہوئے مسلسل اسے چھیڑتی رہی تھی۔

اس نے لپ اسٹک کا آخری ٹچ دیا تھا' جب لائبہ اور طیبہ ان دونوں کو لینے آ گئیں۔ دونوں اس وقت میرون رنگ کے لباس میں سجی تھیں۔

"ماشاء اللہ۔۔۔ چشم بددور۔۔۔" طیبہ نے دیکھتے ہی کہا۔ "اللہ کتنی پیاری لگ رہی ہیں آپ دونوں۔۔۔ منشاء آپا

میرا ابھی میک اپ کر دیں نا۔"

"جب تمہاری منگنی ہوگی تو تمہارا ابھی کر دوں گی۔"

"اللہ آپی۔۔۔" وہ بری طرح شرما گئی۔

ہدیہ کے سسرال والوں نے آٹھ بجے کا ٹائم دیا تھا۔ اس وقت پونے آٹھ ہو رہے تھے۔ باربی کیو اور دیگر پکوان کی مہک پورے گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان دونوں کو ڈرائنگ روم کے بڑے صوفے پر لا کر بٹھا دیا گیا تھا۔

ٹھیک آٹھ بجے مہمانوں کی آمد کا غلغلہ اٹھا۔ ازرار شاہ سیاہ شلوار سوٹ میں ملبوس میرون پر فنتہ شال کندھوں پر لیے انہیں ریسیو کرنے باہر نکل گیا۔

"یہ تمہارے بھائیاں نے سیاہ رنگ کیوں پہنا ہے؟" منشاء نے سرگوشی کی۔

"نظر بد سے بچاؤ کے لیے۔ لگ رہے ہیں نا لیڈی کلر۔"

"تمہارا لیڈی کلر بھی آئے گا یا نہیں۔"

"ارے نہیں' وہ تو بہت شرمیلے ہیں۔"

"اوہو۔۔۔ ابھی سے "وہ" تمہیں کیسے پتہ چلا ان کے شرمیلے پن کا۔"

"اپیا نے بتایا تھا۔ بدتمیز' چپ ہو جاؤ۔"

"احترام کیا کرو میرا' تمہاری [illegible] ہوں۔"

ہدیہ کوئی کرارا سا جواب دینا چاہتی تھی مگر جنید اور حیدر کو آتے دیکھ کر خاموش ہو گئی۔ ان کے پیچھے مہمان خواتین بھی تھے جن میں نازش پھپھو اور اپیا بھی میاں سمیت شامل تھیں۔

☆ ☆ ☆

ازرار شاہ نے اسے خود ڈائمنڈ رنگ پہنائی تھی۔ اس کا لمس محسوس کرتے ہی اس کے وجود میں ہلچل مچ گئی تھی۔ اور جب اس نے ہولے سے عید مبارک کہا تو اس کا سر جھک گیا۔ ہدیہ کو اس کی ساس نے رنگ پہنائی تھی۔ دس بجے تک خوب محفل جمی رہی۔ ڈنر وغیرہ سے فارغ ہو کر وہ لوگ روانہ ہوئے۔ اپیا ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی جبکہ نازش رک گئی تھیں۔

"مجھے تو سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ یہ نبھا ہو کیسے گی۔ ایک مشرق دوسرا مغرب۔ ان کا ملن عجیب سی بات ہے۔" وہ اپنی حیرت کا اظہار کر رہی تھیں۔

"کان اِدھر لائیں پھپھو! میں سیکرٹ اوپن کرتا ہوں۔"

نوفل نے کہا۔

"یہ محبت کا کمال ہے۔" حیدر نے اس سے پہلے ہی راز کھول دیا۔

"کیا واقعی۔۔۔" وہ دونوں کو دیکھنے لگیں۔ ازرار شاہ بدستور اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"لگ تو کچھ ایسے ہی رہا ہے۔"

"میں چینج کر کے آتی ہوں۔" وہ فوراً" جان چھڑا کر اٹھی تھی۔

"آرام سے بھئی۔ ویسے آج کرنے کا ارادہ ہو تو بتا دینا' جملہ حقوق محفوظ کروا چکا ہوں۔" ازرار نے ہانک لگائی۔

"منشاء۔۔۔ عیدی تو لیتی جاؤ بھائیاں سے۔" نوفل نے پکارا۔ "سبز سبز نوٹ لے کر بیٹھے ہیں۔"

"چھ فٹ کا بندہ خود کو اس کے نام کر چکا ہے' اس سے بڑھ کر عیدی کیا ہوگی۔" نازش مسکراتے ہوئے بولیں۔

"منشاء! تمہاری عیدی ڈیو ہے۔" ازرار نے مسکرا کر جواباً" کہا تھا۔

مگر وہ رکی نہیں' سیدھا اپنے کمرے میں جا کر ہی دم لیا اور رات کو جب ہدیہ نے اس سے اس اچانک کایا پلٹ کی وجہ پوچھی تو وہ مسکرا دی۔

"ارادہ تو تھا نہیں ہٹلر کے پیچھے بندھنے کا مگر کیا کرتی یار! میرا اپنا دل ہی مجھے دھوکہ دے گیا۔" اس نے بے بسی سے آنکھیں پٹپٹائیں تو ہدیہ نے اسے تکیہ کھینچ مارا اور پھر دونوں ہی بے اختیار ہنس دیں۔

ثمینہ عظمت علی

مسز احمد تو ہمیشہ ہی ایسی بات کرتیں کہ مجھے غصہ آجاتا۔ اوپر سے جب عنبرین ان کی ہم نوا بن جاتی تو میں تلملا جاتی۔

"تم کیوں ان کی چمچی بن جاتی ہو۔" مسز احمد کے باہر جانے کے بعد میں نے اسے ڈپٹا۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں تم تو خوامخواہ..." اس نے ان کی حمایت کرنا چاہی، پر میں نے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔

"بس کرو، یہ بتاؤ عمار کا ٹیسٹ کیسا ہوا؟" میں نے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھا جو چھٹی جماعت میں تھا اور عنبرین اس کی کلاس ٹیچر تھی۔

"ابھی میں نے پرچے چیک نہیں کیے۔" اس نے قدرے رکھائی سے کہا تو مجھے اپنے رویے کا احساس ہوا اور پھر نئے سرے سے مسز احمد پر غصہ آنے لگا۔ ان کی باتوں ہی کی وجہ سے میرے اور عنبرین کے درمیان کھٹ پٹ ہو جاتی تھی۔

"اچھا بابا سوری، اب موڈ ٹھیک کرو۔" میں نے کہا تو وہ مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

مسز احمد سے میں سخت نالاں رہتی تھی۔ ذرا سی فرصت ملی اور بیگ سے کتاب نکال لی۔ گویا اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ وہ سینئر ٹیچر تھیں اور اسٹاف کی اکثریت سے ان کے تعلقات اچھے تھے لیکن وہ جو بس ہر وقت ریڈنگ کی تبلیغ کیا کرتی تھیں، اس سے مجھے سخت چڑ ہوتی تھی۔ بھلا یہ کیا بات ہے۔ ہر کسی کا اپنا شوق ہے اور آج کل سائنس و ٹیکنالوجی نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ دنیا فنگر ٹپس پر آگئی ہے۔ اب کون کتابیں پڑھتا پھرتا ہے؟ اور چلو نیٹ کی حد تک تو ٹھیک ہے یا اس سے متعلقہ کچھ کتابیں۔ باقی یہ ادب، شعر و شاعری وغیرہ وغیرہ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ بھاری بھاری فلسفوں والے ناول، بے سروپا شاعری، جھوٹے سچے سفرنامے یا بس اسی طرح کی چیزیں پڑھتا رہے۔

ہمارے گھر کا ماحول ایسا ہی تھا، ہم سب بہن بھائی، کزنز میوزک، موویز، پکنک، پارٹی ہلے گلے کے عادی تھے۔ پڑھائی میں اچھے تھے، اس میں کوئی شک نہیں تھا لیکن بس کتابوں سے تعلق پڑھائی کی حد تک تھا۔ اسکولنگ ہمیشہ اچھے انگلش میڈیم اسکول میں رہی سو جو کچھ فکشن وغیرہ اسکول میں پڑھا، سو پڑھا۔ اردو تو بس واجبی سی تھی۔ کبھی کبھار کوئی میگزین وغیرہ پڑھ لیتی تھی، وہ بھی شوبز گوسپ یا ڈریس ڈیزائننگ کے لیے لیکن وہ کمی بھی اب میڈیا، انٹرنیٹ اور ویڈیو فونز نے پوری کردی۔ میری منگنی اپنے کزن اسد سے ہوئی تھی۔ ان کی جاب انگلینڈ میں تھی، اس لیے شادی بھی جلدی کردی گئی۔

چار سال انگلینڈ میں رہنے کے بعد اسد نے دوبارہ کراچی آنے کا فیصلہ کیا، تب تک میری ایمن دنیا میں آچکی تھی۔ مجھے اس فیصلے پر کیا اعتراض ہوتا تھا، ہمارا لائف اسٹائل تو کراچی میں بھی انگلینڈ والا ہی تھا، پھر سارا خاندان یہیں تھا۔ ہم یہیں ٹھہر لے کر سیٹ ہوگئے۔ اب ایمن او لیول کر رہی تھی اور عمار چھٹی جماعت میں تھا۔ ہمارے بچے ہماری طرح پڑھائی میں اچھے تھے لیکن باقی کی مصروفیات ویسی ہی تھیں جیسی ہماری ہوتی تھیں بلکہ اب تو زمانے نے اور ترقی کرلی تھی۔ کمپیوٹر، نئے گیم اسٹیشنز، موبائل کا روز نیا ماڈل، نئے اضافوں کے ساتھ تو آج کے بچوں میں کہاں سے ادبی ذوق پیدا کیا جاتا، ان کا کیا قصور تھا؟

اسکول بچوں کی وجہ سے آنا جانا رہتا تھا، سو پرنسپل جو میری پرسنالٹی اور انگلش سے بڑی متاثر تھیں، انہوں نے مجھے جاب آفر کی جو تھوڑا غور و خوض اور اسد سے مشورے کے بعد میں نے قبول کرلی۔ بچوں کے اسکول اور اسد کے آفس جانے کے بعد میں گھر پر اکیلی ہی رہتی تھی۔ کام کاج کا بھی کوئی زیادہ بوجھ نہ تھا۔ چلو یہ تجربہ ہی سہی۔

ٹیچنگ کرکے مجھے بڑا مزا آرہا تھا اور بھی زیادہ آتا، اگر وہاں مسز احمد نہ ہوتیں۔

میں اور عنبرین جونیئر سیکشن میں تھیں اور مسز احمد غالباً سینئر میں۔ مجھے آئے ہوئے بمشکل ایک مہینہ

ہی ہوا تھا اور ابھی کسی کے بارے میں زیادہ معلومات نہ تھیں۔ عنبرین کو میں پہلے سے ہی جانتی تھی‘ وہ اسکول میں میری جونیئر ہوا کرتی تھی اور ہماری اچھی ہیلو ہائے تھی۔ باقی مسز احمد سے تو مجھے پہلے دن سے ہی چڑ ہو گئی تھی۔ مجھے ان کے بارے میں جاننے کا زیادہ شوق بھی نہیں تھا۔ حلیے سے یہی لگتا تھا کہ اردو‘ اسلامیات وغیرہ پڑھاتی ہوں گی۔ سادہ سی‘ سوبر سی مسز احمد کے سب ہی فین تھے۔ پر مجھے نہ جانے کیوں بس..... اب ایسی بھی کیا سادگی‘ اب اتنی عمر بھی نہ تھی اور آج کل فیشن کے لیے کون سی عمر کی حد ہے۔ خوامخواہ کی دقیانوسیت۔

٭ ٭ ٭

میں اسٹاف روم میں بیٹھی تھی‘ فری پیریڈ تھا اور میں حسب معمول اپنی بہن ارم کے ساتھ ایس ایم ایس‘ ایس ایم ایس کھیل رہی تھی۔ جب عنبرین نے آکر مجھ سے کسی انگلش ورڈ کی مینگ پوچھی۔ لفظ کچھ عجیب اور یونیک سا تھا۔ میں ذرا پزل ہو گئی۔ مسز احمد بھی وہیں بیٹھی حسب معمول اور حسب عادت کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ انھوں نے بھی عنبرین کی بات سن لی۔ کتاب ایک طرف رکھ کر انھوں نے میز پر رکھی۔ ضخیم ڈکشنری کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"ڈکشنری میں دیکھ لیتے ہیں بیٹا!" عنبرین ان کی طرف مڑ گئی۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے کھٹ سے موبائل کی انفو سروس میں ڈکشنری آپشن میں جا کر لفظ لکھا اور سینڈ کر دیا۔ ابھی وہ دونوں صفحات ہی پلٹ رہی تھیں کہ کھٹ سے جواب بھی آگیا۔ میں فاتحانہ انداز میں کھڑی ہو گئی۔

"یہ لو عنبرین!" میں نے موبائل اس کی طرف بڑھایا جو عنبرین نے جلدی سے جھپٹ لیا۔

"زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے مسز احمد!" میں نے ذرا طنزیہ انداز میں کہا۔

"آپ کے چار پانچ روپے تو کٹ گئے ہوں گے۔" انھوں نے اپنی ازلی سادگی سے کہا تو مجھے ہنسی آگئی۔

"چار پانچ روپے؟" ہمارے اسکول سسٹم کی سیلریز ہی اچھے خاصے آفیسرز جیسی تھی اور یہاں سب اچھی فیملیز کی خواتین تھیں... ضرورت کی ماری کوئی نہ تھی۔

"ایک اور چیز بھی ہوتی ہے۔" انھوں نے آہستگی سے کہا۔ "جستجو‘ شوق‘ تجسس اور کچھ پالینے کی لگن اور اس پانے کے لیے محنت... تھوڑی سی۔ اتنی آسان زندگی بھی کوئی اچھی بات نہیں ہوتی۔"

میں ہلی ہلی سی مسکراہٹ کے ساتھ باہر چلی گئی۔

٭ ٭ ٭

ہمارا اسکول ویسے تو دو دن یعنی ہفتہ اور اتوار کو بند ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی کوئی اسٹاف میٹنگ‘ سیمینار یا ورکشاپ ہفتے کے دن رکھ لی جاتی تھی۔ اس ہفتے مجھے اور عنبرین کو اسائنمنٹ ملا تھا۔ پریزنٹیشن کے لیے "ٹیچنگ کے جدید طریقے"

"یہ کیا ہے؟" میں نے عنبرین کے ہاتھوں میں تین چار کتابیں دیکھ کر پوچھا۔

"یہ [illegible] مجھے مسز احمد نے ریفر کی ہیں۔ لائبریری سے لی ہیں اسائنمنٹ کی تیاری کے لیے۔ تم کیا کرو گی؟ مل کر بنائیں؟" اس نے تجویز دی۔

"کون ان موٹی کتابوں میں سر کھپائے۔ ٹیکنو ڈاٹ کام زندہ باد۔" میں نے چہک کر کہا۔

"کس دنیا میں ہو ڈیئر Its just a click away وہ منٹ میں نکل آئے گا پرنٹر سے سارا اسائنمنٹ۔" میں تو بچوں کے ہوم ورک کے لیے بھی نیٹ ہی استعمال کرتی تھی۔ اسکول کی طرف سے بچوں کو کمپیوٹر‘ انٹرنیٹ‘ انسائیکلوپیڈیا۔ ہر چیز استعمال کرنے کی اجازت تھی تو کیا ضرورت تھی آدھے گھنٹے کا کام ایک ہفتے میں کرنے کی۔

"وہ تو ٹھیک ہے پر یہ بکس بہت Authentic ہیں۔"

"چھوڑو بھی سو سال پرانی تو ہوں گی۔"

"نہیں نہیں۔ نیا ایڈیشن ہے۔"

"اچھا یعنی Old wine in new bottle! ہاں بھئی ہوتا مسز احمد کی جانشین اور کل تم کون سی کتاب پڑھ رہی تھیں؟" میں نے اسے گھورا۔

"ڈاکیا اور جولاہا۔" اس نے کہا۔

"یہ ڈاکیوں کا زمانہ ہے اور یہ جولاہا کیا ہوتا ہے؟"

عنبرین نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ وہاں سے چلی گئی۔

اور جو کمپیوٹر سے ہی سہی‘ اسی دن نکال لیتی اسائنمنٹ‘ تو اچھا ہوتا۔ ایمن کی سالگرہ تھی۔ اسی ہنگامے میں جمعہ آگیا اور جمعہ والے دن جو دوپہر سے بجلی کا بریک ڈاؤن ہوا تو آدھا شہر تو بند ہو گیا۔ انتظار میں رات ہو گئی مگر بجلی کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ یو پی ایس تھا لیکن اس پر صرف پنکھے اور لائٹس تھیں‘ وہ بھی کم تعداد میں۔ اب کمپیوٹر کہاں سے چلتا؟

گیارہ بجے عنبرین کو فون کیا تو موبائل آف تھا۔ یعنی وہ سو چکی تھی۔ میری کل پہلی پریزنٹیشن تھی اور اس میں دوسری برانچز سے بھی اسٹاف کو آنا تھا۔

صبح عنبرین بڑی فریش تھی۔ اس کی تیاری مکمل تھی لیکن میری پریشانی سن کر وہ مجھ سے زیادہ پریشان ہو گئی۔

"او گاڈ! اب کیا ہوگا۔ دیکھو میں نے تم سے کہا تھا بکس لے لیتیں۔"

"مجھے کیا معلوم تھا کہ بجلی یوں دھوکہ دے گی۔"

"کیوں معلوم نہیں تھا۔ کراچی ہے یہ‘ کہیں اور رہتی ہو کیا؟"

"لیکن اب کروں کیا؟"

"دیکھو ابھی نو بجے ہیں اور پروگرام گیارہ بجے ہے۔ دو گھنٹے ہیں‘ ہم لائبریری میں بیٹھ کر تیاری کر لیتے ہیں۔"

"نہیں ہوگا مجھ سے۔ ساری رات سو بھی نہیں سکی۔ سر بھی بھاری ہے۔" میں نے کہا۔

"تو یہ میری اسائنمنٹ لے لو۔"

"پاگل ہو گیا؟" اب میں اتنی خود غرض تھی کیا۔ "یہ بتاؤ کہ پرنسپل سے کیا کہوں؟"

"اچھا... دیکھو" وہ سوچ کر بولی۔ "میں مسز احمد سے بات کرتی ہوں۔" پھر اس نے آگے کیا کیا‘ مجھے معلوم نہیں۔ بس پرنسپل نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

٭ ٭ ٭

بچوں کے ایگزامز ختم ہوئے تو ان کی تو چھٹیاں ہو گئیں لیکن اسٹاف کو تو آنا ہوتا تھا۔ کاپیاں چیک کرنا‘ رزلٹ بنانا وغیرہ۔ سب بے حد مصروف رہتے۔ مسز احمد ایگزامز کی انچارج تھیں اور ان کی کوشش ہوتی کہ درمیان میں کچھ چائے اور کھانے پینے کا سلسلہ بھی جاری رہے تاکہ تھکن اور بوریت نہ ہو پھر بریک ہوتی تو باتیں کہاں سے شروع ہوتیں‘ کہاں ختم‘ کچھ پتہ نہ چلتا اور اگر مسز احمد موجود ہوتیں تو بات کیا ہوتی تھی۔ وہی کتاب‘ کتاب اور کتاب۔

"مسز احمد! اب دور بہت بدل چکا ہے۔ بچوں کے پاس اور بہت سے آپشن ہیں۔" یہ مسز عابد تھیں جن کی بات سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی کہ کوئی تو میرا ہم نوا تھا۔

"لیکن کتاب کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔" مسز احمد نے کہا۔ "اور یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کے ذوق کی تعمیر کریں۔ ہم بچوں کو مہنگے مہنگے گفٹس دیتے ہیں‘ کھلاتے پھراتے ہیں لیکن انھیں کتابیں پڑھنے کی جانب راغب نہیں کرتے۔"

"جو لوگ پہلے کتب بینی کے شوقین تھے‘ وہ اب بھی ہیں اور جو نہیں تھے‘ وہ نہیں ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے۔" کسی اور نے کہا۔

"بات تو یہ ہے کہ آج کل کے بچوں میں یہ شوق کیسے پیدا کیا جائے؟ جو لوگ پہلے پڑھتے تھے اور اب بھی پڑھ رہے ہیں تو یہ شوق ایک نسل تک محدود ہو گیا نا۔ اس کے سب لوگ کسی نہ کسی طرح ذمہ دار ہیں۔ پہلے ادیب‘ اسٹار کی حیثیت رکھتے تھے۔ آج کل اس کا مفہوم بدل گیا ہے۔ اب فلم اسٹار‘ ٹی وی اسٹار‘ سنگرز‘

پلیز نیہ......"

"لیکن یہ سب ہمارے ہی جواز ہیں' ورنہ دوسرے ممالک میں ان سب کے باوجود بکس کا بہت زیادہ ٹرینڈ ہے۔" ایک ٹیچر بولی۔ "انڈیا ہی کو دیکھ لیں۔"

"ہاں' ابھی کچھ دن پہلے میں نے ایک انڈین چینل پر ایک پروگرام دیکھا۔" عنبرین گویا ہوئی۔ "جس کا نام تھا My Passion اس میں ایک اداکارہ آئی جس کا نام مجھے معلوم نہیں اور وہ فلموں میں عام سے گلیمرس رول کرتی ہے لیکن اس نے کہا کہ اس کا Passion بکس پڑھنا ہے۔ رومی تک کو پڑھا ہوا تھا اس نے۔"

اب مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں لاکھ ماڈرن تھی یا لائف اسٹائل ویسٹرن تھا یا میں پاکستانی رائٹرز کو نہیں جانتی تھی' پر میری گاڑھی پاکستانیت اور بھارت سے بیر میں کوئی شک نہیں تھا۔

"جھوٹے' منافق' دوغلے لوگ ہیں۔ اسکرین پر شو کرتے ہیں۔" میں نے غصے سے کہا۔

"لیکن دوسرے ہفتے اس پروگرام میں عاطف اسلم آیا تو اس نے کہا کہ میرا Passion چشمے خریدنا ہے۔" عنبرین نے بتایا۔

"ہاں تو ہم سچے لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ کی شو آف کیوں کریں۔" میں نے کہا۔

"مسز اسد۔" مسز احمد مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ "کسی سے جغرافیائی' سیاسی' معاشرتی' سماجی یا مذہبی طور پر کتنے ہی اختلاف ہوں لیکن ماننے والی بات مان لینی چاہیے۔"

"کیوں ہم مان لیں۔" میں بھڑک اٹھی۔ "ہم کسی سے پیچھے نہیں۔ بس لوگوں کو نہ جانے کیوں ہر وقت دوسرے ملکوں کے گن گانے کا شوق ہوتا ہے اور اپنے ملک کی برائیاں کرنے کا۔ کیا فائدہ ایسی کتابیں پڑھنے کا جو ہمیں حب الوطنی بھی نہ سکھا سکیں۔"

میں غصے میں بولتی چلی گئی اور مسز احمد کا سرخ چہرہ اور عنبرین کی تنبیہی نگاہیں نظر انداز کرتے ہوئے باہر چلی گئی۔

"تم نے اچھا نہیں کیا۔" عنبرین میرے پیچھے پیچھے آئی تھی۔

"کیا اچھا نہیں کیا' انڈیا کی تعریف نہیں سنی؟ پاکستان کی برائی برداشت نہیں کی؟ یہ اچھا نہیں کیا۔"

"بات انڈیا پاکستان کی نہیں تھی اور اتفاق سے میں نے جو مثال دی اس کا تعلق انڈیا سے تھا لیکن تم خواہ مخواہ بھڑک اٹھیں' اس طرح تو میں امریکہ' انگلینڈ کہیں کی مثال دے سکتی ہوں۔ علاقے اور ہم عمر ہونے کی وجہ سے ہم اپنا زیادہ تقابل انڈیا سے ہی کرتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ہاں انڈیا سے کرتے ہیں اور انڈیا کو سپیریئر ثابت کرتے ہیں اور خود کو کمتر۔ یہ ہے ہمارا Patriotism" (حب الوطنی) میں نے طنزیہ کہا۔

"کس Patriotism کی بات کرتی ہو تم۔" عنبرین کو غصہ آگیا۔ "یہ کہ ہم کیچ میں پاکستان کی ہار انڈیا سے برداشت نہ کریں؟ ہم آسٹریلیا' انگلینڈ کسی سے بھی ہار جائیں' پر انڈیا سے نہ ہاریں۔ کیوں؟ ہار تو ہار ہوتی ہے۔ ہم رکی پونٹنگ' جیک کیلس' گیل سب کی ہٹنگ انجوائے کریں اور یوراج' سہواگ کو آؤٹ ہونے کی بددعائیں دیں۔ یہ ہے حب الوطنی؟ ہم رانی مکرجی کی ساری فلمیں دیکھیں پھر اس کے کریکٹرز پر تنقید کریں۔ ہم گھنٹوں اس موضوع پر بحث کریں کہ ایشوریا نے سلمان خان اور ابھیشک نے پریتی زنٹا سے شادی کیوں نہیں کی؟ ہم شاہد کپور اور کرینہ کپور کے بریک اپ پر غور کریں۔ ہم کئی دن اس ٹینشن میں رہیں کہ VOI میں اشمیت کیوں جیتا اور پوجی کیوں نکل گیا؟ یہ ہے حب الوطنی۔ بس ہماری گفتگو صبح سے شام تک ان کے گرد ہی گھومتی رہتی ہے۔ چاہے ہم تنقید ہی کریں۔"

میں کچھ دیر کو چپ ہو گئی پھر اچانک بولی۔

"عنبرین! تم کیا سے کیا ہوتی جا رہی ہو۔ مسز احمد نے تمہیں کیا کر دیا ہے۔ وہ خود تو ایسی ہیں اور پھر دوسروں کو۔"

"غلط۔ مسز احمد نے کبھی تم سے کیا کسی سے کچھ غلط نہ کہا' نہ کیا اور جانتی کیا ہو تم ان کے بارے میں۔ تمہیں دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور آتے ہی تم نے انہیں ناپسند کر دیا۔

جانتی ہو' وہ اے لیولز کے بچوں کو انگلش پڑھاتی ہیں۔ آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی ہیں اور وہاں کی آفرز ٹھکرا کر یہاں پاکستان آئی ہیں۔ ان کا ایک بیٹا میڈیا سے منسلک ہے اور آج کل وہ پاکستان کے صوفی شعراء پر ایک انٹرنیشنل ڈاکیومنٹری بنا رہا ہے۔ ان کی بیٹی "تھر" پر ایک انگلش کتاب لکھ رہی ہے جو آکسفورڈ پریس سے شائع ہوگی۔ خود مسز احمد فیسٹ بکس کے پینل میں شامل ہیں۔

اور ہاں تم جو ہر وقت ٹیکنالوجی کی باتیں کرتی ہو تو غور کرو کیا ہم دنیا میں ٹیکنالوجی میں سب سے آگے نکل گئے ہیں؟"

اس نے کہا اور چلی گئی۔

میں بوجھل دل سے گھر واپس آئی۔ نہ جانے کیوں سارا دن طبیعت اداس سی رہی۔ اسد اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ ایمن اور عمار' امی کے گھر جانے کی ضد کر رہے تھے۔ میں خود نہیں گئی اور انہیں بھیج دیا۔ میں نے نیٹ پر مختلف ویب سائٹس کے فورمز وزٹ کیے۔ میں زیادہ تر فیشن' ڈیزائننگ' انٹیریئر' شوبز' میوزک' ہیلتھ اینڈ بیوٹی ٹائپ کے فورمز کی ممبر تھی لیکن آج دانستہ طور پر میں نے بک ریڈنگ کے کمیونٹیز وزٹ کیں۔ بلاشبہ وہاں ممبرز کی تعداد ہزاروں میں تھی لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ پاکستانی ممبرز بہت کم' نہ ہونے کے برابر تھے۔ حالانکہ عام چیٹ رومز میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے پھر میں نے بددل ہو کر بی بی سی کھول لیا۔ بی بی سی پر نہ جانے کون سی خبر تھی' بچوں کا ایک ہجوم تھا۔ نہ صرف بچے بلکہ بڑے بھی۔ اتنا رش اور دھکم پیل۔ میں ڈر گئی۔ حادثات کے متعلق میں ویسے ہی بہت کمزور تھی۔ خبر سننے پر پتہ چلا کہ وہ ہیری پوٹر سیریز کی بک لانچ تھی اور بچوں کا ہجوم بے کراں شاپ پر الڈا ہوا تھا۔ خبر سننے پر معلوم ہوا کہ نہ جانے کتنے لوگ رات سے وہاں آ کر بیٹھ گئے تھے پھر مصنفہ جے کے رولنگ کے بارے میں بتایا جانے لگا کہ کس طرح وہ ایک امیر ترین اور مشہور ترین مصنفہ بن گئی۔ ہیری پوٹر پر تو فلموں کی سیریز بھی ہے پھر بک لینے کے لیے اتنا رش...... میں نے حیران ہو کر سوچا پھر عنبرین کی بات یاد آئی کہ کیا ہم ٹیکنالوجی میں سب سے آگے نکل گئے ہیں؟"

میں نے سوچا تو مجھے اپنے انگلینڈ میں رہائش کے چند سال یاد آ گئے اور مجھے یاد آیا کہ وہاں لوگ کتنا پڑھتے ہیں۔ چاہے اخبار ہو' ناول ہوں یا کچھ بھی۔ ٹرین میں سفر کر رہے ہیں تو کتاب نکال لی۔ کہیں انتظار کر رہے ہیں تو کتاب۔ پارک' ہوٹلز ہر جگہ......

اور یہ تب کے پیچھے پاگل ہوتے بچے......

کیا ہمارے بچے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے استعمال میں ان سے آگے ہیں یا کسی بھی طرح کی ٹیکنالوجی میں ہم ان سے آگے ہیں؟ تفریح کے مواقع ان کے پاس زیادہ ہیں یا ہمارے پاس؟ سہولیات میں' اکانومی میں کون آگے ہے؟

میں نے سوچا اور سوچتی چلی گئی۔

اور مسز احمد نے کہا تھا کہ "کسی سے سیاسی' مذہبی' سماجی طور پر کتنے ہی اختلاف ہوں لیکن ماننے والی بات مان لینی چاہیے۔"

زہرہ ممتاز

چاک داماں کی خبر

"دیکھو جا رہی ہے' کہیں اس کا باپ دیکھ نہ لے۔ توبہ توبہ..... غضب خدا کا' ڈر بھی نہیں ہے نا۔ دیکھو ذرا' باپ آجائے اس کا سر پہ تو مار ہی نہ ڈالے۔" ہیروئن کے ہر اٹھتے پڑتے قدم پر دادی اماں کے تبصروں کو چار چاند لگ رہے تھے۔

"تھوڑا ماری جلدی بھی نہیں کرتی' اب جائے بھی واپس۔" ابھی تو بے چاری نے ہیرو کے غریب خانے پہ قدم رکھا بھی نہیں تھا اور دادی نے اس کی واپسی کی جلدی مچادی۔

"خدا کی مار..... لڑکی کو رتی بھر فکر ہی نہیں ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ عشق اندھا ہوتا ہے۔"

ایمان کی بات اگر ہیروئن کے کان میں دادی اماں کی پھٹکار پڑ جائے تو اس کے عشق کی تو چھوڑ چار آنکھیں نکل آئیں۔ "ہائے دیکھو' خیر ہو گئی نا اس کے باپ کو۔ اب اللہ ماری چار چوٹ کی ہی کھائے گی نا۔"

"دادی اماں پلیز۔" اب کے وہ جھلا کر رہ گئی۔ "فلم دیکھنے دیں نا' تبصرے بعد میں کر لیجئے گا۔"

اسے سین کے کلائمکس کی پڑی تھی۔ امیر کبیر باپ کی اکلوتی لڑکی چھپ کر غریب ہیرو سے ملنے گئی تھی اور پیچھے سے باپ کو خبر ہو گئی۔ وہ جائے واردات بہ مطلب جائے ملاقات پر پہنچ گیا۔ اس کا پُرجلال چہرہ' سہمی ہوئی ہیروئن اور دادی جان کے پُرجوش تبصرے۔ کہاں وہی عام سی تھی مگر وہ ٹی وی' وی سی آر بہت کم دیکھا کرتی تھی۔ سو منہمک تھی۔ ویسے بھی وہ ہر کام انہماک سے کرنے کی عادی تھی۔ کم از کم شغل تو دلچسپی سے کرے' ورنہ نہ کرے اور آج یونہی اس نے موڈ بنا لیا۔ فلم دیکھ لی جائے۔ سنا ہے اس کے گانے اچھے ہیں۔ ابھی وہ ٹی وی کا بٹن آن نہیں کر پائی تھی کہ دادی اماں کی آواز آئی۔

"تمہیں تو کبھی فرصت ہی نہیں ملتی کہ چار گھڑی بیٹھ کر مجھ سے بات کر لو اور کچھ نہیں تو اب اس تصویروں کے ڈبے میں سر کھپاؤ گی۔" یہ شکوہ اس نے اپنی اتنی سی عمر میں اتنی بار اور اتنے لوگوں سے سنا تھا کہ بے اثر ہوتے ہوتے اب اپنا اثر دکھانے لگا تھا۔

ناولٹ
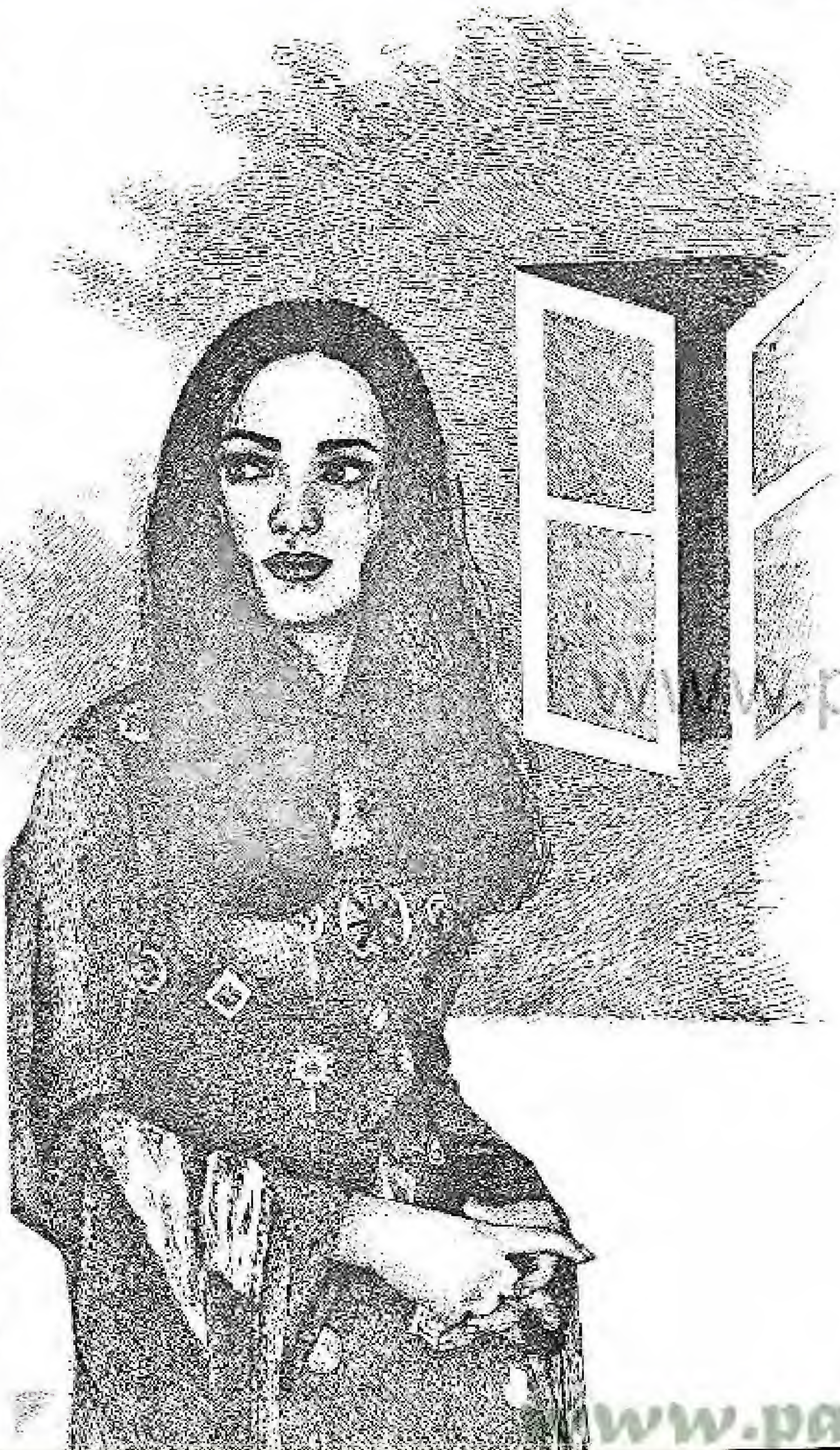
"تو آپ بھی آجائیں نا دادا وادی اماں، دونوں مل کر فلم دیکھیں گے۔"

"ہوا ابھی مصلے سے اٹھے نہیں، ابھی شیطان کے آنسے بیٹھ جائیں۔" وہ بڑبڑاتی، جھنجلاتی پلٹتے پلٹتے وہیں تک گئیں۔ باقی سارے گھر والے دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ اپنے کمرے کے سناٹے سے ہولنے سے بہتر تھا پوتی کے ساتھ یہ تماشا ہی دیکھ لیں۔

☼ ☼ ☼

"مردوں کو خوبصورت نہیں ہونا چاہیے۔"

"ہائیں خالہ! مرزا کا کیا قصور؟"

"نہیں میرا مطلب تھا یہ لفظ عورتوں کے لیے اچھا لگتا ہے، مرد تو......"

"ارے واہ اتنے خوبصورت لفظ پر عورت کی اجارہ داری کیوں۔" سہیل "کھیل کے میدان میں" کے صفحے میں سر گھسائے بیٹھا تھا اس کے فتوے پر اخبار چھوڑ چھاڑ چپٹ پڑا۔

"اچھا بھئی خوبصورت بھانجے! تمہیں اجازت ہے، جب چاہے اپنے آپ کو خوبصورت کہلوانا۔"

وہ تھا بھی اچھا خاصا وجیہہ بندہ۔ عمر اس کی اٹھارہ سال سے زیادہ نہ ہوگی مگر شخصیت اس کی بھرپور مردانہ وجاہت کا نمونہ تھی اور زارا اسے کہ یہی تو سمجھانا چاہ رہی تھی کہ حسین، وجیہہ، جاذب نظر قسم کی تعریفیں ٹھیک ہیں مگر خوبصورت کے ساتھ نزاکت کا تصور ساتھ آجاتا ہے اور پھر مرد کی شخصیت کی کشش اس تصور کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہے۔ یہ حقیقت بھی تھی کم از کم اس کے مشاہدے میں یہ بات ہمیشہ رہی تھی کہ جو مرد واقعی اس تعریف پر پورے اترتے ہیں ان میں نزاکت کا شائبہ کہیں نہ کہیں ضرور جھلکتا ہے اور اسی لیے وہ کہتی تھی کہ مردوں کو خوبصورت نہیں ہونا چاہیے یا دوسرے لفظوں میں اسے خوبصورت مرد اچھے نہیں لگتے تھے۔ اچھا لگنے اور نہ لگنے کا اظہار وہ بے دھڑک کردینے کی عادی تھی۔ اس کے چاہنے والے اور سننے والے بھی تو بہت تھے۔ چھ بہنیں اور ایک بھائی اور اس کا نمبر آٹھواں تھا۔ چھوٹی تھی، لاڈلی تھی، چہیتی تھی اور اسے لگتا کہ سب کی امیدوں اور محبتوں کا واحد مرکز بھی وہی تھی۔ سب اپنے اپنے گھروں میں مگن تھے مگر سب ہی بیک وقت اس کی دھن میں بھی رہتے۔

"زارا خالہ! میرے ساتھ شاپنگ کے لیے چلیں گی۔" خالہ دوڑی گئیں۔

"خالہ! آج میرے دوست آئیں گے، آپ "اسنو" بہت مزے کا بناتی ہیں، بنادیں گی نا؟"

"کیوں نہیں" وہ کہتی جت جاتی۔

"چھوٹی پھپھو! آج میرے اسکول میں پیرنٹس ڈے ہے۔ ممی کو تو فرصت ہی نہیں، آپ چلیں نا۔" وہ ایک دم معتبر ہوکر پل میں سرپرست بن جاتی۔

"زارا جی! آج روٹیاں ڈالو تو چار چھ زیادہ ڈال لینا۔ میری کمر میں سخت درد ہے۔"

اکلوتی بھابی کا کچن الگ تھا مگر دیوار ملی ہوئی تھی۔ اکثر مزے دار خوشبوؤں کے ساتھ کھانے بھی دیوار پار کرجاتے۔ وہ کیوں اعتراض کرتی، آخر کو اکلوتی بھابی تھیں۔ دادی جان کو ہر عمل پر بھروسا تھا مگر وہ اپنا ہر عمل اسی سے سرانجام دلوانا پسند کرتیں۔ ابو جان کو اس کی عادت تھی اور امی جان کو اس کی ضرورت۔ وہ ہر ایک کو لبیک کہتی ذرا نہ تھکتی۔

اور پھر اسی پر قناعت نہیں تھی، اس کے اور بھی اتنے پرستار تھے کہ شمار میں نہ آتے۔ ایک تو وہ تھی بلا کی حاضر جواب، خود اعتماد اور ہنس مکھ۔ حقیقت میں وہ اچھی خاصی سنجیدہ مزاج لڑکی تھی مگر لطف یہ تھا کہ وہ اپنے مقدر کی ہر سنجیدگی کو ہلکے پھلکے انداز میں آسان بنا کر نپٹانے کی عادی تھی۔ جس سے ایک بار ملتی، وہ دوبارہ ملنے کی تمنا کرتا۔ جس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی وہ تا عمر دامن سے لپٹنے کا آرزومند ہوتا اور جس کے ذرہ بھر کام آجاتی، وہ یوں واری صدقے ہوتا کہ اکثر وہ زچ ہوکر رہ جاتی۔

"یہ بڑا مسئلہ ہے، آج کسی سے مسکرا کر مل لو کل وہ گلے لگنے کو تیار رہے گا۔"

اس کی سحر انگیز مروت نے اسے لوگوں نے اتنے اور بڑے بہت روپ دکھائے تھے۔ قصور لوگوں کا بھی اتنا نہیں تھا، وہ جس سے گھنٹہ آدھا گھنٹہ بات کرتی، لگتا اسی کی ہورہے گی اور وہ اپنے نام کی ایک ہی ایک زارا عمر ہزاروں ٹکڑوں میں بٹ جاتی تو بھی کسی کے ہاتھ اتنا نہ آپاتی کہ وہ مطمئن ہوجائے۔ اصل میں مزے کی بات بھی یہی تھی کہ اس ہزار بکھرنے کے عمل سے گزر کر بھی وہ آج تک اپنے سے متعلق کسی ایک واحد شخصیت کو مطمئن نہ کرپائی تھی۔ اس کی اپنی عمر کم تھی اور اس کے چاہنے والوں کے شکووں کی عمر زیادہ۔

"تمہیں تو چوبیس گھنٹوں میں ایک فون کھڑکانے کی بھی فرصت نہیں ہوتی۔ یہ تو میں ہی ہوں جو تمہارا نمبر گھماتے انگلیاں گھستی رہتی ہوں، ورنہ تم تو پلٹ کر پوچھو بھی نا کہ تم زندہ ہے یا مرکھپ گئی ہے۔"

"ارے نہیں بھئی، میں اخبار بہت باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ اگر ایسا کچھ ہوا تو تمہارے سوئم کی خبر ضرور مل جائے گی۔"

"ہاں اور پھر بہت دھڑلے سے زردہ کھانے پہنچ جانا۔ تمہاری پسندیدہ ڈش جو ٹھہری۔"

"ارے ہاں یار! بہت دنوں سے زردہ نہیں کھایا، وہ بھی دیگ کا پکا ہوا۔ کتنا مزے کا ہوتا ہے نا۔"

"لو تو آج مرجاؤں، پرسوں مل جائے گا زردہ۔ پوری دیگ کھالینا۔"

وہ دونوں شروع سے ایک ساتھ پڑھتی آرہی تھیں۔ ایک ہی اسکول، ایک ہی کالج پھر انٹر کے بعد ندا کو آنرز کرنے کا جنون سوار ہوا اور وہ یونیورسٹی پہنچ گئی۔ اسے بھی بہت کھینچنے کی کوشش کی مگر اس کے اردگرد لوگوں کا حصار بہت مضبوط تھا، وہ اتنی آسانی سے کسی کے ہاتھ نہ آسکتی تھی۔ اس کا تو گھر سے دو گلیوں کے فاصلے پر موجود کالج میں گریجویٹ کرنا قیامت کا مسئلہ تھا۔

"آخر یہ موئی پڑھائی تمہاری کب ختم ہوگی۔" دادی ماں کا مسلسل ٹوکنا اور اس کا مسلسل ہنس کر ٹالنا۔

"واقعی بے ہولی!" بھول کر جاتا اور سنبھل کر آتا۔ "امی جان روز نصیحت کرتیں، وہ روز تابعداری سے سر ہلا دیتی۔

"غضب ہوگیا زارا! میں نے تو آج ہی دیکھا۔" وہ بمشکل میر تقی میر اور مومن خان مومن کو حفظ کرنے میں کامیاب ہوئے ہی تھی کہ بھابی نے کمرے میں جھانک کر اسے ڈسٹرب کردیا۔

"کیا ہوا؟" وہ بڑی بڑی باتیں سکون سے سننے کی عادی تھی اور بھابی چھوٹی چھوٹی باتوں کو مزے سے غضب، قیامت کہہ دیا کرتی تھیں۔

"ارے وہ ہمارا اکلوتا گلاب کا پودا جل گیا۔"

"جل گیا....؟ پھر راکھ کہاں ڈالی۔"

"اب میں اکیلی جان کس کس طرف دھیان دوں۔ امی اور ابو کا خیال رکھنا اور دادی جان کو تو جانے آج کل کیا ہوگیا ہے پھر تمہارے بھائی کے مزاج بھی پچھ ٹھکانے نہیں ملتے، کتنے دنوں سے میں نے پودوں کو پانی نہیں دیا۔"

"ارے چھوڑیں بھابی! جس جس کو دے سکتی ہیں، دیتی رہیں پانی، بالی چیزوں کو جلنے دیں۔"

اس کا لہجہ ایسا ہی تھا ہمیشہ سے، کسی کو طنز لگتا، کسی کو پیار اور کسی کو بے نیازی مگر جتنا وہ نظر آتی یا نظر آنے کی کوشش کرتی، اتنی بے نیاز وہ ہرگز تھی نہیں۔ بہت چاہت سے اس نے گلاب کا پودا لگایا تھا اور بڑی لگن سے وہ اسے روز پانی دیا کرتی تھی۔ اب وہ مصروف امتحان تھی اور اس کی فراغت کو ترستے کتنے لوگ اس کے پیچھے روز جلتے کڑھتے تھے، وہ ان بے ضرر معصوم پھولوں کا کیا غم مناپاتی۔

جس دن وہ آخری پیپر دے کر لوٹی، ایک طویل، پُرسکون اور جی بھر دینے والی نیند کی خواہش میں اس نے بہت سی چیزوں کو نظر انداز کردیا۔ دادی جان کو سلام کیا تو "آج تو بیٹا میرے ساتھ کھانا کھانا اور مجھ سے ڈھیروں باتیں کرنا۔"

"جی دادی اماں! بس تھوڑا سا سولوں۔"

"بیٹا! میری فائلیں اور ہر چیز کئی دنوں سے بے

ترتیب پڑی ہے" آج جو کہہ لیتے۔"

"جی ابو ضرور۔" دال، چاول رغبت سے کھاتے ہوئے وہ امی جان کی طرف دیکھ رہی گئی۔

کھانا آج کل بھابھی جان پکایا کرتی تھیں اور جلدی جلدی کے چکر میں وہ سالن چاول کے ساتھ کسی بھی قسم کے لوازمات سے گریز کرتیں اور اسے اندازہ تھا کہ امی ابو اچھے کھانے کے عادی تھے اس روٹین سے۔

"رضیہ خالہ کو فون کر لینا اور مونا باجی کے گھر ہو آنا۔ انہیں کسی کام کے لیے ضروری بازار جانا ہے۔"

وہ جیسے ہی بستر پر آکر لیٹی تو امی جان نے جو یاد آیا سو دہرا دیا۔

ابھی وہ کروٹ لیٹے ہی لگی تھی کہ بھابھی کی آواز آئی۔

"زارا... سو رہی ہو، اچھا کوئی بات نہیں۔" آخری جملے کے ساتھ ان کے لہجے کی مایوسی کو اس نے بری طرح محسوس کیا مگر خود پر طاری نہ کیا۔ سو کر تازہ دم ہو کر اپنا ہنستا مسکراتا چہرہ سب کے سامنے لانا بہتر تھا تاکہ جھنجلاتے کڑھتے سب احکام بجا لاتا۔ وہ مزے سے گہری نیند سو گئی۔ آنکھ اس کی فون کی مسلسل بجتی گھنٹی پر کھلی۔ بہت دنوں بعد اس نے ندا سے ڈھیر ساری باتیں کیں۔

"فرصت ملی نہیں اور تمہارا پہلا کام فون کا پیٹ بھرنا۔" وہ ان جملوں کی عادی تھی، جواباً "چپ رہنا یا بات ٹال دینا اس کا مزاج تھا اور ایسا جب اکثر ہونے لگے تو لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ بندہ بالکل بے حس ہے، پتھر اور ڈھیٹ کسی بات کا اثر ہی نہیں۔ مگر جو لوگ کسی بات کا رد عمل ظاہر نہیں کرتے، اس کا ہمیشہ یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ محسوس بھی نہیں کرتے۔ کچھ لوگ احساس کا اظہار سے رابطہ پسند نہیں کرتے، کچھ اس رابطے کے قائل ہی نہیں ہوتے اور کچھ لوگوں کو اظہار کا ڈھنگ نہیں آتا۔

☆ ☆ ☆

"بھی نیو ایئر تم کب آئے ؟"

"جی بس۔" چائے کی پیالی چھوٹی سی میز پر رکھتے ہوئے اس شخص نے مڑ کر دیکھا تو زارا کے ہوش اڑ گئے۔

"آئی ایم سوری، اصل میں میرے بھانجے کا قد اور ہیئر اسٹائل ایسا ہی ہے۔ میں سمجھی۔"

"حیرت ہے، دیکھنے میں تو آپ بہت ڈیسنٹ لگتی ہیں اور اتنی غیر مہذب حرکت۔ کسی سے فری ہونے کا ویسے یہ نہایت گھٹیا طریقہ ہے۔" اس نے ایسا تاثر دیا جیسے واقعی کسی شدید صدمے سے گزرا ہو اور پھر کندھے اچکا کر چائے کی پیالی اٹھالی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا۔ میں نے آپ کو بتایا کہ میرا بھانجا۔"

"شرم کریں بھانجے کو کیوں بیچ میں لا رہی ہیں۔"

"دیکھیں جناب! میں منہ توڑ دیا کرتی ہوں ایسی باتوں پر۔ آپ ہیں کون اور اہم بات یہ کہ ہمارے گھر میں کیا کر رہے ہیں۔" غصے سے لال پیلی زارا کو کم لوگوں نے ہی دیکھا تھا مگر سعد خان کو لگا اس نے دنیا اب دیکھی ہے۔ لمحے رنگ اور روپ بھی قدرت کے ایک ہی شاہکار میں۔

"اوہو تو یہ آپ کا گھر ہے۔ اس کا مطلب ہے، آپ بد اخلاق بھی ہیں۔ گھر آئے مہمانوں کے ساتھ آپ یہ سلوک کرتی ہیں۔"

"میں اس سے بھی برا سلوک کر سکتی ہوں۔ اگر آپ ایک پل میں یہاں سے چلتے پھرتے نظر نہ آئے۔"

"اس کو کہتے ہیں کھسیانی بلی کھمبا نوچے۔ اگر میں آپ کے نیو ایئر کے جواب میں مسکرا کر آپ کو وش کرتا تو آپ اس وقت مجھے گرم گرم چائے کے ساتھ پکوڑے تل تل کر کھلا رہی ہوتیں مگر بات یہ ہے بی بی کہ میں انگریزی کیلنڈر کا نیو ایئر منانے کا قائل نہیں ہوں اور مجھے اجنبی لوگوں سے یوں فری ہونے کی کوئی قطعاً عادت نہیں۔"

اس کا دل چاہا سامنے لگے ناریل کے درخت سے بڑا سا ناریل توڑ کر اس کے سر پر دے مارے۔ حالانکہ اس

طرح غصہ برداشت کرنا اس کا ہرگز مزاج نہیں تھا۔

"آپ جاتے ہیں یا چوکیدار کو آواز دوں۔"

"شکریہ۔ مجھے باہر کا راستہ پتا ہے۔ ہاں مونا بجو بھی کو بتا دوں گا کہ ان کے میکے میں میری کیا عزت افزائی ہوئی ہے۔" وہ ایک لمحے کو ٹھٹکی، مگر اتنی آسانی سے زیر ہو جانے والوں میں سے تو وہ بھی نہیں تھی۔

"ساتھ یہ بھی بتا دیجیے گا کہ آپ ان کی چھوٹی اور لاڈلی بہن سے کتنی تمیز سے ملے ہیں۔" بلا جھجک اس کے جواب پر سعد خان کو چونکنا پڑا۔ "لڑکی تیز ہے۔ اور۔" ابھی دل ہی دل میں وہ اس کی مزید خوبیاں گننے ہی لگا تھا کہ سہیل کی آواز آئی۔

"ابھی سے کہاں چلے سعد چچا، نانا جان سے تو مل لیں، وہ یہیں آرہے ہیں۔" ابو کی آمد کا سن کر وہ ایک لمحے میں وہاں سے کھسک لی، اور اس سے اگلے لمحے وہ اپنا غصہ بھول بھال اس کے لیے واقعی پکوڑے تل رہی تھی، ظاہر ہے اسے ابو کے پاس آئے مہمان کی خاطر داری کرنی تھی۔ بے دلی سے کرے یا دل سے کرنا تو تھا اور اس کا موقف تھا کہ جب کوئی کام کرنا ہی ٹھہرا تو اسے توجہ سے کرنا چاہیے، سنوار کر، چاہو کم اور اس کا مزاج عموماً اس کے کام پر اثر انداز نہیں ہوا کرتے تھے۔

یکم جنوری کی ایک خاص اہمیت اس کے لیے یوں بھی تھی کہ اس دن اس کی سالگرہ ہوا کرتی تھی اور ستارے اس کے جو بھی کہتے ہوں اس دن اس کا ستارہ عموماً "بہت جوش میں آجایا کرتا تھا، صبح اس کی فون کی گھنٹی پر شروع ہوتی اور دن بھر خاص کر وہ جب دادی جان کے پاس بیٹھی ہو تو یہ میوزک ضرور بجتا۔

"ہے کیا تم میں جو راہ چلتے ہر کوئی تم سے دوستی کرنے بیٹھ جاتا ہے۔" وہ بچپن سے اسے کتنا قریب سے دیکھ رہی تھیں، اور انہیں آج تک اس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی تھی۔ کیسے آتی۔ وہ کوئی راہ چلتے اس کی دو چار باتوں یا ایسی دوستانہ مسکراہٹ (جیسے کہہ رہی ہو، صرف تمہارے لیے ہے) سے متاثر تھوڑی ہوتی تھیں۔ وہ حسب عادت مسکرا کر ٹال گئی۔

"دادی جی! وہ سنبل نے کیک بھیجا ہے' آپ کھائیں گی؟ بہت مزے کا ہے۔"

"یہ سنبل اب تمہیں کیک بھی بھیجنے لگی' چندالیوں پر کسی کا احسان نہیں لیا کرتے' یہ کوئی زمانہ ہے۔ آج کل لوگ۔"

"اں ہو دادی جی! دوست ہے وہ میری اور خود ہی اپنی خوشی سے بھیجا ہے کیک' کوئی میں نے تھوڑی کہا تھا کہ بھیجو۔" جرح در جرح اس پر مسلسل اور متواتر ہمیشہ سے کی جاتی رہی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی اس نے ان رویوں کو برداشت کرنا اور جوابی بحث کرنا بھی اس کا مزاج نہیں تھا۔

مگر آہستہ آہستہ اسے شک پڑنے لگا تھا کہ اس کا مزاج بدل رہا ہے۔ وہ کوفت زدہ سی ہو کر لان کی طرف چل دی۔ اسے بالکل گمان نہیں ہوا تھا کہ سعد صاحب ابھی تک موجود ہوں گے۔

"یار! میں نے پہلے ہی بتا دیا ہے تمہاری خالہ کو کہ میں نیو ایئر وغیرہ کا قائل نہیں ہوں' پھر بھی انہوں نے یہ کیک بھیج دیا۔"

"اُفوہ آہستہ تو بولیں سعد چچا! خالہ نے سن لیا تو قیامت آ جائے گی۔ یہ نہ نیو ایئر کا کیک ہے' نہ انہوں نے آپ کے لیے بھیجا ہے۔ یہ تو میں چپکے سے فریج میں سے مار لایا ہوں' ان کی سالگرہ کا کیک ہے۔ اور ان کی عزیز دوست نے خاص طور پر بنا کر بھیجا ہے۔ آئیں عیش کر لیں' اس سے پہلے کہ ان کو خبر ہو۔"

"اُفوہ! تو تمہاری خالہ آج کے دن پیدا ہوئی تھیں' جب ہی میں کہوں کہ مجھے' ابھی کیوں نہیں لگیں۔" سعد خان نے اسے برآمدے میں تلملاتا دیکھ لیا تھا شاید جب ہی اکتائے لہجے میں نہ زور سے بولا تھا۔

"آج کے دن میں کیا خرابی ہے بھلا؟"

"تمہیں نہیں پتا' یکم جنوری میرے لیے بہت منحوس دن ہے۔" اس دن میری بہت پیاری چڑیا مر گئی تھی۔"

"کیا؟ چڑیا!" سہیل بہت حیرت سے چلایا اور اس کا دل چاہا۔ اس شخص کا سر توڑ دے۔ بے کار میں اترائے جا رہا تھا۔ "سعد چچا! آپ اور چڑیا! کیوں مذاق کر رہے ہیں۔" سہیل پھر بولا۔

"کمال ہے بھتیجے! میں اتنا سنجیدہ ہوں اور تم مذاق کہہ رہے ہو۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں بچپن میں مجھے ایک چڑیا سے محبت بلکہ اچھا خاصا عشق ہو گیا تھا۔ مگر پھر وہ مر گئی اور مجھے یاد ہے اس دن تاریخ بھی یکم جنوری تھی۔ جو کہیں کا شمہ غصے میں وہ اس کا سر تو نہ توڑ سکی' ہاں تیز تیز چلتے ان کے درمیان رکھی ہوئی میز پر رکھے کیک کو جھپٹ لیا۔

"خبردار۔ جو تم نے اس کو ہاتھ بھی لگایا۔" اس نے گھورا سہیل کو اور سنایا سعد کو۔ اور پھر اسی تیزی سے پلٹ گئی۔

"خالہ! یہ زیادتی ہے' اور انسلٹ بھی' چچا کیا سوچیں گے۔" چچا پیچھے بیٹھے مزے سے ہنس رہے تھے' اور وہ خالہ کے تعاقب میں دوڑا آیا تھا۔

"اور تم نے یہ خیال نہ کیا کہ خالہ کیا سوچیں گی' وہ میری سالگرہ کے کیک پر اپنی چہیتی چڑیا کا فاتحہ پڑھیں گے اور پھر تمہیں پیارے ہو کر کھا لیں گے۔" وہ کچن کے بجائے اپنے کمرے میں گھس گئی۔

"ارے اس موئے کیک کے لیے تم بچے سے خفا ہو گئیں' بی بی! تمہیں دوست کی دی ہوئی چیز عزیز ہے۔ یا بھانجا۔"

"یہ عزیز اور غیر عزیز کا معاملہ کب ہے' یہ تو صرف غصہ ہے۔" وہ چاہتے ہوئے دادی جان سے پوچھ نہ کہہ سکی۔ شدید قسم کا غصہ اسے "کبھی کبھی" آتا تھا' اور یہ کبھی کبھی کا بھی رائیگاں جائے تو جو وحشت ہوتی ہے اس کی وضاحت ممکن نہیں۔

☆ ☆ ☆

"دی پلیز! وہ میری بہت اچھی دوست ہے۔" صبح سے وہ کئی بار امی سے رفعت کی شادی میں جانے کا پوچھ چکی تھی اور ہر بار انہوں نے جواباً سوال ہی کیا تھا۔

"جانا بہت ضروری ہے کیا؟" ایک تو اس کا اپنا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا' اور اپنی طرف سے کسی بھی

دعوت وغیرہ میں جانا بلکہ جانے سے پہلے کا مرحلہ خاصا طویل اور صبر آزما ہوا کرتا تھا۔ امی کو ساری ہسٹری بتانا' جانے کا جواز اور نہ جانے کی قباحتیں سمجھانا۔ یہ سب تو جائز تھا' وہ سکون سے بتا کر انہیں مطمئن کر دیتی' اور ان کے قائل ہو جانے کی حد یہ جملہ ہوتا۔

"اپنے ابو کو بتا دینا۔" وہ اپنی طرف سے پروگرام کا مکمل اور ٹو دی پوائنٹ خلاصہ کرتی۔ اور ابو جان کے گوش گزار کر دیتی۔ وہ عموماً سرہلا دیتے۔ لیکن وہ پلٹ کر چار قدم کا فاصلہ طے کر کے دروازے سے باہر نہ ہو پاتی کہ انہیں اپنی ماں یاد آ جاتیں۔

"امی دادی کو بتا دیا ہے نا۔" کبھی کبھی اس کا دل کرتا ابو جان اثبات میں اتنا سر دیکھ کر وہ ان کے سامنے سے چھو ہو جائے کہ وہ لگا سا ہو دے کر جو اپنی ماں کو یاد کرتے ہیں' وہ جملہ بلکہ جملہ کیا ذمہ داری اس کے کانوں میں نہ پڑ پائے۔ کہ یہ ذمہ داری جاتے سے تک اس کی اچھی خاصی آزمائش کروا دیتی۔

"یہ کون سی دوست ہے تمہاری جسے میں نے آج تک نہیں دیکھا؟"

"کالج میں پڑھتی ہے میرے ساتھ دادی جی۔"

"مگر گھر تو کبھی نہیں آئی۔"

"کالج میں جو مل لیتے ہیں روزانہ!" وہ اپنے وارڈ روب سے ایک جوڑا نکالتی ایک رکھتی' کم از کم ان کو انٹرویو کے ابتدا میں ہی جتا تو دیتی کہ اس نے بہرحال جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔

"تو کالج میں مبارک باد دے لینا۔"

"شادی اس کی ہال میں ہو گی کالج میں نہیں' دادی جان۔!"

"اصل کام تو یہی ہوتا ہے نا بیٹا! مبارک باد دینا۔" پنک دھاگے کے کڑھائی والے وائٹ کرتے اور پنک ہی شلوار دوپٹے پر مطمئن ہو کر اس نے استری بھی کرنا شروع کر دی۔

"بیکار ہی ہے یوں غیر لوگوں میں چلے جانا' نہ جان نہ پہچان۔"

"دادی جی! ہم چار سال سے ایک ساتھ پڑھ رہے ہیں۔" فل سائز دوپٹہ استری کر کے اس نے ان کے سامنے پلنگ پر پھیلا دیا۔

"پڑھتی تو تم سالوں سے بیسیوں لڑکیوں کے ساتھ ہو' سب کی شادیوں میں جاؤ گی کیا؟"

"سب لڑکیوں سے میری دوستی نہیں' دادی جی۔" وہ الماری سے تولیہ لے کر باتھ روم میں گھس گئی۔

"عمر سے پوچھ لیا اور بہو کو بتا دیا؟" نہا دھو کر بال پونچھتی جب وہ نکلی تو انہوں نے تھک کر مایوسی سے پوچھا۔

ہمیشہ وہ اسے مکمل طور پر زچ کرنے کے بعد آخر کار یہی پوچھا کرتیں اور ان کا اثبات میں اتنا سر دیکھ کر پھر وہ بے چین ہو جاتیں' اور جاؤں گی کیسے؟"

ایک اور مرحلہ! یہ ہمیشہ سے یونہی تھا' اس کے عشق کے امتحان کبھی ختم ہونے میں نہ آتے تھے۔

"وقار بھائی کب آئیں گے بھابھی؟" شام کی چائے ابو' امی' دادی جی سب کو چھوڑ کر وہ بھابھی کے ساتھ پی رہی تھی' ان کی وضاحتوں اور تفصیلات کا سلسلہ لمبا ہو چلا کرتا تھا۔

"ڈاکٹر کا اپائنٹمنٹ تو آج ہے نہیں۔ ہاں شاید چچا کے ہاں جانے کا ارادہ کر رہے تھے صبح' مگر نہیں۔" پھر ایک گھونٹ چائے کا۔ ایک خستہ نمکین بسکٹ سے شغل اور وہ خود صبر کے گھونٹ لیتے ہوئے چائے کا گھونٹ لینا بھول جاتی۔

"یہ بھی تو کہہ رہے تھے کہ اگر کہیں جانے کا پروگرام بنا تو فون کر دوں گا۔ اب تو میرے خیال سے سیدھا گھر ہی آئیں گے۔" ان کی عادت تھی وہ گھونٹ پانی کی ضرورت ہوتی' وہ پورے سمندر کی سیر کروا دیا کرتیں۔

"تمہیں کہیں جانا ہے کیا؟" یہ خبر صبح سے اتنی ہزار بار جا چکی تھی کہ شاید دیواروں کو ازبر ہو گئی تھی۔ مگر اس وقت وہ کسی دیوار کے آگے نہیں۔ اپنی اکلوتی چہیتی بھابھی کے سامنے بیٹھی تھی۔

"جی وہ رفعت کی شادی میں جانا ہے نا' وہ جو پچھلے ہفتے اس کی خالہ کارڈ دینے آئی تھیں۔"

"ارے ہاں۔ مجھے تو یاد ہی نہیں رہا۔ کتنے بجے جانا ہے؟ تم نے صبح نہیں کہا۔ اب فون کروں گی انہیں تو غصہ کریں گے۔" وہ سکون سے ذرا سی چائے ابھی نہ پی پائی تھی۔ ہر جملے کے اختتام پر وہ اسے لتاڑ رہی تھیں۔ وہ اپنی بے تابی قطعاً "ظاہر نہیں کر رہی تھی۔ مگر پھر بھی وہ مزہ لے رہی تھیں۔ ظاہر نہ کرتی تو کیا ہوا، بے قرار تو وہ ہو جاتی تھی۔ یہ ایک تھرڈ کلاس حرکت سہی مگر ایک جذباتی انسان کی نفسیات سے کھیلنے میں مزا بہر حال بہت آتا ہے۔

"ٹھیک ہے۔ میں فون کر کے دیکھتی ہوں۔" چائے کی پیالی اور بسکٹ کی پلیٹ صاف کر کے انہوں نے بمشکل اوکے کہا۔ کرسی گھسکا کر وہ بھی اٹھنے لگی تو انہیں پھر کچھ یاد آیا۔

"مگر تمہیں جانا کس طرف ہے۔ مجھے فائزہ باجی سے سوٹ لینے جانا تھا پھر۔"

"کون سا سوٹ؟" اب کے اسے جھنجلانا چاہیے تھا مگر وہ سکون سے پوچھ رہی تھی۔

"کل میلاد میں پہننا ہے فائزہ باجی کے ہاں۔ چلو چھوڑو کچھ اور پہن لوں گی۔ تم اپنی تیاری کرو۔" نہ وہ احسان فراموش تھی۔ نہ احسان نہ ماننے والوں میں سے مگر بھابھی کی چھوٹے سے چھوٹے کام کی نوک پلک سنوار کر اسے جتانے کی عادت تھی۔ سو یوں وہ اپنے اکلوتے بھائی کو گھنٹہ دو گھنٹہ کے لیے مستعار لینے کے قابل ہو گئی۔

ویسے یہ نہایت مزے کی بات تھی، اور سارے خاندان کے لیے وہ نہایت معتبر اور اونچے درجے والی شخصیت تھی، جس کی سفارش ہر جگہ چلتی تھی، اور جس کے نام پر بڑے بڑے لوگ بڑے بڑے کام نکلوایا کرتے "زارا آنٹی" زارا خالہ اور چھوٹی خالہ کے نام کا سکہ نئی نسل تو ہر جا بے دریغ استعمال کرتی۔ روی پکنک پر جا رہی ہے۔ بڑی آپا سے اجازت چھوٹی خالہ لیں گی۔ سفینہ کو ال گرین بنارسی ساڑھی بری طرح بھا گیا ہے، عظمیٰ باجی سے سفارش زارا خالہ کریں گی۔ سہیل کے سب دوست پاکستان ٹور پر جا رہے ہیں مونا باجی، حتیٰ کہ ان کے میاں اسلم بھائی کو بھی قائل خالہ ہی کر رہی تھی۔ اور تو اور سارا آپی کے سات سالہ علی کو وڈیو گیم لینے کا بھوت چڑھا تو اپنا منتر چھوٹی خالہ سے پار کیا جس نے سارہ آپی پر اثر کیا اور علی کی مراد بر آئی۔ مگر یہ تو کچھ نہیں تھا۔ ساری بہنیں اور بھائی تک کے مشکل اور ٹیڑھے کاموں کا ٹیڑھا پن زارا بی بی کے سر کے صدقے دور ہوتا۔

"زارا! تو بات کرنا ابو سے میرے شیئرز اِنگ کر دیں۔ امتیاز کو بہت ضرورت ہے پیسوں کی۔" عظمیٰ باجی اٹھتے کھاتے بیٹھے گھر لانے کی ہو چکی تھیں۔ عمران کا خاندان کا خاندان فضول خرچ تھا۔

"بڑا اچھا رشتہ ہے یہ، کیا ہوا جو برادری کے لوگ نہیں، مجھے پتا ہے سیما خوش رہے گی۔ مگر امی جان کو کون قائل کرے! زارا تم کہہ کر دیکھو۔" بڑی آپا کی دو ہی بیٹیاں تھیں مگر انہیں وداع کرنے کا شوق۔ ان کے پیدا ہوتے ہی لگ گیا تھا۔

"سنو زارا! ابو سے ان کاغذات پر سائن کروا لینا پلیز۔" وقار بھائی دفتر جاتے جاتے بائی دی کام دیکھے دیکھتے جلدی میں آئی ہوتے اور اپنا پاسپورٹ پکڑا جاتے یہ جا وہ جا۔ باقی کون رہ گیا بھابھی جان۔ وہ بھی زارا کی "صرف آپ کے لیے" قسم کی طبیعت سے ہر طرح فائدہ اٹھانا جانتی تھیں۔

"ریحانہ باجی کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں میرے ساتھ شاپنگ پر چلو۔ اب میں انہیں منع تو نہیں کر سکتی۔ وقار آئیں تو تم انہیں بتا دینا۔ اور ہاں ذرا ڈھنگ سے کہنا اس طرح کہ وہ ناراض نہ ہوں۔"

اور اس کے کہنے کا ڈھنگ ہی تو تھا، جو اسے ہر جگہ سامنے لے آتا تھا۔ ہر کوئی اس کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلاتا اور خوب چلاتا کہ نشانہ ہرگز خطا نہ جاتا تھا کہ اس کے شانے بھی بہت مضبوط تھے اور اس کے قدم بھی کبھی لڑکھڑائے نہ تھے، اصل میں ہوتا یہ ہے (یہ بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ کم کم ہوتا ہے مگر پھر بھی۔) کہ کچھ لوگ دوسروں کے لیے بڑی بڑی جنگیں لڑ لیتے ہیں مگر جہاں اپنی ذات کا قصہ چلتا ہے۔

یوں سر جھکا کر عاجز بن جاتے ہیں کہ جو نہ اٹکاتے ہوں ان کا بھی خوامخواہ دل کرتا ہے کہ ان کی راہ میں روڑے اٹکائیں۔

☼ ☼ ☼

"زہے نصیب آج تم نے مجھے فون کیسے کیا؟" اپنے ہیلو کے جواب میں اسے ندا سے اسی قسم کے جملے کی توقع تھی۔

"ایسے ہی دل کر رہا تھا تم سے گپ شپ کرنے کو۔"

"چندا! ایسے ہی تو تم نے آج تک مجھے فون نہیں کیا۔"

"بلاوجہ فون تمہیں ندا کر سکتی ہے مگر تم ندا تو نہیں ہو۔ کیا بات ہے؟"

"نہیں سچ۔ ایسے ہی بور ہو رہی تھی تو سوچا تم سے بات کر لوں۔"

"خیریت بھی آج سورج کہاں سے نکلا ہے۔ زارا عمر کو بور ہونے کا وقت بھلا کیسے مل گیا۔"

"دیکھو! تمہیں جرح ہی کرنی ہے تو میں فون رکھ رہی ہوں۔ اس سے بہتر ہے میں کسی رانگ نمبر پر بات کر لوں۔"

"نہیں ڈیئر مجھے پتا ہے۔ تم رانگ نمبرز کو افورڈ نہیں کر سکتیں۔ تم تو پراپر (proper) نمبرز کو بھی ڈھنگ سے نپٹا نہیں سکتیں۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو دوست! میں رانگ نمبرز کو ہرگز افورڈ نہیں کر سکتی۔" وہ حیران ہو گئی۔ زارا نے اس کی کبھی کسی بات کی تصدیق بھی ——— کی تھی، حالانکہ یہ اس کا ہمیشہ کا شکوہ تھا بلکہ اس کا کیا سارے زمانے کا تھا۔

"مگر کبھی کبھی کوئی رانگ نمبر اٹک جاتا ہے تو بار بار ڈائل ہونے لگتا ہے۔"

"ہیں۔ ایکسکیوزمی میڈم کیا کہا آپ نے؟"

"ایسے ہی ایک عام سی بات کر رہی ہوں۔"

"کیوں آج" "ایسے ہی" "سب کچھ کیوں کہہ رہی ہو۔"

"دیکھو، دادی جی بلا رہی ہیں، اب میں چلتی ہوں۔" اس نے کھٹ سے فون رکھ دیا۔

آج دادی جان کا بلاوا اس کے لیے جان بخشی کا بہانا بن گیا تھا، مگر اسے پتا تھا۔ ابھی کچھ دیر بعد پھر گھنٹی بجے گی اور وہ کہہ رہی ہوگی "سنو کیا ہوا ہے؟" اور وہ اسے کیا بتا پائے گی۔ کیا کچھ بتا بھی پائے گی؟ یہ کہ آج دس دن ہو گئے وہ ڈھنگ سے سو نہیں پائی۔ اس کا دماغ کہیں اور رہتا ہے۔ جسم کہیں اور۔ ڈور فون کی ہر بجتی گھنٹی پر اس کے دل کی دھڑکن اس حد سے گزرنے لگتی ہے جس سے کبھی نہ گزری تھی۔ کچھ تو ضرور تھا۔ لہجے کی کوئی کرامت، یا لفظوں میں کوئی سحر شاید جذبے میں کوئی سچ کوئی اثر ضرور ہو۔

"جب تلاش ختم ہو جاتی ہے تو بندے کا دل کرتا ہے ایک طویل گہری نیند سو جائے۔ سکون کی اس حد کو چھونے کی خواہش ہونے لگتی ہے۔ جو انسان جیسی بیچارہ صفت مخلوق کا نصیب نہیں ہے۔"

ان جملوں کی بازگشت مسلسل اس کے کانوں میں ہوتی رہتی تھی اور اس کے باوجود وہ انہیں کبھی دہرا نہیں سکی تھی۔ بھلا یہ سب بیان کرنا ممکن ہے جو صرف محسوس ہو سکتا ہے۔ جسے سنانے کو مجھے لکھتے ہیں؟ تنہائی میں آوازیں تعاقب کرتی ہیں اور اندھیرے میں سائے دوڑنے لگتے ہیں۔ وہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ اس کے خواب سراب ہونے لگے ہیں۔ وہ یعنی زارا عمر جو پہلے ہی تعلقات کے ایک مضبوط دائرے میں گھری ہوئی ہے۔ اتنے ڈھیروں چاہنے والے اور ان کی امیدوں کا واحد مرکز زارا عمر جس کا اپنا کوئی مرکز نہیں اور اس کی قطعاً سمجھ بھی نہیں تھی کہ وہ اپنا مرکز ڈھونڈتی پھرے، تو پھر وہ کیا کر سکتی ہے؟ یہی سوالیہ نشان تھا، جس نے اسے ندا کے آگے زبان کھولنے پر مجبور کیا تھا۔

"تمہیں پتا ہے، سہیل کے وہی سعد چچا تو نہیں، جنہیں تم دو ہفتے پہلے جی بھر کر صلواتیں سنا رہی تھیں۔"

ہاں اس نے تو غور ہی نہیں کیا تھا کہ ایک واحد

ملاقات میں اس نے اس شخص سے بہت برا سلوک کیا تھا۔" فون پر تم اس سے بات کیسے کرلیتی ہو؟ درجن بھر تو ایکسٹینشن لگے ہوئے ہیں تمہارے گھر میں۔"

"کوشش کرتی ہوں کہ بھابھی کے کمرے سے بات کروں، اور جب ابو گھر میں نہ ہوں تو۔"

"آئی ایم سوری زارا! مگر مجھے کچھ پسند نہیں آرہی تمہاری حرکت۔ اگر تمہارے گھر میں کسی کو ذرا سا شبہ بھی ہو گیا تو تمہیں پتا تو ہوگا کہ قیامت کسے کہتے ہیں۔"

ابھی اس نے دل کی خوشگوار دھڑکنوں کو چھو کر محسوس بھی نہیں کیا تھا کہ خدشوں کی زنجیریں پاؤں پکڑنے لگیں۔ اسے ندا کی سچائی کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ وہی ایک رہنما ہوتی، اگر کبھی وہ بھٹکنے لگی تو ان کا تعلق اتنا مضبوط تھا کہ وہ دامن جھٹک کر گزرنے کے بجائے اسے ہاتھ بڑھا کر دلدل سے کھینچ لے اور یہ کیسا ستم تھا۔

وہ جانتے بوجھتے کہ راستہ غلط ہے اس پر چل نکلی تھی۔

ہاں، یہ حضرت انسان ہی تو ہے جو شعور بھی رکھتا ہے اور بھٹکتا بھی ہے، اور انسانی زندگی کے کئی ہزار پہلو ایسے بھی ہیں۔ جو بیان کیے جائیں تو لطیفہ لگیں۔ اور محسوس کیے جائیں۔ تو ٹھوس حقیقت۔

پہلے دو چار دن کے وقفے سے فون پر بات ہوتی تھی، پھر ہر دوسرے روز ہونے لگی، اور اب روزانہ۔ ایک مخصوص وقت پر وہ گھڑی کی ٹک ٹک اپنے دل پر محسوس کرنے لگتی۔ ادھر گھنٹی بجتی اور ادھر اس کا متردد ذہن گھر کے ہر فرد کے بارے میں کہاں ہے، کیا کر رہا ہے، کے اندازے لگانا شروع کر دیتا۔ دادی جان اپنے وظیفوں میں مشغول ہو گئی ہیں۔ امی جان سو گئی ہیں، بھابھی جان کتاب یا رسالے میں بری طرح غرق ہیں۔ اور وہ خود اتنی بہادر ہو گئی ہے کہ چوری کر رہی ہے، اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو رہی تو اطمینان کا سانس لینی ممکن ہو جاتی۔

"میں اگر آج مونا بھابھی سے تمہارا ذکر کروں تو وہ ہرگز انکار نہیں کریں گی مگر۔" بیسیوں بار وہ اس "مگر" پر آکر اٹکا تھا، اور وہ اس سے وضاحت نہ مانگ پائی تھی۔

"اس سے پوچھو پایا کہ اس "مگر" کے آگے کون سی دنیا ہے۔" ندا جھنجلا کر کہہ رہی تھی۔ مگر وہ پوچھ نہ پائی۔ آج اس نے یہاں تک کہا تھا کہ۔

"ایک الجھن ہے میں تمہیں تفصیل سے بتاؤں گا، بس ذرا خود سلجھانے کی کوشش کرلوں۔"

"پھر اس سے کہو روز فون کر کر کے سر نہ کھایا کرے جب مسئلہ حل ہو جائے تو ڈھنگ سے بات کرے۔" مصیبت یہ تھی کہ وہ ندا کے کہے جملے بے دھڑک ادھر منتقل نہ کر پاتی۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ بلا کا باتونی تھا اور حاضر جوابی میں یہ بھی اپنی کوئی مثال نہیں رکھتی تھی، پھر فون پر باتیں کرنا تو اس کا دیرینہ مشغلہ تھا۔ جب سلسلہ چلتا تو وقت گزرنے کا پتا بھی نہ چلتا۔

اور یہ بھی درست تھا کہ سعد خان نے کبھی کوئی غیر شائستہ یا بے تکی بات نہ کی تھی، بے باک ضرور تھا مگر بے غیرت نہیں تھا۔

خاندان کا فرد تھا، اس لیے اسے خاندان کے نام کا، تہذیب و روایت کا بڑا پاس تھا۔ مگر زارا کے گھر کی تہذیب و روایات اچھی خاصی کڑی تھیں۔ وہ ابھی بہک ضرور رہی تھی مگر ندا کو اتنا بھی یقین تھا کہ جب وقت پڑا تو سنبھلے گی بھی ایسے کہ خود کو بھی نہیں دوسروں کو بھی سنبھال لے، سو وہ اسے ٹوک ضرور دیتی تھی مگر روک نہیں رہی تھی کہ انسانوں کی اس دنیا میں اپنی پسند کی شخصیت پر انگلی رکھنے کا حق۔ بہرحال وہ بھی رکھتی تھی۔

ڈاکٹرز ہمیشہ سے اس کی کمزوری رہے تھے اور سعد خان تو امریکہ سے ایف آر سی ایس کرکے آیا تھا۔ اور بھری دنیا میں ندا شاید واحد ہستی تھی جس کے سامنے اس نے اظہار کیا تھا۔ اس دن جب کالج کے زمانے میں فری پیریڈ میں وہ دونوں خواتین کے ایک رسالے میں کسی خاتون فنکارہ کے انٹرویو کی ٹانگ توڑ رہی تھیں۔

"دیکھو دیکھو۔ کتنا مزے کا سوال ہے۔ آپ کیسے مرد سے شادی کرنا پسند کریں گی؟" جواب ہے۔ "ڈاکٹر سے۔" ندا کی بات کاٹ کر اس نے کھٹ سے کہا تھا، اس نے دیر تک اس کے مسکراتے مگر سنجیدہ چہرے کو دیکھا تھا اور پھر کہا تھا۔

"چلو، میں آج رات بارہ بج کر تین منٹ پر چلہ کاٹوں گی کہ ایک عدد ڈاکٹر میری پیاری سہیلی کے نصیب میں لکھ دیا جائے۔" اب یوں تھا کہ ایک عدد ڈاکٹر اس کی سہیلی کی راہ میں تو آگیا تھا، نصیب میں تھا کہ نہیں اس کے لیے وہ اب بھی صرف دعا ہی کر سکتی تھی۔

اصل میں کبھی کبھی ہوتا یوں ہے کہ گھپ اندھیرے میں کہیں کوئی جگنو نظر آجائے تو بندہ اسے پکڑنے کے لیے دوڑتا ہے، اور اگر ہاتھ آجائے تو پھر خوف سے رونے لگتا ہے۔ اور وہ بھی ابھی دوڑ رہی تھی۔ فطرت انسان کو۔ کبھی بہادر بنا دیتی ہے اور کبھی بزدل بھی۔

"سنو، تم بولتی ہوئی بہت اچھی لگتی ہو۔" بہت جوش میں اسے عرفی کی سالگرہ کا قصہ سناتے ہوئے وہ چپ ہو گئی۔

"اچھا۔ اب جا رہی ہوں۔ امی بلا رہی ہیں۔" تعریف کا سلسلہ زیادہ چلے وہ سن نہ پائے گی۔

"ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ امی سو رہی ہیں۔" سعد خان اس موڈ میں تھوڑی دیر اور کھویا رہنا چاہتا تھا، مگر وہ اس سلسلے سے ہمیشہ کترا جاتی تھی۔

"اور لڑکیاں تو اپنی تعریف پر ساتویں آسمان پر پہنچ جایا کرتی ہیں۔"

"میں بھی لڑکی ہوں، اور میں بھی ساتویں آسمان تک ہی پہنچ جایا کرتی ہوں۔ مگر کیا کروں، مجھے نظریں نیچی کرنے کی بھی عادت ہے، اور آسمان کے نیچے زمین ہی ہوتی ہے نا۔"

"نظریں نیچی رکھنے کی عادت ہے تو مجھے کیسے دیکھ لیا۔"

"احسان مانیں کہ رک کر دیکھ لیا۔ ورنہ ہم اس مزاج کے بندے تھے نہیں۔"

"مان لیتے ہیں۔ مگر اس قدر بھی نہ منوایئے گا کہ چھ فٹ کا سعد خان پھر کبھی سر اٹھا کر بھی نہ دیکھ پائے۔"

"آپ کو ضرورت بھی کیا ہے سر اٹھانے کی۔"

"آپ کو دیکھنے کے لیے تو اٹھانا پڑے گا۔"

مونا باجی کی نند کی منگنی تھی، اسے جانے کا شوق ہو رہا تھا مگر اس نے شوق کا اظہار قطعاً نہیں کیا۔ کہ وہ منگنی شادی کی دعوتوں میں جانے کے نام سے ہمیشہ چڑا کرتی تھی۔ سو آج بھی اسے چڑنا اور نخرے کرنا لازمی تھا۔ پہلے وہ نخرہ نہیں کرتی تھی، اسے حقیقتاً دعوتوں وغیرہ میں جانے کے نام سے وحشت ہوا کرتی تھی، نخرہ تو وہ آج دکھا رہی تھی، اور کچھ زیادہ ہی دکھا گئی۔ مگر نتیجہ تو اسے پتا تھا۔ پہلے وہ اس نتیجے پر جلا کڑھا کرتی تھی، آج اطمینان سے اس نے سفید موتیوں کے کام والا فیروزی کرتا شلوار پہنا، فیروزے کی بالیاں کانوں میں ڈال کر اور ٹشو کا بڑا سا دوپٹہ کندھوں پر پھیلا کر اس نے ایک نظر آئینے میں جھانکا۔ یہ طے ہے کہ بندے کا شوق کبھی نہ کبھی نادان ضرور ہوتا ہے۔

"آج تو بڑا اچھا جوڑا نکال کر پہنا ہے۔ شکر ہے تمہیں بھی کچھ عقل آئی۔ اب اس کا دامن تھامے رکھنا، چھوڑ نہ دینا۔" وہ خود کیا تجزیہ کرتی، دادی جان کا کہنا بہت تھا۔ اس نے پھر آئینے میں نہیں جھانکا۔

"سہیل! تم اب مجھے گھر پہنچا دو۔ دادی جی بالکل اکیلی ہیں۔ وہ سو گئی ہوں گی نہیں۔ اور مجھے اب پریشانی ہو رہی ہے۔" سب کا خیال وہ ہمیشہ اسی طرح کیا کرتی تھی، اس لیے کھانے کے بعد سے ہی اس نے سہیل کا سر کھانا شروع کر دیا تھا۔

"ٹھیک ہے خالہ! بس ابھی چلتے ہیں۔" پتا نہیں اس نے کیمرہ کس کو پکڑایا اور گاڑی کی چابی کس سے لی۔ وہ جب پلٹ کر آیا تو وہ چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑی۔ ابھی وہ گاڑی میں بیٹھی ہی تھی کہ پیچھے سے پھر کسی نے اسے بلا لیا۔

"پلیز خدا! ایک منٹ۔" اس نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا دیا۔ اس کا ایک منٹ کئی منٹوں کو ضرب دے کر بنا تھا۔ لیکن واقعی اگلے ہی منٹ گاڑی کا دروازہ کھلا اور پھر انجن اسٹارٹ ہو گیا۔

"آپ۔۔؟ میرا مطلب ہے سہیل کہاں ہے؟" گاڑی گیئر میں ڈالتے اور تیزی سے اسٹیئرنگ گھماتے سعد خان کو وہ کیسے روک سکتی تھی۔

"اسے موٹا بھابھی نے روک لیا ہے، بہت کام ہیں۔" آرام سے گاڑی پارکنگ سے نکال کر وہ ہال کے گیٹ کے باہر لے گیا۔

"کام آپ بھی تو کر سکتے تھے، مجھے چھوڑنے کے لیے اسے ہی جانا چاہیے تھا اگر نہیں تو پھر کچھ دیر اور رک جاتی۔"

"او گاڈ! کیا مطلب ہے تمہارا۔ اس نے مجھے خود چابی دی ہے گاڑی کی۔"

"وہ تو بے وقوف ہے۔ کیا آپ بھی۔"

"ہاں، میں بھی بے وقوف ہوں بلکہ پاگل ہوں، اگر کوئی اعتراض ہو تو ابھی بتا دو۔"

"آپ سمجھ نہیں رہے سعد! کسی کو پتا لگ گیا تو آپ جانتے تو ہوں گے قیامت کسے کہتے ہیں۔"

آج پہلی بار اس نے ندا کی کہی کوئی بات اس کے سامنے دہرائی تھی کیونکہ قیامت کسے کہتے ہیں کہ تشریح اس پر خود آج ہی سوار ہو رہی تھی۔ اکثر خوف آدمی کے اندر ہی اگتے ہیں، اور اسے دہشت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے اپنے اندر چور بیٹھا ہے۔ جب ہی تو ڈر رہی تھی، ورنہ کم از کم موٹا باجی تو جانتی ہی ہوں گی کہ سہیل نہیں تو کون اسے چھوڑنے گیا ہے، اور رات کے اندھیرے میں خاموش سڑک پر دوڑتی گاڑی میں جس شخص کے برابر بیٹھی وہ ظاہر میں تنگ اور اندر سے خشک ہو رہی تھی، وہ ایسا بے اعتبار بھی نہیں تھا۔

"یار! ابھی تو آدمی کو اپنی سمجھ کو چھٹی دے دینی چاہیے۔"

"پلیز! آپ سیدھے راستے سے چلیں۔" اس نے دیکھا، وہ خواہ مخواہ میں راستہ لمبا کر رہا ہے۔

"دیکھو مان لیتا ہوں کہ میں نے سہیل سے خود چابی مانگی ہے اور بے فکر رہو اس کے سوا کسی کو خبر نہیں اور میں تمہیں آرام سے گھر کے گیٹ کے باہر چھوڑ دوں گا۔ دادی جان کو کیا پتا لگے گا کہ تم کس کے ساتھ آئی ہو۔"

"میں اس طرح کی چوریوں کی قطعاً قائل نہیں سعد خان۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"میں بھی اس کا قائل نہیں، مگر تم سوچو تم میرے ہاتھ کس طرح آسکتی تھیں۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔" وہ چپ چاپ اندھیری سڑک کو دیکھتی رہی۔

"یار! اس طرح منہ بنا کر بیٹھی رہیں تو میں تم سے کیا بات کر سکوں گا بھلا۔ اور سوچو یہ سفر تو کتنا تھوڑا ہے، ابھی ختم ہو جائے گا۔" وہ اب بھی کچھ بولی نہیں، ہاں ہلکی سی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"خیر رہنے دو، اگر میں نے تمہارے تیوروں کی پروا کر لی تو وہ بات جس کو کہنے کے لیے میں نے یہ خطرہ مول لیا ہے، وہ رہ جائے گی۔ بات تو فون پر بھی ہو جاتی مگر سامنے بیٹھ کر شاید بات کی حقیقت بھی سمجھ میں آجائے۔"

"ایسی کیا بات ہے جس کے لیے اتنی تمہید اور ایسی صورت حال بنانی پڑ گئی۔"

"اس دن میں سہیل سے یکم جنوری کے بارے میں جو کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ تم نے سنا تھا؟" اس نے موڑ موڑتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، وہ حیران تھی مگر اس کے چہرے پر جیسے ثبت تھا۔ "اور تم نے ہرگز یقین نہیں کیا تھا۔"

"حد ہو گئی اس فضول سی بات کی ہی وضاحت کرنی تھی کیا۔" اس نے قدرے برہمی سے نفی میں سر ہلاتے سوچا۔

"اور میں کہوں کہ یقین کر لو، پھر بھی نہیں کرو گی۔"

"اس بچکانہ لطیفے پر یقین کر لوں، یہی بات کہنی تھی آپ کو۔" وہ مکمل خفگی سے بولی۔

"دیکھو کبھی کبھی ان بچکانہ لطیفوں میں بھی کچھ حقیقت ہوتی ہے زارا! اور جن لوگوں کی زندگی میں ان کی حقیقت ہوتی ہے، ان کی شخصیت میں کہیں نہ کہیں جھول رہ جاتا ہے۔

میں امریکی یونیورسٹی سے ڈگری یافتہ نوجوان، یقین کرو کہ بچپن میں ایک چڑیا کے عشق میں مبتلا ہوا تھا اور اس طرح ہوا تھا کہ اس کے مرنے کا دن مجھے آج تک نہیں بھولا۔ اس دن میں اتنا رویا اور پھر اتنا بیمار ہوا کہ دنوں بستر سے نہیں اٹھ سکا، اور آج بھی جب یکم جنوری کا سورج طلوع ہوتا ہے تو میں "جل تو جلال تو" کا ورد کرنا شروع کر دیتا ہوں، سارا دن مجھ پر ایک انجانا سا خوف سوار رہتا ہے کہ آج کچھ نہ کچھ ہو گا ضرور، اور کئی بار یہ خوف درست ثابت ہوا ہے۔ کئی بار۔"

وہ لمبی شفاف سڑک پر بہت آہستگی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے میرے پاپا کا ایکسیڈنٹ اسی دن ہوا تھا۔ جس کے نتیجے میں ان کی ایک ٹانگ کٹ گئی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی فہد اسی دن فوت ہوا تھا، میری بہت اچھی دوست اور کزن جس نے میرے ساتھ ایم بی بی ایس کیا ہے، ڈاکٹر رشنا۔ کو طلاق بھی اسی دن ہوئی۔ پچھلے سال اسی دن ہمارے گھر میں چوری ہوئی تھی اور اس سال بھی میری نئی شیراڈ تمہارے گھر سے واپسی پر چوری ہو گئی تھی۔"

زارا کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ اتنا بظاہر باشعور شخص اتنا احمق بھی ہو سکتا ہے، لیکن یہ سچ ہی ہے ہر انسان پڑھا لکھا ہو کہ ان پڑھ جاہل، اس کی زندگی کا کوئی نہ کوئی احمقانہ پہلو ہوتا ضرور ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ کبھی کبھی یہ پہلو بندے کی فطری کمزوری کے سبب عیاں ہو جاتا ہے، اور کبھی کوئی اپنی اندرونی طاقت سے اس پر غالب آجاتا ہے۔

"آپ کے خیال میں اگر یکم جنوری کا سورج طلوع نہ ہوا کرے تو آپ کی زندگی میں جتنے نقصان ہوئے ہیں وہ نہ ہوتے۔"

"یہ اور ایسی بیسیوں دلیلیں میں ایک زمانے سے سنتا آرہا ہوں، لیکن محض دلیلیں کبھی کسی وہم کا علاج نہیں ہوا کرتیں۔"

نیا چورنگی سے دائیں مڑنا تھا، انہوں نے مڑنا تھا، لیکن اس نے دیکھا کہ اس نے بہت دیر کے بعد بالکل موڑ پر پہنچ کر انڈی کیٹر دیا تھا، جیسے دور تک چلتے رہنے کے ارادے کو اچانک ملتوی کر دیا ہو۔ اس نے بہر حال سکھ کا سانس لیا۔ (راستہ لمبا کرنے کے چکر میں ہی ایسا نہ ہو کہ پیچھے آنے والے اس سے پہلے گھر پہنچ جائیں۔)

"تو پھر آپ کے خیال میں اس کا کوئی علاج ہے تو ڈھنگ سے کریں، آپ تو خود ڈاکٹر ہیں۔"

"وہم کا علاج کون کر سکتا ہے بھلا۔"

"کوئی بھی ماہر نفسیات یا پھر۔" گاڑی سفید لوہے کے گیٹ کے آگے ہی پہنچ گئی تھی۔ گھر کے سامنے پہنچ کر وہ بات پوری کرنا بھول گئی۔ اس نے ظاہر ہرگز نہیں کیا تھا۔ لیکن پورا راستہ وہ خوف زدہ رہی تھی "کوئی دیکھ نہ لے" کے آسیب میں جکڑی رہی تھی، سو وہ فوراً دروازہ کھول کر دوڑ جانا چاہتی تھی۔

"یا پھر؟" اس نے پیچھے سے بہت مضبوط آواز میں اسے پکارا۔ یہ طے تھا کہ اس کا لہجہ ہمیشہ ایسا ہی مضبوط اور پُر یقین ہوا کرتا تھا کہ اگلا بندہ ہوں، ہاں کر کے ٹالنے کا مجاز نہیں ہو سکتا تھا لیکن وہ بھی زارا عمر تھی کہ "الجھی ہوئی ہو" اعصاب اس کے بھی اتنی آسانی سے اس کا ساتھ نہیں چھوڑتے تھے۔

"یا پھر کوئی محبت کرنے والا۔" اس کا دو ٹوک لہجہ بھی اتنا ہی پُر اعتماد تھا، اگلے لمحے وہ گاڑی سے نکل کر گھر کی طرف بڑھ گئی۔

* * *

"رات تم سعد کے ساتھ اکیلی گھر چلی گئیں۔ وہ رشتہ دار ضرور ہے اور ہے بھی اچھا لڑکا مگر تمہیں پتا ہے آپی ایسی باتوں پر بہت خفا ہوا کرتی ہیں۔"

"موٹا باجی! میں نے تو سہیل سے کہا تھا کہ چھوڑ آؤ۔ اور آرہا ہوں، آرہا ہوں کرتے کرتے اس نے اپنے چچا کو بھیج دیا تو میرا کیا قصور۔" یوں تھا کہ نہ اس نے کوئی ڈیٹ ماری تھی نہ کوئی غلط حرکت کی تھی۔ مگر جانے کیا تھا کہ اندر کی پشیمانی ختم نہیں ہو رہی تھی، ساری

رات تو وہ جانے کس عفریت سے چپٹی رہی' گھڑی بھر کو نہ سو سکی۔ اور ایسے میں اگر کوئی ٹوک دے تو شرمندگی چڑ میں بدل جاتی ہے۔

"میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ احتیاط اچھی چیز ہوتی ہے۔ سہیل تو بچہ ہے مگر تم کو تو عقل ہونی چاہیے نا۔ اچھا خیر اب کوشش کرنا کہ امی اور دادی جان کو ہوا نہ لگے ورنہ تمہیں تو خبر ہے' وہ قیامت سے کم کوئی معاملہ نہیں کریں گی۔" "حد ہوگئی جس کو دیکھو قیامت کو یاد کر رہا ہے آخر ایسی کیا بات کر دی ہے میں نے۔" سارا دن وہ جھنجلائی رہی۔ فون کی بجتی گھنٹی پر بھی کان بند کر لیے۔ رات آٹھ بجے تک یہ میوزک وقفے وقفے سے بجتا رہا' اور بھابھی مسلسل شکوہ کرتی رہیں۔ کہ "فون کرنے والے کو میری آواز قطعی پسند نہیں آرہی۔ بے چارا ہر بار میرے "ہیلو" کے جواب میں مایوس ہو کر فون رکھ دیتا ہے۔" وہ بغیر کوئی دلچسپی لیے' ان کے لطیفے یا طنز کو ان سنی کرتی رہی۔ ویسے بھی فون کے معاملے میں ہر شکایت اسی سے منسوب کی جاتی تھی' وہ یہ "بیچارا" کہہ کر وہ اس گمنام فون کی صنف بھی جتا چکی تھیں۔

"سنو زارا! میں نے آج تک اپنے اس وہم کو کسی کے ساتھ شیئر نہیں کیا سوائے رشنا کے' میرے گھر والے بھی اس قصے کو یاد ضرور کرتے ہیں' لیکن صرف ایک مذاق کے طور پر۔ کوئی نہیں جانتا کہ ہر نئے سال کا پہلا دن میں کس اذیت میں گزارا کرتا ہوں۔ کیا تم جاننے کے بعد سمجھ سکی ہو زارا! اس اذیت کو جس میں' میں مبتلا ہوں۔ یہ جان کر کہ تم یکم جنوری کو پیدا ہوئی تھیں۔"

کبھی آپ یقین اور بے یقینی کے دوراہے پر اس طرح کھڑے ہوئے ہیں؟ وہ سوچ رہی تھی' "کیا واقعی اتنی فضول سی بات کسی کی زندگی پر اس طرح محیط ہو سکتی ہے' اور جب اسے کوئی سرا نہ ملا تو اس نے ندا کو یاد کیا۔ کچھ لوگ اتنی طاقت رکھتے ہیں جو ہمیں وقت کے کسی ایسے لمحے میں جس میں ہم پھنس کر رہ گئے ہوں۔ اس سے نکال سکتے ہیں' گو وہ اس کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے اچانک اسے یاد آیا کہ وہ ایک ہفتے کے لیے لاہور گئی ہوئی ہے اپنے ماموں کی شادی پر۔

"اوہ خدا۔ ابھی کل صبح ہی تو اس نے فون کر کے خدا حافظ کہا تھا' اور وہ چوبیس گھنٹوں میں اتنی اہم بات بھول گئی۔" اور۔ صبح سے لے کر اب تک وہ کتنی معمولی باتیں بھول رہی تھی' دادی اماں کے لیے دودھ میں چینی ڈالنا یاد نہ رہی۔ اور امی جان کو اس نے میٹھی چائے پلا دی۔ وہ تو عرصہ ہوا چینی کی چائے کا ذائقہ ہی بھول گئی تھیں۔ جب ہی تو بول اٹھیں۔

"بیٹا! یہ آج چائے اتنی عجیب سی کیوں لگ رہی ہے۔"

"وہ امی! میں تو بھول ہی گئی۔" پھیکی چائے کا تھرمس کچن میں ہی پڑا رہ گیا تھا۔ اور تو اور دوپہر کو تو اس نے حد درجہ خطرناک غلطی کر ڈالی تھی۔ امی صبح سے کئی بار کہہ چکی تھیں کہ عظمیٰ باجی کو فون کر کے پوچھے ان کی طبیعت کیسی ہے' انہیں دو دن سے بخار آرہا تھا۔ کھانا کھا کر وہ بھابھی کے کمرے میں آگئی' نمبر ڈائل کر کے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب آئے کلینک؟" اور عظمیٰ باجی ہکا بکا پوچھ رہی ہیں۔ "تم نے کس کا نمبر ملایا ہے زارا؟" وہ ایک پل میں ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی۔

"کیا یہ ڈاکٹر توقیر کا کلینک نہیں؟" اپنی بہن سے اپنا لہجہ اور اپنا انداز چھپانا آسان نہیں تھا۔ مگر اس نے بھرپور وثوق سے انہیں غلط فہمی کا یقین دلایا۔ اور ان کے منہ سے سوری رانگ نمبر سنتے ہی ریسیور رکھ دیا۔ دوسرے ہی منٹ گھنٹی بجی۔

"تم نے ابھی کسی کو فون کیا زارا؟"

"نہیں کسی کو۔ ہم تو ابھی کھانا کھا رہے تھے۔" عظمیٰ باجی جوش میں جلدی آجاتی تھیں۔ مگر ان کا دھیان ہٹانا اور ان کو ٹالنا آسان کام تھا۔ صد شکر۔ اگر وہ یہ حرکت مونا باجی کے ساتھ کرتی تو وہ کبھی بھی اتنی آسانی سے نہ ٹلتیں۔

یہ سب کیا ہو رہا تھا اس کے ساتھ؟ وہ غور کرنے سے کترا رہی۔ ہاں آج دوسرا دن بھی گزر گیا۔ فون

کی گھنٹی نہیں بجی تھی۔ تیسرے دن اس نے مکمل حاضر دماغی کا ثبوت دیا' کبھی کبھی چوبیس گھنٹوں کا ایک دن بھی کٹھن امتحان لگتا ہے۔ کرنا یہی ہوتا ہے۔ روز مرہ کے کام اکثر ایسے کام جن کا جسم اس قدر عادی ہوتا ہے کہ کبھی کبھی دماغ کی ہدایت کے بغیر ہی قدم اٹھ پڑتے ہیں۔ ہاتھ چلنے لگتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ہرگز سچ نہیں۔ جو دماغ حکم نہ دے تو آدمی قدم چھوڑ آنکھ بھی نہ اٹھا سکے' ہاتھ چھوڑ انگلی بھی نہ ہلا سکے۔ اس لیے ہر معمولی اور ہر بڑے کام کے لیے حاضر دماغی شرط ہے۔ اور زارا عمر بہرحال اتنی ارزاں نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے کسی بھی ایسی راہ پر خود کو کھو آئے۔

"سنو میں اگر مر جاؤں تو تمہیں اندازہ" کتنے دنوں تک خبر نہ ہو' تم سے کم میرے سوئم کا زردہ اور فاتحہ تو مس کر ہی دو۔" اسے حیرت ضرور ہوا کرتی تھی کہ سعد خان اس سے کبھی شکوہ نہیں کرتا تھا' آج کر ہی ڈالا۔ اور یہ شکوہ اس کے لیے ہرگز نیا نہیں تھا۔ اس سے محبت کرنے والے تمام لوگوں کو یہی شکایت تھی' کہ سوچ تھی کہ وہ اتنی ہی سنگ دل اور مغرور ہے کہ کسی کا مرنا جینا اس کے لیے کوئی اہم بات نہ تھی۔ شاید اس لیے کہ اس نے آج تک "ہائے اللہ! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ" کہہ کر منہ پر ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ وہ چپ چاپ اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا کرتی تھی مگر اس کی کسی کو کیا خبر۔

"راز کی بات ہے مگر آپ کو بتاتے ڈرتی ہوں کہ زردہ میری پسندیدہ ترین سویٹ ڈش ہے۔"

"یار! اسی لیے تو جب میرا دل چاہتا ہے۔ میں تم سے بات کر لیتا ہوں۔ مگر کبھی کبھی بات کرنے کا دل کرتا ہے تو خواہش ہوتی ہے کہ سلسلہ دوسری طرف سے چلے۔"

"سعد! آپ کو پتا ہے۔ میں اتنی آسانی سے آپ کو فون نہیں کر سکتی۔"

"کبھی کبھی کسی کے لیے مشکل میں بھی پڑ جانا چاہیے۔"

"خود رہتا ہی مشکل میں ہو' وہ مزید مشکلات میں پڑنے کا کیسے سوچ سکتا ہے۔"

"کچھ مشکلات کو برتنے میں مزا ملتا ہے۔"

"مزے کی تاثیر بہت جلد خود بخود مٹ جاتی ہے۔ اور مشکلات کی تلخی کو خود اپنی انگلیوں کی پوروں سے کھرچ کر مٹانا پڑتا ہے' اس کا لہجہ مایوس ہوتے ہوتے اب تلخ ہو چلا تھا۔

"کیا بات ہے' آج بہت تلخ ہو رہی ہو' تمہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے کیا؟"

"جو گڑبڑ کا بانی ہو وہ خود آپ سے پوچھے کہ "کیا ہوا ہے؟ تو برداشت کی جس حد سے نپٹنا پڑتا ہے۔ اس سے بھی نپٹ کر دیکھیے۔ زندگی کا ایک جیتا ہوا پہلو نظر میں آئے گا۔"

سعد خان نے ایک بار بھی جاننے کی کوشش یا خواہش نہیں کی تھی۔ کہ اس دن کی ملاقات یا پھر اس کی باتوں نے اس پر کیا اثر کیا تھا۔ وہ تو خود جیسے اپنی الجھن کا بوجھ اس کے کندھوں پر ڈال کر ہلکا ہو گیا تھا۔

اور وہ۔ حقیقت میں تو وہ اب تک بیچ راہ میں کھڑی پیچھے چھوڑ کر آنے والے اور آگے کو جانے والے راستوں کی طوالت کو ناپنے میں لگی پڑی تھی' یوں ہوتا ہی ہے' جب بندہ آنکھ بند کر کے کسی راستے پر چل پڑے اور پھر اچانک کسی ٹھوکر سے آنکھ کھل جائے تو گھپ اندھیرا اور لمبا سفر نظر میں آجاتا ہے۔ ابتدا تو نادانی میں ہو جاتی ہے جب کوئی خوشبو دامن میں بسی ہو تو ایسے ہی بندہ تھوڑی دیر کو آنکھیں موند کر بے ہوش ہو جاتا ہے لیکن انتہا اس کی ہمیشہ ایک مسلسل اذیت کی ابتدا ہوتی ہے ٹھیک ہے جب انتہا یہی ہے تو اس سے دور کیا بھاگنا۔ ایک' دو' تین دن اسے مشکل لگا لیکن اب وہ مسلسل بجتی فون کی گھنٹیوں کو سکون سے نظر انداز کر سکتی تھی۔ یہ راستہ ہی ایسا ہے جو اس کو چھو لے اسے شدید جھٹکا لگتا ہے اور پھر ایک برقی لہر تمام عمر جسم میں سرسراتی ہی رہتی ہے۔ یوں تو تمہیں ہے؟ کچھ لوگوں کو چھو کر لگتا ہے کہ ان پر ایک بجلی سی طاری ہے ہاں مگر ساری انگلیاں ایسی میٹا نہیں

ہوتیں کہ اس کرنٹ کو محسوس کرسکیں اور سارے لوگ زارا عمر جیسے مضبوط نہیں ہوتے کہ جس راہ پر آنکھیں بند کرکے پڑ گئے ہوں۔ اسی پر ہی باہوش وحواس پیٹھ موڑ کر چلنے لگیں۔

"میں دوڑ سکتی ہوں ساری عمر پیچھے کی طرف، اس سراب سے کبھی نہ بھی نکلی تو دور ہو جاؤں گی۔" اس نے بہت وثوق سے ندا سے کہا۔ اور ندا کو بھی اس بات پہ ہرگز شک نہ تھا۔

"ٹھیک ہے لیکن تم ایک بار اس سے بات تو کرلو، صرف اس پروپوزل کا ذکر کردو اس سے، جس پر کچھ دنوں میں تمہارے گھر والے بالآخر متفق ہو جائیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ۔"

"مت الجھاؤ مجھے 'بڑھ ہو سکتا ہے۔'" کے بھنور میں دوست! میں کبھی بھی اس بات میں پہل نہیں کرسکتی۔ جس کا اظہار سعد خان کو خود پہلے کرنا چاہیے تھا جو مجھے خود نہ مانگے میں اسے ایسی پیش کش کیسے کرسکتی ہوں۔"

"وہ الجھا ہوا ہے یار! یہ ذرا سی بات شاید اس کے لیے آسانی کردے۔" اس نے چائے کا گھونٹ لینے کے لیے پیالی منہ تک لے جاتے ہوئے واپس رکھ دی۔

"وہ مرد ہو کر ذرا سی الجھن سے نہیں لڑ سکتا تو میں کیوں اس کی خاطر اپنی زندگی میں مزید الجھنیں پیدا کروں۔"

عظمٰی باجی کے پڑوس میں رہنے والے کرنل صاحب بہت دنوں سے اپنے صاحبزادے کے لیے عظمٰی باجی اور شکیل بھائی سے کہہ رہے تھے اور اب باقاعدہ پروپوزل بھیجا تھا۔ وہ سن رہی تھی، دیکھ رہی تھی اور جو کچھ ہو رہا تھا اسے بھی سمجھ رہی تھی لیکن اسے پتا تھا۔ وہ کچھ کرے گی نہیں۔ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ تکیے میں منہ دے کر رونا اسے نہیں آتا تھا۔ اور اپنی مشکل کسی اور کو سمجھانا اس کا شیوہ نہیں تھا، کسی کسی پر تو آدمی کو مان ہوتا ہے کہ وہ اس کی مشکل سمجھے گا۔ اگر وہی نہ سمجھے تو پانی ڈالو کہ مٹی وہ وہیں کھڑی رہی ویسے ہی۔

☼ ☼ ☼

"زارا خالہ پلیز! امی کو منائیں۔ مجھے نائلہ کی شادی میں ایک دن اس کے ہاں رہنے کی اجازت دے دیں۔"

روبی کا حلقہ احباب وسیع تھا اور آنے جانے کے معاملے میں اجازت دینے کے لیے بڑی آپا کا نظریہ تنگ۔ وہ فون پر بڑی آپا کو منا رہی تھی اور اندر کمرے سے عظمٰی باجی کی آواز اس کے کانوں میں با آسانی پڑ رہی تھی۔

"آپو جان، زارا سے پوچھ کر کیا کرنا ہے۔ آپ اپنی مرضی بتائیں، اس کی بھلا کیا رائے ہوگی۔ وہ بہرحال ہم سے چھوٹی ہے۔ ہماری ہی بات سنے گی۔"

"میں کہہ رہی ہوں ناں آپا! آپ میری بات تو کبھی نہیں ٹالتیں۔ جانے دیں اسے، نائلہ بہت اچھی لڑکی ہے اور اس کے گھر والے بھی بڑے ڈیسنٹ لوگ ہیں، میں مل چکی ہوں ان سے۔" پیشانی پر آئے بالوں کو انگلیوں سے پیچھے کرتے وہ مسکراتے ہوئے بڑی آپا سے کہہ رہی [illegible]

زارا عمر کی رائے مقدم تھی اگر وہ کسی کو اچھا کہہ رہی تھی تو وہ بلا مبالغہ اچھا ہوگا۔ بڑی آپا نے اجازت دے دی۔ اور اس کی یہی رائے، جو اس کے سارے چاہنے والوں کے لیے بڑی محترم ومقدم تھی، اس کی اپنی زندگی کے اہم ترین موڑ پر اس قابل بھی نہ ٹھہری کہ کوئی رک کر اس پر ایک نگاہ غلط انداز ہی ڈال لے، اس نے بھی محسوس کرنا چھوڑ دیا۔

"چندا! تم کسی سے کچھ کہہ کر تو دیکھو۔ سارا آپی سے تو۔ تمہاری بڑی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔"

"جس معاملے میں مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہ جائے میں اس میں بے کار میں ٹانگ کیوں اڑاؤں۔"

وہ آج بہت دنوں بعد ندا کے اصرار پر لائبریری آئی تھی۔ گریجویشن تک وہ دونوں اکثر یہاں پڑھنے کے لیے آیا کرتی تھیں۔

"چاہے وہ تمہاری زندگی کا معاملہ ہی کیوں نہ ہو؟

اس معاملے میں تم صرف ٹانگ نہیں، پوری کی پوری اڑ سکتی ہو۔" لائبریری کی سیڑھیوں پر گود میں دو موٹی موٹی کتابیں رکھے بیٹھی ندا کو اس نے پورا گھوم کر سر سے پیر تک دیکھا۔

"آئی ڈونٹ بلیو اٹ۔ یہ تم کہہ رہی ہو ندا۔ اتنا غلط مشورہ! تم جو مجھے کئی دنوں سے ہوش دلانے کو ہزاروں دلیلیں دیتی آرہی ہو۔ اب ہوش میں آئی ہوں تو کہہ رہی ہو کہ اڑ جاؤں۔ مگر کس بات پر اڑ جاؤں کس برتے پر اڑ جاؤں اور کس کے لیے؟"

"تمہارے خیال میں تم ہوش میں آگئی ہو؟ اور میرا خیال ہے کہ یہ جو تھوڑے بہت تمہارے حواس تمہارے ساتھ ہیں ناں، وہ بھی چند دنوں میں تمہارا ساتھ چھوڑنے والے ہیں۔ بھلا بتاؤ، تمہیں یہ بھی خبر نہیں کہ دو دن ہوئے سعد خان کا پروپوزل تمہارے گھر پہنچ چکا ہے۔"

"نہیں۔ کب، کیسے؟ مجھے تو کسی نے بتایا ہی نہیں۔" وہ تو اس طرف سے اس کا ہر دیا بجھا کر مکمل اندھیرے میں تھی۔ اور ندا کہہ رہی کہ چراغ نے خود چل کر اس کے در پر دستک دی ہے۔ وہ واقعی ہوش میں نہیں تھی۔

"تم پتا کرنے کی کوشش کرو تو کوئی تمہیں بتائے بھی۔ جبکہ وہ تمہیں بتانے کی کوشش میں باقاعدہ ٹیلیفون کے ڈائل پر اپنی انگلیاں گھستا رہتا ہے مگر تم نے سننا ہی چھوڑ دیا ہے۔" اسے لگ رہا تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا، مگر بہرحال کچھ بھی سمجھنے کی کوشش وہ ندا کے سامنے ہی کرسکتی تھی۔

"ویسے بائے دی وے، تم سعد خان کے معاملے میں sincere (مخلص) کیسے ہوگئی ہو۔" پہلی بات تو یہی تھی، جو اس کی عقل میں نہیں آرہی تھی۔

"زارا عمر! تم جس معاملے میں ہوش وحواس سے جاؤ میں اس میں مخلص کیسے نہ ہوں ویسے سعد خان نے مجھے فون کیا تھا اور رشنا جو اس کی کزن اور واقعی اچھی دوست بھی ہے اس سے بھی میری اچھی خاصی بات ہو چکی ہے اور بقول اس کے کچھ الجھنیں ایسی ہوتی ہیں، جن میں عورت مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ وہم بھی ایک ایسی ہی بیماری ہے، اور تم وہ واحد شخصیت ہو جس کے حصول کے لیے وہ اپنی اس الجھن سے لڑ رہا ہے مگر ابھی پھنسا ہوا ہے دلدل میں۔ تمہیں ہاتھ بڑھا کر اسے کھینچنا ہوگا۔" وہ ندا کی ایک ایک بات تو بہت غور سے سن رہی تھی۔ یا بالکل نہیں سن رہی تھی۔ مگر اس کے چہرے کے خطرناک تیور دیکھ کر اسے بولتے بولتے رکنا پڑا۔

"تم نے اس سے ذکر کیا تھا کرنل صاحب کے بیٹے کا؟ اور سعد خان نے تمہیں فون نہیں کیا، بلکہ تم نے اسے۔" ابھی چند لمحوں پہلے اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ مگر اب جو کچھ آرہا تھا بہت ناقابل یقین تھا۔

"ہاں۔ میں نے اسے فون کیا تھا مگر۔"

"ندا! میں تمہیں اس بات کے لیے کبھی بھی معاف نہیں کروں گی۔ تم نے میرا مان توڑا ہے۔" وہ بیگ کاندھے پر ڈال کر ایک جھٹکے سے اٹھ گئی اور وہ دو، تین تین قدم ایک ساتھ پھلانگنے لگی۔

"زارا! سنو تو۔" وہ پیچھے سے آوازیں دے رہی تھی مگر جانتی تھی کہ اگر زارا نہ سننا چاہے تو قیامت کا شور بھی اٹھے تو اس کے کان پر جوں نہ رینگے گی۔ اس کے پیچھے دوڑنا بھی بے سود تھا۔ وہ سامنے سے گزرتی بس کو ہاتھ دے کر اس میں سوار ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج پھر سارے بہن بھائی شام کی چائے کے بعد ابو کے کمرے میں جمع تھے۔

"ٹھیک ہے، ابو آپ کے رشتے پر بھی غور کرنا چاہتے ہیں تو میں شیخ کرنل صاحب کی بیگم سے کہہ دوں کی وہ ایک ہفتہ ٹھہر جائیں، لیکن بہرحال انکار تو ہمیں انہیں کرنا نہیں ہے۔" جانے آج اس نے کان کھڑے کرلیے تھے یا آوازیں خود ہی اس کے تعاقب میں تھیں۔ باہر لان میں ٹہلتے ہوئے پچھلی کھڑکی سے سب باتیں اس کے کان میں پڑ رہی تھیں۔ عظمٰی باجی حسب عادت سب سے پہلے جوش میں آگئی تھیں۔

"خیر انکار' اقرار کا فیصلہ تو ابھی ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔ سعد خان بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے کہ اسے آسانی سے نظر انداز کیا جاسکے۔ ابو جی آپ مل تو چکے ہیں اس سے۔"

وقار بھائی کا لہجہ ہمیشہ بارعب ہوا کرتا تھا' بات کرتے تو لگتا فیصلہ دے رہے ہیں' لیکن وہ فیصلے اتنی آسانی سے نہیں دیا کرتے تھے۔ البتہ لوگوں سے ان کا فیصلہ اگلوانے میں اچھے خاصے ماہر تھے۔ وہ گھنٹہ بھر مسلسل یہ بحث سنتی رہی مگر نتیجہ کیا ہوا' کوئی سرا تک ہاتھ نہ لگا۔ بحث وہیں تھی۔ جہاں سے چلی تھی' اور اسے احساس ہو رہا تھا کہ جتنا چلے گی' الجھتی جائے گی۔ اور سرا ان مباحث کا بھی نہیں مل رہا تھا جو اس کے اندر چل رہے تھے' وہ سوچنے بیٹھتی تو خیالات کی یلغار اسے بہت حد تک بے حال کر ڈالتی۔ اچھا خاصا اس نے سب چھوڑ چھاڑ (حتیٰ کہ احساس بھی) بیٹھ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ ندا کی دوستانہ ہمدردی نے اسے پھر کھولا کر رکھ دیا اور چوبیس گھنٹے کے بعد بھی اس کے غصے کا وہی عالم تھا۔ جب وہ اس کے ہاں آئی۔ ایک بار اس کا دل چاہا منہ پھیر کر چلی جائے لیکن وہ اس کے گھر آئی تھی' یہاں اس سے منہ پھیر کر وہ کہاں جاسکتی تھی۔

"اگر کل تم وحشت اور سکون سے بیٹھ کر میری بات سن لیتیں تو یہ جو پورا دن جل بھن کر کوئلہ ہوگئی ہو' اس کی نوبت نہ آتی۔"

اس کی امی اور دادی جان سے سلام دعا کر کے' بھابھی سے خیریت پوچھ کر وہ کتنی دیر تک اس کے کمرے میں بیٹھی دادی جان کے پسندیدہ موضوعات یعنی وہی "زمانہ خراب" ہے' اور نئی نسل کی بے راہ روی اور ہماری کون سنتا ہے' کو بہت دل لگا کر سنتی رہی تھی۔ پہلے کتنی دیر تک وہ الماری میں سر دیے کچھ کر لینے کی ناکام کوشش کرتی رہی اور پھر باتھ روم میں گھسی پانی سے کھیلنے لگی تھی۔

"ٹھنڈا ٹھنڈا لگ رہا ہوگا۔ ہے نا۔" بالآخر اس نے اندر جھانک کر اسے ٹوکا تھا۔ بہت غصے میں (کچھ نہ کرتا اور مصروف نظر آتا اس کا پیرپور تھا۔ لامحالہ جب وہ اس کے لیے چائے بنانے کچن میں گھسی تو ندا نے کمرہ ہی ڈالا وہ ہری پتی کھولتی چائے کو دیکھتی رہی۔

"ساری دنیا میں تم شور مچاتی پھرتی ہو کہ اعتماد ہر رشتے کی بنیاد ہے مگر تم خود ایک فیصد بھی اس اصول پر پوری نہیں اترتیں۔ غصہ مجھے تم پر آنا چاہیے۔ تم نے کس طرح سوچا' اور مسلسل سوچے جارہی ہو کہ میں ندا علی یعنی تمہاری دوست کوئی ایسی بات کر سکتی ہوں۔ جو تمہارے وقار کو مجروح کرے۔ مجھے کوئی شوق نہیں ہے' شیو بڑھائے ہیرو اور روتی سسکتی ہیروئین کو ملوانے کا۔ آئی سمجھ۔ میں نے تو فون کر کے تمہارے ہیرو صاحب سے صرف اتنا کہا تھا۔ کہ ڈاکٹر صاحب اگر آپ کا جذبہ اتنا طاقتور نہیں ہے کہ آپ کی ایک الجھن کو قابو میں کر سکے تو آپ اسے اپنے دل کے اندر کہیں دفن کر کے رکھ دیں۔ اور میری دوست کو پریشان کرنا چھوڑ دیں۔" چائے کا کپ اس کے آگے رکھ کر وہ خود کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ بہت دیر بعد وہ کچھ بول سکی۔

"آئی ایم سوری ندا! تمہیں پتا ہے' میرا دماغ کتنا الجھا ہوا ہے۔"

"نو سوری! تمہیں بھی پتا ہے مجھے اس لفظ سے چڑ ہے۔ ہاں جب تمہارا دماغ ذرا سلجھ جائے تو غور کرنا کہ اگر میں تم سے کہوں کہ تم نے میرا مان توڑا ہے تو۔"

فون کی گھنٹی اسی وقت بجی۔ اس نے بہت دنوں بعد ویسی ہی احتیاط سمیت فون اٹھایا۔

"دیکھو بغیر قصور کے کسی کو سزا دینا زیادتی کی انتہا ہے۔"

"آپ کو کوئی ضروری بات کہنی ہے کیا۔؟"

"اس وقت تو تم بولو' اور میں سنتا ہوں۔ یہی اہم ترین بات ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر فون رکھ رہی ہوں۔"

"زارا! کیا کسی قسم کی کوئی آس بھی نہیں دلاؤ گی؟"

"بھلا میرے ہاتھ میں کیا ہے جو آس اور امید کی بات کروں۔"

"پتا نہیں یہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ صرف تم ہی میری الجھن کو مجھ سے بہتر طریقے سے سمجھ سکتی ہو۔ اور یہ بھی میرا ہی خیال ہے اب اس کا حل صرف تمہارے ہاتھ میں ہے۔" وہ اس بات پر بھی کھل کر ہنسنا چاہ رہی تھی مگر اگلی طرف سے فون بند ہو چکا تھا۔ اس نے سر اٹھایا تو ندا سامنے ہی بیٹھی تھی۔

"اس نے کل رات رشنا سے کہا تھا کہ اس سلسلے کے اچھے انجام کی اسے ہرگز توقع نہیں مگر میں نے رشنا سے کہا کہ اس کا خیال بالکل غلط ہے۔ تم بتاؤ کون ٹھیک ہے؟" اس نے حد درجہ مضحکہ خیز قہقہہ لگا کر اسے دیکھا۔

"میں جو نہ تین میں۔ نہ تیرہ میں۔ میں بھلا کیا بتا سکتی ہوں۔" وہ واقعی کچھ نہ بتا سکتی تھی' ہر روز محفل جمتی' ہر روز مذاکرات ہوتے "آج اس کو فون کر کے اس سے پوچھا جارہا ہے' کل فلاں کے گھر جا کر اس سے پوچھ لینے کا مشورہ ابو جی' وقار بھائی کو دے رہے ہیں' حتیٰ کہ جمعہ کی رات بڑے ماموں' خالہ' تایا' تائی سب ان کے گھر کے ٹی وی لاؤنج میں موجود گریٹھ گئے' ضرورت تھی ایک عدد "رائے" کی سوجو' جو اس قابل سمجھا گیا' اسے بلا لیا گیا۔ مگر نتیجہ۔

"دن پر دن گزر رہے ہیں عمر اتم سے ایک ذرا سا فیصلہ نہیں ہو چکتا۔" دادی جان نے ٹوک ہی دیا آج سارے بہن بھائی' ابو' امی سمیت اس کے کمرے میں دادی جان کے گرد ڈیرا ڈالے بیٹھے ہوئے تھے۔

"امی جان! آپ ذرا سا کہہ رہی ہیں' مجھے تو دن سوجھ رہا ہے۔ نہ رات' ایک ڈاکٹر ہے تو دوسرا انجینئر۔ اس کا اعلیٰ خاندان تو اس کا بہترین ہے۔ یہ خوبرو تو وہ اسمارٹ' اس کو باکردار کہا جارہا ہے تو اس کو شریف۔ اب کیا کروں؟

"میرا تو خیال ہے ابو جی! سکہ اچھال لیتے ہیں جس کی ہوگی وہ جیتے گا۔" وقار بھائی نے کچھ جھنجھلا کر کہا تو ابو جی اور دادی جان سمیت سب ہنسنے لگے۔

اور اپنے کمرے کی کھڑکی کے نیچے لان کے دائیں طرف بیٹھی زارا عمر کا دل چاہا کہ گھٹنوں میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے' اٹھ اٹھ کر سارے خاندان سے سر ٹکرا آئے۔ کسی ایک کو بھی اس کا خیال نہیں آرہا ہے۔ اتنے لوگوں میں کوئی بھی نہیں سوچ رہا کہ پیچھے دیوار سے لگی بیٹھی زارا عمر ایک عاقل و بالغ اور پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ کم از کم اقرار یا انکار میں گردن ہلانے کا شعور ضرور رکھتی ہے۔ اور شریعت میں بھی کہیں نہیں لکھا ہوا کہ یوں اس کی زندگی کا سلسلہ چلے اور اسے دیوار کے پیچھے بیٹھا چھوڑ دیا جائے۔ کیا کسی کو اس کا واقعی خیال نہیں آیا؟

بڑی آپا جو اپنی بیٹیوں کے رشتوں کے لیے پہلے اس سے مشورہ لیتیں' عظمیٰ باجی جو اس کے ہر معاملے میں اپنے آپ کو حد درجہ حساس ثابت کرتیں' موٹا باجی جو شاید اپنے دیور کے دل کے حال سے واقف تھیں۔ سارہ آپی جنہیں گھر میں اس کا بہترین ہمدرد و رازداں ہونے کا دعویٰ تھا' اور وقار بھائی اور بھابھی جن کے بیشتر مسئلے اور الجھنیں اس نے ان کے بغیر کسی خاموشی سے شیئر کیے تھے' اور نہ امی' نہ ابو کو نہ دادی جان ان لوگوں کو بھی نہیں۔ ہاں کسی کو احساس نہیں اس کی ذات کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس کی بھی کوئی مرضی ہو سکتی ہے۔ اگر (تالی) پڑھی گئی ہے تو اس کا ووٹ بھی کوئی قانونی حیثیت رکھتا ہے۔

"سکہ اچھالیں گے مگر زارا عمر کا منہ کھول کر نہیں دیکھیں گے کہ اس میں بھی زبان ہے' اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر نہیں محسوس کریں گے کہ یہ بھی دھڑکتا ہے۔" وہ ریسیور کان سے لگائے کمرے کے کنارے کی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔

"تو تم کیوں منہ کھول کے اپنی زبان کو زحمت کلام نہیں دے دیتیں۔" ندا اس سارے سلسلے سے حد درجہ بیزار ہوگئی تھی۔

"بھئی۔ تم دیوار کے پیچھے سر جھکائے بیٹھی رہو گی تو کسی کو کیا خاک نظر آؤ گی۔ سامنے آؤ' اور لوگوں کو اپنے ہونے کا احساس دلاؤ۔" وہ روز اس کو ایک ہی مشورہ دے رہی تھی۔

"کیا کروں، لوگوں کے کندھے پکڑ کر ان سے کہوں کہ سنو میں بھی تو ہوں۔"

"ہاں تو کیا حرج ہے اگر اسی طرح اپنا آپ منوا لو۔"

"یہ بھی ممکن نہیں کہ میں اس طرح اپنا آپ ان لوگوں کو محسوس کروادوں جنہیں میں اپنی ذات کا حصہ سمجھتی ہوں۔"

"اور آج اگر اس ذرا سی بات کو تم نے ناک کا مسئلہ بنالیا تو ساری عمر خود اپنے آپ کو محسوس کرنے سے بھی کتراتی رہو گی۔ ایک بار زارا عمر! ایک بار چند لفظ چند جملے بول جاؤ۔"

کسی بندے کے سامنے، جس پر تمہیں بہت مان بھی ہو اور جس کے بارے میں تمہارا خیال ہو کہ وہ تمہارا بھرم بھی قائم رکھے گا۔ وہ کیا کہے کہ مان تو اسے سب پر تھا، بھرم تو اس نے بھی ہمیشہ ہر کسی کا رکھا تھا مگر۔

"دیکھو، سعد خان اگر ناکام ہوا تو مر تو نہیں جائے گا مگر ابھی یوں ہے کہ اس کی زندگی میں ایک الجھن ہے، پھر یہ الجھن اس کی زندگی ہو گی۔" ندا نے فون رکھ دیا تھا مگر وہ کتنی دیر تک ریسیور تھامے بیٹھی رہی تھی۔ وہ سب کی باتیں سمجھتی ہے محسوس کر سکتی ہے، اور اس کی ایک ذرا سی بات سے صرف یہ تمنا تھی کہ بن کہے بنا ظاہر ہوئے اس کی بات رہ جائے۔ ایسا ہوتا ہے ناں جب آپ الجھ الجھ کر پاگل ہو رہے ہوں۔ اور ایک ہی چار دیواری میں رہنے والے آپ سے انچ دو انچ کے فاصلے پر چلنے والے آپ کے برابر بیٹھے ہوئے، آپ سے باتیں کرتے ہوئے، آپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے۔ ذرہ بھر آپ کی کیفیت کو محسوس نہ کر سکیں۔

ندا کی باتوں کا اس پر اثر تھا۔ سو آج سارا دن وہ اسی جستجو میں رہی کہ ایک ایسے جملے کو ترتیب دے لے۔ چند لفظ ایسے جوڑ کر کسی سے کہہ دے، دادی جان کو کھانا دیتے ہوئے وہ کئی بیکار سی باتیں بول گئی۔ مگر ان سے کچھ کہنا۔

"میں تو پہلے ہی کہتی تھی، یہ فلمیں وی سی آر دیکھ دیکھ کر آج کی نسل کے دیدوں کا پانی بالکل مر گیا ہے۔ لو بھلا لڑکیاں بھی کبھی اپنے بیاہ شادی کے معاملوں میں یوں بولتی ہیں۔" وہ ٹھہر ٹھہر کے ذرا اپنے ذہن کو جھٹکنے لگی۔ امی جان کو درزی کے پاس سے آئے کپڑوں کی فہرست بتاتے ہوئے اور بھابھی بیان سے خالہ کے گھر ہونے والی دعوت کی روداد سنتے ہوئے بھی اس نے کئی بار رک کر غور کیا۔

رات کے کھانے کے لیے روٹیاں ڈالتے ہوئے بھی اس نے سوچا آج وہ دو چار روٹیاں زیادہ ڈال لے۔ اور بھابھی تیار گرم گرم روٹیاں دیکھ کر یقیناً "نہایت خوشگوار حیرت سے پوچھیں گی۔

"کیا بات ہے، زارا! خیر ہے یہ عنایت۔" اور وہ کہہ دے گی۔ کیا کہہ دے گی؟ تف ہے اس پر اور اس کی سوچ پر۔ اس نے جھنجھلا کر آج روٹیاں ہی نہیں ڈالیں۔ دادی جان آج ڈبل روٹی کھا لیں گی، اور امی، ابو چاول۔ اور وہ خود غصہ، یہ ناممکن ہے۔ وہ بھی کسی سے ایسی کوئی بات نہیں کہہ سکتی۔ ابو کو چائے بھی اس نے آج حتی المقدور خوالت کرکے دی تھی، اور اب سر جھکائے کمرے سے باہر جارہی تھی۔

"بالکل [illegible] خان!" وہ دروازے تک پہنچ گئی تھی۔

"کیا بات ہے زارا بیٹا! مجھے لگ رہا ہے تم کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔" ابو جان ہمیشہ اسے اس دروازے پر چونکاتے تھے۔

"جی وہ کچھ نہیں۔ مگر وہ۔" اگر ابھی اس نے اس ننھی سی کرن کو اپنی "نہیں" سے بجھا دیا تو آگے یقیناً اندھیرا ہی ہے۔

"وہ ابو! مجھے اصل میں ڈاکٹرز بہت اچھے لگتے ہیں۔" "او میرے خدا" زندگی کا مشکل ترین لمحہ، اور مشکل ترین جملہ، وہ اپنے بستر پر لیٹ کر کتنی دیر تک یقین کرتی رہی کہ کیا واقعی اس نے کہہ دیا۔

☆ ☆ ☆

"آج یکم جنوری ہے۔" نرم بستر پر کروٹ بدلتے ہوئے چڑیوں کی چہچہاہٹ سے سعد خان کی آنکھ کھل

گئی اور روشنی کی پہلی کرن کے ساتھ یہ احساس، اس کے ذہن میں گردش کر گیا۔ اس کی تمام حسیات بیدار ہو چکی تھیں اور اب نیند اسے یقیناً دوبارہ مدہوش نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے پھر بھی چادر تان کر آنکھیں بند کر لیں۔ کاش وہ آج کی تاریخ میں بیدار نہ ہو۔ سویا رہے اور یہ دن سرک جائے۔ وہ ایک ذمہ دار شخص، معاشرے کا اہم فرد ڈاکٹر سعد خان اس وقت اپنے آپ کو دنیا کا کمزور ترین شخص سمجھ رہا تھا۔ اور اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ پورے چھ فٹ کا مرد اس وقت کسی کی گود میں سر رکھ کر کہے کہ "سنو مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" بے شک اپنے آپ سے لڑنا اور پھر اپنی سوچوں پر فتح پالینا بہت بڑی کامیابی ہے۔ وہ بستر چھوڑ کر اٹھ گیا۔

نماز پڑھ کر اس نے کپڑے تبدیل کیے۔ جاگرز پہنے اور جاگنگ کے لیے نکل گیا۔ صبح دم بہت حد تک ویران سڑک پر دوڑتے ہوئے اس نے اپنے اندر بے پناہ تازگی جذب کرنے کی کوشش کی۔ یہ اونچا درخت ابھی اس کے اوپر بھی گر سکتا ہے۔ اس کا ذہن اس کے ساتھ دوڑ رہا تھا۔ وہ بہت دور تک گیا اور پلٹ کر آتے ہوئے پہلا خیال [illegible] گیٹ تک آکر وہ پھر لرزا۔ سب خیریت ہو۔ کلینک جاتے ہوئے بیس منٹ کی ڈرائیو میں وہ بیسیوں بار ٹھٹکا۔ اب یہ ٹرک اس کو روندتا ہوا گزر جائے گا۔ یا یہ گاڑی ضرور اس کی گاڑی سے ٹکرا جائے گی۔ مگر روز کے وقت پر وہ کلینک میں موجود تھا۔ ہر مریض کی نبض ٹٹولتے ہوئے اس کے اپنے دل کی دھڑکن بے قابو ہوئی۔ ہر فون کی گھنٹی پر اس نے "خدا خیر کرے" کا ورد کیا۔ اور شام کو ہاتھوں میں سر لیے وہ چائے کی پیالی سے اٹھتے، بنتے بگڑتے بگولوں کو دیر تک تکتا رہا۔ اور اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔

"تم ابھی تیار ہو کر میرے گھر پہنچو۔ فوراً"۔

مونا بھابی سے "کیوں" پوچھنا بیکار تھا۔ وہ وضاحتیں سننے اور سنانے کی عادی نہ تھیں۔ اگلے دس منٹ بعد پھر اس کی سیر او سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اور اس کے واہمے اس کے پیچھے۔ اچانک ہی گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی، اسے لگا اس کی گاڑی کے پرخچے اڑ گئے ہیں۔ وہم کی آخر حد یہ ہے کہ اس کو بالآخر حقیقت جان لیا جائے۔ مونا بھابی کے گھر کے آگے شدید دباؤ میں اس کے پاؤں بریک پر پڑے تھے، سو صرف بریک چرچرائے تھے اور اس کے دماغ میں دھماکے ہوگئے تھے، بے شک آج کے دن میں اس نے جتنے وہم کیے تھے، شاید آج تک نہیں کیے تھے۔ مگر اس کا کوئی وہم درست ثابت نہیں ہوا تھا حالانکہ یہ بھی طے ہے کہ آدمی مستقل ایک ہی بات سوچتا رہے تو وہ ہو کر رہتی ہے۔

اگلے گھنٹے وہ اپنے والدین، بھائیوں، بہنوں اور بھابیوں کے ہمراہ زارا عمر کے خوبصورت لان میں بیٹھا بہت سے ہنستے مسکراتے چہروں کو دیکھتا ایک پر اٹک گیا تھا۔

کھلتے گلابی سوٹ میں بڑے سے نشو کے دوپٹے کو سر پر سلیقے سے جمائے وہ روشنی کا ہالہ بنی اس کے عین سامنے والے صوفے پر بیٹھی مسکرا رہی تھی۔ نازک سی انگوٹھی اس کے ہاتھ میں ڈالنے سے پہلے اس نے سرگوشی کی۔

"ہیپی برتھ ڈے۔" اور پھر اس لمحے انگوٹھی پہناتے اس کا ہاتھ پھر لرز رہا تھا۔

"ہاں یہ واقعی مبارک دن ہے۔" اس کی آنکھوں کی چمک اس کے واہموں کو جلا ڈالنے میں واقعی تیز تھی۔ مبارک سلامت کے شور کے بعد سب ادھر ادھر مگن ہو گئے۔

"میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھے ابھی آپ سوچ رہے تھے کہ اسی لمحے آپ کے دل کی دھڑکن رک بھی سکتی ہے؟"

"ہاں اور پھر میں نے سوچا اگر اس لمحے رک بھی جائے تو کیا۔"

"مگر آج آپ کا کوئی وہم درست ثابت نہیں ہو سکا کہ آج سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی امید کی ایک کرن، اس کا ایک رہا بھی تمام دن آپ کے گرد روشن رہا تھا۔"

"یقیناً" زارا عمر! محبت کر [illegible] رہا اعتماد ہی تو میرے واہمے ختم کر سکتا تھا۔" وہ سوچ کر مسکرا دیا۔

☆

تحسین اختر

تیری آنکھ کے آنسو

"السلام علیکم!" وہ دونوں کالج جانے کے لیے گھر سے نکلی تھیں۔ گلی سے گزرتے ہوئے اوصاف ان کے قریب سے گزرا تھا اور ان دونوں کو دیکھتے ہی نگاہیں جھکائے سلام کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔

"وعلیکم السلام!" فرازیہ نے زیرِ لب سلام کا جواب دیا تھا جبکہ مازیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"تم اپنی عادت سے باز نہیں آ سکتیں۔ دانت نکالنے کے بجائے بے چارے کے سلام کا جواب دے دیتیں تو نامۂ اعمال میں کچھ نیکیوں کا اضافہ ہی ہو جاتا، کمی نہ ہوتی، لیکن تم تو......" فرازیہ نے چلتے چلتے مازیہ کو اچھی خاصی جھاڑ پلا دی تھی۔

فرازیہ اور مازیہ جڑواں بہنیں تھیں لیکن ان کی عادت، مزاج اور خیالات میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

"مجھے تو آرام سے ڈانٹ دیا ہے لیکن اس کا اسٹائل ملاحظہ نہیں کیا۔" مازیہ بمشکل اپنی ہنسی پر قابو پا کر بولی تھی۔

"کیوں کیا ہوا ہے اس کے اسٹائل کو؟"

"یہ خالہ فراست کے اکلوتے فرزند ارجمند اوصاف جاوید صاحب کچھ زیادہ ہی دقیانوسی قسم کے اور مولوی ٹائپ نہیں ہیں؟ اب دیکھو نا یار! آج کل کے لڑکوں کا یہ اسٹائل کہاں ہوتا ہے لیکن اسے تو دیکھ کر لگتا ہے کہ بے چارہ ابھی تک اٹھارہویں صدی میں جی رہا ہے۔ ابھی اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کبھی ہمیں دیکھ کر اس طرح گھر میں نہ گھستا جیسے دو پیاری اور خوب صورت لڑکیوں کی بجائے گلی میں کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔"

مازیہ نے دوپٹہ کھینچ کر مزید چہرے کے اوپر ڈالا تھا۔ اس سے پردہ کرنا مقصود نہیں تھا بلکہ دھوپ کی شدت سے بچنے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔

وہ حسین تھی اور اسے اپنے حسن کو بچا کر رکھنے کے تمام گر بھی آتے تھے۔ وہ ہمیشہ اوصاف جاوید کا جی بھر کر مذاق اڑاتی تھی اور فرازیہ ہمیشہ اسے ڈانٹ دیتی تھی۔

"شرم کرو کچھ۔ مجھے تو لگتا ہے وہ تمہیں بے حد پسند کرتا ہے بلکہ تم سے شدید محبت کرتا ہے۔" فرازیہ نے اسے چڑانے کے لیے اب وہ بات چھیڑی تھی جو مازیہ عارف کا بلڈ پریشر منٹوں میں ہائی کر دیتی تھی حالانکہ یہ بات فرازیہ کو سو فیصد سچ لگتی تھی۔

"کیا؟" وہ رک کر یوں چیخی تھی کہ اردگرد سے گزرنے والے بھی رک کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

"کیا بدتمیزی ہے چلو تو۔" فرازیہ نے سٹپٹا کر اس کا بازو کھینچا تھا۔

"تم ایسی بات کرتی ہی کیوں ہو۔ تمہیں معلوم ہے نا کہ میں اس شخص کو قطعی پسند نہیں کرتی اور تم پھر بھی میرا پیئر اس کے ساتھ بنانے کی کوشش کرتی ہو۔ فری! آخری بار کہہ رہی ہوں آئندہ تم نے ایسی الٹی سیدھی بات کی تو میں تم سے پکی پکی ناراض ہو جاؤں گی۔"

"یہ لو۔۔۔ میری توبہ جو آئندہ تم سے کچھ کہا۔ تم تو یہ بھی خیال نہیں کرتی ہو کہ یہ ہمارا گھر نہیں شہری ایک سڑک ہے جس پر لڑکیوں کا یوں چلانا معیوب

سمجھا جاتا ہے۔" وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولی تھی۔

"اور تم خیال کرتی ہو کہ کون سی بات کہنے والی ہے اور کون سی نہیں۔" وہ دونوں ہمیشہ کی طرح لڑ پڑی تھیں۔

بیس منٹ کی پیدل مسافت پر ان کا کالج تھا جس میں سے دس منٹ گزر چکے تھے۔ فرازیہ کو یقین تھا کہ باقی دس منٹ کا فاصلہ بھی لڑائی میں کٹے گا اس لیے وہ اس سے دو قدم آگے ہو کر چلنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"چائے ملے گی!" سب سے پہلے مانوس اور مسحور کن خوشبو کا جھونکا چائے بناتی مازیہ کے نتھنوں سے ٹکرایا تھا اور پھر اس نے شائستہ آواز میں یہ الفاظ سنے تھے۔

"کیوں نہیں! بس ابھی لائی' آپ باہر جا کر بیٹھیں۔" کچن کے دروازے میں ایستادہ ذیشان کو دیکھ کر وہ یک دم فریش ہو گئی تھی۔

یہ شخص اس کی زندگی میں ایسا ہی تازہ ہوا کا جھونکا تھا جس نے اس کے روز و شب کو معطر کر رکھا تھا۔

"یہاں کھڑا اچھا نہیں لگ رہا ہوں کیا۔" وہ دو قدم چل کر اور آگے آیا تھا۔

"در اصل میں یہاں گرمی بہت ہے نا۔"

کیتلی میں دودھ انڈیلتے ہوئے اس کے ہاتھ اور لہجہ دونوں لرز رہے تھے۔ وجہ ذیشان ہی تھا جو اب اس کے بالکل پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔

"تم بھی گرمی میں ہی کھڑی ہو۔ جب تم جیسی نازک لڑکی گرمی کی شدت کا مقابلہ کر سکتی ہے تو کیا میں اتنا مضبوط آدمی اسے نہیں سہہ سکتا۔"

"میں تو چائے بنا رہی ہوں اس لیے اس گرمی کو برداشت کر رہی ہوں اور آپ!"

"اور میں اس لیے اسے برداشت کر رہا ہوں کہ مازیہ عارف بھی اسی گرمی میں کھڑی ہے اور میں مازیہ عارف سے الگ تو نہیں ہوں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر

شیلف پر پڑا بھاپ اڑاتا چائے کا مگ اٹھایا تھا اور کچن سے باہر آ گیا تھا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے باہر آئی تھی لیکن اب قدم رکھ کہیں رہی تھی اور پڑ کہیں رہے تھے۔

"میں مازیہ عارف سے الگ... تو نہیں ہوں۔" یہ فقرہ مسلسل سماعتوں میں گردش کر رہا تھا۔

ذیشان جیسا ویل مینرڈ' وجیہہ اور ویل ایجوکیٹڈ شخص جس لڑکی کو اس طرح چاہتا ہو وہ خود پر جتنا بھی ناز کرے کم تھا۔ یہ مازیہ عارف کا ذاتی خیال تھا۔

"اوہ' چائے سے شغل فرمایا جا رہا ہے۔" مازیہ اور ذیشان صحن میں پڑی کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھے سرگوشیوں میں جانے کیا باتیں کر رہے تھے جب فرازیہ دونوں ہاتھوں سے بکھرے بالوں کو سمیٹتے ہوئے باہر آئی تھی۔

ذیشان ان کا خالہ زاد تھا لیکن مازیہ کی طرح وہ بھی مانتی تھی کہ جو بات ذیشان میں ہے وہ ان کے پورے خاندان کے کسی اور شخص میں نہیں ہے۔ وہ اپنی بہن کی اس میں حد سے زیادہ دلچسپی سے بھی بخوبی آگاہ تھی اس لیے دل سے ذیشان کو وہی مقام دیتی تھی جو مازیہ کے رشتے کے حوالے سے دینا چاہیے تھا۔

"تم سو رہی تھیں' اس لیے تمہیں نہیں بلایا۔ حالانکہ ذیشان تو کہہ رہے تھے فرازیہ کو جگا کر لاؤ۔" مازیہ نے وضاحت دی تھی۔

"یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ تم دونوں میرے آنے سے پہلے اس طرح باتوں میں گم تھے کہ تم لوگوں کو کسی تیسرے بندے کا کیا خیال آتا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے تم اب ہماری جاسوسی کرنے لگی ہو۔" ذیشان خالی کپ زمین پر رکھتے ہوئے اس کی جانب مڑا تھا۔

"جی نہیں مجھے کیا پڑی ہے جاسوسی کرنے کی' یہ تو سامنے کی بات ہے۔ میری جگہ کوئی بھی ہوتا اس منظر کو دیکھ کر وہی اندازہ لگاتا جو میں نے لگایا۔" وہ منہ پھلا کر بولی تھی۔

"اچھا بابا اب لڑنے مت بیٹھ جانا یہ بتاؤ چائے پیو گی؟"

مازیہ اتنا خیال رکھنے والی اور بڑھ چڑھ کر کام کرنے والی نہیں تھی لیکن ذیشان کے آتے ہی اس کے مزاج میں ایک واضح تبدیلی آ گئی تھی۔ فرازیہ اور دوسرے گھر والے پہلے پہل اس تبدیلی پر حیران ہوتے تھے لیکن جوں جوں بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی ان سب نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔

"تم بناؤ گی تو ضرور پیوں گی۔" فرازیہ بھی ایسے موقعوں پر اسے خوب تنگ کرتی تھی۔

"بنا لائی ہوں۔" وہ اپنا اور ذیشان کا خالی کپ اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئی تھی۔

"یہ مازیہ اتنی اچھی نہیں ہے لیکن تمہاری موجودگی میں ہو جاتی ہے۔" وہ مازیہ کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ہنس کر بولی تھی۔

"پھر تو تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں تمہاری بہن کو ایسا بنا دیتا ہوں۔" وہ بھی اس کی بات کا مزا لیتے ہوئے بولا تھا۔

"یہ تو ہے۔" وہ بولی پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

کچن میں چائے بناتی مازیہ نے فوراً کچن کی کھڑکی کھول کر انہیں ہنستے ہوئے دیکھا تھا' چائے کا پانی چولہے پر پڑا کھول رہا تھا اور وہ یک ٹک ذیشان کو دیکھتی اس کی دلکش ہنسی میں کھوئی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا! اندر آ جاؤ' تمہارا اپنا گھر ہے۔" خالہ فراست نے اوصاف کو کسی کام سے ان کے گھر بھیجا تھا اور اب دروازے پر ہی کھڑا ان کا پیغام شکیلہ بیگم کو پہنچا رہا تھا۔ وہ اوصاف کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں۔ وہ بہت شرمیلا اور کم گو لڑکا تھا اور سلجھی ہوئی عادات کا مالک تھا۔ وہ بہت چھوٹا سا تھا جب ان لوگوں نے اس محلے میں آ کر رہنا شروع کیا تھا۔ فراست اور شکیلہ پہلے دن سے ہی پڑوسنوں کی بجائے بہنوں کی طرح رہی تھیں۔ اوصاف' فرازیہ اور مازیہ کے ساتھ کھیل کود کر جوان ہوا تھا لیکن اب وہ ان دونوں سے کچھ جھجکنے لگا تھا۔

"بیٹا! یہ وہی گھر ہے جہاں تم دن کا بیشتر حصہ گزارتے تھے اور بلا روک ٹوک آتے جاتے تھے پھر اب اتنا کیوں جھجک رہے ہو۔" وہ اسے اندر لے آئی تھیں۔ جو نگاہیں جھکائے ان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

"بیٹھو بیٹا!" انہوں نے صحن میں رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ شکیلہ بیگم کے بیٹھنے کے بعد خود بھی بیٹھ گیا تھا۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟" کچھ فاصلے پر بچھی چارپائی پر بیٹھی مازیہ کالج کا کوئی کام کر رہی تھی۔ اوصاف کے بیٹھتے ہی اس نے اپنی کتابیں سمیٹی تھیں۔

"بس امی! میرا کام ختم ہو گیا ہے اور پھر یہاں دھوپ بھی بہت تیز ہے اندر کمرے میں جا رہی ہوں۔" وہ چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"اوصاف آیا ہے تم نے اسے سلام بھی نہیں کیا۔ بھائی ہے تمہارا۔" شکیلہ بیگم کو مازیہ کی بدتمیزی ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔ ابھی بھی اوصاف کی موجودگی کا

خیال نہ ہوتا تو اسے بے بھاؤ کی سناتیں۔ لیکن اپنا غصہ پی کر رہ گئی تھیں۔ جبکہ ان کے بھائی کہنے پر اوصاف نے کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔

"السلام علیکم!"

وہ اپنی اماں کی طبیعت سے واقف تھی۔ اگر اب بھی سلام نہ کرتی تو پھر بعد میں ایک لمبا لیکچر سننا پڑتا اس لیے لٹھ مارنے والے انداز میں سلام جھاڑا تھا۔

"وعلیکم السلام!" اوصاف نے صرف ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

دھوپ میں چمکتا گلابی چہرہ جواب انار کی طرح دہک رہا تھا۔ وہ لاپروا اور مغرور لڑکی اسے اپنے دل کے بہت قریب محسوس ہوتی تھی۔ وہ اندر کمرے میں جا چکی تھی لیکن اوصاف کے تن من کو سرشار سا کر گئی تھی۔

"بہت لاپروا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو بیٹا! اس میں اور فرازیہ میں بہت فرق ہے۔ میں تو اسے بہت سمجھاتی ہوں کہ اگلے گھر جاؤ گی تو کیا کرو گی۔ کچھ تربیت اور طریقہ سلیقہ بھی سیکھ لو۔ لیکن اس لڑکی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔" وہ مازیہ کے جانے کے بعد اوصاف سے اس کی شکایتیں کرنے لگی تھیں۔

"خالہ جان! مازیہ آہستہ آہستہ سب سمجھ جائے گی۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" اس نے انہیں تسلی دی۔

"خاک سمجھے گی۔ تم بیٹھو بیٹا! میں ذرا فرازیہ کو دیکھوں وہ تمہارے لیے چائے تو بنائے۔"

"نہیں نہیں خالہ جان! آپ تکلف نہ کریں۔ چائے پھر کبھی سہی اس وقت تو مجھے ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ارے بیٹا! بیٹھو تو چائے کی ایک پیالی کے لیے تکلف کیسا اور تم کون سا روز روز آتے ہو۔ آج بھی دروازے سے لوٹ رہے تھے وہ میں ہی زبردستی لے آئی۔"

"خالہ جان! میرا آپ سے وعدہ رہا، چائے پھر کبھی پیوں گا اس وقت پلیز مجھے اجازت دیں۔"

"اچھا بیٹا! تمہاری مرضی۔" وہ جیسے ہار مان کر بولی تھیں۔

"اچھا خالہ! خدا حافظ۔" وہ جس طرح دبے پاؤں آیا تھا اسی طرح خاموشی سے باہر نکل گیا تھا۔

"خدا حافظ بیٹا!"

"فراست کتنی خوش بخت ہے۔ ایک بیٹا ہے لیکن دس پر بھاری ہے۔ اللہ ایسی سعادت مند اولاد ہر کسی کو دے۔" اوصاف کے جانے کے بعد شکیلہ بیگم نے دل میں سوچا تھا اور مازیہ کی خبر لینے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"فری! میری اچھی بہن پلیز مان جاؤ نا۔ دیکھو تم میری مدد نہیں کرو گی تو اور کون کرے گا اور پھر اس میں غلط ہی کیا ہے۔ ذیشان کوئی غیر نہیں ہے ہمارا اپنا ہے پھر اس کے ساتھ جانے میں کیسا اعتراض۔"

"دیکھو مازی! یہ ٹھیک ہے کہ ذیشان ہمارا کزن ہے لیکن جب تم اس طرح کالج کے یونیفارم میں اس کے ساتھ جاؤ گی تو دیکھنے والے کیا سمجھیں گے۔ تمہارے یا اس کے ماتھے پر تو نہیں لکھا ہوا کہ تم دونوں رشتہ دار ہو کوئی اور نہیں ... دکھائی دو گے۔"

"تم یہ لیکچر چھوڑو بس وہ آنے ہی والے ہیں۔ میں ان کے ساتھ جاؤں گی۔ تم امی سے کہہ دینا میرا پریکٹیکل ہے اس لیے دیر ہو گئی۔"

"امی! مجھے ڈانٹیں گی کہ میں کچھ دیر انتظار کر کے تمہارے ساتھ نہیں آ سکتی تھی۔" فرازیہ نے اسے گھورا تھا۔

"فری پلیز!" وہ اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے لیکن آخری بار۔" فرازیہ ہمیشہ کی طرح اس کی ضد کے آگے ہار گئی تھی۔

"اوہ سو سویٹ۔" مازیہ نے آگے بڑھ کر اس کے گلے میں پیار سے باہیں ڈال دی تھیں۔

"اچھا اب پرے ہٹو۔ ساری لڑکیاں ہمیں دیکھ رہی ہیں۔ ذیشان کے ساتھ میں اور تم دونوں جائیں گے مجھے آگے جا کر اتار دینا۔" فرازیہ نے اس کے بازو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ چلو آؤ گیٹ پر چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ذیشان وہیں کھڑے انتظار کر رہے ہوں۔" مازیہ اسے گھسیٹتے ہوئے کالج کے گیٹ پر لے آئی تھی۔

"فری بے چاری تم سے بہت محبت کرتی ہے۔" فری کو انہوں نے بڑی سڑک پر اتارا تھا اور اب مازیہ بڑے مزے سے ذیشان کی گاڑی میں بیٹھی تھی۔ جب ذیشان نے فری پر تبصرہ کیا تھا۔

"ہاں تو اسے محبت کرنی بھی چاہیے میری بہن نہیں ہے کیا۔" وہ شوخی سے بولی تھی۔

ذیشان کی ہمراہی اور سہانا موسم اس کے انگ انگ پہ سرور طاری تھا۔

"یہ تو زبردستی والی محبت ہوئی نا یار!" وہ اسے چھیڑنے کے انداز میں بولا تھا۔

"نہیں محبت بس محبت ہوتی ہے اس میں زبردستی والی کوئی بات نہیں ہوتی۔"

"اوہ، مازیہ عارف بھی ایسی گہری بات کر سکتی ہے؟"

"گویا میں جاہل ہوں یا بے حس جو ایسی بات نہیں کر سکتی۔"

"دیکھو مجھے لڑنا نہیں ہے۔ تمہیں لڑنے کے لیے تو اپنے ساتھ نہیں لایا ہوں۔" اس نے گاڑی ایک خوب صورت پارک کے باہر کھڑی کی تھی۔

"پھر کس لیے لائے ہیں؟"

"تم سے باتیں کرنے کے لیے، تمہیں جی بھر کر دیکھنے کے لیے، تمہیں اپنی سنانے اور کچھ تمہاری سننے کے لیے۔" وہ چلتے چلتے پھولوں کے ایک کنج کے قریب آ بیٹھے تھے۔

"سنو مازی! تمہارے بغیر یہ زندگی مجھے زندگی ہی نہیں لگتی کیونکہ میرے پاس ایسی زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے جس میں تم شامل نہ ہو۔ تمہارے بغیر میں زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔"

"ذیشان! ایسے مت کہیں۔ ہمارے مقدر میں کوئی رکاوٹ، کوئی گردش نہیں ہے۔ ہم ہمیشہ ساتھ ساتھ رہیں گے۔ آپ مایوسی کی باتیں مت کریں۔"

"مازی! یہ جو محبت ہوتی ہے نا یہ ہمیں بزدل بنا دیتی ہے۔ یہ ہمیں ہر پل ڈراتی رہتی ہے۔ میں بھی بہت بزدل ہو گیا ہوں تمہارے بچھڑنے کا دھڑکا میرے دل کو خوف زدہ کرتا رہتا ہے۔"

"میں نے تو سنا ہے ذیشان! محبت انسان کو بہت بہادر بنا دیتی ہے۔ بندہ اس کی خاطر ہر شے سے ٹکرا جاتا ہے۔ اسے ہر قیمت پر حاصل کر کے چھوڑتا ہے بشرطیکہ محبت سچی ہو۔"

"پروین شاکر نے شاید ایسے ہی لہجے کے بارے میں کہا ہے" وہ اس کی باتیں سن کر بولا تھا۔

کتنی شفاف ہے یہ آواز
چشمے کی طرح ہے جس نے میرے
اندر کے تمام موسموں کو
آئینہ بنا کے رکھ دیا ہے
پتھر ہو کہ پھول ہو کہ سبزہ
تاروں کی برات ہو کہ مہتاب
سورج کا جلال ہو کہ تن میں
خوابوں کی دھنک کھنچی ہوئی ہو
بارش ہو، شفق کھلی ہوئی ہو
ہر رت کا گواہ اس کا لہجہ
تہہ تک جسے آنکھ چھو کے آئے
کتنی شفاف ہے یہ آواز!

"ذیشان! آپ بھی نا بس۔" وہ بری طرح جھینپ گئی تھی۔ ذیشان کی پر حدت نظریں اسے موم کی طرح پگھلانے لگی تھیں۔

"چلیں بہت دیر ہو گئی ہے۔" مازیہ کو اچانک خیال آیا۔

"ہاں چلو!" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"مازیہ! پتہ ہے میں تمہیں سارے زمانے سے چھین لوں گا۔ تم صرف میری ہو، صرف میری۔"

راستے میں ذیشان نے یقین کا ایک اور جگنو اس کی ہتھیلی پر دھرا تھا اور وہ آنکھیں موندے ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"خالہ فراست کی ہمت کیسے ہوئی اپنے پینڈو اور جاہل بیٹے کا رشتہ میرے لیے لے کر آنے کی۔ کیا سوچ کر انھوں نے ہمارے گھر کا رخ کیا ہے آخر۔" اس نے جیسے تیسے بابا جان کے گھر سے نکلنے تک صبر کیا تھا اور اب کمرے میں آتش فشاں بنی بیٹھی تھی۔

اوصاف جاوید اس کے لیے رشتہ بھیجے یہ سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔

"مازیہ! ہوش کے ناخن لو۔ اس طرح چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ بیٹی والوں کو ہر کوئی پوچھتا ہے اور پھر اوصاف کے رشتے پر جس طرح تم واہی تباہی بک رہی ہو میں پوچھتی ہوں ایسی کون سی قیامت آ گئی ہے۔ وہ لڑکا ہیرا ہے ہیرا' لاکھوں میں ایک ہے۔ ٹھیک ہے اس گھر میں سب کا جھکاؤ ذیشان کی طرف ہے اور پھر وہ میرا بھانجا ہے میرے بیٹے ہر کسی سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے میں نے فراست کو بڑے طریقے سے جواب دے دیا ہے لیکن کوئی تم سے پوچھے کہ تم کیوں آگ کا شعلہ بنی بیٹھی ہو۔ اوصاف جاوید کا رشتہ ہی آیا ہے نا ہم نے تمھیں اس کے ساتھ رخصت کرنے کی تیاری تو نہیں کر لی۔" شکیلہ بیگم نے اس کی طبیعت اچھی طرح صاف کر دی تھی۔ وہ کب سے بیٹھی اس کا رونا پیٹنا سن رہی تھیں۔

"اُفوہ امی جان! آپ بھی نا بس۔" رخصتی والی بات پر وہ جھنجلا گئی تھی لیکن ان کی ان سب باتوں سے ایک بھید تو کھل گیا تھا کہ ذیشان کی اور اس کی پسندیدگی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔

"اس اوصاف کے بچے کی خبر تو میں اچھی طرح لوں گی۔ مجھے کہیں ملے تو سہی۔" شکیلہ بیگم کے کمرے سے نکلتے ہی وہ دانت کچکچا کر بولی تھی۔

"خبردار جو تم نے اوصاف سے کچھ کہا تو۔ پہلے ہی بے چارے کا دل توڑ دیا اور پھر بھی تمھاری تسلی نہیں ہوئی۔" فرازیہ نے تختی سے کہا تھا۔

"کب کیا آپا کہا تم نے بے چارے کا دل توڑ دیا۔"

"فری تم سب جانتی ہو پھر بھی ایسا کہہ رہی ہو؟" اسے سچ مچ فرازیہ کی بات سے صدمہ پہنچا تھا۔

"چلو چھوڑو۔ اسے انکار کر تو دیا ہے اب تم کیا چاہتی ہو۔"

"تمھیں اس کا اتنا خیال ہے تو خود کر لو اس سے شادی۔" اسے فرازیہ کا اوصاف جاوید کی حمایت کرنا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اسی لیے تپ کر بولی۔

"وہ مجھے بہن سمجھتا ہے اس لیے مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ ویسے بھی ہماری ایسی قسمت کہاں جو بھی آتا ہے تمھارا امیدوار بن کر آتا ہے۔" فرازیہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر اسے مزید تپایا تھا۔

"میں جا رہی ہوں۔" وہ تکیہ اس پر پھینک کر کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

موسم بے حد خوب صورت ہو رہا تھا۔ مست ہوا جھومتی جھامتی ہر آنگن میں دستک دے رہی تھی۔ یہ سہانی شام اور دلکش موسم ذیشان اور مازیہ کے دل کا پیامبر بنا ہوا تھا۔

آج ان کی منگنی کی تقریب تھی چونکہ نکاح بھی کوئی دکھاوا نہ تھا اس لیے سادہ سی یہ تقریب کسی بھی تکلف کے بغیر تھی۔ ذیشان کی طرف سے نبیلہ خالہ اور خالو مازیہ کو انگوٹھی پہنانے آئے تھے۔ ان کے علاوہ چند ایک رشتہ دار تھے جن کو خاص طور پر بلایا گیا تھا۔

مازیہ ہلکے گلابی جوڑے میں کھلی پڑ رہی تھی۔ وہ خوب صورت تو تھی لیکن محبتوں اور چاہتوں کے اعجاز نے اس کے چہرے پر وہ رنگ بکھیر رکھے تھے کہ اس پر سے نگاہ ہٹانا مشکل تھا۔

"میری مازیہ تو چاند کا ٹکڑا ہے' چاند کا ٹکڑا۔" نبیلہ خالہ نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر چوما تھا اور وہ شرم سے دوہری ہو گئی تھی۔

"آپ خالہ یا پھپھی ساس ہیں جو اپنی بہو کی اس طرح تعریف کر رہی ہیں۔" لڑکیوں کے جھرمٹ میں سے کسی نے کہا تھا اور ہر طرف قہقہے بکھر گئے تھے۔

"مازیہ میری بہو نہیں میری بیٹی ہے۔ میری ماں جائی کے دل کا ٹکڑا۔"

خالہ نے اسے سینے سے لگایا تھا اور ہر لڑکی اور ہر عورت نے مازیہ عارف کی قسمت پر ایک بار تو ضرور رشک کیا تھا۔ لیکن فراست بیگم چپکے سے اس محفل سے اٹھ کر باہر چلی آئی تھیں۔ اس چاند کو تو ان کے آنگن میں چمکنا تھا کیونکہ ان کا پیارا اور سعادت مند بیٹا اس چاند کا اس شدت سے تمنائی تھا کہ اس کے بعد وہ ہر آرزو' ہر خواہش بھلا بیٹھا تھا۔

اس نے آج تک ان سے کچھ نہیں مانگا تھا اور اگر کچھ مانگا تھا تو وہ اپنے بیٹے کی جھولی میں نہ ڈال سکی تھیں۔ اس خیال سے ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ لیکن مازیہ انھیں بیٹیوں کی طرح ہی عزیز تھی لہٰذا اس کی خوشیوں کو اپنی نظر لگ جانے کے ڈر سے اس کے قریب سے اٹھ آئی تھیں۔

حسین شام کی باقیات پھول' مٹھائیوں کے خالی ڈبے' سنہری لڑیوں کی صورت صحن میں جا بجا بکھری ہوئی تھیں۔ چونکہ سب مہمان قریب ہی سے آئے تھے اس لیے تقریب ختم ہوتے ہی واپس لوٹ گئے تھے۔ چونکہ رات بھی گہری ہو گئی تھی اس لیے پھیلاوا سمیٹنے کی بجائے اپنے اپنے بستروں پر گر گئے تھے۔

واحد مازیہ تھی جس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی جو خوش رنگ سپنے بن رہی تھیں۔ وہ بستر سے نکل کر باہر صحن میں چلی آئی تھی۔ صحن میں بکھری بہت سی چیزیں اور پھر اس کے ہاتھ کی ایک انگلی میں چمکتی ہوئی خوب صورت نگوں والی انگوٹھی اسے یاد دلانے کو کافی تھی کہ وہ ذیشان کی ہو چکی ہے۔

☼ ☼ ☼

عارف احمد محکمہ انکم ٹیکس میں تھے۔ انھوں نے ہمیشہ ایک سچے مومن کی طرح اپنے آپ کو حرام کی کمائی سے بچائے رکھا تھا اور اپنی بیٹیوں کی پرورش حق حلال کی کمائی سے کی تھی۔ وہ قناعت پسند تھے اور قناعت پسندی کو ہی پسند کرتے تھے۔ لیکن آج کل وہ ایک مشکل میں پھنسے ہوئے تھے۔ ایک مل اونر ٹیکس کی لاکھوں کی رقم بچانے کی خاطر انھیں بہت تنگ کر رہا تھا۔

"عارف احمد یہ معاملہ دبا دو تو ہم تمھارا منہ بند کر دیں گے۔" ہاشم صدیقی نے اپنے موقف پر ڈٹے عارف احمد سے آخری مرتبہ ڈیل کرنے کی کوشش کی۔

"ہاشم صاحب آپ میرا منہ بند کرنے کے بجائے قومی خزانے کا منہ بھر دیں تو آپ کے حق میں زیادہ بہتر ہوگا۔" عارف احمد نے بھی ٹکا تو ڑ جواب دیا تھا۔

"تم جیسے معمولی افسر ہاشم صدیقی کی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں اور تم اس معمولی افسری پر اتنا اترا رہے ہو کہ ہاشم صدیقی کو سمجھانے لگے ہو۔ خیر ہم تمھارے منہ نہیں لگنا چاہتے' تم نے ہم سے ڈیل نہ کر کے اپنا ہی نقصان کیا ہے۔"

"ہونہہ! بھری ہوئی تجوریوں کو مزید بھرنے کے لیے ہر کام کر گزرتے ہیں' یہ بھی نہیں سوچتے کہ دوزخ کا ایندھن خرید رہے ہیں۔" عارف احمد نے بے جان ریسیور کو گھورتے ہوئے دل میں سوچا تھا اور ریسیور کریڈل پر پٹخ کر پھر سے اپنا کام کرنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

"امی جان! چار بجنے والے ہیں اور مازیہ ابھی تک کالج سے واپس نہیں آئی۔" فرازیہ کو ہلکا سا بخار تھا اس لیے اس نے کالج سے چھٹی کر لی تھی۔ وہ سو کر اٹھی تو سہ پہر کے سائے ڈھل چکے تھے۔ اس نے شکیلہ بیگم سے پوچھا تھا۔

"ہاں میں خود پریشان ہوں بنا بتائے وہ کبھی اتنی دیر سے نہیں آئی۔ تم اس کی دوست آسیہ سے معلوم کرو کہیں اس کی طرف نہ ہو۔"

"جی اچھا۔" فرازیہ جلدی سے ٹیلی فون کی طرف بڑھی تھی۔

"امی جان وہ آسیہ کے ساتھ بھی نہیں ہے۔" تھوڑی دیر بعد اس نے باہر آ کر تشویش سے انھیں بتایا

تھا۔

"ہائے اللہ! تو پھر وہ کہاں چلی گئی؟"

"کیا ہوا خیریت تو ہے۔ تم دونوں کے چہروں پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟" عارف احمد آفس سے لوٹے تو ان دونوں کو پریشانی سے ادھر ادھر پھرتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"بابا! وہ مازیہ ابھی تک نہیں آئی۔"

"اچھا۔ تم لوگ پریشان مت ہو میں پتہ کرتا ہوں۔" وہ الٹے قدموں باہر نکل گئے تھے۔

سہ پہر سے شام اور شام سے رات ڈھلی لیکن مازیہ کا کہیں نام و نشان نہ ملا تھا۔ عارف احمد اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چکے تھے لیکن اس کا کہیں سراغ نہیں مل رہا تھا۔

جوان بیٹی کا نازک معاملہ تھا اس لیے وہ کسی کو بتا بھی نہیں رہے تھے۔ لیکن جب ساری رات اسی بھاگ دوڑ میں گزر گئی اور صبح کا اجالا ہر طرف پھیلنے لگا تو عارف احمد نے شکیلہ بیگم کے کہنے پر ذیشان کے گھر اطلاع کی اور اس کے والد کو مدد کے لیے بلایا جو ایس پی تھے۔

ذیشان اس کے والد اسحاق جمال اور عارف احمد تینوں اسے ڈھونڈنے نکلے ہوئے تھے جب فرازیہ نے مازیہ کو کھلے دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھا تھا اور شکیلہ بیگم کو چیختے ہوئے متوجہ کیا تھا۔

"مازیہ میری جان!" شکیلہ بیگم جن کے آنسو کل شام سے نہ تھمے تھے دوڑ کر اس سے لپٹ گئی تھیں۔

"مازیہ! تم کہاں چلی گئی تھیں؟ تمہیں پتہ ہے ہم کتنے پریشان تھے۔" فرازیہ نے آگے بڑھ کر ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا تو نبیلہ بیگم نے پوچھا تھا۔

"خالہ! مجھے نہیں پتہ وہ کون لوگ تھے۔ میں تو کالج سے آ رہی تھی کہ وہ زبردستی مجھے ایک گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے اور ایک کمرے میں بند کر دیا تھا ساری رات میں دیواروں سے سر ٹکرا ٹکرا کر روتی رہی تھی لیکن کسی نے مجھے باہر نہیں نکالا اور جب صبح ہوئی تو وہ مجھے گاڑی میں ڈال کر گھر کے باہر چھوڑ گئے۔ پتہ نہیں کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے۔" مازیہ نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا تھا۔

"تمہیں کسی نے کچھ کہا تو نہیں میرا مطلب ہے کوئی غلط نیت سے تو تمہارے قریب نہیں آیا۔" نبیلہ بیگم نے اس کے قریب ہو کر اپنے اندیشوں کی تصدیق کرنا چاہی تھی۔

"نہیں خالہ جان! جس طرح وہ مجھے لے کر گئے تھے ایسے ہی چھوڑ گئے کمرے میں کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ مجھے تو انہوں نے کھانے کو بھی کچھ نہیں دیا تھا۔"

"اچھا پھر ان لوگوں کا کیا مقصد تھا؟" مازیہ کے بتانے پر جہاں فرازیہ اور شکیلہ بیگم نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا تھا وہیں نبیلہ بیگم سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

"فرازیہ! تم اپنے بابا جان کو فون کر کے بتا دو۔ وہ جانے کہاں کہاں خوار ہو رہے ہوں گے۔" شکیلہ بیگم کو کچھ دیر بعد خیال آیا تو انہوں نے فرازیہ سے کہا تھا۔

عارف احمد کو لگ رہا تھا کہ ایک رات میں ہی ان پر قیامت گزر گئی ہے۔ فرازیہ کا فون سنتے ہی وہ تینوں الٹے قدموں گھر کی طرف دوڑے تھے اور مازیہ کو صحیح سلامت دیکھ کر انہوں نے سجدہ شکر ادا کیا تھا۔

"میں جانتا ہوں یہ کمینی حرکت کس کی ہے۔" عارف احمد کے ذہن میں ہاشم صدیقی کا نام ابھرا تھا۔

"بھائی جان! کیا آپ اسے جانتے ہیں؟" نبیلہ بیگم نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"ہاں بہت اچھی طرح۔ ہاشم صدیقی ایک مل اونر ہے، لاکھوں کا ٹیکس تھا جس پر وہ ادا نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے وہ مجھے کئی بار دھمکیاں بھی دے چکا تھا۔"

"تو آپ نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟ میں اب بھی اسے نہیں چھوڑوں گا اس کے خلاف اغوا کا پرچہ ضرور کٹے گا۔" اسحاق جمال نے غصے سے کہا تھا۔

"ہاں پرچہ تو میں ضرور کٹواؤں گا تاکہ اسے پتہ چلے کہ عارف احمد اتنا کمزور نہیں ہے۔"

☆ ☆ ☆

اس سارے معاملے میں ہاشم صدیقی کا کچھ بگڑا یا نہیں البتہ مازیہ عارف کی زندگی پر اس واقعے نے گہرے اثرات چھوڑے تھے۔ جب عارف احمد نے اسحاق جمال سے بات کی تھی تو اس نے ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے ان کے شک کی تصدیق کر دی تھی۔

"عارف احمد! تمہاری بیٹی کو ایک رات کے لیے مہمان بنایا تھا لیکن خدا گواہ ہے اس کی طرف کسی نے میلی آنکھ سے دیکھا تک نہیں تھا۔" اسحاق جمال کے ٹھنڈے لہجے نے عارف احمد کو ساکت کر دیا تھا۔

یہ خبر جس جس کے کانوں تک پہنچی تھی اس نے ایک دفعہ افسوس کرنے کے بہانے مازیہ کو کھوجتی ہوئی اور شک بھری نگاہوں سے ضرور دیکھا تھا۔

مازیہ عارف ایسے کسی شخص کا سامنا کرتے ہوئے کٹ کر رہ جاتی تھی اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس ماحول سے بھاگ کر کہیں دور چلی جائے ان لوگوں کی شک بھری نظروں سے چھپ کر بیٹھ جائے۔

"ذیشان! تم گھر کیوں نہیں آتے۔ تم سے ملے تمہیں دیکھے اتنے دن ہو گئے ہیں۔" ایک دن دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے ذیشان کو فون کیا تھا۔

"مصروفیت اتنی زیادہ ہے کہ کسی اور چیز کا ہوش ہی نہیں رہتا۔" اس کا لہجہ پہلے والا نہیں تھا۔ مازیہ نے دھڑکتے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے اس لہجے کو پہچاننے کی کوشش کی۔

"ذیشان... میں کوئی غیر تو نہیں مازیہ ہوں تمہاری مازیہ۔" وہ بے یقین تھی۔

"مازیہ پلیز! مجھے ڈسٹرب مت کرو۔ اس وقت میں واقعی بہت مصروف ہوں۔" وہ الجھا ہوا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے جب تم فارغ ہو جاؤ تو مجھے کال کر لینا۔ پھر ہم ڈھیر ساری باتیں کریں گے۔"

"مازیہ! میری کال کا انتظار مت کرنا میں کچھ دنوں تک بزی رہوں گا۔"

"ذیشان! پہلے ہی بہت دن ہو گئے ہیں ہمیں بات کیے ہوئے۔ مجھے لگتا ہے تم بھی بدل رہے ہو۔" وہ رونے والی ہو گئی۔

"میں نہیں بدل رہا ہوں بلکہ تم بدل گئی ہو۔" وہ پراسرار انداز میں بولا تھا۔

"میں! میں کیا بدلی ہوں۔ میں تو پہلے والی مازیہ ہوں۔"

"یہ تم کہتی ہو نا۔ لوگوں سے پوچھو جو تمہارے بارے میں کیسی الٹی سیدھی باتیں بنا رہے ہیں اور میں تم سے محبت ضرور کرتا ہوں لیکن اپنے اندر اتنا ظرف اور حوصلہ نہیں پاتا کہ زندگی بھر کے لیے لوگوں کی نظروں میں تماشا بن جاؤں۔ اس لیے پلیز آئندہ مجھے کال مت کرنا۔" اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں بتا دیا تھا کہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اس پر شک کرتا ہے۔

"تو کیا تم بھی... تم بھی ذیشان! مجھے ایسا سمجھتے ہو!" بے اعتباری کا دکھ اس کے لفظوں میں کرلانے لگا تھا۔

"میرے سمجھنے یا نہ سمجھنے سے کچھ نہیں ہوتا مازیہ! جو حقیقت ہے سو ہے۔ پلیز مجھے آئندہ ڈسٹرب مت کرنا۔"

"ذیشان... ذیشان... ذیشان..." دوسری طرف فون بند ہو چکا تھا۔ وہ بے جان آواز میں زندگی کو پکارتی رہی تھی۔

حلقوم سماعت میں
اگ آئے ہیں اب کانٹے
آواز کا اک قطرہ
لیکن نہیں مل پاتا
شبنم تیرے لہجے کی
کس تن میں اترتی ہے
نم تیری ہنسی کا اب
کس تن کو بھگوتا ہے
میں پیاس سے بے کل ہوں
اور تیرے تکلم کا!
اک گھونٹ نہیں ملتا
اس قحط صدا میں دل
اب کے نہ کٹے شاید
یہ پیاس سماعت کی

چال رہے کے تلے شاید
مازیہ عارف لوگوں کی طنزیہ نظریں، ان کی شک بھری زہر آلود باتیں، مرچ مسالے سے بھری اپنے متعلق مختلف کہانیاں سب سہہ گئی تھی۔ لیکن ذیشان کی بے اعتباری اس کی نس نس کو تیز دھار آلے کی طرح کاٹ گئی تھی۔ جس شخص کو وہ زندگی سے بھی زیادہ قابل اعتبار سمجھتی تھی اس نے اتنی کم ظرفی دکھائی تھی کہ حقائق جانے بغیر اس کی زندگی سے یوں الگ ہو گیا تھا جیسے کبھی اسے جانتا ہی نہ ہو۔

"شکیلہ! اولاد کی مرضی کے آگے ماں باپ کا کیا بس چلتا ہے۔ میں نے تو اس لڑکے کو بہت سمجھایا ہے لیکن وہ میری ایک نہیں سنتا۔ وہ کہتا ہے کہ وہ مازیہ سے شادی نہیں کرے گا۔ ہاں اگر آپ اپنی بہن سے مستقبل میں ایسا کوئی رشتہ ضرور جوڑنا چاہتی ہیں تو پھر فرازیہ کے لیے بات کر لیں لیکن مازیہ نہیں۔" نبیلہ خالہ شرمساری امی جان کے پاس بیٹھی کہہ رہی تھیں۔ اور مازیہ کی سماعتیں یہ سب سن کر مفلوج ہوئی جا رہی تھیں۔

"ارے فرازیہ تو میری پیاری سی بہن ہے۔" کسی وقت ذیشان نے یہ فقرہ بہت لاڈ سے کہا تھا جو اب مازیہ کے دل پر قیامت ڈھا رہا تھا۔

"لیکن نبیلہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور پھر مازیہ میں اچانک اس کو کیا برائی نظر آنے لگی ہے۔ وہ اور مازیہ ......"

"وہ کل کی بات تھی شکیلہ! اب وہ ایسا نہیں چاہتا۔" نبیلہ خالہ نے ان کی بات کاٹ کر سفاکی سے کہا تھا اور مازیہ کو یہ سن کر اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا تھا۔

ان کے درمیان اور کیا کیا باتیں ہوئی تھیں اس میں یہ سننے کی تاب تھی نہ حوصلہ۔ وہ قدموں کو گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

فرازیہ تک جب یہ بات پہنچی ذیشان نے مازیہ سے منگنی توڑ کر اسے پروپوز کیا ہے تو اس نے گھر میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

"نبیلہ خالہ سے ہمارا رشتہ اتنا کمزور نہیں ہے کہ ہمیں اسے مضبوط کرنے کے لیے مزید کسی رشتے کا سہارا چاہیے۔ وہ آپ کی بہن ہیں اور ہمیشہ بہن ہی رہیں گی میرے لیے ایسا سوچیے گا بھی مت۔ مجھے ذیشان کی خواہش سے زیادہ اپنی بہن کی خوشی عزیز ہے۔"

اور دل سے تو وہ بھی ایسا نہیں چاہتی تھیں سو انہوں نے نبیلہ کو انکار کہلوا دیا تھا۔

"فرازیہ ـــ" مازیہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن کچھ نہ کہہ سکی۔ جس طرح اس کی بہن نے اس کا مان رکھا تھا، وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی اور اب اس کے گلے لگی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"مازیہ! جو شخص زندگی کی اونچ نیچ کو نہ سمجھ سکے، اعتبار قائم نہ رکھ سکے، جو ظاہر میں کچھ ہو اور باطن میں کچھ اور، جس کے قول و فعل میں اتنا تضاد ہو اس کے لیے یہ قیمتی موتی مت ضائع کرو۔ یہ تو اچھا ہے اس نے شروع میں ہی راستہ بدل لیا اگر تمہاری شادی اس سے ہو جاتی اور وہ بعد میں یوں کھل کر سامنے آتا تو سوچو زندگی تمہارے لیے موت سے بھی بدتر ہوتی۔ اس لیے اس پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں ایک بڑی اذیت سے بچا لیا۔"

فرازیہ کی ہر بات اپنی جگہ سو فی صد درست تھی لیکن مازیہ اس دل کو کیسے سمجھاتی جس پر آج بھی اسی بے وفا کا راج تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک چھوٹے سے واقعے نے مازیہ عارف کی زندگی کو سرتاپا بدل کر رکھ دیا تھا۔

ذیشان اب ان کے گھر نہیں آتا تھا۔ صرف نبیلہ خالہ آتی تھیں وہ بھی شکیلہ بیگم کے پاس بیٹھ کر چلی جاتی تھیں۔ ان کی فرازیہ اور مازیہ سے پہلے والی بے تکلفی نہ رہی تھی۔

"ذیشان کی شادی ہو رہی ہے۔" ایک شام نبیلہ خالہ ان کے گھر سے ہو کر گئیں تو اپنے پیچھے وہ خبر چھوڑ گئیں، جس نے مازیہ عارف کے دل کو نئے سرے سے لوہے کی گرم سلاخوں میں پرو دیا۔

شکیلہ بیگم، مازیہ سے نظر چرائی پھر رہی تھیں کہ جیسے اس سارے معاملے میں ان کا قصور ہو۔

"امی جان! آپ تیاری کر لیں آپ کو اس شادی میں ضرور جانا ہے۔"

وہ بہت بے صبری اور لاپروا لڑکی تھی لیکن وقت نے قبل از وقت سمجھدار کر دیا تھا۔

"نہیں بیٹا! نبیلہ سے میں نے کہہ دیا ہے اس کو بیٹے کی خوشیاں مبارک ہوں لیکن ہم میں سے کوئی نہیں آئے گا۔ اولاد کے آگے تو کوئی چیز، کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ تمہارے بیٹے نے میری بیٹیوں کے دل دکھائے ہیں ہم اس کی خوشی میں شریک نہیں ہو سکتے؟"

"امی جان! جس طرح ہم سب لوگ مجبور تھے اس طرح نبیلہ خالہ بھی بیٹے کے سامنے مجبور تھیں ان کا کوئی قصور نہیں ہے وہ آپ کی بہن ہیں۔ ان کے اکلوتے بیٹے کی خوشی میں ان کی بہن شریک نہیں ہو گی تو تصور کریں ذرا انہیں کتنا دکھ ہو گا۔ آپ وعدہ کریں آپ وہاں ضرور جائیں گی۔"

"میری بچی!" شکیلہ بیگم نے اپنی لاپروا اور کھلنڈری سی بچی کا یہ روپ دیکھا تو اسے سینے سے لگا کر رونے لگی تھیں۔

اس نے ماں کو تو سمجھا دیا تھا باقی لوگوں سے بھی اپنے آنسو چھپا لیے تھے لیکن ذیشان کی شادی کا سن کر جس طرح دل کو کوئی نوچ رہا تھا وہ تکلیف سہی نہ جا رہی تھی۔ بھوک پیاس اڑ گئی تھی اور نیند آنکھوں سے یوں روٹھی تھی کہ جیسے اب کبھی مہربان نہ ہو گی۔

☆ ☆ ☆

"بہن! مازیہ کو میری جھولی میں ڈال دو۔ میرا بیٹا اسے پھولوں کی طرح رکھے گا۔ دیکھو اب میری پھیلی ہوئی جھولی کو خالی مت لوٹانا۔ میرا بیٹا بہت صابر اور معصوم ہے۔ اس نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں مانگا اور زندگی میں پہلی اور آخری بار جو چیز مانگی ہو وہ ابھی تک میں اسے نہیں دے سکی ہوں۔ بہن! اب کے مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹانا میں اپنے بیٹے کا سامنا نہیں کر سکتی۔"

دھوپ ڈھل کر صحن سے ہوتی ہوئی دیواروں پر بسیرا کر چکی تھی۔ درختوں کے پتے ہلکی ہوا سے دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ شکیلہ بیگم چاول چنتے چنتے یکدم ساکت ہوئی تھیں اور اب خالی خالی نظروں سے ان کو دیکھے جا رہی تھیں۔

"اوصاف تمہاری نظروں کے سامنے پلا بڑھا ہے تم سے زیادہ اس کی عادتوں کو کون جانتا ہو گا پھر بھی شکیلہ! تم سوچ لو جتنا دل چاہے انتظار کروا لو لیکن اس بار مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹانا۔" فراست خالہ نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی تھی۔

فرازیہ جو قریب ہی تھی۔ فراست بیگم کی بات سن کر ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"امی جان! اوصاف بھائی بہت اچھے ہیں۔ فراست خالہ صحیح کہہ رہی ہیں۔ وہ اپنی مازیہ کو بہت خوش رکھیں گے۔"

اس نے آج سے بہت پہلے اوصاف جاوید کی آنکھوں میں اپنی بہن کے لیے بہت سچی، پاکیزہ اور خالص محبت دیکھی تھی۔ ایسی محبت جو دعوؤں سے نہیں بس عمل سے کی جاتی ہے۔ جس کی سچائی کی گواہی کسی پارک، باغ یا کسی سڑک پر نہیں دی جاتی جو صرف کسی راز کی طرح دل میں چھپائی جاتی ہے اور وقت آنے پر اس کی خوشبو چاروں اور پھیلتی ہے۔

وہ کہہ کر اٹھی اور سیدھی مازیہ کے پاس جا پہنچی۔

"مازی! اب تمہیں سچی اور جھوٹی محبت کا فرق معلوم ہو گا۔ دیکھو اوصاف جاوید سے ہمارا کوئی رشتہ نہ تھا لیکن وہ تم سے محبت کرتا تھا اور اس نے بھی ذیشان کی طرح بہت سی جھوٹی کہانیاں تمہارے بارے میں سن رکھی ہوں گی لیکن اس میں اور ذیشان میں کتنا فرق ہے کہ اس نے تمہیں مورد الزام نہیں ٹھہرایا اور نہ

تمہاری محبت ختم ہوئی بلکہ فراست خالد پہلے سے بھی زیادہ چاہت اور شوق سے تمہارا ہاتھ مانگنے چلی آئی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اب تم کیا چاہتی ہو؟" وہ سچائی جانتے ہوئے بھی ذیشان کی جگہ اوصاف جاوید کو نہ دے سکی تھی اس لیے اس کی باتوں سے آشنا کر بولی۔

"میں یہ چاہتی ہوں کہ اب امی جان تم سے پوچھیں تو تم انکار نہ کرنا۔ شادی تو تمہیں ایک دن کرنی ہی ہے تو پھر وہ شخص کیوں نہ ہو جو پورے خلوص سے تمہیں چاہتا ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ اور کچھ!" وہ بڑے آرام سے مان گئی تھی۔

مغرب کی اذانیں ہونے لگی تھیں وہ فرازیہ سے کہہ کر وضو کرنے چل پڑی تھی۔

"جب ذیشان نہیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔" وضو کرتے ہوئے بھی اس کا دل عجیب انداز میں کرلایا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھوں پہ مہندی رچی تھی۔ پور پور خوشبو میں بسی ہوئی تھی۔

اوصاف جاوید کو اس بات سے کوئی غرض نہ تھی اسے تو بس اتنا پتہ تھا کہ مازیہ عارف ہمیشہ کے لیے اس کی ہو چکی ہے۔

اس نے مازیہ عارف کو بے تحاشا چاہا تھا لیکن اس کو اس سے مانگا نہیں تھا اس نے اسے ہمیشہ دعاؤں میں اپنے اللہ سے مانگا تھا۔ اس اللہ سے جو معجزے دکھاتا ہے ان دعاؤں میں جن سے تقدیر بدل جایا کرتی ہے۔ محبت کے ساتھ جو بے غرض اور بے ریا ہوتی ہے۔

وہ کم رو تھا۔ اس میں اعتماد کی کمی تھی۔ اس میں صنف مخالف کو اپنی طرف راغب کرنے کے اوچھے ہتھکنڈے نہ تھے لیکن اس میں سچائی تھی اس کے قول و فعل میں تضاد نہ تھا اور پھر اسے اس ذات اعلیٰ صفات سے مانگنے کا ہنر آتا تھا جو کسی کی جھولی خالی نہیں رہنے دیتا۔ سجدہ شکر ادا کرنے کے بعد وہ کمرے میں آیا تھا۔

"السلام علیکم!" وہ بیڈ پر مازیہ کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"وعلیکم السلام!" مازیہ کو وہ دن یاد آیا تھا جب اسی طرح سلام کرنے پر اس نے فرازیہ کے سامنے اوصاف کا خوب مذاق اڑایا تھا۔ دل پہ آنسوؤں کی بارش میں کچھ اور تیزی آئی تھی۔

"میں بہت خوش نصیب ہوں۔ پتہ ہے کیوں؟" اس نے گھونگھٹ الٹ دیا تھا۔ سامنے وہ شعلہ جوالہ بنی اس کے دل کے تاروں کو ہلا گئی تھی۔

"پوچھو گی نہیں کیوں؟"

"کیوں؟" اس کے لہجے میں اصرار تھا سوائے پوچھنا ہی پڑا۔

"اس لیے کہ تمہارا ساتھ نصیب ہوا ہے۔" اس کا دل ایک بار پھر بھر آیا تھا اور آنکھیں آنسو چھپاتے چھپاتے بھی چھلک پڑی تھیں۔

"آئندہ ان آنکھوں کو کبھی رونے نہیں دینا کیونکہ تمہارے آنسو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہیں جو بھی دکھ ہوگا میں اس دکھ کو اپنی ذات پہ سہوں گا۔ صرف اور صرف خوشیاں تمہاری ہوں گی۔ بولو یہ سودا منظور ہے۔" اس نے مازیہ کے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں پر چنتے ہوئے ایک جذب کے عالم میں کہا تھا۔

"منظور ہے۔" اس نے کچھ پل کے لیے سوچا اور اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ ہوئی نا بات۔" اوصاف نے مسکراتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

اور مازیہ نے پہلی بار کھل کر مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھوں پر اپنا سر رکھ دیا تھا۔

رخسانہ نگار عدنان

ناولٹ

سعدیہ بیگم سے بیا کی گم صم کیفیت چھپی نہیں رہ پاتی۔ وہ بیا کو بہانے سے عارفہ بیگم سے ملوانے لے جاتی ہیں۔ عارفہ بیگم کی خراب طبیعت اسے ہر چیز بھلا دیتی ہے۔ وہ پوری تن دہی سے ان کی دلجوئی کرتی ہے لیکن منزہ غفور کا تجسس اسے بے کل کیے رکھتا ہے۔ زریاب کی حقیقت کھلنے پر اسے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو بے بسی کی انتہا پر محسوس کرتے ہوئے اللہ سے گڑگڑا کر سکون کی دعا مانگتی ہے۔ ولید کے ذریعے اسے رافع کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے تو وہ مزید دل گرفتہ ہو کر واپس سعدیہ بیگم کے پاس جانے کو بے چین ہو جاتی ہے۔ اس کی اچانک روانگی عارفہ بیگم خصوصاً اور ولید کو تعجب میں مبتلا کرتی ہے۔ اسی وقت کسی کی آمد سب کو چونکا دیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر اسے یہ سعدیہ بیگم کو دل تھامے پڑے دیکھ کر دھک سے رہ جاتی ہے۔

۱۷

سترہویں اور آخری قسط

ضویا کے سامنے حارث کھڑا تھا۔

"آپی آئی ہیں؟ دیکھو میں میچ ادھورا چھوڑ کر آیا ہوں۔ کدھر ہیں وہ۔ اوکے یار! تھینکس بائے۔" وہ مڑ کر اپنے لفٹ دینے والے دوست کو ہاتھ ہلاتے ہوئے اندر آگیا۔

"مگر تم تو کہہ رہے تھے آج اکیڈمی میں ٹیسٹ ہے تمہارا فزکس کا اور تم میچ کھیل کر آ رہے ہو۔" ضویا وہیں کمر پر ہاتھ جمائے کر پوچھنے لگی۔

"ڈیئر آپی! میچ کا بھی سیمی فائنل تھا۔ سمجھا کرو سب چلتا ہے۔ آپی کدھر ہیں آپی!" وہ پکارتے ہوئے اندر چلا گیا اور ضویا اسے گھورتی رہ گئی۔ ولید کندھے اچکا کر حارث کے پیچھے ہی اندر چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"ہر انسان خوش قسمتی یا بد قسمتی کو اپنی نظر سے دیکھتا اور سمجھتا ہے مگر ایک پیمانہ تو سب کی نظروں میں سب سے زیادہ قابل قدر ہوتا ہے اور وہ ہے دولت کا پیمانہ!

میری نظروں میں بھی اس پیمانے سے بڑھ کر کبھی کوئی پیمانہ نہیں رہا اور ساری زندگی میں نے اس پیمانے کے تعاقب میں سرپٹ بھاگتے گزاری اور سرپٹ بھاگنے کے دوران میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ کیسے قیمتی انمول رشتے اور لوگ میں خود اپنے ہاتھوں سے جھٹکتا دھتکارتا اس ایک بے وفا پیمانے کے پیچھے بھاگتا رہا اور اندھا دھند بھاگنے میں میں یہ قطعاً بھول گیا کہ اس پیمانے سے بے وفا شے بھی اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں بلکہ اس دنیا کے تماشا گاہ میں سراسر نظر کا دھوکا ہے۔

دولت کا یہ پیمانہ اگر کبھی میرے پاس آ بھی جاتا تو کتنے دن میرے پاس رہتا؟ گنتی کے چند دن اور ایسا ہوا بھی۔ یہ پیمانہ میرے ہاتھ آیا بھی اور میں نے خود اسے اپنے ہاتھوں سے جھٹک کر چکنا چور کر دیا ہے نا مزے کا لطیفہ!

اس لاحاصل دوڑ کے دوران میں بھول گیا کہ میری اصل دولت روپیہ پیسہ اور زر و جواہر نہیں بلکہ مجھ سے وابستہ رشتے ہیں جنہیں اس بے وفا دولت کی خاطر میں ایک ایک کر کے دھتکارتا رہا۔

میری ہر زیادتی طعن و تشنیع لاتوں گھونسوں کے جواب میں بھی مجھ سے وفادار رہنے والی میری پاکباز پرہیزگار بیوی جس نے میرے ہر ظلم کو صبر کے ساتھ سہنے کی انتہا کر دی اور اس کے صبر نے مجھے اور شہہ دی آج مجھے سمجھ میں آ رہا ہے کہ ظالم کو ظالم کون بناتا ہے مظلوم کی خاموشی اور صبر......

اس نے خاموشی اور صبر سے اپنے اعمال کے توشہ خانے میں میرے لیے دائمی سزا کیسے درج کرائی۔ ہر لات، ہر گھونسے، ہر تھپڑ، ہر الزام کا جواب آج میرے سامنے ان تاریک اندھیری خوفناک راتوں کی صورت میں موجود ہے۔

اور مجھ سا بد نصیب کون ہوگا کہ میرے جیسے بچوں کے بچپن اور لڑکپن کو ٹھڈے مارتا کاغذ کے نوٹوں کے پیچھے بھاگتا رہا اور سچ کہوں تو ان نوٹوں کے حصول کے لیے میں نے کس کس برائی کو اپنے گلے کا طوق نہ بنایا، اب یاد کروں تو جھوٹ، دھوکا، چھوٹی موٹی چوری چکاری، تھوڑا سا فراڈ، چھوٹا موٹا غبن اور سب سے بڑا ہاتھ جو میں نے ایک مالدار عورت سے جھوٹی محبت کا فریب رچا کر شادی کر کے مارنے کی کوشش کی مگر پانسہ الٹا پڑ گیا اور میرے ہاتھ ایک جھنجلائی ہوئی کوفت زدہ ناکام زندگی آئی۔

نیک بیوی کی کھری محبت اور بے ریا ساتھ نے بھی میری آنکھیں نہ کھولیں۔ حقیقتاً "میرے قلب پر دولت کی مہر لگ چکی تھی اور یہ مہر آنسوؤں سے، نیکی سے یا دعاؤں کے سحر سے ٹوٹنے والی نہیں تھی اور سچ ہی کہا گیا کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں قلب اندھے ہو جاتے ہیں۔ سو میں دولت کی حرص میں دل کا اندھا ہو چکا تھا۔ سو مجھے کیا سجھائی دیتا تھا۔ الٹا اس ہوس زر میں جو ہاتھ مارا سو الٹا ہی پڑا۔

میرے کردار کا گھٹیا پن اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ ایک بار بیوی کے دام بٹورنے کی کوشش کی تو دوسری بار بیٹی سے اور تیسری بار ایک دولت مند عورت سے...... اور میری قسمت کا مذاق دیکھو ہر بار مجھے منہ کی کھانی پڑی۔

ایمہا انصاری...... سعدیہ انصاری کے بعد دوسری بار مجھے اپنی قسمت کی لاٹری لگی تھی کہ جس کا ہر نمبر میرے مقدر سے میچ ہو رہا تھا۔ میں نے اس ٹکٹ کو استعمال بھی بڑی مہارت سے کیا اور دوسری بار قسمت نے بڑی مہارت سے اس کا جواب میرے منہ پر دے مارا اور دو ڈھائی لاکھ کے چیک اور تھوڑے سے زیورات کے ساتھ بھلا میری حرص کا منہ بند ہوتا تھا؟ مجھے تو ڈھیروں ڈھیر دولت چاہیے تھی۔

اگرچہ وہ دو ڈھائی لاکھ بھی میں نے آرام سے ہتھیا لیے۔ اپنی پھپھی جیسی بیوقوف بھتیجی سے مگر دل بے قرار کو قرار نہیں تھا اور بالآخر یوں سمجھو ہزار سالہ تپسیا کے بعد اس دولت کے طلسم کدے کا دروازہ مجھ پر کھل ہی گیا، شائستہ کی صورت میں۔

ہاں! آہ! پھر میری بری قسمت آڑے گئی۔

چند دن کے خوابناک عیش کے بعد میری حریص طبیعت نے روز سونے کا انڈا دینے والی مرغی سے سارے انڈے ایک ہی بار حاصل کرنے کے لیے مرغی ہی حلال کر ڈالی اور ساتھ ہی اس طلسم کدے سے ذلت و رسوائی کے ساتھ دھکا بھی مل گیا۔

آج میں ہوں اور عمر قید کی یہ کال کوٹھری کہ جہاں پورے قد کے ساتھ کھڑا ہوں تو کمر کو خم دینا پڑتا ہے میں جو کبھی خمیدہ کمر تو کیا خمیدہ نہیں چلا تھا اور آج سیدھا کھڑا ہونے سے بھی قاصر ہوں۔

مجھے دولت سے بڑا پیار تھا اور اس پیار نے مجھے قدم قدم پر رسوائی، جگ ہنسائی دی اور میں نہیں سمجھا اور اب اس پیار نے میرے جسم پر ہی نہیں میری روح پر بھی سکوں کے نقش کندہ کر دیے ہیں۔ میرے سارے بدن پر اٹھنی، چونی اور روپے برابر ابلے ڈ کے نشانات۔

میرا تو بدن میرے اللہ نے ٹکسال بنا دیا۔ دہکتے ہوئے سرخ سرخ جلتے بلتے دکھتے سکے...... کوئی میری اذیت میری تکلیف کا شاید ہی اندازہ کر سکے۔ درد و دکھ سے ...... آ میں لگا رہے پھر بھی گیلی لکڑی کی طرح جل رہا ہے اور کوئی خیال کرنے والا تو درکنار میری حالت دیکھنے والا بھی نہیں۔ اور یہ سب لکھنے کا مقصد یہ نہیں کہ میری حالت پر رحم کھا کر میرے لیے رحم کی دعا کی جائے، مجھ جیسا رذیل گھٹیا انسان کسی رحم، کسی ہمدردی کی دعا کا مستحق نہیں اور سچ کہوں تو میرا دل اس تکلیف دہ حالت، مار دینے والی تنہائی اور گھٹا ٹوپ اندھیرے سے نہیں گھبراتا۔ سوچتا ہوں شاید اسی طرح اگلی زندگی کی دائمی سزا میں کچھ کمی واقع ہو جائے، تھوڑی سی معافی مل جائے۔

تو پھر یہ سب لکھنے کا مقصد؟ یہ سب پڑھ کر بھی جن جن کی زندگیوں کو میں نے دوزخ بنانے کی کوشش کی ان کے دلوں میں میرے لیے ہمدردی کی رمق پیدا نہیں ہو سکتی۔

ایمہا انصاری! بیٹی اس لیے نہیں کہوں گا کہ مجھ جیسا بدبخت، باپ کہلوانے کا مستحق ہو ہی نہیں سکتا۔ جو اپنی فرشتوں جیسی معصوم بیٹی کے جذبات کو روندنے اور اس کی روح تک کچلنے سے دریغ نہ کرے، وہ کیسے باپ کہلا سکتا ہے؟

میں نے دیکھی تھی تمہاری آنکھوں میں اس منحوس پیمانے کے لیے تڑپ، تشنگی اور حسرت......

نعمتیں جب تک ہمارے پاس ہوں ہم انہیں محسوس تک نہیں کرتے بلکہ اکثر دوسروں کی طرف دیکھ کر اپنی حالت پر جلتے کڑھتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے بھی تو ایسا ہی کیا۔ کبھی باپ کی محبت نے انسانی فطرت سے مغلوب ہو کر بچوں کو سینے سے لگانے کی خواہش بھی کی تو ہمیشہ "دفع دور...... یہ چھوٹے سکے ہیں" کہہ کر جھٹک دیا اور آج...... آج بری طرح سے یہ زخمی دل ہمک رہا ہے کوئی...... کوئی میرے پاس ہو...... روشی...... رافع ایک بار ایک بار...... میں اپنے بچوں کو گلے لگا سکوں، گلے نہ بھی لگا سکوں، ان کو چھو کر ان کا محبت بھرا لمس اپنی انگلیوں کی پوروں میں محفوظ کر سکوں۔

مگر میں نے تو انہیں بھی نعمتیں کیا، ساتھ رہنے والے بھی نہ گردانا اور آج...... یہ تو میری تا عمر کی

بے بسی ہے' جس کا کوئی علاج نہیں۔

اور نعمتیں جو تم سے چھن گئیں ان کا ملال ہمہ وقت تمہاری حسرت بھری نگاہوں میں' میں نے بکھرے لیتے دیکھا۔

اب اس کال کوٹھری میں بیٹھ کر سوچتا ہوں' تجزیہ کرتا ہوں کہ ہم سے وہی کچھ چھینا جاتا ہے جو ہمارا ہوتا ہی نہیں۔

اور چھوٹا نقصان ہمیشہ بڑے فائدے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اگر ہم بے تحاشا واویلا نہ کریں تو۔

رافع' مجھ جیسے بدنصیب کھوٹے سکے جیسے انسان کا کھرا ہیرے جیسا بیٹا ہے کہ جسے یقیناً "بیٹا" پکارنے کا بھی مجھے حق نہیں مگر تم نے میری کمینگی اور گھٹیا پن کے باوجود میرے ساتھ نیکی کی ہے۔ میرے چار آنسو بہانے پر اپنی کل متاع میرے حوالے کر دی۔ اس وقت تو مجھے اپنی کامیاب اداکاری پر ہنسی اور تمہاری بیوقوفی پر مزہ آیا تھا اور آج سوچتا ہوں تو تمہاری یہ معصوم حرکت میرے لیے حسد و رشک کا باعث ہے کہ تم نے کس طرح اپنے نصیب کے خسارے کو میری تقدیر کا حصہ بنا دیا۔

"انصاری ہاؤس" کا جھوٹا سہارا' مصنوعی خوشی تم سے چھین کر رافع جیسے انمول انسان کی رفاقت شاید تمہاری اس معصومیت کو دیکھتے ہوئے رب نے تمہاری قسمت میں لکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ایمہا انصاری! خوشیاں مناؤ اور سارے آنسو دھو ڈالو... کہ میری کمینگی اور گھٹیا پن نے تمہارے لیے دائمی مسرت کا اہتمام کر ڈالا اور بھی روپے پیسے جیسی بے جان چیز کے چھن جانے پر ایک آنسو نہ بہانا۔ اپنے انمول آنسو اس چیز کے لیے بہاؤ جو تمہارے لیے رو سکتا ہے اور دولت جیسی بے وفا شے کسی کے لیے ایک قطرہ آنسو نہیں بہاتی پھر ہم اس کے چھن جانے پر کیوں روتے ہیں؟

تمہاری اصل دولت رافع جیسا بلند کردار انسان ہے اور دیکھنا تمہاری یہ دولت دن بدن دوگنی چوگنی ہوتی جائے گی کہ تمہارے دل سے اس کے چھن جانے کے سارے ملال کہیں گم ہو جائیں گے۔ اسے مخلص ایک باپ کی بے جا تعریف نہ سمجھنا اپنے بیٹے کے لیے بلکہ قربت مرگ کی گھڑیوں میں اذیت کے جہنم سے گزرتے انسان کا بے ریا مخلص مشورہ جاننا۔

تمہیں چھوٹے دکھ پہنچا کر بڑی خوشیوں کی نوید سنائی گئی ہے اس نوید کو کان لگا کر سنو۔

جانے سے پہلے معافی نہیں مانگوں گا نہ تم سے نہ کسی اور سے' مجھے معلوم ہے میں معافی کا حقدار ہوں ہی نہیں۔

اور اس خط کو پڑھنے کے بعد ضائع کر دینا آفتاب زبیری کو یہ گوارا نہیں کہ اذیت کی ان گھڑیوں میں کوئی غائبانہ ہی اس پر ترس کھائے۔ ہاں روشی سے جب بھی ملاقات ہو تو ایک الگ پیار بھرا ہاتھ میری طرف سے اس کے سر پر ضرور رکھ دینا۔

یہ خط میں تم تک کیسے پہنچا رہا ہوں؟ ان سارے بے جان نوٹوں کے بدلے جو میں نے تم سے اینٹھے تھے' اب میرے لیے کاغذ کے پرزے ہیں کسی کے کام آجائیں گے۔"

اندھیری رات کے مسافر کا آخری پیغام

صبح کے اجالوں کے نام

خط پر جا بجا آنسوؤں کے دھبے تھے اور ٹوٹی پھوٹی تحریر' بے ربط جملے آفتاب زبیری کی شکستہ حالت کے گواہ تھے۔

وہ خود بھی تو رو رہی تھی۔

اس منحوس خاکی لفافے کا عقدہ حل ہو چکا تھا۔ اور اب اسے یاد آیا تھا ملازمہ نے اسے یہ کہہ کر لفافہ دیا تھا کہ آپ کے پرانے محلے سے کوئی شخص دے کر گیا ہے۔ وہ اس وقت فریال کی اذیت بھری کہانی سن کر آرہی تھی۔ ذہنی طور پر بری طرح سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ اس نے تو شاید ملازمہ کی بات بھی نہیں سنی تھی۔ خاکی لفافے سے فوراً ہی طلاق کے وسوسے نے سر اٹھایا اور اس کے دل و دماغ کی دنیا تہہ و بالا ہو گئی۔

وہ زریاب سے ملنے کے بعد اپنے برباد دل کو پھر سے آباد کرنے کے لیے اس کی ہمراہی کے لیے بری طرح

سے بے تاب ہو رہی تھی۔ اس وقت تو اسے زریاب ہی اپنے ہر درد کا درماں' ہر زخم کی دوا لگ رہا تھا جو اس کے خوب صورت رومانس بھرے ماضی کو ایک بار پھر زندہ کر کے اس کی زندگی کا حصہ بنا سکتا تھا اسی لیے تو رافع سے علیحدگی کے مطالبے میں شدت آگئی تھی۔

اور زریاب کی جو بھیانک صورت فریال نے اسے دکھائی تھی' اسے لگا وہ اپنی کوتاہ بینی اور حماقت کے ہاتھوں خود اپنی زندگی کی کشتی کو آگ لگانے چلی تھی۔

رافع کے ساتھ وہ کیوں ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی تھی؟ وہ جب بھی رافع کی ڈلی ہوئی شخصیت کا زریاب کی شاندار' ڈیشنگ پرسنالٹی اور دولت کی چمک دمک سے مقابلہ کرتی تو دل ہر سمجھوتے سے انکار کر دیتا۔

اس کے دل کی دوسری چبھن' جب اس نے رافع کو روشی کے معاملے میں جنگلیوں کی طرح چیختے اور گالیاں بکتے سنا۔

اور جو زبان اور فحش گفتگو زریاب کے بارے میں فریال نے بتایا۔ رافع کی بدکلامی اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھی۔

زریاب کے مقابلے میں رافع کی عزت کیا!

مگر آج وہ جس مقام پر کھڑا تھا وہ اس کی اپنی ان تھک محنت کا پھل تھا۔ کسی کے باپ کی بخشی ہوئی وراثت نہیں جس کے بل بوتے پر زریاب اپنا قد کاٹھ اونچا کیے کھڑا تھا۔

اور میرا دل جو اس سے خائف تھا اس دل میں لطیف درد نے کروٹ لی کہ وہ مجھے... ایمہا انصاری کو کیسے نظر انداز کر سکتا ہے۔ ہاں صرف یہ غم تھا سب سے بڑا کہ وہ مجھے اگنور کر رہا ہے۔

"یعنی ابھی رافع نے کوئی فیصلہ نہیں کیا... اور ان سارے نئے واقعات کی روشنی میں ابھی تو میرے دل نے بھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔" اچانک ہی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی تھی نہ جانے کب کا سینے میں گھٹا ہوا سانس اس نے بے حد اطمینان سے خارج کیا۔

"وہ سب کچھ جو میرے دل کے نہاں خانے میں اندر ہی کہیں پوشیدہ ہے وہی سب تو رافع کے دل میں ہے تب ہی تو وہ میری ضد کو ٹالے جا رہا ہے۔

وہی... وہی تو ہے میرا چارہ گر... میرے ہر درد کی دوا اور میں خواب کے پیچھے' سراب کے پیچھے خوار ہو رہی تھی۔"

وہ آنکھیں موندے مسکرائے جا رہی تھی۔ ایک زمانے کے بعد جیسے اس کے اعصاب پر دھری غم کی چٹانیں ایک ایک کر کے اس کے قدموں میں جا گری تھیں۔ اس کے کندھے ہر بوجھ سے آزاد ہو گئے تھے۔

وہ اٹھی اور اس خط کو ضائع کرنے چل دی آفتاب زبیری کی خواہش کے مطابق... شاید اسی ایک نیکی کے عوض اس دنیا یا اس دنیا میں آفتاب زبیری کی سزا میں تخفیف ہو جائے۔

"ان کے مجھ پر ایک نہیں دو احسان ہیں۔ ایک اس طوفانی رات کو مجھ پر جھوٹا الزام لگانے کا احسان اور دوسرا آج..." وہ جلتے ہوئے کاغذ کے شعلوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"اسی لیے پھپھو رو رہی تھیں۔" اسے سعدیہ بیگم کے آنسو یاد آئے دفعتاً" باہر فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"رافع کا فون ہو گا۔" پہلی بار اس کا دل فون کی گھنٹی سن کر انوکھی تال پہ دھڑکا تھا۔

وہ تیزی سے فون کی طرف بڑھی۔

"تمہارے پاس مجھ سے ملنے کے لیے صرف اڑتالیس گھنٹے ہیں۔ ان دو دنوں کے دوران اگر تم مجھ سے ملنے نہ آئیں تو مجھ سے محبت کے جو نئے پیمان تم نے باندھے ہیں پرسوں تک سارے شہر میں نشر ہو جائیں گے۔ مجھے معلوم تھا تم ایک دن میرے ساتھ یہ شعور رویہ ضرور اپناؤ گی اسی لیے... میں نے اس دن کی تیاری پہلے سے کر رکھی تھی۔ ہم دونوں کے بیچ ٹیلی فون پر ہونے والی میرے بلیک بیری کا ریکارڈنگ بٹن ہمیشہ آن ہوتا تھا کہو تو کوئی خوب صورت سے دو چار جملے سنوا دوں یا تم یونہی مجھ سے ملنے آجاؤ گی؟" اس وقت اس کی جو ذہنی حالت تھی وہ کسی بھی طرح زریاب کے فون کے لیے تیار نہ تھی اور اس کا فون نہ سننے کے لیے

تو اس نے اپنا سیل فون مسلسل آف کر رکھا تھا۔ مگر وہ اس طرح کے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر سکتا ہے اس کا اسے قطعاً" اندازہ نہیں تھا۔

"نہیں...... میں نہیں آؤں گی جو کر سکتے ہیں کر لیں۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

"ویل ڈن ویری ویل۔ مجھے تمہاری یہ بہادری پسند آئی۔ اوکے اب سب کچھ تمہارے حسب خواہش ہو گا بلکہ یہ تو تمہارے ساتھ نیکی ہی ہو گی کہ رافع جو تمہیں طلاق دینے پر آمادہ نہیں وہ تمہاری رومانٹک گفتگو سننے کے بعد ایک منٹ کی تاخیر نہیں کرے گا۔ چلو ہم کسی کا بھلا ہی کر سکیں۔ تم نہیں آتیں نہ سہی کل یا پرسوں شام کو میں خود حاضر ہو جاؤں گا کیونکہ تین دن بعد میری سیٹ کنفرم ہے۔ اب جانے سے پہلے اپنی ڈارلنگ سے آخری ملاقات نہ کی تو یہ پیار کی بدنامی ہو گی چلیں۔ جی محبت کے سارے تقاضے ہم ہی نبھالیں گے۔ اوکے ٹیک کیئر باقی ملنے پر......"

اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔

اسے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ جس شاخ پر بیٹھی تھی بار بار اسے کاٹنے کی کوشش کر چکی ہے اور آج اس کی یہ کوشش رنگ لا رہی تھی۔

"تو یہ ہے میری زندگی میں خوشی کی حقیقت...... رافع کتنا ہی بلند کردار، روشن خیال، کھرا اور مخلص کیوں نہ ہو کم از کم بے غیرت نہیں۔ اس کا تو مجھے اچھی طرح سے علم ہے جب بھی موقع آیا وہ غیرت پر محبت اور اپنی ذات کی ہر خوشی کو قربان کر ڈالے گا۔ اوہ میرے خدا! یہ میں نے کیا کیا؟؟"

وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے جھکتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"کل سے عارفہ بھابی اور ضوبیا کے دس فون آ چکے ہیں کہ تم اچانک کیوں چلی آئیں اور فوراً" آنے کا کہہ کر آئی تھیں پھر آئیں بھی نہیں۔ بے چارہ حارث تو تم سے ملا بھی نہیں۔ چلو رہنا نہیں ویسے جا کر مل آؤ۔" پھپھو اٹھتے بیٹھتے اسے کہہ رہی تھیں۔

اور وہ بس ٹکر ٹکر انہیں دیکھے جاتی یا وہاں سے اٹھ کر چل دیتی۔

"آخر ہوا کیا ہے، کچھ پتا بھی تو چلے کسی نے کچھ کہہ دیا اور یہ رافع کو دیکھو پورے چار دن ہو گئے آج کوئی فون نہیں آیا خود کر رہی ہوں تو وہ مشین بولتی ہے آگے سے...... ایسے تو کبھی نہیں ہوا کہ وہ مجھے فون کرنا بھول جائے۔" وہ بات کرتے کرتے اٹھ کر چل دیں۔

"عصر کا ٹائم ہو رہا ہے نماز پڑھ لوں۔ تم بھی اٹھ کر پڑھ لو اور چلو وہ گھڑی جا کر ان سے مل آتے ہیں۔ تم ذرا رافع کو فون کرنے کی کوشش تو کرو شاید نمبر مل ہی جائے۔" وہ جاتے جاتے اسے کہہ گئیں۔

وہ بیٹھی لب کاٹتی رہی۔

"زریاب کی ڈیڈ لائن ختم ہونے میں چند گھنٹے باقی ہیں۔ رات کو یا کل شام...... یا اللہ! میں کیا کروں......؟ پھپھو کو بتا دوں سب۔ وہ کیا سوچیں گی کہ میں اس طرح جھوٹ بول بول کر اس سے ملنے جاتی تھی۔ بے شرمی اور ڈھٹائی کے ساتھ۔"

وہ بے چینی سے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

وہ ایک پل کو خوفزدہ سی ہو گئی۔

"زریاب کا فون ہو گا۔" وہ وہیں کھڑی سہمی ہوئی نظروں سے بجتے فون کو دیکھتی رہی۔

"رافع کا فون نہ ہو میں اسی سے پوچھوں وہ کب آ رہا ہے؟" اسے اس پل رافع کا خیال کسی ڈھال کی طرح لگا تھا، چھپر چھاؤں کی طرح...... بے اماں گھڑی میں کسی سائبان کی طرح۔

"ہیلو......" اس نے کانپتی آواز میں ریسیور کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔

"بیا بیا! تم آ جاؤ...... تم کیوں چلی گئی تھیں می......" ضوبیا بری طرح سے رو رہی تھی۔

"ضوبیا! کیا ہوا! بولو کیا ہوا ممی کو؟" وہ تڑپ کر بولی۔

"ابھی تایا جی آئے تھے انہوں نے ممی کو، چاچو کو، ولید کو بہت برا بھلا کہا اور ساتھ ہی کہہ گئے کہ ہم لوگوں کا جتنا بھی حصہ بنتا تھا وہ ماہانہ خرچ کی صورت میں انہیں دیتے رہے ہیں۔ سارا حساب کتاب ان کے پاس لکھ رکھا ہے ہمارے حصے میں فقط دو تین لاکھ آئیں گے ورنہ کہتے ہیں تم لوگ کیس کر دو۔ ممی تو کچھ بول ہی نہ سکیں وہ گرجتے برستے چلے گئے اور ممی وہیں بے ہوش ہو گئیں۔ میں انہیں ہسپتال لے کر جا رہی ہوں، پلیز تم آ جاؤ۔"

"میں آ رہی ہوں ضوبیا! تم فکر نہیں کرو گھبراؤ نہیں میں آ رہی ہوں۔" وہ آنسوؤں کے درمیان تیزی سے بولی۔ ضوبیا شاید پہلے ہی فون بند کر چکی تھی۔

"کیا ہوا؟" پھپھو اس کی پریشان آواز سن کر اس کے پاس آ کھڑی ہوئیں تو اس نے روتے ہوئے ساری بات بتا دی۔

"اوہ یہ تو بہت برا ہوا۔ پتا نہیں بھائی صاحب نے اس دولت کی خاطر اور کتنی جانوں سے کھیلنا ہے اور جس کے لیے یہ سب کچھ سمیٹ رہے ہیں وہ عیش میں اڑاتے ہوئے گویا اسے تیلی لگا رہا ہے۔ چلو تم کپڑے بدل لو ہم بھی چلتے ہیں۔" وہ اسے دلاسا دیتے ہوئے بولیں۔

"نہیں میں ایسے ہی ٹھیک ہوں چلیں۔"

وہ دونوں جب ہسپتال پہنچیں تو عارفہ بیگم کو آئی سی یو میں لے جایا جا چکا تھا۔

"ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں اگلے چوبیس گھنٹے ان کے لیے بے حد خطرناک ہیں اگر سروائیو کر گئیں تو ٹھیک ہے ورنہ...... بہت جان لیوا ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" ضوبیا نے روتے ہوئے بتایا تھا۔

کھڑے کھڑے سب کی ٹانگیں شل ہو گئیں اور دعا کرتے لب تھکنے لگے باہر شام گہری رات میں ڈھل رہی تھی۔ اس کا موبائل بار بار بج رہا تھا اور ہر بار نمبر دیکھتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگتا۔

اسے رافع کی کال کا انتظار تھا اور زریاب...... شاید انتظار کی آخری انتہا پر تھا۔

"بیگم صاحبہ! مجھے اجازت ہے میں جاؤں۔ موسم بھی خراب ہو رہا ہے۔" ڈرائیور سعدیہ بیگم کے پاس آ کر بولا تھا۔

"ہاں تم جاؤ۔" انہوں نے اسے اجازت دے دی۔

"ٹھہرو حبیب گل۔" وہ چند لمحوں بعد اس کے پیچھے چلی آئی۔

"مجھے جاتے ہوئے ذرا ڈراپ کر دینا۔" اس نے آر یا پار ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"یوں اس کو اور شہہ مل جائے گی، مجھے کہا تو نہیں جائے گا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" اس نے دل میں سوچا اور پھپھو کو تھوڑی دیر میں آنے کا کہہ کر چلی آئی۔

"بی بی جی باہر موسم بہت خراب ہے۔ بارش ہو رہی ہے اور بادل......"

"تم مجھے صرف ڈراپ کرو گے۔" وہ دو ٹوک لہجے میں کہتے ہوئے اس کے ساتھ باہر آ گئی۔

باہر تیز بارش ہو رہی تھی اور سارا آسمان بادلوں سے اٹا پڑا تھا۔

"تو میری قسمت کا فیصلہ آج پھر یہ دیوانہ وار برستی بارش ہی کرے گی۔" وہ ونڈ اسکرین پر تیزی سے گردش کرتے وائپرز کو دیکھتے ہوئے ہنسی تھی۔

وہ اب اس کشمکش کے برزخ سے نکل آنا چاہتی تھی اور اس برزخ سے نکلنے کا تاوان کیا ہو گا اس کی خبر اس کے دل ناداں کو نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

"وہ کہہ رہے ہیں وہ نیچے نہیں آ سکتے انہیں ٹمپریچر ہے آپ اوپر آ جائیں۔" ریسپشنسٹ نے ریسیور رکھتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ چند لمحے سنگی فرش پر جیسے گڑی رہ گئی۔

"یہ خوف یہ وحشت میری جان لے لے گا۔ آج جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" اس نے لفٹ سے اتر کر کاریڈور کے ریڈ کارپٹ پر چلتے رکتے بے شمار بار سوچا اور آخر کار فیصلہ کر لیا۔

"بس جو ہو سو ہو۔" اور وہ اندر داخل ہو گئی۔

وہ واش روم سے گیلا چہرہ لیے نکل رہا تھا اس کی طرف دیکھ کر بڑی جاندار مسکراہٹ اچھالی۔

"میں نیچے آنا چاہ رہا تھا مگر نقاہت ملنے نہیں دے رہی تھی۔ اسی لیے تمہیں زحمت دی ورنہ تمہارے خوف سے میں آگاہ ہوں۔" وہ جتانے والے انداز میں بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے کنکھیوں سے سائیڈ ٹیبل پر پڑی "بوتل" کی طرف دیکھا زریاب کی آنکھوں کے سرخ ڈورے اور لڑکھڑاتا لہجہ تو اس کا گواہ تھا۔

"بیٹھو نا میں جانتا ہوں تم کتنی بہادر ہو۔" اس نے بے تکلفی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر کاؤچ پر بٹھانا چاہا۔

"پلیز۔" وہ جیسے کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی تھی۔

"میں خود بیٹھ سکتی ہوں اور میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔" اسے یک دم یاد آیا تھا کہ ممی ہسپتال میں ہیں اور کس وجہ سے ہیں۔ اس کا خون کھولنے لگا۔

"میں جانتا ہوں مائی ڈیر! یہ ادائیں حسین والوں کی شان ہوتی ہیں۔ تمہاری موجودگی اور یہ قاتل موسم ہم خود کو سنبھالیں تو کیسے؟" وہ لڑکھڑاتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

"شٹ اپ۔۔۔" اس نے چلاتے ہوئے اسے دھکا دینے کی کوشش کی مگر وہ تو کسی بھاری چٹان کی طرح وزنی تھا۔

"چھوڑو مجھے۔۔۔ چھوڑو۔۔۔" اس نے اپنی پوری طاقت لگائی تھی اسے دھکیلنے کے لیے۔

"چھوڑنے کے لیے تو نہیں پکڑا زریاب۔۔۔ بس چند خوب صورت لمحات اس حسین شام میں اپنے اس پروانے کی جھولی میں ڈال جاؤ اور بس۔۔۔ اتنی سی بات کے لیے اتنے نخرے۔۔۔ بھول گئیں کبھی ہم بھی تمہاری چاہ تھے۔ تمہاری صبح تھے تمہاری شام تھے۔۔۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد۔۔۔" وہ اس کے بازو جکڑے لڑکھڑائی آواز میں کہہ رہا تھا۔

اسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ اتنی کمزور اور کم ہمت ہے تھوڑی سی کوشش اور زور آزمائی کے بعد ہی اس کی ہمت دم توڑ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

جس کے ساتھ کبھی اس نے دن رات رو رو کر دعائیں مانگی تھیں آج اس کے ساتھ رسوائی اس کا مقدر بننے والی تھی۔

"میں نے ایسا کیوں کیا۔۔۔؟ کیوں آگئی اکیلی ادھر فریب کھانے۔۔۔ فریال نے کہا تھا۔۔۔ بیا! وہ انسان کے روپ میں بھیڑیا ہے شیطان ہے۔۔۔ اور میں نہ جانے کس زعم میں اس شیطان سے نپٹنے چلی آئی میرے خدا میری مدد کر۔۔۔"

اور پھر تو نہ جانے کیسے اس کے اندر کوئی لاوا سا بھڑک اٹھا تھا۔

اس نے زریاب کے ہاتھ پر زور سے کاٹتے ہوئے پوری طاقت سے اسے دھکا دیا اور کاؤچ کے دوسری طرف الٹ گئی۔

زریاب شاید اس کے کمزور پڑ جانے سے اس دھکے کے لیے تیار نہیں تھا گرتے ہوئے اس کا سر ٹیبل کی سائیڈ سے ٹکرایا چند لمحوں بعد وہ سر پکڑ کر بمشکل اٹھا۔ ایمہا کے پاس یہی چند لمحے تھے۔ اس نے واش روم کے پاس پڑا پیتل کا گملا اٹھا کر زریاب کی طرف پھینکا۔ اور زریاب کے منہ سے نکلنے والی تیز چیخ نے اسے بتا دیا کہ اس کا نشانہ خطا نہیں ہوا۔

وہ اس کے گرنے کا انتظار کیے بغیر دروازے کی طرف لپکی پتا نہیں دروازہ باہر سے لاک تھا یا آٹو میٹک لاک ہو گیا تھا اس کی ہزار کوشش اور جھٹکوں سے بھی نہ کھل سکا۔

زریاب دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ چیختی ہوئی واش روم کی طرف بڑھی اور جلدی سے اندر گھس کے لاک لگا لیا۔

وہ اب دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ "اگر اس نے لاک باہر سے کھول لیا تو۔۔۔" اس نے گھبرا کر دروازے کے اوپر لگی چٹخنی بھی چڑھا کر لی اور خود نیچے گرتے ہوئے بے اختیار رونے لگی۔

کتنی ہی دیر گزر گئی اسے کچھ پتا نہیں چلا۔

"کیا کروں باہر بھی مکمل خاموشی ہے کیا معلوم وہ درندہ گھات لگائے بیٹھا ہو۔۔۔ اب کیا میں ساری رات ادھر۔۔۔ ایک بار پھر نہیں نہیں میرے خدایا! اب کی بار نہیں۔ رحم کر مجھ پر رحم کر میری خطائیں بخش دے۔ ممی پھپھو میں نے یہ کیا کر ڈالا کیا کروں؟" وہ منہ پر ہاتھ رکھے اپنی سسکیاں روکنے کی کوشش کرنے لگی۔

باہر ابھی بھی بارش ہو رہی تھی۔ باتھ روم کی چھت کے پاس چھوٹا سا روشن دان تھا بارش کی آواز ادھر ہی سے آرہی تھی۔

"یا اللہ! کیا کروں کیا دروازہ کھول کر باہر جاؤں۔" وہ وحشت بھرے انداز میں اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

کان لگا کر دروازے سے باہر کوئی آواز سننے کی کوشش کی مگر باہر مکمل خاموشی تھی۔

"اگر زریاب کو کچھ ہو گیا۔۔۔ وہ گملا کتنا بھاری تھا اس کے شاید خون بھی نکل رہا تھا۔۔۔ میں یہاں باتھ روم میں بند۔۔۔ اور وہ باہر مر۔۔۔ نہیں نہیں میں مر جاؤں گی۔" اس خیال سے تو اس کی روح تک کانپ اٹھی تھی ایسا بہرحال اس نے کبھی بھی نہیں چاہا تھا۔

"اگر زریاب ٹھیک ٹھاک ہوا اور ہوش میں۔۔۔ اور میرے انتظار میں۔

اور اگر وہ۔۔۔ مر گیا ہو۔۔۔ تو بھی میں نہیں بچ سکوں گی۔۔۔"

ایک طرف کنواں اور دوسری طرف کھائی والا حساب تھا۔ اسے لگا یہ منحوس بارش اس کی زندگی کو آخری اندھیروں کے حوالے کرنے آئی ہے۔

وہ نیچے بیٹھ کر ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"کاش میں کسی کو بتا ہی آتی۔۔۔ ولید کو ہی ساتھ لے آتی کسی کو تو ہمراز بنایا ہوتا۔۔۔ حارث کو لے آتی۔۔۔ میرا موبائل باہر پڑا ہے کمرے میں۔۔۔ اگر میں کسی طرح ولید کو کال کر سکوں۔۔۔ مگر باہر کیسے جاؤں؟"

اور پھر شاید اس کے آنسوؤں پر تقدیر کو ترس آ گیا کسی دل سے چاہنے والے کی کوئی دعا اس کے حق میں مقبول ہوئی یا اس کی اپنی ہی کسی نیکی کا بدلہ۔۔۔ اس کے کان قریب ہی کوئی غیر مانوس سی آواز سن رہے تھے۔

اس نے گھبرا کر چہرے سے ہاتھ ہٹائے اور ادھر ادھر دیکھا۔

"او میرے خدایا۔۔۔ مائی گاڈ او۔۔۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ سارے سفر کے دوران ایک پل کے لیے بھی پرسکون نہیں ہو سکا تھا۔ اس ذہنی کھنچاؤ نے اس کے اعصاب شل ڈالے تھے مگر کوئی حل نظر نہ آتا تھا۔ ایک آخری حل تو ان کاغذات کی صورت میں اس کے بریف کیس میں موجود تھا جو وہ ڈائیورس پیپرز کی شکل میں تیار کروا کے لے جا رہا تھا۔

بیا کے لیے۔۔۔ جو اس نے اپنے لیے اکلوتی فرمائش کی تھی۔۔۔ وہ کیسے اس کی یہ خواہش پل صراط سے گزر کر پوری کرنے کے قابل ہوا تھا یہ بس وہی جانتا تھا۔

"کاش۔۔۔ کاش پہلے دن سے میں اپنے دل میں چھپے ان جذبات کو بیا پر آشکار کر دیتا خواہ اسے ناگوار ہی گزرتا جس طرح آہستہ آہستہ وہ ناموافق ماحول میں رہنے کی عادی ہوتی چلی گئی اسی طرح میرے جذبات بھی اس کے دل پر خواہ ہولے ہولے سہی اثر کرتے جاتے مگر میں نے تو ان جذبات کو سیپ کے موتی کی طرح سخت خول جیسے نظر انداز کر دینے والے رویے کے پیچھے چھپا کر رکھا اچھے حالات سے مشروط کر کے۔۔۔ جب میں بیا کے لیے سب سہولتیں حاصل کر لوں گا پھر ان موتیوں جیسے سچے آبدار کھرے جذبات کو اس کے سامنے کھول کر رکھ دوں گا۔

اور میں جو ساری زندگی وقت کی قدر کو اپنی ہر ترجیح پر اولیت دیتا رہا بیا کے معاملے میں بھول گیا کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا کہ مناسب و موافق حالات پیدا ہونے پر مجھ جیسے منصوبہ ساز اپنے جذبات کا اظہار

سامنے صوفے پر ولید کا موبائل پڑا تھا جاتے ہوئے شاید وہ ادھر ہی بھول گیا تھا۔ رافع نے آگے بڑھ کر موبائل اٹھالیا۔

"و..... ولید میں بیا..... ! پلیز تم تو ہیلپ می..... میں ہوٹل..... کے کمرہ نمبر..... میں ہوں۔ میں یہاں لاکڈ ہوں۔ پلیز آجاؤ پلیز ولید" وہ ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور رافع کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

اسے بیا کی بات سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر ہچکیاں سن کر اس کی سماعتوں میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔

"وہ اس وقت ہوٹل کے کمرے میں کیا کرنے گئی ہوگی اور..... اور ولید کو فون..."

"اللہ کا شکر ہے چھوٹی تائی کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ ڈاکٹرز کافی مطمئن ہیں۔ خطرہ تو ابھی ہے مگر پہلے سے کم تمہارا آنا مبارک ہوا۔" اسی وقت ولید اندر آتے ہوئے بولا تو رافع نے چونک کر ہاتھ میں پکڑا موبائل دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے ہاتھ پشت پر کرلیا۔

"تمہارے پاس گاڑی ہے نا !" وہ یک دم ولید سے بولا۔

"ہاں ہے۔" وہ کچھ حیران سا بولا۔

"مجھے ذرا چابی دو میں ابھی تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔" وہ عجلت بھرے انداز میں بولا تو ولید نے کچھ بھی پوچھے بغیر چابی نکال کر اس ہاتھ پر رکھ دی تو وہ ولید کا موبائل آہستگی سے پیچھے صوفے پر رکھتے ہوئے "ابھی آتا ہوں۔" کہہ کر باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

دروازہ لاکڈ تھا چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے دروازے پر دستک دی۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔

اس نے ایک قدم پیچھے ہو کر روم نمبر پڑھا یہی نمبر تھا جو ایبہا نے بتایا تھا۔ رافع نے اب کے ذرا زور سے دستک دی۔ مسلسل خاموشی پر اس نے کی ہول سے اندر جھانکا۔

سامنے بیڈ خالی تھا۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑی بوتل نے اس کا خون کھولا دیا۔ اس نے دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کردیا۔

"ایبہا ! تم اندر ہو تو دروازہ کھولو۔" اس بار اس نے بلند آواز میں کہا تھا۔ بند دروازے کے پیچھے ہلکی سی آہٹ ہوئی۔

"دروازہ لاکڈ ہے شاید۔" اس کی کانپتی ہوئی آواز رافع کو سنائی دی تو ایک گہرا اطمینان اسے اپنے رگ و پے میں اترتا محسوس ہوا۔ وہ حیران سے تھی۔

"ہینڈل کو گھما کر دیکھو ورنہ چابی اندر ہی نہیں ہوگی۔"

دروازے کے ساتھ کھٹ پٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ رافع کے صبر کا پیمانہ جیسے چھلکنے کو تھا تب ہی دروازہ کھل گیا۔

"را..... رافع۔" وہ رافع کو اپنے سامنے پانے کی بالکل بھی توقع نہیں کر رہی تھی۔ اس کی حالت بے حد مخدوش ہو رہی تھی۔

"رافع۔" پھر گھٹی گھٹی سی چیخ اس کے لبوں سے نکلی اور وہ اس کے فراخ سینے میں منہ چھپا کر ہچکیوں سے رونے لگی۔

"چپ کرو بیا ! پلیز چپ کر جاؤ دیکھو یہاں سب....." وہ اسے اپنے ساتھ لگائے دو قدم اندر کمرے میں آگیا۔

"نہیں نہیں مجھے اندر نہیں جانا۔ مجھے یہاں سے لے چلیں..... چلو۔" وہ ایک جھٹکے سے اس کے سینے سے علیحدہ ہوتی ہوئی باہر کی طرف لپکی۔

"اچھا چلتے ہیں ایک منٹ ٹھہرو۔" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے اندر کی طرف دیکھنے لگا۔

"رافع ! چلیں..... چلیں پلیز میں مر جاؤں گی چلیں۔" وہ ایک بار پھر اس کے ساتھ لپٹتے ہوئے ہسٹریائی انداز میں چلائی تھی۔

اس نے کندھوں سے پکڑ کر ایبہا کا چہرہ سامنے کیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر کوئی نشان نہیں تھا جبکہ گردن پر دو تین جگہ خراشیں تھیں۔

اس کے یوں دیکھنے پر وہ ایک پل کو ٹھٹکی — اور اسے پہلی بار اپنے دوپٹے کی غیر موجودگی کا احساس ہوا۔ بے اختیار اس نے مڑ کر اپنے دوپٹے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔

دوپٹہ تین قدم کے فاصلے پر کاؤچ کے پاس پڑا تھا۔ رافع نے آگے بڑھ کر اسے دوپٹہ پکڑایا اور باتھ روم کے دروازے کے پاس ڈھیر ہوئے زریاب کو جھک کر دیکھنے لگا۔

"بظاہر وہ زخمی نہیں تھا مگر بے ہوش تھا۔

"چھوڑ دیں رافع ! اس موذی کو..... پلیز چلیں..... چلیں یہاں سے۔" وہ اس کی شرٹ کا کالر پیچھے سے کھینچتے ہوئے خوفزدہ آواز میں بولی۔

"ایک منٹ دیکھ تو لینے دو کہیں خدانخواستہ....." وہ اس کے دل کی دھڑکن اور نبضیں چیک کر رہا تھا۔ اسے شاید کہیں گہری چوٹ آئی تھی۔

رافع نے اسے بمشکل اٹھا کر بیڈ پر لٹایا۔ ایبہا نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

رافع نے گاڑی میں آکر بیٹھنے تک اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ خود کو بمشکل گھسیٹتے ہوئے چل رہی تھی۔ گھنٹہ بھر کے اس جان لیوا حادثے نے اس کے جسم سے ساری توانائیاں نچوڑ لی تھیں۔

لفٹ سے باہر قدم رکھتے ہی وہ چکرا کر گرنے لگی تھی۔ رافع نے اسے کندھے سے تھام کر سہارا دیا اور اسے پتا بھی نہیں چلا ان ہاتھوں کی اجنبیت کب اس کے لیے اتنی گہری اپنائیت میں بدلی کہ اسے ان کا لمس ناآشنا محسوس ہی نہیں ہوا۔

"تم بیٹھو میں ابھی آیا۔" اسے گاڑی میں بٹھا کر وہ ایک بار پھر ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ وہ ریسپشنسٹ سے کچھ کہہ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا۔

باہر بارش تھم چکی تھی۔ مگر سڑکیں ابھی گیلی تھیں۔ رات گہری اور تاریک ہو چکی تھی۔ ہوٹل کی بارونق سڑک سے مڑتے ہی آگے سب طرف خاموشی سناٹا اور اندھیرا تھا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی رافع کے سوالوں کا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا ولید نے رافع کو بھیجا ہے؟" اس کو یہ الجھن بھی پریشان کر رہی تھی۔ مگر رافع تو یوں لب بھینچے انہماک سے ڈرائیونگ کر رہا تھا جیسے ساتھ بیٹھے اس کے وجود ہی سے لاعلم ہو۔

گاڑی نے موڑ کاٹا ہی تھا کہ گھڑ گھڑ کی آواز کے ساتھ اس کا انجن بند ہو گیا۔

"کیا مصیبت ہے۔" وہ اترتے ہوئے بڑبڑایا اور بونٹ اٹھا کر چیک کرنے لگا۔

ایبہا کی پریشان بھٹکتی نگاہیں اچانک اپنے بائیں جانب دیکھتے ہوئے ٹھہر سی گئیں۔

اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ مانوس رستوں پر سفر کر رہی تھی۔ نہ جانے کب اور کیسے زندگی ایسے رخ بدلتی ہے کہ مانوس رستے اجنبی اور اجنبی راہ گزر انسان کو اس کی منزل کی جانب لے جاتی ہوئی ہے۔

وہ "انصاری ہاؤس" کے سامنے کھڑے تھے جس کے باہر مین گیٹ کے اوپر بڑا سا بینر لگا تھا برائے فروخت کا۔

کبھی یہ انصاری ہاؤس اس کے لیے باغ عدن کے باغوں میں سے ایک تھا جس سے نکلے جانے کا غم اسے آدم و حوا کی طرح دن رات رلاتا تھا۔ یہ وہ سراب تھا جس کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اس نے اپنے خوابوں کے پاؤں ہی لہولہان نہیں کیے تھے آج اپنی جان اور آبرو سب داؤ پر لگانے چلی تھی۔

سراب خواب ہی تو ہوتے ہیں اور خواب بند آنکھوں سے ہی دیکھے جائیں تو بھلے لگتے ہیں۔ حقیقت میں ان کے تعاقب میں نکلو تو تلخ حقیقتوں کے پتھر آدمی کی آنکھیں پھوڑ دیتے ہیں۔

"دشکر ہے لمبی گڑبڑ نہیں تھی۔" کب رافع نے اس کے برابر آکر بیٹھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اسے پتا نہیں چلا۔ ایبہا کی محویت پر ایکسیلیٹر پر پڑا اس کا پاؤں ذرا سا پیچھے ہٹا تھا۔ انصاری ہاؤس پر سے بڑا.....

فروخت کے بینر نے اسے ذرا سا چونکایا پھر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

ایبہا کی محویت ٹوٹی تو ایک گہرا سانس لے کر اس نے گردن موڑ کر رافع کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بار پھر گاڑی ڈرائیو کرنے میں محو ہو چکا تھا اس کی موجودگی سے لاعلم۔

ایبہا کا جی چاہا وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے یا چلا کر اس سے پوچھے کہ وہ اس سے کچھ پوچھتا کیوں نہیں۔

وہ بے بسی کے اپنے گہرے احساس میں گرفتار لب کاٹتے ہوئے اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔

"تم فریش ہو آؤ پھر ہسپتال چلتے ہیں۔" وہ رافع کی آواز پر چونکی۔ ان کی گاڑی گھر کے آگے کھڑی تھی۔

"یہ چابی لے لیں۔ میں ای سے لے کر آیا تھا۔" اس نے چابی دیتے ہوئے کہا تو اسے گہری شرمندگی نے آلیا اس کے جملے سے کوئی کیا کچھ نہیں اخذ کر سکتا تھا۔

"اگر اللہ نے میرا پردہ رکھنا ہوتا تو یقیناً" ولید کو بھیجتا رافع کو بھیجنے کا مطلب ..... اب جو بھی کچھ ہے میں خود رافع سے پوچھ لوں گی اس نے کیا طے کیا ہے، مزید شش و پنج کی حالت میں رہ کر مجھے ایک بار پھر ان وسوسوں کی سولی پر نہیں لٹکنا۔" وہ دل میں فیصلہ کرتے ہوئے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

اس کی گود سے کوئی چیز آہستہ آواز کے ساتھ نیچے گری تھی۔ پہلے رافع کا ارادہ بھی اندر جا کر تھوڑا فریش ہونے کا تھا مگر نیچے گری اس چیز نے اسے گاڑی میں بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے اب اپنی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔" وہ دھوپ میں کرسی پر بیٹھی تھیں اور بیا ان کی کمزور پنڈلیوں اور پاؤں پہ زیتون کے تیل سے ہلکا ہلکا مساج کر رہی تھی۔ ضویا ان کے پاس بیٹھی سیب کاٹ رہی تھی۔

"ممی یہ کون سی نئی بات ہے۔ بے چاری اولاد آدم جیسے ہی پیدا ہوتی ہے موت کا خوف اس کے بڑے ہونے کے ساتھ ہی بڑا ہوتا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ابھی حضرت ملک الموت میرے سامنے آئے اور ضویا بی بی ..... مرحومہ ہو گئیں کہ ہو گئیں۔" وہ سیب کی پتلی پتلی قاشوں پر نمک اور کالی مرچیں چھڑکتے ہوئے مزے سے بولی۔

"ہر وقت اول فول نہ بکا کرو۔ اس بار تو شاید تم دونوں کی دعائیں مجھے کھینچ لائیں مگر اب مزید انتظار ..... میں ..... میں نے تمہاری چچی اور چچا کو آج شام بلوالیا ہے شادی کی ڈیٹ فکس کرنے کے لیے۔ تمہاری پھپھو تو تھوڑی دیر میں آنے والی ہیں ان سے کچھ مشورہ کرنا ہے اور۔"

"ممی! اللہ کا خوف کھائیں۔ ابھی آپ کو ہسپتال سے ڈسچارج ہوئے ایک ہفتہ ہوا ہے اور آپ ڈھول ڈھمکے کا پروگرام بنا رہی ہیں۔" ضویا زور سے چیخی تھی۔

"پھر وہی فضول بکواس۔ تم اٹھو اور جا کر کچن کو دیکھو۔ میں بیا سے بات کر لیتی ہوں۔" انہوں نے باقاعدہ ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھا دیا۔

"ماشاء اللہ ممی جی! کیا سیانا بندہ ڈھونڈا ہے آپ نے مشورے کے لیے۔" وہ بیا کی سنجیدہ شکل کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "ان سے تو اچھا آپ کو یہ سامنے والی دیوار مشورہ دے دے گی۔ نہ دیوار نے آگے سے ہوں ہاں کرنا ہے نہ انکار۔ اس طرح بیا بی بی نہ ہاں کریں گی نہ ناں۔" وہ جاتے جاتے اسے چڑا گئی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہے ضویا۔ بیا! مجھے بتاؤ بیٹا مسئلہ کیا ہے۔ کیوں اس قدر گم صم سی ہو کیا پریشانی ہے۔ پہلے میں سمجھی شاید رافع کے ساتھ تمہاری کچھ گڑبڑ ہے مگر جس دن سے ہوش آیا ہے رافع سے ملی ہوں تو اپنی ہی نظر لگ جانے کے ڈر سے اسے جی بھر کر دیکھتی بھی نہیں کہ میرے رب نے میری معصوم بچی کا کیسا وجیہہ سمجھدار جوڑ بنایا ہے۔ سعدیہ تو تم پر جان چھڑکتی ہے اور گھر میں کون ہے۔ جس سے تم پریشان ہو؟" وہ اسے ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھنے لگیں۔

"ممی! ایسی کوئی بات نہیں بس یونہی آپ کی بیماری نے مجھے جیسے خوفزدہ کر دیا کہ خدانخواستہ اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو ..... آپ نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے ضویا کی جلد سے جلد شادی کر دینے کا ..... ممی! ہم بیٹیاں بہت کمزور بہت بزدل ہوتی ہیں اور خود سے کوئی بھی فیصلہ کم از کم میں تو درست نہیں کر سکتی۔ میں نے تو اپنا ہی تجزیہ کیا ہے ممی! مجھے نہ انسانوں کی پہچان ہے نہ اپنی ..... دوسروں کو جاننے پرکھنے کا انسان تب دعوا کرے جب وہ خود کو سمجھ لے اور اس دنیا کا سب سے مشکل کام اپنے آپ کو سمجھنا ہے۔ بڑے واقعات کو جانے دیں۔ اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہم اس طرح سے ری ایکٹ کر جاتے ہیں کہ اپنا وہ روپ دیکھ کر ہم خود چونک جاتے ہیں کہ یہ میں ہوں؟ اور جو انسان درست فیصلے کی قوت ہی نہ رکھے وہ مشکل حالات کا کیا سامنا کرے گا۔"

وہ نہ جانے کیا کہے جا رہی تھی۔ عارفہ بیگم کچھ سمجھ نہ پائیں۔

"کیا پریشانی ہے بیا!" انہوں نے پیار سے اس کا گال سہلایا۔

"ممی! مجھے لگتا ہے میرے اعصاب بہت کمزور ہو گئے ہیں اب ..... اب مزید کوئی بھی بڑی بات، کوئی صدمہ کچھ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ ممی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ ان کے کندھوں پر سر رکھ کر سسکنے لگی۔

"کیا رافع نے کچھ کہا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"السلام علیکم بھائی جان! ماشاء اللہ آج تو بہت بہتر لگ رہی ہیں۔" سعدیہ بیگم کی بشاش آواز کے ساتھ رافع کے بھاری قدموں کی آہٹ نے اسے یک دم سے سیدھا ہونے پر مجبور کر دیا۔

چہرے پر آئے بال ہٹاتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں اور پاس کھڑی پھپھو کو سلام کرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اسے پیار کر کے کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"کیسی ہیں اب ممانی جان۔" وہ اسی طرح کھڑے کھڑے عارفہ بیگم کا حال پوچھنے لگا۔ ایبہا نے ایک شکایتی نگاہ اس پر ڈالی اور سر جھکا لیا۔

"اللہ کا شکر ہے بیٹا! اس نے کچھ فرائض ادا کرنے کے لیے نئی زندگی دی ہے۔ اس کا جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہے بیٹھو نا۔"

"ممانی جان! کچھ فرائض نہیں انشاء اللہ آپ اپنے سارے فرائض اپنے ہاتھوں سے ادا کریں گی۔" وہ بڑے پر اعتماد اور اپنائیت بھرے لہجے میں بولا تھا۔

"انشاء اللہ۔" سعدیہ بیگم نے بلند آواز میں کہا۔

"میں اب چلتا ہوں امی! مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔" وہ اسی طرح کھڑے کھڑے بولا۔

"یہ کیا بات ہوئی بیٹا! اب آئے ہو تو تھوڑی دیر بیٹھو۔ بیا! اٹھو بیٹا چائے لے آؤ۔ اتنی دیر تو بیٹھو گے نا؟" انہوں نے کچھ ایسے لہجے میں کہا کہ وہ سر ہلاتے ہوئے بیٹھ گیا۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر آگئی۔ اس نے چائے بنا کر ضویا کے ہاتھ بھجوا دی اور خود کچن میں ہی رہی۔ نہ جانے دل کو کیسی آس لگی تھی کہ وہ جانے سے پہلے ضرور اس کے پاس آئے گا۔

اس رات اسے ہسپتال پہنچا کر بے حد سنجیدہ چہرے کے ساتھ وہ تھوڑی دیر ہی رکا تھا۔ اگلے دن بھی کھڑے کھڑے عارفہ بیگم کی خیریت پوچھنے آیا۔ اس سے اس نے کوئی بات نہیں کی حالانکہ اس رات کے بعد اس کا رواں رواں رافع کے کچھ کہنے کا منتظر تھا۔ پتا نہیں وہ اس سے بات کیوں نہیں کر رہا تھا۔ نظر تک نہیں ملاتا تھا۔ یوں پاس سے گزر جاتا جیسے کسی کرسی یا صوفے کے پاس سے کوئی لاتعلقی سے گزر جاتا ہے۔

اس کے دل میں کیا تھا؟ وہ اس کی ذریاب کے کمرے میں موجودگی سے کیا سمجھا تھا اور اس سمجھنے کے نتیجے میں کیا طے کیے بیٹھا تھا یہ خیال ہی اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ اور اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے نہ اس کے پاس الفاظ تھے اور نہ

کوئی گواہ۔

ابھی تو وہ خاموش تھا مگر جب بولے گا' اس سے پوچھے گا تو وہ کیا کہے گی کیسے اپنی صفائی پیش کرے گی؟ یہ خیال آتا تو اس کی خاموشی ہی غنیمت لگتی لیکن آخر کب تک؟ کوئی کب تک انتظار کی سولی پر لٹک سکتا ہے وہ اس سارے قصے کو آر یا پار کیوں نہیں کرتا؟ وہ یونہی برتن ادھر ادھر اٹھا کر رکھتی رہی اپنی الجھی ہوئی سوچوں سے باہر آئی تو رافع کے قدموں کی گونج دار چاپ بیرونی دروازے کی طرف بڑھ چکی تھی۔ اس کا جی چاہا اپنا سر دیوار کے ساتھ دے مارے "یہ آخر اب مجھ سے کون سا کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔ میری بے بسی کا مزہ لے کر سنگدل انسان۔" پہلے بے بسی پھر طیش نے اسے آلیا وہ زور زور سے برتن پٹخنے لگی۔

"ارے رے... بیا! یہ برتن ہمارے اپنے ہیں کرائے کے یا ہمسائیوں کے نہیں' کچھ تو خیال کرو۔" اسی وقت ضویا اندر داخل ہوئی تھی اور اس نے ضویا کی بات سن کر اپنے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ زور سے سنک میں دے ماری اور آنکھوں میں امڈتی نمی کو چھپتی بھاگتے ہوئے باہر نکل گئی۔

"ایں' اسے کیا ہوا؟" وہ اس کے یوں بھاگنے پر حیران سی سوچتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

ضویا اور ولید کے نکاح اور رخصتی کی تاریخ محض پندرہ دن بعد کی رکھی گئی حالانکہ اس نے عارفہ بیگم سے کہا بھی کہ اتنی جلدی بھلا تیاری کیسے ہوگی پھر وہ بھی ابھی پوری طرح سے صحت مند نہیں ہوئیں۔

"تیاری کے لیے تو تمہارے چچا چچی نے صاف منع کر دیا ہے کہ انہیں فرنیچر' مشینری اور اس طرح کی دوسری چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ ان کے گھر میں سب کچھ موجود ہے۔ ولید نے ابھی دو ماہ پہلے اپنا کمرہ فرنشڈ کروایا ہے۔ اس لیے فرنیچر کے نام پر تو ایک پیڈ بھی انہیں نہیں چاہیے' رہے کپڑے اور زیور تو وہ اس کے لیے بھی منع کر رہے تھے مگر اتنا تو بہرحال ہم کریں گے اور دیکھنا جیسے ہی تیاریاں شروع ہوں گی میری بیماری کیسے غائب ہوتی ہے۔ میں تو ایک ایک سانس میں ہزار بار شکر ادا کر رہی ہوں کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو رخصت کر سکوں۔"

"ممی! آپ کو یہ سب ابھی اتنی جلدی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ابھی آپ مکمل طور پر ٹھیک بھی نہیں ہوئیں پھر آپ کے پاس کون رہے گا بھلا۔" ضویا سنجیدگی سے ان کے پاس بیٹھ کر کہنے لگی۔

"میں جو ہوں ممی کے پاس۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس کے منہ سے اچانک نکلا تھا۔

"شادی تک نا' اس کے بعد تو تم بھی چلی جاؤ گی۔ پھپھو نے تمہیں یہاں اسی لیے تو رہنے دیا ہے شاید۔"

ضویا کے "شاید" نے بیا کے دل میں جتا دیا جیسے بجھا ڈالا۔ پھپھو ہر دوسرے تیسرے دن چکر لگاتی تھیں آتے جاتے اسے اسی لگاوٹ سے پیار کرتیں مگر ساتھ چلنے کو ایک بار بھی نہ کہتیں۔

"پتا نہیں ان کا یہاں بیٹھے بیٹھے کیا طے کر رکھا ہے۔" اسے اب اس خیال سے ہی خوف ہونے لگی تھی۔

"اور ممی پلیز' میرے لیے یہ بکس بھر بھر کپڑے اور دیہاتی عورتوں کی طرح ڈھیر سارے بھاری زیورات نہ بنایئے گا بس۔ میری پسند کے اسٹائلش تین چار جوڑے اور ہلکی سی جیولری بس۔" وہ اپنے خیالوں سے چونکی تو ضویا کو کہتے سنا۔

اور وہ خود کتنے دن تک اس بات کا سوگ مناتی رہی تھی کہ ممی نے اسے خاندانی دستور اور رسوم کے مطابق ٹرک بھر کر جہیز نہیں دیا بس تھوڑا سا زیور' دو سوٹ کیس کپڑوں کے اور چیک بک کی صورت بوجھ گلے سے اتار پھینکا ہے اور یہ ضویا...

"کیا واقعی میرے بہت سے غم بہت سی محرومیاں خود ساختہ تھیں۔" وہ قدم قدم پر خود احتسابی سے گزر رہی تھی۔

"میں واقعی بہت بدل گئی ہوں۔ ضویا ٹھیک کہتی ہے۔" اس نے آخر میں خود ہی اعتراف کر لیا۔

"اور ممی جی' آپ ہی تو کہتی ہیں کہ ٹرک بھر جہیز لے جانا بھی کوئی کامیاب شادی کی ضمانت نہیں تو پھر اتنے تردد کی بھلا کیا ضرورت۔ زندگی تو لوگوں کے ساتھ گزارنا پڑتی ہے چیزوں کے ساتھ تو نہیں۔" ضویا کی آواز ایک بار پھر اس کے کان میں پڑی۔

"روشی کیا لے کر گئی تھی؟ اور کتنی خوش ہے۔ وہ میں تو پھر بھی شاندار خاندانی بیک گراؤنڈ' جہیز کے نام پر اچھا خاصا سونا پیسہ لے کر آئی تھی۔ یہ ہے میری کامیاب زندگی۔" ڈھیر ساری اداسی نے پھر اسے گھیر لیا تھا۔ وہ ان دونوں کو باتیں کرتا چھوڑ کر چپکے سے اٹھ کر باہر آ گئی۔

☼ ☼ ☼

"یہ تو بھئی سراسر زیادتی ہے۔ ہر کوئی میری بنی سنوری دلہن کو دیکھنے کے بجائے کسی اور کی پرانی دلہن کو دیکھے جا رہا ہے۔ اٹھاؤ بھئی یہ ایپھا بی بی کو میری دلہن کے پہلو سے۔" وہ جو ضویا کے سجے سنورے شرمائے شرمائے روپ کو نگاہوں کے رستے دل میں اتار رہی تھی اس کی طرف دیکھتا اس کی تعریف کر رہی تھی۔ ولید کی اچانک آواز پر ایک دم سے سیدھی ہوئی تھی۔ وہ ضویا کے دوسری طرف بیٹھا بڑے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا ایپھا نے اسے گھور کر دیکھا۔

"کیا کہہ رہے تھے تم؟" ایک دم ہی سب اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"بھئی ابھی مووی والے سے کہہ رہا تھا کہ میری دلہن کے اچھے اچھے کلوز اپ لیتا' یہ دن کوئی بار بار تھوڑی آتا ہے تو کہنے لگا اچھا جی لے لیں گے پہلے یہ جو حسین چہرہ ہمارے کیمرے کے فوکس میں آ رہا ہے پہلے اس کے تو چند اچھے اچھے کلوز اپ محفوظ کر لیں۔ اب بولو یہ زیادتی ہے کہ نہیں۔" وہ ایپھا کے گھورنے کی پروا کیے بغیر اسی ڈھٹائی سے بولا تو وہ غصے میں اٹھ کر جانے لگی۔

"بیا! تم ولید کی باتوں کا برا نہ مانو وہ یہی تو چاہ رہا ہے کہ تمہیں غصہ آئے اور تم اس سے لڑو۔" ضویا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھنے سے روک دیا تھا۔

گولڈن اور براؤن بنارسی پھولوں والی خوب صورت ساڑھی میں وہ کیسی لگ رہی تھی اس کا اندازہ اسے خود بھی تھا مگر اس طرح سب اسی کی طرف متوجہ ہو جائیں گے یہ اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا جس کی نظروں میں وہ اچھا لگنا چاہ رہی تھی وہ تو شاید اس کی طرف دیکھنا ہی بھول گیا تھا۔

مہندی اور بارات میں کئی بار ایسے مواقع آئے کہ وہ بنی سنوری خوشبوؤں میں بسی اس کے بالکل آس پاس سے گزرتی رہی اور وہ کسی پتھر کے بت کی طرح انجان بنا رہا حالانکہ کئی بار اسے احساس ہوا کہ اس کا چہرہ مستقل کسی کی نظروں کے حصار میں ہے۔ اور ان نظروں کی تلاش میں جب اس کی تلاشتی پیاسی نگاہیں رافع کے چہرے پر آ کر ٹھہرتیں تو وہ پہلے کی طرح بالکل اجنبی ہوتا۔ اب تو اسے اپنی ٹھیک ٹھاک انسلٹ محسوس ہونے لگی تھی اور وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ شادی کے ہنگامے سرد پڑتے ہی وہ خود خلع کے لیے درخواست دے دے گی۔

رافع کا انجان رویہ اسے بہت کچھ سمجھا چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس پر کوئی گھٹیا الزام لگا کر اسے ٹھوکر مارے وہ خود کیوں نہ پہل کر ڈالے اور اب وہ اتنی بہادر ضرور ہو گئی تھی کہ یہ سب کر سکتی تھی۔

"اب بیٹھو بیا!" فریال نے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"نہیں' تھینکس۔ اب تم بیٹھو اپنی بھائی بھائی جان کے پاس۔" اس نے ولید کی طرف دیکھتے ہوئے جتانے والے انداز میں کہا تو وہ آنکھ دبا کر ہنس پڑا۔

"ہاں بھئی انہیں بہت جلدی ہے۔ جانے وہ انہیں کسی اور کی جان بننے۔" پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ولید کی سرگوشی سن لی تھی کوئی اور موقع ہوتا تو واقعی پاؤں سے سینڈل اتار لیتی۔

پھپھو اور ممی چچی کے ساتھ میٹھی باتوں میں مگن تھیں وہ پیچھے سے اس کے پاس سے گزرتی پنڈال کے ہجوم سے باہر نکل آئی۔

لش گرین لان کے درمیان میں بہت خوب

صورت سوئمنگ پول بنا ہوا تھا جس میں صاف شفاف پانی بلکورے لیتا سفید روشنی کو مختلف رنگوں میں تقسیم کر رہا تھا۔

وہ پول کے کنارے چلتی ایک طرف بنی ریلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ باہر اچھی خاصی خنکی تھی مگر آسمان بالکل صاف تھا۔ تاروں بھرا آنکھیں سیلا آسمان۔

”ولید اور ضوبیا کتنے خوش قسمت ہیں جو چاہا سو پالیا۔ اللہ ان دونوں کی خوشیاں اور محبت یونہی قائم و دائم رکھے۔“ اس کا دل کسی اور بات کے غم میں نڈھال ہوا جا رہا تھا اور وہ اپنے خیالات کی رو کسی اور جانب موڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ جو پچھلے چند دنوں میں خوب زور شور سے کہے جا رہی تھی کہ ضوبیا کے بعد وہ ممی کے پاس رہے گی۔ ولید اور ضوبیا نے چچا جان کے ساتھ مل کر پہلے سے اس کا بھی حل ڈھونڈ لیا تھا۔

ممی کے بالکل ساتھ والا گھر چچا جان نے خرید لیا تھا۔ دونوں گھروں کی پچھلی دیوار گرا کر بیچ میں رستہ بنا لیا گیا تھا اور عارفہ بیگم نے یہ گھر کس طرح خریدا اس کا علم بھی اسے کل ہی ہو سکا۔ وہ اس بات پر سب سے خوب جھگڑنا چاہ رہی تھی کہ اسے کسی بھی بات سے باخبر نہیں رکھا جاتا مگر شاید اسے اپنے خیالوں سے ہی نجات نہیں مل رہی تھی جو اردگرد کی خبر رکھ سکتی۔

عارفہ بیگم نے اپنا سارا زیور بیچ ڈالا تھا۔ ضوبیا نے اپنے لیے محفوظ رکھی گئی ساری رقم اور زیور بھی ممی کو دے دیا تھا۔ کچھ چچا جان نے رقم دی تھی اور یہ گھر خرید لیا گیا تھا۔ تایا جان نے تو حصے کے نام پر ان کو صرف ڈھائی لاکھ روپے دیے تھے جو انہوں نے کوئی بھی شکوہ کیے بغیر رکھ لیے تھے کہ بہرحال ایک چھت انہیں چاہیے تھی کہ ان کی بیٹیاں سسرال سے آئیں تو ماں کے گھر کا دروازہ کھلا ملے۔

”ضوبیا نے ممی کی اصل غم گسار بیٹی ہونے کا حق ادا کیا ہے اور میں ..... میں کیا کروں مجھے تو اپنے غم۔ پھپھو کیسی دور دور سی ہو گئی ہیں بالکل انجان۔“

شاید کسی نے اسے آواز دی تھی۔ وہ گہرا سانس لیتے ہوئے پلٹ کر جانے لگی کہ ایک دم پیچھے سے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا وہ ذہنی و جسمانی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھی سو اسی جھونک میں کھینچنے والے کی طرف کھنچتی چلی گئی۔

رافع کے سینے سے ٹکراتے ہی اس نے ایک جھٹکے سے خود کو الگ کیا تھا وہ نہ جانے کب اس کے پاس آکر کھڑا ہوا تھا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

”یہ کیا مذاق ہے؟“ وہ اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے زور لگاتے ہوئے بولی۔

”یہ مذاق نہیں۔ میرے صبر کی انتہا ہے۔“ وہ گہری آواز میں بولا۔

”صبر یا تماشا۔“ وہ دانت کچکچا کر بولی اور اپنا ہاتھ کھینچنے لگی۔

”تماشا..... ہاں یہ لفظ ٹھیک ہے۔ ہم دونوں شروع سے اب تک جن ڈرامائی موڑ سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ اسے ایک ”تماشا“ ایک کہانی کہا جا سکتا ہے۔ ایک ایسی کہانی جو آنسوؤں میں بھیگی ہوئی ہے اب یہ تمہارے اور میرے ہاتھ میں ہے کہ ہم اسے المیہ انجام سے دوچار کرتے ہیں یا طربیہ؟“ وہ اسی طرح اس کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں لیے مزے سے بولا۔

”اچھا پلیز‘ میرا ہاتھ چھوڑیے اور یہ کہانیاں بنانے یا سنانے کی ضرورت نہیں۔ آپ نے جو کچھ اپنے دل میں سوچ رکھا ہے اور اس روتی بسورتی کہانی کو جو بھی انجام دینے کا فیصلہ کر رکھا ہے مجھے سنا دیجئے۔ میں ہر طرح کا انجام سہنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ اس تکلیف دہ ڈرامے نے میرے اعصاب اس قدر تھکا ڈالے ہیں کہ مزید انتظار..... شاید آپ میرے جان سے گزرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے میں نے اتنے دن جو تم سے لاتعلقی اختیار کیے رکھی ہے وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے تھی؟“ وہ شاید اس کی مزاحمت سے محظوظ ہو رہا تھا سو اس کے نازک ہاتھ پر اپنی گرفت اور بھی سخت کر لی۔

”توبہ کتنے ظالم ہیں آپ۔ کیا توڑیں گے میرا ہاتھ

!" کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ظالم کون ہے ابھی اس کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔ لو چھوڑ دیا ہاتھ' ویسے میں نے چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا تھا۔" اس نے کہتے ہوئے ایک دم سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا جیسے دوسرے ہاتھ سے سہلاتے ہوئے وہ ناراض نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"میں فیصلے پر اسی رات پہنچ چکا تھا جب تمہیں ہسپتال چھوڑ کر گیا تھا۔"

"کیا مطلب؟" وہ اپنے ہاتھ کی تکلیف بھول گئی۔

"کیسا فیصلہ؟" اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"تمہیں چھوڑ دینے کا۔" وہ سنجیدگی سے بولا تو اس کا سانس جیسے سینے میں اٹک گیا۔

"مجھے بتاؤ کوئی بھی غیرت مند شوہر جو اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے لاکڈ کمرے سے اس حال میں نکالے اور پھر بھی اسے اپنے سے علیحدہ نہ کرے تو ایسے مردوں کو ہمارے معاشرے میں کیا کہا جاتا ہے۔۔۔ اس رات رستہ بھر یہ خیال میرے دل و دماغ پر کسی تازیانے کی طرح برستا رہا تھا اور شاید میں اس معاشرتی دباؤ میں آ کر اپنے جذبات کا خون کرنے پر بھی تیار ہو جاتا اگر تم وہ چیز اپنے ساتھ زریاب کے کمرے میں نہ لے کر آتیں۔"

"کیا..... کیا چیز۔" اس نے الجھن بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

"اس چیز کے متعلق بتانے سے پہلے سن لو کہ اس واقعے کے باوجود اور خود پر اٹھنے والی انگلیوں کا اذیت ناک احساس بھی میرے دل کو تمہیں خود سے علیحدہ کرنے پر مجبور نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ چیز اگر مجھے نہ بھی ملتی تو بھی بیا میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔" وہ گہرا سانس لیتے ہوئے بولا۔

"وہ بیا جو میرے باپ کے جھوٹے ڈرامے اور بیماری کے ناٹک پر اس سے ہمدردی کرتے ہوئے اپنی ساری رقم اس کی جھولی میں ڈال دے۔ وہ بیا بد کردار اور بری نہیں ہو سکتی پھر تمہارے وہ قرض میرے اوپر واجب الادا تھے۔ ایک رات میرے باپ نے جھوٹ بول کر تمہارے کردار پر کیچڑ اچھالی اس جھوٹ کا بہت بوجھ تھا میرے سینے پر۔

دوسری وہ شام جب روشی نے نیند آور گولیوں کی آدھی شیشی حلق میں انڈیل کر خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اس شام جب اس کا نکاح ہونے والا تھا۔ اور میں اسے سب طرف ڈھونڈ آیا تھا اور ٹھیک وہی کچھ ہمارے ساتھ ہونے جا رہا تھا جو میرے باپ نے تمہاری زندگی کے ساتھ کیا تھا۔ اس شام اگر تم مجھے اس بند اسٹور میں بے ہوش پڑی روشی کے پاس نہ لے جاتیں جبکہ تمہارے پاس اپنا انتقام لینے کا اچھا موقع بھی تھا۔

اس شام تم نے ہمارا' میری بہن کا پردہ رکھا' بولو ایسی لڑکی بری کب ہو سکتی ہے جو موقع ملنے کے باوجود اس کے ساتھ بھلائی کر جائے جس نے اس کے ساتھ برا ترین کیا ہو۔ اس شام تم نے دوسرا بوجھ میرے کندھوں پر رکھ دیا تھا۔

میں نے اپنے دل میں عہد کیا تھا کہ کبھی زندگی میں موقع آیا تمہارا پردہ رکھنے کا یا کسی بھی بے گناہ کا تو میں ضرور ضرور اس قرض کو اتارنے کی کوشش کروں گا۔ سو اس رات جب تم نے ولید کو فون کر کے بلوایا اور قدرت نے مجھے اپنی آمد سے دو دن پہلے وہاں بھجوا کر وہ فون کال سننے کی توفیق دی اور میرے سامنے میرے عہد کو کھڑا کر دیا۔ اس عہد کی وجہ سے میں معاشرے کی کسی بھی گالی کو قبول کرتے ہوئے تمہیں اپنانے کو تیار تھا۔

میں ضوبا کی شادی کے فوراً بعد تمہیں لے جانا چاہتا تھا تم سے کچھ بھی سوال جواب کیے بغیر کہ میرے عہد نے مجھے اس کا پابند کر دیا تھا۔

رہ گیا زریاب کا معاملہ..... تمہیں شاید یاد نہ ہو جب پہلی رات تم ہمارے گھر رہنے کے لیے آئیں اور میں نے تم سے زریاب کے بارے میں پوچھا تو تم نے بڑی نخوت سے جواب دیا تھا جیسے کسی بہت معتبر انسان کا ذکر آیا ہو۔

زریاب کی ان ساری حرکات کا مجھے چند دن پہلے علم

ہو چکا تھا اور میں تمہیں وہی بتا کر خبردار کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ اگر میں تمہیں کچھ بتاؤں تو تم یقین نہ کرو گی۔ تو تم نے بڑی رکھائی سے کہا تھا کہ یقین کرنا یا نہ کرنا میرا مسئلہ نہیں۔ تمہیں بتاؤں۔ اس لمحے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ مجھے یہ سب باتیں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیونکہ تم یقین نہیں کرو گی۔ الٹا اسے میرے حسد پہ محمول کرو گی اس لیے میں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

تم زریاب کے جال میں کیسے پھنسیں اس کا بھی مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا اسی رات..... اور میں سمجھتا ہوں اس میں بھی کوتاہی میری ہے اپنی ملکیت کو آپ خود Own (اپنائیں) نہیں کریں گے تو دوسرے ضرور اسے چھیننے کی کوشش کریں گے جس التفات کی تلاش میں تم زریاب کی طرف کھنچیں اگر وہ مجھ سے ملا ہوتا تو۔۔ پھر مجھے بار بار تمہاری طرف سے طلاق کے مطالبے کا بھی رنج تھا۔ تمہارے دل کا کیا حال ہے مجھے اندازہ نہیں تھا مگر پھر تمہاری کیفیت دیکھ کر ہوتا چلا گیا۔"

"خیر چھوڑو اس ذکر کو یہ تو لمبا قصہ ہے مگر اس میں سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ تم اپنی صفائی اپنا گواہ اپنے ساتھ لے آئی تھیں جس نے سارا معاملہ شیشے کی طرح صاف کر دیا۔" وہ کہہ کر چپ ہو گیا تو بیا نے بے چین ہو کر اسے دیکھا۔

"زریاب کا "بلیک بیری" جس سے تم نے ولید کے موبائل پر کال کی تھی اور خوف و دہشت میں تم وہ موبائل اس طرح مٹھی میں دبائے میرے ساتھ گاڑی میں آ بیٹھیں اور جب تم چینج کرنے کے لیے گھر اتریں تو وہ سیل فون تمہاری گود سے نیچے گر گیا اور اس میں شاید زریاب نے تمہیں بلیک میل کرنے کے لیے سب کچھ ریکارڈ کر رکھا تھا۔" رافع کی بات پر بیا کی سانسیں جیسے تھمنے لگیں جس خوف کے باعث وہ اس سے ملنے گئی تھی اسی۔۔۔ اپنے قتل کے سامان کو اپنے ساتھ اٹھا کر لے آئی۔

"تف ہے میری بے وقوفی اور حماقت پر..... مجھ سے احمق لوگوں کا یقینا" ایک خوشگوار و کامیاب زندگی پر کوئی حق نہیں ہوتا۔" وہ ایک بار پھر دل ہی دل میں خود کو لعن طعن کرنے میں مصروف ہو چکی تھی۔

"اور اس میں اس آخری شام کی ساری گفتگو بھی ریکارڈ تھی وہ شاید تمہیں مزید ہراساں کرنے کے لیے ریکارڈنگ بٹن پش کر کے واش روم میں چھوڑ آیا تھا اور اسے نہیں پتا تھا یہ تمہاری بے گناہی پر آخری مہر ثابت ہو گی اس کی بدنیتی اور تمہاری مزاحمت و مقصد سب کچھ واضح تھا۔" وہ کہہ کر ایک دم چپ ہو گیا۔

"زریاب کی سحر انگیز شخصیت کا بت تمہاری نگاہوں کے سامنے پاش پاش ہونا ضروری تھا ایک کامیاب زندگی کا آغاز کرنے کے لیے۔"

بیا کو کافی دیر بعد جیسے اس جملے کی بازگشت اپنے کانوں میں سنائی دی۔

تت تو...... تو آپ کو سب پتہ ... معلوم ہو چکا تھا۔ میری بے گناہی بھی اور زریاب کی خباثت بھی...." وہ بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو اتنے دن...... اتنے ڈھیر سارے دن.... جب آپ ادھر گھر آتے رہے، میرے آس پاس پھرتے اجنبی نظروں سے تکتے منہ پھیرتے آپ کو سب معلوم تھا؟" وہ کہتے ہوئے جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھی اس نے پیچھے ہٹتے ہوئے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"یعنی میری بے بسی کا مذاق اڑاتے رہے، مزہ لیتے رہے۔" وہ اب اس کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔

"اصل میں تمہارا حسن پرسوز و غمگین تھوڑا رویا دھویا اتنا اچھا لگتا ہے جیسے چاند کے گرد ہالہ.... تو میں نے سوچا...." وہ معصومیت سے اقرار کرتے ہوئے بولا۔

"تو میں نے سوچا کچھ دن اور اس رونی صورت کا نظارہ...." غصے میں چلاتے ہوئے اس نے پوری قوت سے رافع کو پیچھے سوئمنگ پول میں دھکیلنے کی کوشش کی مگر یہ الگ بات کہ اس کے فولادی جسم کو تو وہ پیچھے نہ دھکیل سکی الٹا اس کے بازوؤں کی مضبوط گرفت میں آ گئی۔

"چھوڑیں مجھے بے ایمان انسان ظالم...." وہ اب بھی پوری طاقت سے اسے دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے کچھ اور اس کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔

"اسی لیے تو کہہ رہا تھا کہ اس سے زیادہ خود پر صبر کے بند نہیں باندھ سکتا۔ تمہیں سب کچھ بتا دیا تو پھر ایک پل کے لیے خود سے دور نہیں رکھ سکوں گا۔ کہاں تمہیں ضوبیا کی شادی کے لیے رکنے دوں.... ابھی تو تم سے بہت سارے ڈھیر سارے اولین دن سے لے کر اس گھڑی تک اتنے بدلے لینے ہیں گن گن کے کہ تم ضوبیا اور ولید تو کیا اپنے گھر میں بھی کسی کو کتنے ہی دن تک نظر نہیں آؤ گی۔ ظالم میں ہوں کہ تم چلو ابھی سارے حساب کتاب کر لیتے ہیں کون ظالم ہے اور کیا ہے ... ہیں۔" وہ اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا پارکنگ کی طرف جو بڑھا تو وہ گھبرا گئی۔

"چھوڑیں مجھے چھوڑیں نا کوئی دیکھ لے گا۔"

"آئی ڈونٹ کیئر اب تو چاہے سارا شہر دیکھ لے۔" وہ اسے اسی طرح بازو سے پکڑے پارکنگ تک لایا تھا۔

"ایں۔" اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ابھی تھوڑی دیر پیشتر جو آسمان ستاروں سے جگمگا رہا تھا وہاں جگہ جگہ سیاہ بدلیاں منڈلا رہی تھیں اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنا شروع ہو چکی تھیں۔

"یہ بارش بھی نا۔ یہ بارش میرے لیے کتنی بابرکت ثابت ہوتی ہے کوئی مجھ سے پوچھے۔ یہی بارش تو تمہیں مجھ تک لائی تھی ہمیشہ کے لیے۔ اور آج پھر...." اس نے ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ کا دروازہ کھولتے ہوئے اسے بٹھا کر خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

اور وہ جو آج تک اس بارش سے خائف رہی تھی مسکراتے ہوئے اپنی ہتھیلی کھڑکی سے باہر نکالتے ہوئے رافع کی بات کی تائید کرنے لگی۔ واقعی یہ بارش تو جب بھی برسی اس کی جھولی میں دائمی خوشیاں ڈال گئی بس اسے سمجھ دیر میں آئی اور اب جب سمجھ آئی تو

"میں اب کبھی بارش سے خفا نہیں ہوں گی۔" اس کے لبوں سے پھسلا تھا۔

"صرف بارش سے؟" رافع نے شوخی سے پوچھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس بار اس کی ہنسی میں رافع کی ہنسی بھی شامل تھی۔

اسے معلوم تھا یہ بارش اسے رلانے نہیں ہنسانے آئی ہے۔ اس کے من کی پیاس بجھانے۔

وہ کھڑکی سے باہر سر نکال کر بڑے شوق اور لگن سے بوند بوند برستی اللہ کی اس رحمت کو دیکھنے لگی جو وہ پیار کرنے والوں کو محبت کی بوچھاڑ میں بھگونے کو بے تاب ہوئی جا رہی تھی۔

حفاظتی بند باندھ لیجیے

ہم ہیں آوارہ سُو بسو لوگو!
جیسے جنگل میں رنگ و بُو لوگو!

ساعت چند کے مسافر سے
کوئی دم اور گفتگو لوگو!

تجھے تمہاری طرح کبھی ہم بھی
رنگ و نکہت کی آبرو لوگو!

قریۂ عاشقی، سراچہ ٔ دل
کھر ہمارے بھی تھے کبھو لوگو!

وقت ہوتا تو آرزو کرتے
جانے کس شے کی آرزو لوگو!

تاب ہوتی تو جستجو کرتے
جانے کس کس کی جستجو لوگو!

کوئی منزل نہیں، دوانا ہیں
ہم مسافر ہیں، بے ٹھکانا ہیں

ابن انشاء

زندگی

تم مجھے زندگی کہتے ہو
مجھے یقین ہے
مگر میری ایک خواہش ہے
کہ اس زندگی کے بعد
مجھے ایک اور زندگی ملے
تاکہ میں دیکھ سکوں
کہ تم
میری زندگی سے
کسی اور زندگی تک کا فاصلہ
کتنے عرصے میں طے کرتے ہو

فرزانہ سہیل

نگری نگری پھرا مسافر، گھر کا رستا بھول گیا
کیا ہے تیرا، کیا ہے میرا، اپنا پرایا بھول گیا

کیا بھولا، کیسے بھولا، کیوں پوچھتے ہو؟ بس یوں سمجھو
کارن دوش نہیں ہے کوئی، بھولا بھالا بھول گیا

یاد کے پھیر میں آ کر دل پر ایسی کاری چوٹ لگی
دکھ میں سکھ ہے، سکھ میں دکھ ہے، بھید یہ نیارا بھول گیا

سوجھ بوجھ کی بات نہیں ہے، من موجی ہے مستانہ
لہر لہر سے جا سر پٹکا، ساگر گہرا، بھول گیا

ہنسی ہنسی میں، کھیل کھیل میں، بات کی بات میں رنگ مٹا
دل بھی ہوتے ہوتے آخر گھاؤ کا رسنا بھول گیا

اپنی بیتی جگ بیتی ہے جب سے دل نے جان لیا
ہنستے ہنستے جیون بیتا، رونا دھونا بھول گیا

جس کو دیکھو اس کے دل میں شکوہ ہے تو اتنا ہے
ہمیں تو سب کچھ یاد رہا، پر ہم کو زمانہ بھول گیا

کوئی کہے یہ کس نے کہا تھا کہہ دو جو کچھ جی میں ہے
میرا جی کہہ کر پچھتایا اور پھر کہنا بھول گیا

میرا جی

کل اور آج

پہلے ایسا
کب ہوتا تھا
اجیارا ہو یا اندھیارا
جب ہونا ہو تب ہوتا تھا
ایک ہی دن
چلتا تھا ہفتوں
خواب تھے چھوٹے
رات بڑی تھی
وقت!
نکلا تھا کم باہر
جیب کے اندر
جیب گھڑی تھی
آنکھ اٹھی
اور منظر بدلے
یہ کیسا...!
جنجال نیا ہے
پچھلا سال
گیا تھا کل ہی
آج جو دیکھا
سال نیا ہے
پہلے ایسا
کب ہوتا تھا!

ندا فاضلی

[illegible]
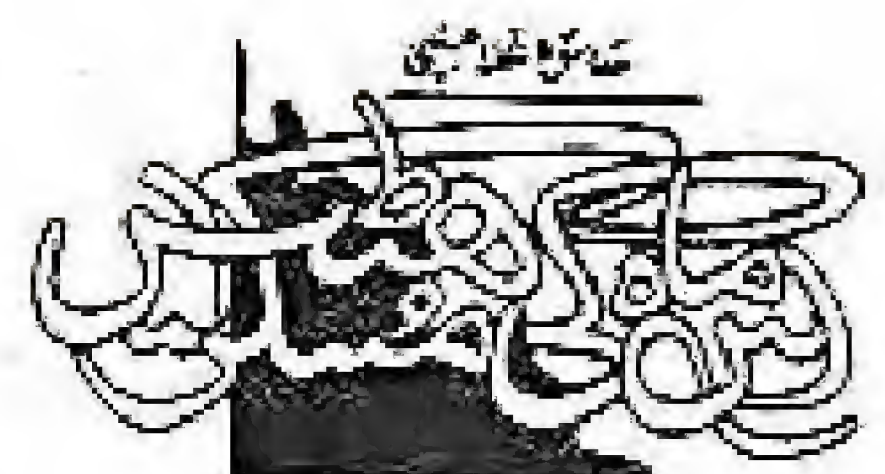
حماقت

ایک آرٹسٹ فلم دیکھ کر ہال سے باہر آ رہا تھا کہ پولیس نے اسے پکڑ لیا۔ پوچھ گچھ کا آغاز ہوا۔
"اچھا ڈان اوریلی! آخر ہم نے تمہیں پکڑ ہی لیا۔"
آرٹسٹ قہقہے لگانے لگا۔ پولیس نے اسے پانچ دن اور پانچ رات سونے نہ دیا۔ آرٹسٹ ہنستا ہی رہا۔ ایک ماہ تک اسے صرف چند گھونٹ پانی اور چند ٹکڑے کھانے کے سوا کچھ نہ ملا۔ لیکن وہ ہنستا ہی رہا۔ دو ماہ تک قید تنہائی میں رکھا۔ اس کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی دھمکی دی۔ چند روز تک آنکھ نہ جھپکنے دی۔ کم از کم چھ ماہ کی محنت سے سخت سزائیں اس پر آزمانے کے بعد ناکام ہونے پر ایک روز پولیس آفیسر نے کہا۔
"ڈان اوریلی! اتنی سزائیں جھیلنے کے بعد تم ہنس رہے ہو؟"
اس نے کہا "مجھے تم لوگوں کی حماقت پر ہنسی آ رہی ہے۔"
"ہماری حماقت...؟"
"ہاں تمہاری حماقت!" آرٹسٹ نے جواب دیا۔ "میرا نام ڈان اوریلی نہیں ہے۔ تم نے اپنی حماقت سے ایک غلط شخص کو پکڑ رکھا ہے۔"

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

وصیت

ایک خرانٹ کنجوس جب مرنے لگا تو اس نے وصیت نامے میں لکھوا دیا کہ پانچ ہزار روپے میرے ان ملازمین کو دیے جائیں، جو عرصہ پانچ سال سے میری خدمت میں مامور ہیں۔
وکیل نے اس فیاضی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ "آپ نے بڑا نیک کام کیا ہے۔" کنجوس نے جواب دیا۔
"میرا تو ایک ملازم بھی ایسا نہیں جو ایک سال سے زیادہ عرصے سے میری ملازمت میں رہا ہو۔ البتہ اخباروں میں تو یہ بات اچھی لگے گی۔"

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

سیٹھ صاحب

سیٹھ صاحب نے آرٹسٹ سے پوچھا۔
"آپ میری جو پورٹریٹ بنائیں گے وہ خوبصورت ہو گی نا؟"
"جی ہاں آپ مطمئن رہیں صاحب! آپ خود کو بھی نہیں پہچان پائیں گے۔"

کہانی

"یہ اس علاقے کا سب سے اونچا اور مشہور پہاڑ ہے۔" گائیڈ نے سیاح کو بتایا۔
"اس سے کوئی نہ کوئی روایت یا کہانی بھی وابستہ ہو گی؟" سیاح نے دلچسپی سے پوچھا۔
"ہاں! ایک مرتبہ ایک سیاح جوڑا اس پہاڑ پر چڑھا اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔" گائیڈ نے بتایا۔
"اوہ! کیا ان کے بارے میں کچھ نہیں پتا چلا کہ ان کا کیا بنا؟" سیاح نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔
"بس اتنا ہی پتا چلا کہ وہ دوسری طرف اتر کر آگے روانہ ہو گئے تھے۔" گائیڈ نے مطمئن سے لہجے میں بتاتے ہوئے جواب دیا۔

فروہ اقرا۔ کراچی

مرکز

بہت بڑا سودا کرنے کے بعد ایک مال دار تاجر اپنے خیالوں میں گم سڑک پر چلا جا رہا تھا۔ اپنے خیالوں میں وہ ایسا کھویا ہوا تھا کہ تنظریں آسمان پر تھیں اور اردگرد کے ہجوم کا کوئی احساس نہ تھا۔ وہ چوراہے پر پہنچا ہی تھا کہ ایک تیز رفتار کار اسے چھوتی ہوئی گزری اور آگے بڑھ کر رک گئی۔

کار چلانے والا شخص تاجر کے قریب آ جانے پر اس سے بولا۔

"تیسے صاحب! اگر آپ وہاں نہیں دیکھیں گے جہاں جا رہے ہیں تو وہاں پہنچ جائیں گے جہاں دیکھ رہے ہیں۔"

عقیلہ بانو۔ خانیوال

سمجھ دار

بیوی نے شوہر سے پوچھا۔

"سنیں جی! آپ اتنی دیر تک کہاں تھے؟"

"دیکھو! سمجھ دار عورتیں شوہروں سے ایسے سوال نہیں پوچھتیں۔" شوہر نے متانت سے جواب دیا۔

"مگر سمجھ دار مرد بھی تو اچھی بیویوں۔۔۔" ابھی بیوی بات کر ہی رہی تھی کہ شوہر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"دیکھو! سمجھ دار مرد کی کبھی بیوی نہیں ہوتی۔"

مصباح گل۔ سرگودھا

ایک سفر

ایک صاحب اپنے سفر کا حال سنا رہے تھے۔

"ٹرین پانچ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا رہی تھی مگر اس بری طرح ڈگمگا رہی تھی کہ مجھے اندیشہ تھا کہ میری ہڈیوں کے تمام جوڑ الگ ہو جائیں گے۔ کچھ مسافر اچھلتے تو ان کے سر برتھ سے جا ٹکراتے اور کبھی وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک لڑھکتے جاتے۔ انہیں واپس اپنی سیٹوں پر پہنچنا مشکل ہو جاتا۔ بچے چیخیں مار رہے تھے۔ اور بیت الخلا میں بیٹھ رہے تھے۔ میں تو مضبوطی سے سیٹ کے پیچھے پکڑے بیٹھا تھا لیکن اندیشہ تھا کہ کسی بھی لمحے اچھل کر باتھ روم سے جا ٹکراؤں گا۔

اچانک تبدیلت کچھ ہم پر رحم آیا۔ ٹرین کچھ ہموار انداز میں چلنے لگی۔ ٹرین کی کھڑکھڑاہٹ اور مسافروں کی چیخ و پکار تھمی تو کمپارٹمنٹ میں کچھ سکون سا محسوس ہونے لگا۔ اور اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ ٹرین پٹری سے اتر گئی تھی۔"

ثریا۔ فرحت غلام نبی۔ خانیوال

اتنی سی بات

پہاڑی علاقے کی ایک نہایت ضعیف عورت کو ایک جھگڑے کے سلسلے میں گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کیا گیا تو جج صاحب نے پوچھا۔

"آپ اس جھگڑے کے سلسلے میں کیا جانتی ہیں؟"

"ایسی کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔" جھریوں بھرے چہرے والی خاتون نے مبہم سا جواب دیا۔

"پھر بھی۔۔۔ آپ بتائیے تو سہی۔۔۔ آپ نے کیا دیکھا؟" جج صاحب نے اصرار کیا۔

"ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی۔" بڑی بی نے ایک بار پھر بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "بس ادھر عجب گل نے شہباز خان کو جھوٹا بولا۔ شہباز خان نے عجب گل کے سر پر ڈنڈا مارا۔ عجب گل ادھر۔۔۔ گر کے ٹھنڈا ہو گیا۔ عجب گل کا دوست ادھر کھڑا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ عجب گل گر گیا ہے تو اس نے خنجر نکال کر شہباز خان کا پیٹ چیر دیا۔ ادھر شہباز خان کا دوست بھی موجود تھا۔ اس نے جب یہ دیکھا تو گولی چلا کر عجب گل کے دوست کو ٹھنڈا کر دیا۔ اسی بک بک میں دو تین آدمی اور مر گیا۔ بس اتنی سی بات پر جھگڑا شروع ہو گیا۔"

کیا فائدہ۔۔۔؟

دولت مندوں کے پاس چندہ لینے والے کثرت سے آتے رہتے ہیں لیکن انہیں ان سے جان چھڑانے کے طریقے بھی خوب آتے ہیں۔ ایک سیٹھ صاحب کے پاس کچھ لوگ علاقے کے مکینوں کے لیے نئی میت گاڑی خریدنے کے سلسلے میں چندہ لینے پہنچے۔

"بھئی میں تو معذرت چاہوں گا۔ نئی میت گاڑی کے لیے میں تو چندہ نہیں دے سکتا۔ علاقے میں پہلے سے جو میت گاڑی موجود ہے، پچاس سال پہلے میں نے اس کے لیے چندہ دیا تھا اور آج تک مجھے اس گاڑی سے فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہیں ملا۔ تو میں نئی گاڑی کے لیے چندہ کیوں دوں؟"

ندا یوسف۔ کراچی

منگنی اور شادی

"میں تم سے شادی کر کے تمہاری خاطر اپنے ڈیڈی کا شاندار اور آسائشوں سے بھرا گھر نہیں چھوڑ سکتی۔"

"تو اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟ شادی کے بعد میں بھی تمہارے ساتھ وہیں رہ لوں گا۔"

"آئندہ میں کسی لڑکی سے شادی کی درخواست نہیں کروں گا۔"

"کیوں۔ کیا پھر کسی لڑکی نے تم سے شادی سے انکار کر دیا؟"

"نہیں۔ آج ایک لڑکی نے ہاں کہہ دی۔"

"میں اس وقت تک شادی نہیں کروں گا جب تک کہ مجھے اپنے سے بالکل الٹ لڑکی نہیں مل جاتی۔"

"میرے خیال میں تو پھر تمہیں زیادہ مشکل پیش نہیں آنی چاہیے۔ تمہارے محلے میں کئی ذہین اور باذوق لڑکیاں رہتی ہیں۔"

"میں اس لڑکی سے ضرور شادی کر لیتا مگر اس نے ایک ایسی بات کہہ دی کہ مجھے اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔"

"کیا کہہ دیا اس نے؟"

"اس نے نہیں کہہ دیا۔"

بے چارگی

نوجوان مریض نے ماہر نفسیات کے کئی سوالوں کا جواب نہیں دیا تو اس نے مریض سے دل کی بات اگلوانے کا طریقہ سوچا۔ اس نے کاغذ پر پنسل سے ایک عمودی لکیر کھینچی اور مریض سے پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"دلکش لڑکی۔" مریض نے جواب دیا۔

ماہر نفسیات نے عمودی لکیر کے درمیان سے ایک افقی لکیر کھینچی اور پوچھا۔

"اچھا یہ کیا ہے؟"

"حسین و جمیل لڑکی سر کو جھکائے بال سنوار رہی ہے۔" نوجوان مریض نے خلاؤں کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔

"میں تمہارا مسئلہ سمجھ گیا۔" ماہر نفسیات نے کہا۔ "تمہارے ذہن میں رومانس زدہ خیالات بھرے ہوئے ہیں۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" نوجوان نے احتجاج کیا۔ "گندی گندی تصویریں تو آپ خود بنا رہے ہیں۔"

کیا فائدہ

میاں بیوی کار میں جا رہے تھے کہ بارش نے آ لیا۔ ونڈ اسکرین بالکل دھندلی ہو گئی اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کئی بار حادثہ ہوتے ہوتے رہ گیا تو خوف سے لرزتی ہوئی بیوی نے شوہر سے کہا۔

"کار روک کر ونڈ اسکرین صاف کیوں نہیں کر لیتے؟"

شوہر نے کہا۔ "اس سے فائدہ؟ میں عینک تو گھر ہی بھول آیا ہوں۔"

کرن، بیش۔ کراچی

نشانیاں

عبداللہ کومے میں چلا گیا۔ اس کے عزیز و اقارب اسے مردہ سمجھ کر تدفین کی تیاریاں کرنے لگے مگر وہ دفن ہونے سے پہلے ہوش میں آ گیا۔

"تمہیں وقتی طور پر مرنے کا یہ تجربہ کیسا تھا؟" دوستوں نے جاننا چاہا۔

"بھئی میں مرا نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں زندہ ہوں مجھے بھوک لگ رہی تھی اور اپنے پاؤں مجھے ٹھنڈے محسوس ہو رہے تھے۔" عبداللہ نے بتایا۔

"پھر بھی۔ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم زندہ تھے؟"

"بھئی۔ سیدھی سی بات ہے۔ اگر میں جنت میں ہوتا تو مجھے بھوک نہ لگ رہی ہوتی اور اگر میں جہنم میں ہوتا تو مجھے اپنے پاؤں ٹھنڈے ٹھنڈے ہرگز محسوس نہ ہو رہے ہوتے۔"

فرمائش

دادا جان نے ٹھنڈی سانس لے کر پوتے سے کہا۔

"آج کل کی لڑکیاں تو کسی بات پر نہیں شرماتیں۔ ہمارا زمانہ اور تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑکیوں کے چہرے شرم سے سرخ ہو جاتے تھے۔"

"کیا آپ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھے بتانا پسند کریں گے؟" پوتے نے سنجیدگی سے فرمائش کی۔

سمیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

شرط

خرم بٹ کے سر پر پٹی اور بازو پر پلستر چڑھا دیکھ کر ہم نے پوچھا۔
"خیریت تو ہے۔ کیا آج پھر موٹر سائیکل کا ایکسیڈنٹ ہو گیا؟"
"نہیں۔!" خرم بٹ نے مری مری سی آواز میں جواب دیا۔
"تو پھر یہ حالت کیسے ہو گئی؟"
"دراصل میں نے عدیل بٹ سے دو سو روپے کی شرط لگائی تھی کہ وہ مجھے کندھے پر بٹھا کر بانس کی سیڑھی پر نہیں چڑھ سکتا۔"
"تو پھر۔؟"
"تو پھر کیا۔ میں شرط جیت گیا۔" خرم بٹ نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

بے نیازی

نئے نئے دولت مند ہونے والے میاں بیوی یورپ کی سیر کے لیے چلے گئے۔ واپسی پر ان کے دوست احباب بے چینی سے ان کے سفر کا حال سننے کے منتظر تھے۔ ان کے اعزاز میں دی گئی ایک دعوت میں ایک خاتون نے نو دولتیے کی بیگم سے پوچھا۔
"آپ نے روم کو بھی اپنے دورے میں شامل رکھا تھا یا نہیں؟"
"مجھے تو معلوم نہیں۔" بیگم نے بے نیازی سے کندھے اچکا کر کہا۔ "ٹکٹ ہمیشہ میرے میاں خرید کر لاتے تھے۔"

اپنی چیز

عراق کے نواح میں دو امریکی فوجی ایک ٹرک میں جا رہے تھے کہ راستے میں ایک صحیح سلامت بم پڑا نظر آیا۔ ایک فوجی نے چلا کر ڈرائیور فوجی سے کہا۔
"ارے ارے۔ گاڑی روکو۔ سڑک کے بیچوں بیچ بغیر پھٹا ہوا ایک بم پڑا ہے۔"
ڈرائیو کرنے والے فوجی نے آنکھیں سکیڑ کر بم کی طرف دیکھا پھر بے پروائی سے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولا۔
"اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں یہ ہمارا اپنا بم ہے۔"

بے قصور

ایک سیٹھ نے دھوبی سے شکایت کی۔
"پچھلی بار تم جو کپڑے دھو کر لائے تھے' ان میں سے مٹی کے تیل جیسی بو آ رہی تھی۔"
"بی بی! اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں جب کپڑے لے کر گیا' تب بھی ان میں سے مٹی کے تیل کی بو آ رہی تھی۔" دھوبی نے اطمینان سے جواب دیا۔

ہری مرچیں

- وہ کچھ اس قسم کا ایکٹر ہے کہ جب ڈائریکٹر کو کسی سین میں دکھانے کے لیے لکڑی یا پتھر نہیں ملتا تو وہ اسے کاسٹ کر لیتا ہے۔
- ہمارے ہاں بہت سے لوگ فلموں پر تبصرہ کرنے کے اہل ہیں لیکن افسوس کہ اگر گندی باتوں اور گالی گلوچ کو ان تبصروں سے نکال دیا جائے تو پھر اخبار میں چھاپنے کے لیے کچھ نہیں بچتا۔
- کمپنی کا ایک ملازم اپنے لیے میڈیکل کی سہولیات منظور کرانے کی غرض سے فارم بھر رہا تھا۔ اس میں ایک سوال تھا۔
"کیا آپ کے خیال میں آئندہ تین مہینوں کے اندر کسی وقت آپ کو ایمرجنسی میں اسپتال جانے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے؟"
- بیجنگ کے مرکزی علاقے میں بہت سے مانگنے والے مختلف جملے کارڈ لیے کھڑے ہوتے ہیں' جن پر مختلف انداز میں لکھا ہوتا ہے کہ ان کی مالی مدد کی جائے۔ لوگ ان عبارات پر توجہ نہیں دیتے لیکن پچھلے دنوں ایک مانگنے والے کی عبارت نے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائے رکھی۔ اس نے اپنے گلے کا کارڈ پر لکھا تھا۔ "بریڈ پٹ اور انجلینا جولی کے ہاں بچے کی پیدائش متوقع ہے۔ میں اس موقع پر تحفہ دینے کے لیے رقم جمع کر رہا ہوں۔ براہ کرم میری مدد کریں۔"

صدف عمران۔ کراچی

شگفتہ جاہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

سیدنا جریر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ کچھ اعرابی لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ وہ کمبل پہنے ہوئے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا برا حال دیکھا تو لوگوں کو صدقہ دینے کی رغبت دلائی۔ لوگوں نے صدقہ دینے میں دیر کی' یہاں تک کہ اس بات کا رنج آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر معلوم ہوا۔ پھر ایک انصاری شخص روپوں کی ایک تھیلی لے کر آیا۔ پھر دوسرا آیا یہاں تک کہ (صدقہ اور خیرات کا) تار بندھ گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر خوشی معلوم ہونے لگی پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص اسلام میں اچھا طریقہ جاری کرے (یعنی عمدہ کام کو جاری کرے جو شریعت کی رو سے ثواب ہو اور اس کا نمونہ قرآن و سنت میں موجود ہو) پھر لوگ اس کے بعد اس کام پر عمل کریں تو اس کو اتنا ثواب ہوگا جتنا سب عمل کرنے والوں کو ہوگا اور عمل کرنے والوں کے ثواب میں کچھ کمی نہ ہو گی اور جو اسلام میں برا طریقہ جاری کرے (مثلاً بدعت یا گناہ کا کام) اور لوگ اس کے بعد اس پر عمل کریں تو تمام عمل کرنے والوں کے برابر گناہ اس پر لکھا جائے گا اور عمل کرنے والوں کا گناہ کچھ کم نہ ہوگا۔

(صحیح مسلم)

حج اکبر

عبداللہ بن مبارک صدر درجے کے متقی تھے' ایک سال حج کرتے ایک سال جہاد میں شریک ہوتے۔ آپ حج سے فارغ ہوئے تو حرم شریف میں ایک ساعت کے لیے سو گئے۔ آپ نے خواب میں دیکھا کہ دو فرشتے آسمان سے نازل ہوئے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا۔
"اس سال کتنے لوگ حج کو آئے؟"
دوسرے نے جواب دیا۔ "چھ لاکھ۔"
پھر اس نے پوچھا۔ "کس قدر لوگوں کا حج قبول ہوا؟"
دوسرے نے کہا۔ "کسی کا حج قبول نہیں ہوا۔"
آپ فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ سنا تو میرے دل میں ایک اضطراب پیدا ہو گیا۔ میں نے کہا۔
"اس قدر لوگ اطراف سے اس قدر رنج اٹھا کر جنگل اور بیابانوں کو عبور کر کے آتے ہیں ان کی تکلیفیں اور عذاب ضائع ہو گیا۔"
پھر اس فرشتے نے کہا۔ "دمشق میں ایک موچی رہتا ہے اس کا نام علی بن الموافق ہے۔ وہ حج کو نہیں آیا مگر اس کا حج قبول ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان سب لوگوں کو اس کے طفیل بخش دیا۔"
جب میں نے یہ سنا تو خواب سے بیدار ہو کر خیال کیا کہ مجھے دمشق جا کر اس شخص کی زیارت کرنا چاہیے۔ جب میں دمشق پہنچا تو اس کا گھر تلاش کیا۔ دروازے پر دستک دی اندر سے ایک شخص نکلا میں نے اس کا نام دریافت کیا۔ اس نے کہا۔
"علی بن الموافق۔"
میں نے کہا۔ "مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"
اس نے کہا۔ "ہاں کہو۔"
میں نے کہا۔ "آپ کیا کام کرتے ہیں؟"
اس نے کہا۔ "میں پارہ دوزی کرتا ہوں۔"
پھر میں نے خواب کا تمام واقعہ اس سے بیان کیا۔ اس نے پوچھا۔
"تمہارا نام کیا ہے؟"
میں نے بتایا "عبداللہ بن مبارک۔"
اس پر انہوں نے بتایا۔ "مجھے تیس سال سے حج کی آرزو تھی سو میں نے اس مدت دراز میں تین ہزار دینار جمع کیے اور اس سال حج کا ارادہ کیا۔ ایک دن میری بیوی

نے چونکہ حاملہ تھی، مجھ سے کہا، "ہمسایہ کے گھر سے طعام کی خوشبو آرہی ہے۔ جاؤ اور میرے لیے کچھ طعام ان سے مانگ لاؤ۔" جب میں گیا تو میرے ہمسایہ نے مجھ سے ذکر کیا کہ تین دن سے اس کے بچے فاقے میں ہیں۔ انہوں نے کچھ نہیں کھایا۔ آج اتفاق سے میں نے ایک مردار گدھا دیکھا تو اس سے ایک ٹکڑا گوشت کاٹا اور گھر لاکر طعام بنایا وہ تمہارے لیے حلال نہیں۔ جب میں نے یہ سنا تو میری جان کو ایک آگ سی لگ گئی۔ میں تین ہزار درہم گھر سے اٹھا کر لایا اور اسے دے دیے کہ اس سے بال بچوں کا گزارہ کرو کہ میرا حج یہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے کہ میرے خلوص نیت کو دیکھ کر بغیر ادائیگی مراسم حج اس نے مجھے اس فعل کو قبولیت حج کا درجہ عطا فرمایا۔"

آمنہ صدیقہ بھٹی۔ عنایت پور بھٹیاں

محبت کیا ہے؟

ایک دفعہ حضرت سیدنا شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی سے دریافت کیا گیا۔

"محبت کیا ہے؟" تو آپ نے فرمایا۔

"محبت، محبوب کی طرف سے دل میں ایک تشویش ہوتی ہے۔ پھر دنیا اس کے سامنے ایسی ہوتی ہے جیسے انگوٹھی کا حلقہ یا چھوٹا سا ہجوم، محبت ایک نشہ ہے جو ہوش ختم کر دیتا ہے۔ عاشق ایسے محو ہیں کہ اپنے محبوب کے مشاہدے کے سوا کسی چیز کا انہیں ہوش نہیں۔ وہ ایسے بیمار ہیں کہ اپنے مطلوب کو دیکھے بغیر تندرست نہیں ہوتے۔ وہ اپنے خالق عزوجل کی محبت کے علاوہ کچھ نہیں چاہتے اور اس کے ذکر کے سوا کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتے۔"

(اقتباس از بہجۃ الاسرار)

انیقہ انا۔ چکوال

راز رکھو!

حضرت عمرؓ کے دور کا واقعہ ہے کہ ایک لڑکی نے حد شرعی سے بچنے کے لیے خودکشی کی کوشش کی اور زندہ بچ گئی۔ اور پھر اس نے سچے دل سے تائب ہوگئی۔ ایک آدمی نے اسے نکاح کا پیغام دیا جو کہ اس واقعہ سے لاعلم تھا۔ سرپرست نے حضرت عمرؓ سے پوچھا۔

"کیا میں اس آدمی کو یہ واقعہ بتا دوں؟"

آپؓ نے فرمایا "کیا جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے چھپایا ہے تو اسے چاک کرنا چاہتا ہے۔ واللہ اگر تونے کسی سے بھی اس کا ذکر کیا تو میں تجھے لوگوں کے لیے عبرت بنا دوں گا۔ جس طرح پاک دامن عفیفہ کی شادی کرتے ہیں اسی طرح اس کی بھی شادی کر۔"

ثمرہ شعیب بٹ۔ گوندلانوالہ

یاد رکھیے!

- حضرات آپ ہمارا فیصلہ نہیں کرسکتے کیونکہ تاریخ کی ابدی عدالت نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ ہم اور وقتی طور پر تو ہار سکتے ہیں لیکن شکست نہیں کھا سکتے

بکھر تو سکتے ہیں لیکن مٹ نہیں سکتے۔

(ہٹلر)

- جلد بازی میں پوری کتاب کو پڑھنے سے بہتر ہے ایک ایک صفحے کو پڑھا اور ہضم کیا جائے۔ (میکلے)
- ایک بزدل آدمی کے ہاتھ میں پستول بھی پکڑا دو لیکن جب اس پر حملہ ہوگا تو وہ ایک گولی بھی نہیں چلا سکے گا لیکن ایک بہادر آدمی بے دست و پا بھی میدان فتح کرلے گا۔ (ہٹلر)

انیسہ مختار۔ چیچہ وطنی

جواہر پارے!

- آنسو کسی ذات کے قریب آنے کی دلیل ہیں۔
- ماسوا ہنسے تو ماورا کدھر سے آئے۔
- آنسو کا سفر رکتا نہیں، یہ سیدھا بارگاہ وحدت میں لے جاتا ہے۔
- خوش نصیب انسان وہ ہے جو اپنے نصیب پر خوش ہے۔
- راستہ، سڑک یا زندگی، کسی کا اپنا کوئی شعبہ نہیں ہے۔ سڑک تو وہی رہتی ہے، صرف مسافر کا فرق ہے۔ اسی سڑک پر تو جیکارڈ بھی پھرتے رہتے ہیں۔ وہیں سے اللہ کا ولی بھی گزرتا ہے۔

(واصف علی واصف)

خدیجہ رحمٰن۔ ایم۔ بی۔ دین (دکن)

دریا، سمندر!

- ※ عاجزی اور کمینگی میں بڑا فرق ہے۔ کسر نفسی کو تحقیر ذات تک نہ پہنچاؤ۔
- ※ طوفانوں کی طاقت سب کشتیوں کو نہیں ڈبو سکتی۔
- ※ انسانی عقل و خرد کی تمام طاقتیں مکڑی کے کمزور جالے کے سامنے بے بس ہیں۔

(واصف علی واصف)

گل پری مرزا۔ لاہور

عورت!

حضرت امام شافعیؒ نے فرمایا "عورت! میں تیری

تعریف اس لیے نہیں کرتا کہ تو کائنات میں سب سے زیادہ حسین ہے۔ میں اس سبب تجھ سے محبت نہیں کرتا کہ تو انسانی راحت کا سب سے موزوں سرچشمہ ہے بلکہ میں اس واسطے تیری تعظیم کرتا ہوں کہ انسانیت تیرے ہی فیض سے ہے۔"

رابعہ شاہ۔ شفیع شریف

دعا!

ایک مرتبہ ایک قوم حضرت معروف کرخیؒ کے پاس سے دریائے دجلہ میں کشتی پر گزری جن کے پاس شراب اور دیگر سامان تعیش رکھا ہوا تھا۔ لوگوں نے کہا۔

"آپ ان کے لیے بد دعا کیوں نہیں کرتے؟" آپ نے فرمایا۔

"اے اللہ ان کو آخرت میں بھی ایسا ہی خوش و خرم رکھ جیسے یہ دنیا میں خوش ہیں۔" لوگوں نے اس دعا پر تعجب کیا تو فرمایا۔

"نعوذ باللہ میں کسی مسلمان پر بد دعا کروں۔ بے شک اللہ انہیں آخرت میں اسی وقت خوش کرے گا جب دنیا میں نیکی اور توبہ کی توفیق دے کر معاف کرے گا۔ یہ اس کی حسن سیاست میں سے ہے۔"

نورین ظفر خان۔ لودھراں

سنہرے اقوال!

- ضرورت بزدل کو بھی بہادر بنا دیتی ہے۔ (سالسٹ)
- آنسوؤں کو بہہ جانے دو، یہ غموں کو مایوسیوں میں تبدیل ہونے سے روکتے ہیں۔ (لی ہنٹ)
- طنز وہ آئینہ ہے جس میں دیکھنے والا اپنے سوا ہر کسی کے چہرے کو دیکھتا ہے۔ (سوئفٹ)
- وہ آدمی عظیم ہے جو اپنا کام چلانے کے لیے دوسروں کے دماغوں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ (پیاٹ)
- یہ کتنی عجیب بات ہے کہ چھوٹے بچوں کو ہم پہلے تو بولنے کی ترغیب دیتے ہیں اور پھر ان کو ڈانٹتے ہیں کہ خاموش ہو جاؤ۔ (جیوبرٹ)
- تقریباً ہم سب ماننے کے محتاج ہیں۔ (چیسٹرفیلڈ)
- عقل مند لوگ اندازہ نہیں کرسکتے کہ بے وقوف اب کیا کہنے والا ہے۔ (براؤننگ)
- ذہانت گفتگو کا نمک ہے۔ (ہیزلٹ)
- فلسفہ چنبیلی کی بیل پر گلاب کا پھول۔ (لارڈ مشکرافٹ)
- آہ! اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لیکن آنکھوں میں آنسو تھے۔ (اسکاٹ)
- بے محل ہنسنا غیر ضروری گفتگو کرنا اور غلط جگہ بیٹھنا بے وقوفی ہے۔ (بیومانٹ)

سیدہ نسبت زہرا۔ کبیروالا

سادگی و نفس کشی!

امیرالمومنین حضرت علی المرتضیٰ شیر خدا کرم اللہ وجہہ کے زمانہ خلافت میں ایک اعرابی کا اونٹ مر گیا۔ وہ دور دراز کا سفر طے کرتا ہوا بیت المال سے اونٹ حاصل کرنے کے لیے دارالخلافت مدینہ منورہ پہنچا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی رہائش گاہ پر آیا تو حضرت امام حسینؓ نے اس کا استقبال کیا اور خوش آمدید کہا اور فرمایا "حضرت امیرالمومنین کرم اللہ وجہہ تو کاروبار خلافت کے سلسلے میں کہیں باہر تشریف لے گئے ہیں۔"

حضرت امام حسینؓ نے اس اعرابی کو مسجد کے حجرے میں بٹھایا اور کہا۔

"میں آپ کے لیے کھانا تیار کر کے لاتا ہوں۔" چنانچہ تھوڑی دیر میں پرتکلف کھانا تیار کر کے آپؓ نے اس کے سامنے رکھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی مسجد میں

تشریف لے آئے۔ اعرابی نے کہا۔
"میں یہ کھانا ہرگز نہ کھاؤں گا۔ جب تک اس غریب شخص کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک نہ کرلوں جو صحن مسجد میں خشک روٹی پانی میں بھگو بھگو کر کھا رہا ہے۔" حضرت امام حسینؓ نے فرمایا۔
"یہی تو میرے والد امیرالمومنین حضرت علی شیر خدا کرم اللہ وجہہ ہیں۔ وہ اپنے معمول کے برخلاف یہ پرتکلف کھانا ہرگز نہ کھائیں گے۔"
اعرابی یہ سادگی اور نفس کشی دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سلطنت عظیم کے سیاہ و سفید کے مالک کی یہ سادگی۔
ایسی خشک غذا جس کو غریب ترین انسان بھی کھانا گوارا نہ کرے۔ غرض اس اعرابی کو بیت المال سے ایک عمدہ اونٹ دلا دیا گیا۔
اور وہ شکر گزاری و حیرانی کے جذبات سے لبریز شاد کام اور بامراد اپنے وطن مالوف کو واپس چلا گیا۔
گڑیا شاہ۔ کبیر وڈ پکا

کچھ باتیں آپ سے کہنی ہیں،

- بے صبری، صبر سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔
- تکلف کی زیادتی، محبت کی کمی کا باعث بن جاتی ہے۔
- زمین اور اہل زمین کے درمیان بکھری اچھی باتوں کو یوں چنیے جیسے پرندے زندگی کے لیے رزق چنتے ہیں۔
- جب انسان کچھ پالیتا ہے تو کچھ کھو بھی دیتا ہے۔ پالینے کی سرشاری وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جاتی ہے اور کھو دینے کا ملال وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔

صبا سلیم قادر۔ ٹنڈو جان محمد

قبر کی منزلیں،

حضرت عثمان بن عفان کے غلام حضرت ہانیؓ سے منقول ہے کہ حضرت عثمانؓ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو ان پر اس قدر رقت طاری ہوتی کہ آنسوؤں سے ان کی داڑھی بھیگ جاتی۔ ان سے کسی نے دریافت کیا۔
"جب آپ جنت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں، اس وقت تو نہیں روتے لیکن جب آپؓ کو قبر یاد آجاتی ہے یا آپؓ کسی قبر کو دیکھ لیں تو اس قدر شدت سے روتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"
حضرت عثمان بن عفانؓ نے فرمایا۔ "میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہے کہ قبر آخرت کی منزلوں میں سے سب سے پہلی منزل ہے۔ جو اس منزل میں کامیاب ہوا، اس کے بعد کی منزلیں بھی اس پر آسان ہوں گی۔ اور جو اس منزل میں کامیاب نہ ہوسکا اس کے لیے اس کے بعد کی منزل اور بھی مشکل ہوگی۔"
کنول شاہین۔ تلہ گنگ

سنہری باتیں،

- جس نے مجھے ایک لفظ سکھا دیا اس نے مجھے غلام بنا لیا۔ (حضرت علیؓ)
- چونکہ جاہل کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ وہ عالم ہے اس لیے وہ کسی کی بات نہیں مانتا۔ (حضرت امام قاقی)
- ہنسنا اور خوش رہنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ غذا کو چبانا۔ (جعفر)
- ضمیر کی خلش اس دنیا کو ہی دوزخ بنا دیتی ہے۔ (بورمو)
- خاموشی گفتگو کا حسن ہے۔ (بوعلی سینا)
- جو شخص ارادے کا پکا ہو وہ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ (گوئٹے)

عظمیٰ شیرازی۔ ٹنڈو آدم

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

ربیعہ شعیب ـــــــ میرپور آزاد کشمیر

وہ جو چاند تاروں کے ہاں پر سر شام گھر سے نکل پڑا
جسے دوستوں پہ غرور تھا، وہ کہاں ڈھلا وہ کہاں گیا
دھڑکنوں میں جو شخص تھا میں کہ جس کے دل کا سکون تھا
غم زندگی تیری تلخیاں، وہ کہاں گیا وہ کہاں گیا

پروین افضل شاہین ـــــــ بہاولنگر

ہم صبح پرستوں کی یہ ریت پرانی ہے
ہاتھوں میں قلم رکھنا یا ہاتھ قلم رکھنا

کشمالہ ـــــــ جلال پور جٹاں

لمحہ لمحہ نظر آتا ہے کبھی اک اک سال
کبھی لمحے کی طرح سال گزر جاتا ہے
[illegible]
وقت اپنے دوست بہرحال گزر جاتا ہے

صبا رانا سلیم ـــــــ ٹنڈو جان محمد

میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں کوئی پوچھ نہ لے
یہ اگر ضبط کا آنسو ہے، تو ٹپکا کیسے

صبا فرید ـــــــ کبیر وڈ پکا

اک اور برس بیت گیا اشک رواں کے ساتھ
اس سال تو خدا کرے کوئی خوشی ملے

انیقہ انا ـــــــ چکوال

اک اشک چھلک جائے تو طوفاں اٹھا دے
رکھتا ہوں میں آنکھوں کے پیالوں میں سمندر
اک چاند سے کیا اس کی ملاقات ہوئی ہے
رہتا ہے ہر وقت اجالوں میں سمندر

نورین ظفر خان ـــــــ گوجرانوالہ

کیوں اداس بیٹھے ہو اس اندھیرے میں
دکھ تو کم نہیں ہوتے روشنی بجھانے سے
کچھ سمجھ نہیں آتی شہر کے مکینوں کی
لوگ روٹھ جاتے ہیں آئینہ دکھانے سے

نزہت جبین ضیاء ـــــــ کراچی

دم توڑتے برس نے اس بار پھر صدا دی
بھیگا نہ اس برس بھی نصیب کا دسمبر

کنول شاہین قیصر ـــــــ تلہ گنگ

میں لوٹ کر نہ آؤں گا
تو منتیں ہزار کر
یہ عمر بھر رلائے گا
نہ دل کا اعتبار کر

ثریا فرحت ـــــــ خانیوال

مجھ سے مخلص نہ واقف میرے جذبات سے تھا
اس کا رشتہ تو فقط اپنے مفادات سے تھا
اب جو بچھڑا تو کیا رونا جدائی پہ تیری
یہ اندیشہ تو ہمیں پہلی ہی ملاقات سے تھا

روبینہ گیلانی ـــــــ گوجرانوالہ

کس قدر تکلیف دہ تھا آرزوؤں کا سفر
مسئلہ در مسئلہ، سانحہ در سانحہ

عائشہ اسلم ـــــــ گجرات

جنوں میں مجھ کو ڈبوتے تو بات تم پہ بھی آتی
یہ ساحل پہ لاکر ڈبوتا، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا
جی میں آیا تو خوب کھیلا خوشی سے اترا تو توڑ ڈالا
میرا جگر بھی ہے اک کھلونا، کوئی سنے گا تو کیا کہے گا

ننھی کان ہتی ـــــــ ملتان

ہجر کی شب نالۂ دل وہ صدا دینے لگے
سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے
باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

صائمہ سلیم ـــــــ کراچی

یادوں کے حاشیے بھی اہم ہیں بہت
دیمک لگی کتاب کو آہستہ کھولیے

عمرہ طاہر بٹ ____________ لاہور

دنیا کا ذکر بھی ہوگا زمانے کو ہم یاد بھی آئیں گے
مگر طاقچوں میں رکھی بوسیدہ کتابوں کی طرح
میرے خواب تجھے جگا بیٹھیں گے چاندنی بن کر
تیری یادیں مجھ پہ برسیں گی غزالوں کی طرح

تہمینہ شاہ، رابعہ شاہ ____________ کنٹھی شریف

آنکھوں میں کوئی خواب اترنے نہیں دیتا
یہ دل کہ مجھے چین سے مرنے نہیں دیتا
بچھڑے تو عجب پیار جتاتا ہے خطوں میں
مل جائے تو پھر حد سے گزرنے نہیں دیتا

منزہ، رابعہ ____________ اسکندر آباد

سمجھتے تھے ہم کہ پاؤں کے کانٹے نکل گئے
منزل قریب آئی تو رستے بدل گئے
دوست ہم کو جن کی رفاقت پہ ناز تھا
وہ لوگ بھی ہوا کی طرح رُخ بدل گئے

ایمن عزیز ____________ میانوالی

کھیتوں میں پھر سرسوں کی رُت آ پہنچی
آج تمہیں دیکھے پھر اک سال ہوا

تسنیم نسیم ____________ میانوالی

ہمہ وقت رنج و ملال کیا جو گزر گیا سو گزر گیا
اسے یاد کرکے نہ دل دکھا جو گزر گیا سو گزر گیا

نغمانہ بٹ ____________ لاہور

یارب یہ سال سب کی مسرت کا سال ہو
پیغام عیش لائے یہ عشرت کا سال ہو
آنسو کا سال ہو نہ یہ آہوں کا سال ہو
نغمے نئے سنائے بہاروں کا سال ہو

مصباح گل ____________ سرگودھا

نئی رُتوں میں دکھوں کے سلسلے ہیں نئے
وہ زخم تازہ ہوئے جو کہ بھرنے والے تھے
یہ کس مقام پہ سُوجھی تجھے بچھڑنے کی
کہ اب تو جاکے کہیں دن سنورنے والے تھے

عائشہ جٹ ____________ بہاولپور

منزل تو کچھ بھی دور نہ تھی اس نشان سے
تھک کر جہاں گرا تھا پرندہ اڑان سے
برسوں کا ساتھ چھوڑ کر وہ اس طرح گیا
جیسے کوئی ستون گرا ہو مکان سے

ثمرہ احمد بٹ ____________ بتوکی

اک پردیسی لوٹ کے آیا اپنے دیس
مدتوں بعد کسی کی دید ہوئی ہے
جگمگ جگمگ سارا نیا سال
روشن ایسی اپنی عید ہوئی ہے

گڑیا شاہ ____________ کہروڑ پکا

کہیں سورج سے ذرے کی ٹھنی ہے
کہیں تتلی سے بھنورا لڑ گیا ہے
پڑی ہے اوس رشتوں پر کچھ ایسی
لہو کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے

ثنازیہ رانا ____________ دیپال پور

یہ سال بھی گزر رہا ہے ترے پیار کی مانند
آتے ہوئے کچھ اور تھا جاتے ہوئے کچھ اور

ریحا چوہدری ____________ ساہیوال

ہم نے یہ سورج کے بجھنے کا ہنر سیکھ لیا
درد رکھنا ہے تو پھر دیدۂ تر کیا رکھنا

سیدہ حنا قیصر ____________ حیدرآباد

جہاں سوال کے بدلے سوال ہوتا ہے
وہیں محبتوں کا زوال ہوتا ہے
کسی کا بن کر رہنا ہنر ہی سہی
کسی کو اپنا بنانا بھی کمال ہوتا ہے

راحیلہ ملک ____________ اسلام آباد

سال کی پہلی کرن کے ساتھ پھر جاگا ہے دل
پھر وہی میری طلب، اب کے برس مل جائے تو

انشین ____________ فیصل آباد

وہ اس انداز کی مجھ سے محبت چاہتا ہے
کہ میرے ہر خواب پر اپنی حکومت چاہتا ہے
وہ کہتا ہے کہ میں اس کی ضرورت بن چکا ہوں
تو گویا وہ مجھے حسب ضرورت چاہتا ہے

حنا سلیم اعوان ____________ ہری پور ہزارہ

ہر ایک آنکھ تھی پُرنم، یہ کیسا موسم تھا
جُدا ہوئے جو دو شخص تو بات اک برس
کسی کے جانے کا اشرف گلہ کروں کس سے
جُدا ہوئی ہے میری خود سے ذات اک برس

خط آئے

رضیہ جمیل

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع ۔37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
Shuaemonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
آپ کی خوشیوں، سکون اور عافیت کے لیے دعائیں۔
پہلا خط نادیہ جہانگیر اور ثوبیہ جہانگیر کا ہے، لکھتی ہیں
ٹائٹل ہمیشہ کی طرح بہت خوبصورت تھا۔ لڑکی کا گلابی گلابی چہرہ بہت نرم، بہت پرکشش سا لگا۔
جب "شعاع" کھول کے دیکھا تو نزہت شانہ حیدر کا نام سامنے ہی جگمگا رہا تھا۔ ہماری تو خوشی سے باچھیں کھل اٹھیں، اسی لیے سب سے پہلے "ابھی عشق ہو تو پتہ چلے" کو پڑھا۔ بہت زبردست اور خوبصورت ناول تھا۔
اسماء قادری کا ناول بھی بہت زبردست تھا اور سدرہ سحر عمران نے بھی ہمیشہ کی طرح بہت خوب لکھا۔
رخسانہ نگار نے اس دفعہ پھر "آخری قسط" کا دھچکا لگایا مگر آخر میں جب ان کا محبت نامہ پڑھا تو ان پر پیار آیا۔
ارے رخسانہ آپی! آپ کی محبت کا شکریہ، جو ہم قارئین کا اتنا خیال رکھتی ہیں کہ ہمارے لیے وقت نکال کر خط بھی لکھ ڈالا۔ ہمیشہ خوش رہیں۔ "اکیسویں صدی کی لیلیٰ" سعدیہ رئیس نے بہت اچھا لکھا۔ افسانوں میں ثمینہ عظمت علی کا افسانہ پہلے نمبر پر رہا۔ رفعت ہمایوں نے چہرے پہ مسکان سجا دی۔ راشدہ رفعت تو لکھتی ہی بہت زبردست ہیں۔ "رنگ ہائے زیست" بھی ہمیشہ کی طرح پسند آیا۔
"زرد موسم" راحت آپی نے اس دفعہ بہت تیز تیز لکھا۔ اب تو ہمیں صد فیصد یقین ہے کہ طارق صاحب ہی ایمن کے شوہر نامدار ہیں۔
نور بانو مجوب نے سچ کی ایک ایک بات اتنے خوبصورت انداز سے پیش کی کہ ہمارے دلوں کو وہیں باندھ کے رکھ دیا۔
عاقب جاوید سے مل کر اچھا لگا۔ "فضا بھی پوچھتی ہے" میں صالحہ شبیر کا انتخاب پسند آیا۔
اور امید ہے اس بار بھی "ہر بار کی طرح" ہمارا تبصرہ نوکری میں جائے گا۔ کیوں ہے نا.....؟

☆ نادیہ اور ثوبیہ! تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔ آپ کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ آپ کا خط اس بار شامل اشاعت ہے۔ آپ نے ناولٹ لکھنے کا وعدہ کیا تھا، اس کا کیا ہوا؟ مقابلہ افسانہ نگاری کے لیے اپنی تحریریں ضرور بھجوائیں۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔

"شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔"

بینش رحمت اللہ نے نارووال چھمبر سے لکھا ہے۔
دسمبر کا شمارہ ہر لحاظ سے تو نہیں مگر بہرحال زبردست تھا۔ اگر ٹائٹل موسم کی مناسبت سے ہوتا تو زیادہ اچھا ہے۔ سب سے پہلے سلسلہ وار ناول پڑھے۔ "تاریخ کے جھروکے" میرا پسندیدہ ترین سلسلہ ہے۔ پلیز "آئینہ خانہ" کو ختم کر کے اس کے صفحات میں اضافہ کر دیں۔ آپی! مجھے لکھنے کا بے حد شوق ہے، لکھا بھی مگر خود ہی پھاڑ دیا کہ شعاع والے تو خط شائع نہیں کرتے، افسانہ یا ناولٹ کیا شائع کریں گے۔

☆ بینش! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے دو خط شائع نہ ہوسکے۔ آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ خط شائع نہیں کرتے تو افسانہ یا ناولٹ بھی شائع نہیں کریں گے۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے تو ضرور لکھیں۔ شعاع میں نئے مصنفین کی صلاحیتوں کو سامنے لانے کے لیے ہم نے مقابلہ افسانہ نگاری کا انعقاد کیا ہے۔ آپ اس میں حصہ لے سکتی ہیں۔ دوسری بہنوں کو بھی جن میں لکھنے کی صلاحیت ہے اس مقابلے میں حصہ لینے کی دعوت دے رہے ہیں۔
فرحت اشتیاق اور نبیلہ تقوی کے جن ناولوں کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے وہ کتابی شکل میں شائع نہیں ہوئے۔

سیما امتیاز لاہور سے اپنی ای میل کے ساتھ جلوہ افروز ہیں، لکھتی ہیں۔
ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ سب سے پہلے بات کروں گی "لو یو پا" کی۔ اس بار یکسانیت سی رہی اور یوں لگا جیسے 1956ء کی کوئی فلم دیکھ رہے ہیں، جس کے آخری پندرہ منٹ میں سارا کچا چٹھا کھولنا فرض ہو۔ بہت ہی فلمی انداز لگا۔ "زرد موسم" تھوڑا سلو ہوتا جا رہا ہے۔ راحت آپی! کچھ خیال کریں۔ نزہت شانہ کا "عشق ہو تو پتہ چلے" میں عبیر کا انجام پڑھ کر افسوس ہوا۔ اسماء قادری کا ناول روایتی سا لگا۔ "محبت اور تم" سدرہ سحر عمران کا پسند آیا۔ اس بار بھی "میرے چارہ گر" کی آخری قسط پا کر ابھی آستینیں چڑھائی ہی تھیں کہ رخسانہ جی کے خط نے ہمیں ٹھنڈا کر دیا۔ افسانوں میں راشدہ رفعت بازی لے گئیں۔ جبکہ ثمینہ عظمت علی کا "جن" بے ساختہ مسکرانے پر مجبور کر گیا۔ مستقل سلسلے سارے ہی زبردست تھے۔ البتہ شاعری میں ندا فاضلی کی غزل بے حد پسند آئی۔

☆ پیاری سیما! یاد آوری کا شکریہ۔ آپ کی تعریف اور تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

رابعہ شاہد، پاتوالی سے تفصیلی تبصرے کے ساتھ آئی ہیں، لکھتی ہیں۔
ماڈل کی سادگی اور معصومیت بہت پسند آئی۔ سب سے پہلے "میرے چارہ گر" ناولٹ پڑھا اور رخسانہ آپی کا خط بھی۔ "ریگ زار تمنا" کو ماہا جی بہت اچھے طریقے سے آگے لے کر جا رہی ہیں۔ "زرد موسم" میں ایمن بالکل اچھا نہیں کر رہی اور مرا الہ نے ایمن کو بالکل چھوٹ دے رکھی ہے اور اپنی بیٹیوں پر جو بے جا سختی کر رہی ہے تو یہ دونوں باتیں ہی غلط ہیں۔ ایمن بھی خراب ہو جائے گی اور مومل بھی بگڑ جائے گی۔
پھر اسماء قادری کا مکمل ناول "چاہا ہے تجھے" پڑھا تو بہت اچھا لگا۔ واقعی اس دنیا میں نوید خان جیسے وحشیوں کی کمی نہیں ہے۔ اس کا اینڈ بہت پسند آیا۔
"ابھی عشق ہو تو پتہ چلے" نزہت شانہ حیدر کا پسند آیا مگر اس کا اینڈ اچھا نہیں لگا۔ ثوبان اور عبیرہ کا ملاپ ہو جاتا تو اچھا تھا مگر شاید ایمان کو اس کے صبر کا پھل ملا۔
"میں، محبت اور تم" سدرہ نے بہت اچھا لکھا۔ کبھی کبھار سنجیدہ پن بھی انسان کو پرکشش بنا دیتا ہے۔
آخر میں سب بہنوں کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔

محبت ہی محبت کا تقاضا اب کے سال کرتے ہیں
چلو پھر آنے والی رُت کا استقبال کرتے ہیں
کہ اب ہم سب کو سہاروں کی ضرورت ہے
نئے سال میں آنے والی بہاروں کی قدر کرنی ہے

☆ رابعہ! ہماری طرف سے بھی نئے سال کی مبارک باد قبول کیجئے۔ آپ کا محبت بھرا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ محبت اس کائنات کا سب سے خوبصورت جذبہ ہے۔ اگر سب لوگ محبت سے رہیں تو یہ دنیا جنت بن جائے۔
ادارے کے اراکین کی تعداد خواتین ڈائجسٹ کے 25 ویں سالگرہ نمبر میں شائع ہو چکی ہیں پھر کسی موقع پر آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔
"شعاع" کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

صائمہ مشتاق حمد نے حافظ آباد سے لکھا ہے۔

ٹائٹل پہ نظر پڑی تو دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ بہرحال ٹائٹل گرل اچھی تھی۔

فہرست پر نظر دوڑائی۔ ایک ساتھ تین ناول دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ویسے "شعاع" آج کل کچھ زیادہ "دیالو" نہیں ہو گیا مکمل ناولز کے معاملے میں۔ سب سے پہلے سدرہ سحر کا ناول پڑھا۔ موضوع اگرچہ پرانا ہی تھا لیکن سدرہ نے جس طرح کہانی کو آگے بڑھایا' اس میں جو ایک تسلسل تھا' وہ قابل تحسین ہے۔ اسماء قادری آپ کا ناول بھی ایک ایسا ناول تھا جس کا پہلا سین مکمل ہوتے ہی میں ساری کہانی سمجھ گئی تھی لیکن پڑھ کر مزہ آیا۔ رخسانہ ڈیئر! ہمیں آپ کے وعدے پر یقین ہے۔ آخری قسط یقیناً اچھی ہوگی۔ سعدیہ رئیس کافی عرصے بعد ناولٹ کے ہمراہ آئیں۔ کہانی کے شروع میں ان کا اسلوب بیان بے حد اچھا لگا' منفرد سا لیکن اختتام کچھ مبہم سا تھا۔ کیا عمر حیات' ہاشم کو پسند کرتا تھا یا نہیں؟ رفعت ہمایوں اس دفعہ پہلے جیسا مزہ نہ دے سکیں۔ افسانہ بہت دلچسپ لگا۔ "زرد موسم" کی تو کیا ہی بات ہے۔ بہت روانی اور تسلسل سے آگے بڑھ رہا ہے لیکن راحت جی "زرد موسم" کے علاوہ بھی کچھ لکھیے نا۔ فائزہ! آپ کہاں چھپ گئی ہیں' پلیز فٹافٹ واپس آئیں اپنے "لاہوری اسٹائل" کے ساتھ۔ "تاریخ کے جھروکے" میں رابرٹ کلائیو کے بارے میں پڑھ کر بے حد مزہ آیا اور حیرانی بھی ہوئی کہ کیسے کیسے لوگ ہیں جن کے بارے میں سنا تک نہیں لیکن تاریخ کے صفحات پر انہوں نے کتنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔

اور میری شائستہ مومن کے انٹرویو کی درخواست کا کیا بنا؟ پلیز ضرور پوری کیجئے گا۔

☆ صائمہ! شعاع پر تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔

عمر حیات نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہاشم سے شادی کی تھی تو پسندیدگی کا جذبہ ضرور ہوگا لیکن شادی کے بعد ہاشم کا رویہ دیکھنے کے بعد آپ خود فیصلہ کریں کہ چاہت یا پسندیدگی ہو سکتی ہے؟

شائستہ مومن کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کر لی ہے' کسی خاص نمبر میں ان کا انٹرویو شائع کریں گے۔

یہ ای میل ہمیں روبینہ توقیر نے کراچی سے بھیجی ہے' لکھتی ہیں۔

ٹائٹل بس سو سو تھا۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" اور "صحابیات" کا سلسلہ بے حد معلوماتی ہے۔ اس سے آگے بڑھے تو "رنگ زار تمنا" اب کچھ زیادہ ہی تیزی سے انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آپا! راحت مانیے گا مگر ماہا جی کا یہ ناول مجھے کچھ خاص متاثر نہ کر سکا۔ حالانکہ ماہا جی میری فیورٹ رائٹرز میں سے ایک ہیں۔ "زرد موسم" میں بے چاری ایمن پہ بے تحاشا ترس آیا اور یہ سر طاہر محمود کتنا خبیث ہے۔ راحت آپی اس کو ٹھیک ٹھاک سبق دیجیے گا۔ مکمل ناولز تینوں ہی اچھے لگے۔ "چارہ گر" کی آخری قسط کا بے حد انتظار ہے۔ گو انجام یقیناً ہماری توقع کے خلاف نہیں ہوگا اس کا تو ہمیں یقین ہے مگر پھر بھی۔ افسانے تینوں ہی زبردست تھے۔ "شعاع کے ساتھ ساتھ" مجھے بہت پسند ہے۔ انٹرویو میں ایمان علی کو پا کر بھی خوش ہو گیا۔ نور بانو محبوب کا "لبیک" پڑھ کر بے ساختہ خواہش جاگی کہ کاش ہم بھی وہ سب کچھ کبھی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ بے حد ایمان افروز تحریر تھی۔ "موسم کے پکوان" بہت اچھے تھے۔ اور پیارے شعاع کے سارے مستقل سلسلے تو ہوتے ہی لاجواب ہیں۔

☆ پیاری روبینہ! ہمیں افسوس ہے کہ ماہا ملک کا ناول آپ کو متاثر نہ کر سکا۔ ڈیئر مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

ارم الطاف نے راولپنڈی سے لکھا ہے

دو چھوٹے چھوٹے بیٹوں کی حد درجہ بڑھتی ہوئی مصروفیت اور اپنی لیکچرر شپ کے ہاتھوں خط نہ لکھ سکی۔ آج اچانک دل میں یہ خواہش شدت سے ہوئی کہ آپ کو خط لکھا جائے۔

"کبھی عشق ہو تو پتہ چلے" نزہت شبانہ حیدر کی اچھی کاوش تھی۔ اگرچہ عبیرہ جیسی خود غرض لڑکی سے کوئی خاص ہمدردی نہیں محسوس کی مگر کہانی اپنی جگہ سولڈ تھی۔ "چاہا ہے تجھے" میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ "میں محبت اور تم" بھی بس ٹھیک تھی۔ زرتاب جو مغرب میں رہا' اس سے زیادہ بے باک تو حریہ لگ رہی تھی۔ "رنگ ہائے زیست" بہت تخیل انداز میں لکھی گئی کہانی تھی اور صحیح معنوں میں حقیقت کی عکاسی تھی۔ "21ویں صدی کی لیلیٰ" بڑی اچھی ہوئی کہانی تھی اور جبکہ عمر حیات' ہاشم کے بارے میں جان چکا ہے کہ وہ جواد سے ملتے جارہی تھی تو کیا وہ اسے قبول کرے گا۔ عجیب سی کہانی تھی کہ مزہ نہیں آیا۔ "میرے چارہ گر" پڑھتے کر یک اپنا ہی لطف ہے۔ پتہ نہیں ہماری قارئین بہنیں اس چیز کو اتنا ایشو کیوں بناتی ہیں کہ آخری قسط لکھا اور دی نہیں۔

☆ پیاری ارم! آپ نے اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر خط لکھا' بے حد خوشی ہوئی۔ جواد احسان واقعی ڈاکوؤں کا سرغنہ تھا۔ عمر حیات کو شادی سے پہلے ہی ہاشم کے عشق کے بارے میں پتا تھا لیکن اس نے گھر والوں کے دباؤ پر شادی کر لی تھی۔ شادی کے بعد ہاشم نے جو کیا اب اس کے لیے عمر حیات کے دل میں جگہ بنانا بہت مشکل ہوگا۔

سعدیہ انیس اور سدرہ انیس نے کراچی سے لکھا ہے

اس دفعہ سرورق کی معصوم و سنجیدہ سی لڑکی اچھی لگی اور "زرد موسم" کی ایمن تو بالکل ہی پاگل لگتی ہے۔ سر طاہر تو بہت ہی زہر لگتے ہیں۔ ہم تو کہتے ہیں اس کو پھانسی پر لٹکا دینا چاہیے۔ ماہا ملک کی تو کیا بات ہے۔ زبردست' بہت اچھے لیکن اس قسط میں ہاشم کا کردار بالکل بھی نہ تھا۔ "میرے چارہ گر" کے بعد رخسانہ نگار کا خط پڑھا۔ تین چار قسطوں کے نامکمل ناول کو انہوں نے کیا بنا دیا۔ ہمارا نہیں خیال کہ اس میں اتنی گنجائش تھی۔ اور تو ان کے ناول کے ہیروئن کی دوغلی شخصیت بھی اچھی نہیں تھی۔ چلو مانتے ہیں کہ جب اس کو اس کے پیار (یعنی منگیتر) سے الگ کر کے اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف کر دی گئی۔ غلط ہوا تھا اس کے ساتھ لیکن اس کا ردعمل تو اس سے بھی زیادہ غلط تھا۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ محترمہ زریاب کو نہ بھول سکیں۔ دوسری بات... اسی چکر میں اس کی ران سے نہ نبھ سکی اور ایسا کا دوبارہ سے زریاب سے ملنا بالکل بھی صحیح نہیں تھا۔ وہ اب ایک شادی شدہ لڑکی تھی۔ نومبر کے "خط آپ کے" میں آخری خط کی آخری لائن میں لکھا تھا عمیرہ احمد "پیر کامل" کا دوسرا حصہ لکھنے والی ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں "پیر کامل" کا اینڈ نہیں معلوم کہ امامہ ہاشم اور سالار سکندر نے بھی ملتے یا نہیں۔

اور ہاں محترمہ نمرہ احمد کہاں غائب ہو گئیں۔ انہیں اپنا ہوا اشتہارے اور دیتا ہے...

یہ "دلوں کے رشتے اور دلوں کے موسم" جیسے زبردست ناول لکھنے والی پیاری سی مریم عزیز کہاں ہیں؟ پلیز مریم! کوئی زبردست سا اس جیسا ناول لکھو۔

☆ سعدیہ اور سدرہ! ہمیں افسوس ہے آپ کے پچھلے خط شائع نہ ہو سکے۔ رخسانہ نگار نے دراصل یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کبھی کبھی جو ہمیں بہت ناگوار ہوتا ہے اور ہم اسے شدید ناپسند کرتے ہیں' وہ ہمارے حق میں بہتر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کیا بہتر ہے اور کیا بدتر وہ انسان کے لیے اچھا کرتا ہے لیکن انسان بے صبرا ہوتا ہے۔ ایسا کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ وہ جان نہ سکی کہ جس چیز کے پیچھے وہ بھاگ رہی ہے' وہ سراب ہے۔

"پیر کامل" کے اینڈ میں امامہ اور سالار مل گئے تھے اور ان کی شادی ہو گئی تھی۔

نمرہ احمد نے آپ کے لیے بہت خوبصورت ناول لکھا ہے۔ فروری کے شمارے میں آپ پڑھ سکیں گی۔ شعاع یا خواتین ڈائجسٹ میں شامل ہوگا۔

مریم عزیز بھی آپ کے لیے ناول لکھ رہی ہیں شاید۔

مہرین احمد کلفٹن سے لکھتی ہیں

میں نے کبھی کسی رسالے میں خط نہیں لکھا مگر آپ کو چار خط لکھ چکی ہوں۔ آپ کا رسالہ بہت اچھا ہے۔ آپ کی سب رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں' اس بار مکمل ناول میں "کبھی عشق ہو تو پتہ چلے" اور "چاہا ہے تجھے" بہت پسند آیا۔ "میرے چارہ گر" بھی اچھا جا رہا ہے مگر بہت جلدی ختم ہو رہا ہے۔ ماہا ملک کا "رنگ زار تمنا" بھی اچھا ہے مگر اب اختتام ہونا چاہیے۔ سدرہ سحر عمران کا مکمل ناول بھی کچھ اچھا تھا مگر مکمل طور پر اپنے حصار میں نہ لے سکا۔ "اکیسویں صدی کی لیلیٰ" بہت ہی اچھا لگا۔ اگر عمر حیات کا رویہ ہاشم کے ساتھ کچھ نرم ہوتا تو اور بھی اچھی بات تھی۔ اس رسالے کی جان جو کہانی تھی' وہ "جنت" تھی۔ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد بھی آنکھ اور دل بھی لگا۔ ثمینہ عظمت علی کو اتنی اچھی کہانی لکھنے پر مبارک باد اور آخر میں ایک فرمائش کہ کنز عمران نذیر کا انٹرویو شائع کریں۔

☆ مہرین! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شائع نہ ہو سکے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ سدرہ سحر عمران نئی مصنفہ ہیں۔ وقت کے ساتھ

ساتھ ان کی تحریر میں بہتری آرہی ہے۔ آپ کو ان کے ناول میں کمی محسوس ہوئی۔ ہمیں یقین ہے ان کی آئندہ تحریروں میں آپ کو یہ احساس نہیں ہوگا۔

عمران نذیر کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔ جلد پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

مریم مظہر نے پاڈہ (لاڑکانہ) سے لکھا ہے

اس ماہ کا ٹائٹل بہت ہی زبردست تھا۔ "اکیسویں صدی کی لیلیٰ" کا انجام حیرت میں ڈال گیا۔ ناول تینوں ہی بہت اچھے تھے۔ اسماء قادری کا "چاہا ہے تجھے" زبردست تھا لیکن یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ایک باپ کا ایسا روپ بھی ہوسکتا ہے۔ "میں محبت اور تم" ناول بہت اچھا تھا۔ خاص کر اس میں حریر کا کردار بہت اچھا تھا۔ ارے ارے رکیے۔ میں اس ناول کا تو ذکر کرنا تو بھول گئی جو اس ماہ کی جان تھا۔ ہاں وہی "کبھی عشق ہو تو پتا چلے"۔ آپ "آئینہ خانے میں" کی جگہ کوئی ایسا سلسلہ شروع کریں جس میں کسی بھی ایک مصنف کا انٹرویو شائع کریں۔

☆ مریم! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

ساجدہ امیر دین سومرو نے سانگھڑ سے لکھا ہے

اگر اس ماہ کے شعاع کی بات کی جائے تو بہت خوب تھا اور کہانیوں کا تو کیا ہی کہنا۔ خاص طور پر "میرے چارہ گر" کی تو کیا ہی بات ہے۔

پچھلے ماہ میری چوتھی بھانجی پیدا ہوئی تو میں نے دیکھتے ہی کہہ دیا یہ ایبہا ہے۔ آپی نے کہا۔ نہیں میں نے اس کا نام حنا رکھنا ہے لیکن وہ ساجدہ ہی کیا جو پیچھے ہٹ جائے۔ اب ہم اسے ایبہا کہتے ہیں لیکن ہمیں اس کے معنی پتا نہیں۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو ضرور بتایئے گا۔

اب آتے ہیں شعاع کی طرف تو "پیارے نبی کی پیاری باتیں" میں کبھی پڑھنا بھولتی نہیں۔ وہ بہت زبردست تھیں۔ آپ سے گزارش کرتی ہوں کہ وصی شاہ اور فیض احمد فیض کی غزلیں شائع کریں۔

☆ ساجدہ! معذرت کہ آپ کے پچھلے خط شعاع میں جگہ نہ پاسکے۔

ایبہا کے معنی ہیں "جنت کی چڑیا"

فیض احمد فیض اور وصی شاہ کی غزلوں کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ تھوڑا انتظار کرلیں۔

مصباح گل سرگودھا سے لکھتی ہیں

"باتوں سے خوشبو آئے" سلسلے میں آخری انتخاب "بات دل کو لگتی ہے" میرا بھجوایا ہوا تھا جو کہ تحریم (کراچی) کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس کو معمولی بات نہ جانیے اور اس پر خاص توجہ دیں کہ شائع ہونے والا انتخاب اپنے اصل بھجوانے والے کے نام سے ہی شائع ہو۔

☆ مصباح! ہمیں بے حد افسوس ہے ایسا دانستہ نہیں سہواً ہوا ہے۔ آئندہ خیال رکھیں گے کہ آپ کا بھجوایا ہوا انتخاب کسی اور کے نام سے شائع نہ ہو۔ ایک بات بتاتے چلیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی شعر یا لطیفہ بہت سی بہنیں بھجوا دیتی ہیں۔ ممکن ہے آپ کے سلسلے میں بھی یہی ہوا ہو۔

حاصل پور سے عمرانہ کوثر تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں

ضروری تو نہیں کہ لبوں سے کہہ دوں داستان اپنی
زباں اک اور بھی ہوتی ہے اظہار کے لیے

واقعی حقیقی بات ہے محبت کا اظہار لبوں سے نہ ہوسکے تو دوسری زبان استعمال کرنی پڑتی ہے اور وہ ہے قلم کی زبان۔ میں برسوں سے شعاع کی خاموش قاری ہوں اور اس کے ساتھ محبت کا رشتہ اتنا پرانا اور مستحکم ہے کہ ہر چیز کے بغیر گزارہ ممکن ہے مگر شعاع کے بغیر گزارہ ناممکن ہے۔ آج کے اس مصروف اور مسائل سے بھرپور دور میں شعاع بہترین تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے۔

دسمبر کا شمارہ خلاف توقع بہت ہی لیٹ یعنی 4 تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے نظر ٹائٹل گرل پر پڑی۔ فیروزی کلر کے سوٹ میں ملبوس لائٹ میک اپ میں اچھی لگی۔ آنکھوں میں اٹریکشن تھی مگر لبیں مسکراہٹ سے خالی تھا۔

دسمبر کے حوالے سے پرتاثیر اداریے کی تحریر نے دل پر گہرا اثر ڈالا۔ حمد و نعت سے فیض یاب ہوئے۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" بہت اچھی لگیں۔ فنکاروں سے ملاقات اچھی لگی۔ بہنوں۔۔۔ تعریف و تنقید پر مبنی خطوط پڑھ کر مزا آیا۔ واقعی قارئین بہت باریک بینی سے کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

"شاعری سچ ہوتی ہے" میں صالحہ شبیر کے فیورٹ اشعار

ہمیں بھی پسند آئے۔ "اس ماہ کی مسکراہٹیں" نے واقعی مسکرانے پر مجبور کردیا اور ذہن فریش ہوگیا۔ اب ہوجائے کچھ تبصرہ کہانیوں پر بھی۔ سلسلے وار تو ساری ہی قابل داد ہیں۔

"رنگ ہائے زیست" "باپ بیٹی اور ماں بیٹے کی محبت پر مبنی افسانہ" ایک دلکش تحریر تھی۔ ماں اور بیٹی کی محبت تو دیکھی ہے مگر باپ بیٹی کی اتنی گہری محبت کچھ معنوی سی لگی۔

"اے محبت" "عشق و معشوق پر مبنی افسانہ کچھ خاص نہ لگا۔

سعدیہ رئیس کا ناولٹ "اکیسویں صدی کی لیلیٰ"

ورائٹی بہت زبردست تھی۔ کہانی کا اسٹارٹ اینڈ بھی اچھا تھا مگر کہانی تو عام کہانیوں جیسی ہی لگی۔

☆ عمرانہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ کو شعاع سے اتنی محبت ہے پھر بھی اتنی دیر بعد قلم کو زبان دی۔ اب ہمیں خط لکھتی رہیے گا۔

باپ بیٹی کی محبت آپ کو معنوی لگی یہ جان کر حیرت ہوئی۔ بیٹیاں ماں کی غم گسار ہوتی ہیں لیکن وہ محبت باپ سے زیادہ کرتی ہیں۔ اسی طرح بیٹے باپ کا بازو ہوتے ہیں لیکن باپ کو زیادہ محبت بیٹیوں سے ہی ہوتی ہے۔ یوں بھی پرائی ہونے کے بعد بیٹیاں زیادہ یاد آتی ہیں۔

ربیعہ اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئی ہیں انہیں شکوہ ہے

آپ "باتوں سے خوشبو آئے" اور "رنگا رنگ پھول" میں میری تحریریں شائع کیوں نہیں کرتیں؟ ہر ماہ انتظار رہتا ہے مگر دیکھ کر بہت اداس ہوجاتا ہے کہ اس بار بھی میرے اقوال، لطیفے، شعر وغیرہ آپ کو شاید پسند نہیں آئے۔

☆ ربیعہ! آپ اچھی چیزیں انتخاب کرکے بھیجیں۔ ہم ضرور شائع کریں گے۔ قارئین کی شرکت کے لیے ہی ہم نے یہ سلسلے شروع کیے ہیں اور بہنوں کے انتخاب سے ہی شعاع کے سلسلے سجاتے ہیں۔

نسرین خورشید، ثمرین خورشید خانیوال سے آئی ہیں، لکھتی ہیں

ماڈل کا فیروزی اور براؤن لباس بہت خوبصورت لگتا اگر اس کی گھنیری زلفیں پورے ٹائٹل پر جلوہ گر نہ ہوتیں۔ آج کل کے پُرمصائب حالات میں ٹینشن زیادہ ہیں اور تیرگی بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ اس لیے اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے انسانوں کی تفریح کا سامان کرنا اور تفریح بھی ایسی جس میں اصلاح کا پہلو نمایاں ہو بہت بڑا اور عظیم کام ہے اور اس سلسلے میں شعاع لیڈنگ رول ادا کررہا ہے۔ اب تھوڑا تبصرہ ہوجائے کہانیوں پر۔ سب سے پہلے تو رخسانہ جی! آپ پر غصہ آیا پھر قسط پڑھی تو یہ قسط اتنی اچھی تھی کہ اگر رخسانہ صاحبہ اس جیسی دس اقساط اور بھی لکھ دیں تو منظور۔ کہانی میں ہماری متلاشی نگاہیں خاکی ٹوپی کے معمے کو حل کرتی رہیں۔

☆ نسرین اور ثمرین! یہ تو بہت اچھا ہوا کہ رخسانہ کی قسط پڑھ کر آپ کا نہ صرف غصہ ختم ہوگیا بلکہ آپ دس مزید قسطیں پڑھنے کے لیے تیار ہیں۔

اب آخری قسط پڑھ کر بتایئے گا کہ رخسانہ کا ناول آپ کو کیسا لگا؟

شعاع کی اتنی اچھی تعریف کے لیے بہت شکریہ۔

گوجرہ سے صدف حسین نے لکھا ہے

ٹائٹل بس سو سو تھا۔ سب سے پہلے میں ذکر کروں گی نور بانو محبوب کا۔ ان کی "حج کی داستان" پڑھ کر ایسے لگا جیسے ہم ان کے ساتھ مدینہ منورہ کی گلیوں میں گھوم رہے ہیں۔ لبیک پڑھتے ہوئے میری امی کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔ نور بانو نے ہمیں گھر بیٹھے ہی حج کروا دیا۔ اس کے بعد "ریگ زار تمنا" پڑھی۔ اتنی لمبی قسطوں کو ایک ہی قسط میں نمٹا دیا۔ جس دن ربیعہ نے "عباد ولا" میں قدم رکھا مجھے اسی دن شک تھا کہ منزہ بیگم کا ضرور ربیعہ سے کوئی رشتہ ہوگا۔ "میرے چارہ گر" رخسانہ نگار کے خط سے سارے گلے شکوے دور ہوگئے لیکن یہ نہیں پتا چلا کہ اس خاکی لفافے میں کیا تھا۔ اسماء قادری کے ناول میں حسن کا کردار انمول تھا۔ اسماء قادری نے بہت اچھا لکھا۔ غزالہ نگار نے اچھا لکھا۔ گڑیا نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا۔ سعدیہ رئیس نے بھی اچھا لکھا۔ ثمینہ عظمت علی جب بھی لکھتی ہیں جھنڈے ہی گاڑ دیتی ہیں۔ مستقل سلسلے سب ہی اچھے جارہے ہیں۔

☆ صدف! نور بانو محبوب کا "سفر حج" آپ کو پسند آیا۔ ہم آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے ان تک پہنچا رہے ہیں

ہیں۔
خاکی لفافے میں کیا تھا یہ آپ کو اس ماہ کی قسط پڑھ کر پتا چل گیا ہوگا۔

کراچی سے صالحہ امجد نے لکھا ہے

یہ میرا کسی بھی ماہنامے میں پہلا خط ہے اور خط لکھنے کی وجہ نوربانو محبوب کا سفرنامہ "لبیک اللھم لبیک" ہے۔ اس قدر پُراثر تحریر ہے کہ اس کو پڑھ کر دل خوش ہو گیا اور دل میں شدت سے یہ امنگ جاگی کہ اے کاش ہمیں بھی یہ سعادت نصیب ہو جائے۔ (آمین)

خط لکھنے کی ایک اور وجہ انیسہ سلیم کے ناولٹ کی ایک بات ہے۔ دسمبر کے شمارے میں لاہور کی شاہدہ شاہد نے جو اعتراض کیا ہے، وہ ہمیں بھی صحیح لگا ہے کیونکہ ہم نے نہ کہیں پڑھا اور نہ ہی کسی حدیث وغیرہ میں لکھا دیکھا کہ اگر عورت خلع لے تو اس کو اپنے شوہر سے بغیر حلالہ رجوع کا حق ہے۔ یہ بات بہت عجیب لگی ہے اور اس کی وضاحت بہت ضروری ہے۔ آپ نے لکھا ہے کہ علماء نے فتویٰ دیا ہے تو برائے مہربانی اس کے بارے میں ضرور وضاحت کریں یا تو ان علماء کرام کا نام بتا دیں یا کسی حدیث یا کسی کتاب میں لکھا ہے تو اس کا حوالہ ضرور دے دیں کیونکہ جب سے یہ پڑھا ہے، ذہن الجھ گیا ہے کیونکہ یہ ہمارے لیے بالکل نئی بات ہے جس کا علم میں آنا سب کے لیے ضروری ہے۔

باقی آپ کا رسالہ آج کل کے زمانے میں واقعی ایک نیکی کی شعاع ہے۔ اس میں وہ سب کچھ ہوتا ہے جو لڑکیوں کی زندگی کو سنوارنے میں کام آتا ہے۔

☆ صالحہ! دیوبند کے علماء کرام نے متفقہ طور پر فتویٰ دیا ہے کہ اگر عورت خلع لے اور مرد اسے طلاق نہ دے اور پھر عورت اپنے شوہر سے دوبارہ رجوع کرنا چاہے تو اسے حلالہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ جب چاہے رجوع کر سکتی ہے۔ عائلی قوانین میں بھی یہ فتویٰ شامل ہے۔

عقیلہ بانو خانیوال سے لکھتی ہیں

دسمبر کے شمارے کا ٹائٹل دیکھتے ہی دل سے آواز آئی۔ بہترین۔ ویسے تو اس سال زیادہ تر ٹائٹل اچھے ہی تھے۔

سب سے پہلے تو "زرد موسم" پڑھی۔ پڑھ کر بہت دکھ ہوا اور طاہر محمود پر غصہ۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آیا، آخر دارا جی بی ایمن کو ایک دن اپنے پاس بٹھا کر طاہر محمود کے بارے میں بتا کیوں نہیں دیتے۔

ماہا جی پلیز منیزہ بیگم کی ملاقات احمد صاحب سے ضرور کروائی ہے جو کہ شہریار کے والد ہیں اور میرا خیال ہے وہ ربیعہ کے بھی بھائی لگتے ہیں، اسی لیے ربیعہ کو ان میں کشش محسوس ہوئی تھی۔

اس قسط میں شہلا اور ہاشم کے بارے میں کچھ بھی نہ لکھا گیا تھا۔ تشنگی سی محسوس ہوئی۔ وردہ کا فیصلہ مجھے تو بہت پسند آیا۔ محبت جرم نہیں لیکن رافع ذردہ کے ساتھ نا انصافی کر رہا تھا۔ رخسانہ باجی اس خاکی لفافے میں کیا تھا یہ تو بتا دیا ہوتا۔ اگلی قسط تک بے صبر رہے مجھے اس سین کا بھی بہت انتظار ہے کہ ابیہا اس چین سے کچھ لکھے جو دانی نے اسے گفٹ کیا تھا کہ وہ یقیناً اس چین کی مدد سے کوئی فیصلہ تحریر ہوسکے گی۔

نوربانو محبوب کا "سفرحج" پڑھ کر دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ضرور یہ مقامات دکھائے۔ (آمین)

بہت مزہ آیا اس کو پڑھ کر بالکل ایسا ہی محسوس ہوا کہ میں بھی وہیں پہنچی ہوئی ہوں۔

"جس [illegible] افسانہ [illegible] بہت [illegible]" [illegible] ہوا اور ایڈیٹر پڑھ کر بہت مزہ آیا۔

تینوں مکمل ناول اچھے تھے لیکن ان میں بیسٹ تھا۔ "میں، محبت اور تم" سدرہ سحر عمران نے بہت اچھا لکھا۔ ایک اچھا ناول لکھنے پر میری طرف سے مبارک باد قبول کر سدرہ!

☆ عقیلہ، "زرد موسم" پڑھ کر آپ کو دکھ ہوا اور طاہر محمود پر غصہ آیا تو صحیح ہے لیکن اگر دارا جی ایمن کو طاہر محمود کے بارے میں بتا بھی دیں تو ایمن ماننے والی نہیں۔ کچھ تو فطرتاً "وہ ضدی اور خود سر ہے۔ کچھ حالات نے اس کا ذہن خراب کر دیا ہے۔ ویسے بھی محبت میں عقل غائب ہو جاتی ہے۔ انسان کسی کی نہیں سنتا۔

ماہا ملک تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں، وہ احمد صاحب کے بارے میں ضرور لکھیں گی۔

میرکراچی سے شازیہ حمید نے لکھا ہے

دسمبر کا شعاع حسب توقع پہلی تاریخ کو ملا۔ دیگر قارئین کی طرح مجھے کسی بھی رسالے کے لیے بک اسٹال کے چکر نہیں لگانے پڑتے کیونکہ میرے میاں کا خود بک اسٹال ہے۔ پورا رسالہ پڑھنے کے لیے مجھے بمشکل دو دن چاہیے ہوتے ہیں۔ اس مرتبہ کا شعاع بھی بہت اچھا تھا لیکن سعدیہ رئیس کی "اکیسویں صدی کی لیلیٰ" پڑھ کر ازحد کوفت کا سامنا کرنا پڑا اور کسی بھی رسالے میں پہلی بار خط لکھنے کا موجب بنا۔ کہانی میں نیا پن تو خیر سرے سے مفقود تھا بلکہ سعدیہ رئیس کے نام کو دیکھتے ہوئے کہانی بھی نئی نہیں تھی۔ شعاع اور خواتین کے پرانے شمارے اگر اٹھا کر دیکھے جائیں تو شاید اس موضوع پر کئی کہانیاں نکل آئیں گی۔ بے تکے پن سے بھرپور کہانی شعاع میں نہیں شائع چاہیے تھی۔ اس کے علاوہ سدرہ سحر عمران کی "میں، محبت اور تم" بھی بے پناہ جھول لیے ہوئے فارمولا قسم کی کہانی تھی۔ راشدہ رفعت اور اسماء قادری اچھی رہیں۔ البتہ رخسانہ نگار کی "میرے چارہ گر" ان کے منفرد انداز نگارش کی وجہ سے پسند کی جا رہی ہے۔ ماہا ملک کا ناول بھی اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا ہے۔ راحت جبیں کے ناول کا بھی انتظار رہتا ہے۔ دسمبر کے شعاع کی خاص بات ایمان علی کا انٹرویو تھا جس کی وجہ سے میری ایک شدید خواہش پوری ہوئی۔ نزہت شبانہ حیدر کی "عشق ہو تو ایسا" بھی پسند آئی۔ مستقل سلسلے تو ہماری پسند کے ہی ہیں۔ [illegible] ادارہ سے [illegible] افسانہ [illegible] کے بارے میں پڑھا، کوشش کروں گی کہ پہلے خط کے بعد پہلے افسانہ کو بھی لکھ ڈالوں۔

☆ شازیہ! آپ کی تعریف اور تنقید دونوں ہی متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ افسانہ ضرور لکھیں۔ آپ کی تحریر کی روانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔

ساہیوال سے ریحا چوہدری نے لکھا ہے

ٹائٹل اچھا تھا، منفرد سا اور فرا حکیم بھی خاصی یونیک تھیں۔

پچھلی دفعہ غلطی سے شعاع والوں نے ہمارے آپ ہونے کا بڑا ہی اچھا بندوبست کیا۔ یعنی ریحا کے بجائے ہمیں ریما بنا دیا۔ اب چلتے ہیں شعاع کے دوسرے سلسلوں کی طرف۔

نادیہ خان اور توفیق حیدر کے ساتھ بھی ایک اچھی سی ملاقات کروا کر شکریہ کا موقع دیں۔ "شاعری سچ بولتی ہے" میں صالحہ شبیر نے نسیم کوثر کے بہت اچھے اشعار کا انتخاب کیا اور باقی اشعار میں سے حنا سلیم کا منتخب کردہ قطعہ بہت زبردست تھا۔ مسکراہٹیں میں نمرہ اور اقراء کا بھیجا ہوا "شکوہ" اچھا لگا۔ رخسانہ جی نے "میرے چارہ گر" کا اختتام ابھی تک نہیں کیا۔ اتنا اچھا لکھتی ہیں وہ کہ طوالت بھی گراں نہیں گزرتی اور اب تو اس لیے بھی کوئی گلہ نہیں کہ انہوں نے اتنی اچھی وضاحت دے دی ہے۔ رخسانہ جی نے ایک بہت شاندار مکمل ناول لکھا تھا "شہسوار" مجھے ان سے کہنا ہے کہ وہ ناول اگر وہ سلسلے وار لکھتیں تو شاید زیادہ افیکٹو ہوتا۔ بہرحال ٹاپک تو ابھی بھی موجود ہے نا، وہ اپنے زرخیز ذہن کا استعمال کر کے اسی تھیم کو کسی نئے انداز سے بھی لکھ سکتی ہیں۔

اور آخر میں بات ناول آف دی ایئر کی۔ میری بات فیورٹ رائٹر نزہت شبانہ حیدر کا مکمل ناول "عشق ہو تو ایسا" بہت بہت اور بہت ہی اچھا لگا۔ وہ بہت منفرد لکھتی ہیں اور بہت ہی اچھا بھی اور ان کے کریکٹر عام ہوتے ہوئے بھی کتنے خاص لگتے ہیں، ان کی اسٹوری اتنے ردھم سے آگے بڑھتی ہے کہ یوں لگتا ہے آپ کوئی اچھا سا کلاسک سونگ سن رہے ہوں۔ صرف اتفاقی یا مزے دار سی اسٹوری ہی نہیں بلکہ ہمیشہ ایک خوبصورت سا اخلاقی سبق بھی موجود ہوتا ہے۔

آپ نے ندیم ہاشمی کی بہت اچھی غزل منتخب کی۔ اب آپ سے ایک سوال، کیا تحریری مقابلے میں حصہ لینے کی دعوت عام ہے۔

☆ ریحا! بہت معذرت خواہ ہیں کہ آپ کا نام غلط شائع ہوا۔

تحریری مقابلے میں ہماری سب قارئین حصہ لے سکتی ہیں۔ آپ اپنی تحریر ضرور بھجوائیں۔

شعاع پر تفصیلی تبصرے کا شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

☆

شاعری سچ بولتی ہے

رشنا جتوئی

وہی جو پھولوں میں خوشبو دھنک میں رنگ بھرتا ہے
دلوں کو نرم کر کے پیار کی فصلیں اگاتا ہے
نہایت مہرباں ہے اور نہایت رحم والا ہے
شروع اس نام سے جو صبح فروا لگا اجالا ہے

"وہی" جو دُکھ بھرے موسم کی ویرانی میں سینوں پر دھنک لمحوں کی خوشبو سے مہکا ہاتھ رکھتا ہے، دلوں کو جوڑتا ہے اور پھر ان میں محبت نام کی سوغات رکھتا ہے۔ سفر میں راستے گم ہوں، دلائے گر ہی کتنی ہی میلی ہو، غموں کی دھوپ پھیلی ہو، اسے کوئی کہیں جس وقت اور جس حال میں آواز دیتا ہے وہ سنتا ہے۔ بہت ہی مہرباں ہے رحم کرتا ہے۔ وہی سچ ہے، ہمیں سچ بولنے کا حکم دیتا ہے۔ سو اس کو یاد کرتے ہیں اسی کے نام سے آغاز کرتے ہیں۔

اور جس کے نام سے آغاز کیا ہے اس کے فوراً بعد جس ہستی کا نام لیا جاتا ہے کچھ ذکر اس کا بھی کرتے ہیں۔

سارے حرفوں میں اک حرف پیارا بہت اور یکتا بہت
سارے ناموں میں اک نام سوہنا بہت اور ہمارا بہت

اس کی شاخوں پہ آ کر زمانوں کے موسم بسیرا کریں
اک شجر جس کے دامن کا سایہ بہت اور گھنیرا بہت

ایک آہٹ کی تحویل میں ہیں زمیں آسماں کی حدیں
ایک آواز دیتی ہے پہرا بہت اور گہرا بہت

جس دیے کی توانائی ارض و سما کی حرارت بنی
اس دیے کا ہمیں بھی حوالہ بہت اور اجالا بہت

میری بینائی سے اور مرے ذہن سے محو ہوتا نہیں
میں نے روشنے محمدؐ کو سوچا بہت اور چاہا بہت

میرے ہاتھوں سے اور میرے ہونٹوں سے خوشبو جاتی نہیں
میں نے اسم محمدؐ کو لکھا بہت اور چوما بہت

بے یقیں راستوں پر سفر کرنے والے مسافر سنو
بے سہاروں کا ہے اک سہارا بہت عالی والا بہت

یہ کلام ہے سلیم کوثر کا اور جو شروع میں پیراگراف میں نے نقل کیا وہ ان کے مجموعۂ کلام "خالی ہاتھوں میں ارض و سما" کا ابتدائیہ ہے۔ میری ڈائریوں میں موجود شاعری میں ستر فیصد شاعری سلیم کوثر کی ہی ہے۔ ان کی غزلیں جتنی اچھی ہیں، نظمیں تو اور زیادہ عمدہ ہیں ان کی ایک نظم میں سے ایک ٹکڑا پیش خدمت ہے۔

من آنگن میں شہر بسا ہے
دریا کی لہروں پر بہتے
رستوں میں ان دیکھے سپنے کھلے ہوئے ہیں
خواب، دھنک، خوشبو اور چہرے ملے ہوئے ہیں
تیز ہواؤں میں دیپ سمے کے جلے ہوئے ہیں
لیکن شہر کے دروازے پر
بے خوابی کے سکھ دُکھ اوڑھے
جانے کس کی آس میں آنکھیں
نیندوں کا پہرہ دیتی ہیں

اور فیض احمد فیض صاحب فرما رہے ہیں کہ

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں
لکھا گیا ہے بہت لطف وصل و درد فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں
یہ اپنا عشق ہم آغوش جس میں ہجر و وصال
یہ اپنا درد کہ ہے کب سے ہمدم مہ و سال
اس عشق خاص کو ہر ایک سے چھپائے ہوئے
گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے

ڈاکٹر طارق عزیز کس سے مخاطب ہیں دیکھیں کس سے۔

زمیں زادے چلو باتیں کریں شہر تمنا کی
یہ باتیں جو سنگتی ہیں مگر کرنی نہیں بنتیں
انہیں روشن اگر کر پاؤ تو کتنے سخی ٹھہرو
مگر کیا کر سکو گے تم؟
مگر کیا کر سکیں گے ہم؟
کہ ہم اس شہر میں بے خواب راتوں کے حوالے ہیں
زمیں زادے، زمیں پر بسنے والے تھکنے والے ہیں

معتبر نیازی کو میں نے بہت کم پڑھا ہے۔ ان کی نظم آپ بھی پڑھیے۔

چاروں سمت اندھیرا گھپ ہے اور گھٹا گھنگھور
وہ کہتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کون؟
میں کہتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ میں!
کھولو یہ بھاری دروازہ
مجھ کو اندر آنے دو
اس کے بعد اک لمبی چپ اور ہوا کا شور

اور پروین شاکر کی بھی سن لیجیے ذرا۔ فرماتی ہیں کہ

جس صبح کی آواز میں بارش کی کھنک ہو
اس دن کا بدن دیکھیے سُر کیسے ہوا ہو
جس شام کے ماتھے پہ کھلے وصل کا تارا
اس رات کے اقرار کی کیا صورتیں ہوں گی
اے بعید بھرے دن مرے، اے رمز بھری رت
یہ ماہ زدہ، مہر گزیدہ دل وحشی
پھر کون سے جادو کے اثر میں ہے گرفتار
برسات میں جلتے ہوئے جنگل کے کنارے
کس قاف کے باشندے سے ٹھہری ہے ملاقات

امجد اسلام امجد کی ہر نظم دوسری سے مختلف ہوتی ہے۔ ذرا اس نظم کو پڑھ کر دیکھیے۔

گلاب چہرے پہ مسکراہٹ
چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے
جو ہنستی تو ایسے لگتا کہ جیسے چاندنی پگھل رہی ہو
کبھی جو کانچ کی سیڑھیوں سے سہیلیوں کو لیے اترتی
تو ایسے لگتا کہ جیسے دل میں اتر رہی ہو
وہ ساحلوں کی ہوا سی لڑکی
سمندروں کے لیے بنی ہے
وہ ساحلوں کی ہوا سی لڑکی
کل ہی ملی تھی
اسی طرح تھی
گلاب چہرے پہ مسکراہٹ
چمکتی آنکھوں میں شوخ جذبے
جو ہنستی تو ایسے لگتا کہ جیسے چاندنی پگھل رہی ہو
مگر جو بولی تو اس کے لہجے میں وہ تھکن تھی
کہ جیسے صدیوں سے دشت ظلمت میں جل رہی ہو
وہ ساحلوں کی ہوا سی لڑکی

محسن نقوی کی تو شان ہی الگ ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجیے۔

سورج کے بے کنار صحرا میں
دھول اڑاتا ہے یاد کا موسم
اپنی بے حرف آنکھ لیے میں
زندگی کے ورق الٹتی ہے
جیسے بارش میں بھیگتی چڑیا
گھونسلے کی طرف پلٹتی ہے

اور غزل میں بھی ان کا الگ رنگ ہے۔

قتل چھپتے تھے کبھی سنگ کی دیوار کے بیچ
اب تو کھلنے لگے مقتل بھرے بازار کے بیچ

اپنی پوشاک کے چھن جانے پہ افسوس نہ کر
سر سلامت نہیں رہتے یہاں دستار کے بیچ

سرخیاں امن کی تلقین میں مصروف رہیں
حرف بارود اگلتے رہے اخبار کے بیچ

جس کی چوٹی پہ بسایا تھا قبیلہ میں نے
زلزلے جاگ پڑے ہیں اسی کہسار کے بیچ

کاش اس خواب کو تعبیر کی مہلت نہ ملے
شعلے اُگلنے نظر آتے ہیں مجھے گلزار کے بیچ

ڈھلتے سورج کی تمازت نے بکھر کر دیکھا
سر کشیدہ مرا سایا صفِ اشجار کے بیچ

رزق، ملبوس، مکان، سانس، مرض، قرض، دوا
منقسم ہو گیا انساں، انہی افکار کے بیچ

دیکھے جاتے نہ تھے آنسو مرے جس سے محسن
آج ہنستے ہوئے دیکھا اسے اغیار کے بیچ

سرشار صدیقی کی یہ نظم چھوٹی ہے مگر بات بڑی ہے

لوگوں نے کہا
اس در سے کبھی
کوئی ناامید نہیں لوٹا
کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا
میں بھی لوگوں کے ساتھ چلا
چہرے پہ گردِ ملال لیے
اک پُر امید خیال لیے
اک خالی دستِ سوال لیے
جب قافلہ اس در پہ پہنچا
میں اس گھر کو پہچان گیا
پھر خالی ہاتھ ہی لوٹ آیا
اس در سے مجھے کیا ملنا تھا
یہ گھر تو میرا اپنا تھا

رات کے سحر پر کتنے شاعروں نے کیا کچھ لکھا۔ ذرا وزیر آغا کو بھی پڑھیے۔

رات سجا کر لائی ہے اک تھال میں پھول ہزار
بیچ میں موتی، کچی کلیاں اور کلیوں کے ہار

بھینی بھینی باس کی زد میں آیا حدِ شمار
رات سجا کر لائی ہے اک تھال میں دیپ ہزار
ہاتھ رنگیلے، ہونٹ دہکتے، گالوں کا رنگ انار
روشن ماتھے کی کرنوں نے چھیڑے دل کے تار
رات سجا کر لائی ہے اک تھال میں تیر ہزار
زخمی تارے، گھائل سپنے، شبنم کے اسرار
دکھ کے زرد نکیلے کانٹے ہوتے جو دل کے پار

اور سلیم کوثر صاحب محبت کو کس طرح بیان کرتے ہیں دیکھیے۔

تم سے منزل کا نہیں
رشتہ سفر کا ہے مرا
یہ ضروری تو نہیں
ساتھ چلا بھی جائے
تم سے ملا بھی جائے
عشق دیدار کا محتاج نہیں ہوتا ہے
ایک احساس کا رشتہ ہے یہ خوشبو کی طرح
دیکھیے، چھوتے ہے عاری کسی جادو کی طرح
صرف آوازہی کافی ہے محبت کے لیے
اور سب کچھ ہی اضافی ہے محبت کے لیے

اور یہ غزل سوئی گیس کمپنی (جہاں میرے والد کام کرتے تھے) کے میگزین میں، میں نے پڑھی تھی۔ شاعر ہیں شمیم احمد شمیم (مرحوم) ملاحظہ کیجیے۔

ہماری چاہ کی تم کو نہ کچھ خبر ہوگی
شبِ فراق تڑپ کر یوں ہی بسر ہوگی

تمہارے حسن تصور سے ہے جہاں روشن
تمہارے دید کے قابل نہ یہ نظر ہوگی

ہم اپنی چاہ کو رسوا کریں، یہ ناممکن!
زباں دل نہ کھلے گی نہ چشم تر ہوگی

رواں ہے کون سی منزل کو قافلہ دل کا
تمہاری یاد فقط اس کی ہم سفر ہوگی

نہ جانا تم نے کبھی میری خامشی کا سبب
ہمارے بعد ہماری تمہیں قدر ہوگی

ہیں ناتواں یہ ارادے تمہیں بھلانے کے
میں جانتا ہوں کبھی، یہ مہم نہ سر ہوگی

تمہارے پیار کی شمع ہے اس طرح روشن
نہ ہوگی شام کبھی اس کی نہ سحر ہوگی

جو سن سکو تو سناؤں میں داستانِ الم
تمہاری پلکوں پہ آ کر جو مختصر ہوگی

شمیم ان سے گلہ کیا کہ وہ تو سنگدل ہیں
تمہاری نالہ و فریاد بے اثر ہوگی

اور اب چند متفرق اشعار بھی پڑھ لیجیے۔

خواب محلوں کے تو میں نے نہیں دیکھے لیکن
دل میں اک حسرتِ تعمیر لیے پھرتا ہوں

تم بھی بالوں میں لیے برف چلے آئے ہو
میں بھی اک شکوۂ تاخیر لیے پھرتا ہوں
(سجاد ہاشمی)

بہت دل کو کشادہ کر لیا کیا
زمانے بھر سے وعدہ کر لیا کیا

ہنرمندی سے اپنے دل کا صفحہ
مری جاں تم نے سادہ کر لیا کیا

بہت نزدیک آتی جا رہی ہو
بچھڑنے کا ارادہ کر لیا کیا
(جون ایلیا)

آدمی عقلِ کل نہیں ہوتا
حرفِ آخر نہیں کسی کی رائے
(انور شعور)

درِ مسجد پہ کوئی شے پڑی ہے
دعائے بے اثر ہوگی ہماری!
دعا مانگیں گے کب تک آسماں سے
زمیں کب معتبر ہوگی ہماری
(راحت اندوری)

اب میرا خیال ہے کافی ہو گیا۔ باقی کبھی آئندہ شیئر کرلیں گے۔ ایسے ہی میں ہوں آپ کی جانی پہچانی سیدہ رشا جلالی۔ اس امید بلکہ یقین کے ساتھ کہ میرا انتخاب پڑھنے والوں کو پسند آئے گا، اب اجازت دیجیے۔ اور ہاں اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

شعاع کے ساتھ ساتھ

نادیہ

عظمیٰ رئیس شیرازی، ٹنڈو آدم

میرا نام عظمیٰ ہے لیکن زیادہ تر لوگ اُمی کہتے ہیں۔ 20 اگست میری ڈیٹ آف برتھ ہے اور تعلیم میری ابھی جاری ہے۔ میں بی اے فائنل کی اسٹوڈنٹ ہوں اور مستقبل میں انشاء اللہ اردو ادب پڑھنے کا ارادہ ہے۔ آپ سب دعا کریں کہ میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاؤں۔

1۔ شعاع سے وابستگی کو زیادہ لمبا عرصہ نہیں گزرا لیکن چند سالوں میں میں نے شعاع، خواتین اور کرن کے تمام پرانے شمارے پڑھ ڈالے۔ شعاع ہمارے گھر آج سے نہیں بلکہ اس وقت سے آ رہا ہے کہ جب سے اس کی اشاعت عمل میں آئی تھی۔ شعاع کے حوالے سے یادگار واقعہ کچھ یوں ہے کہ ہمارے یہاں شروع سے ہی شعاع، خواتین اور کرن پڑھنے کے بعد بڑے بڑے کارٹن میں ترتیب سے رکھ دیے جاتے ہیں تاکہ محفوظ رہے تو ہوا کچھ یوں کہ ان ڈائجسٹوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے بہت ہی زیادہ ہو گئی تو آنٹی نے ان تمام ڈائجسٹوں کو تین بڑے بڑے کارٹن میں ترتیب سے رکھ دیا آدھی رات کا وقت تھا جب ہم سب عجیب سی آواز سن کر اٹھ گئے۔ سب کے سامنے انوکھا سا منظر تھا۔ سلپ سے تینوں کارٹن کی کتابیں جب بارش کی صورت میں نیچے سوئے ہوئے ماموں کے اوپر برس رہی تھیں، وہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہم سب کا ہنس ہنس کر برا حال تھا اور رہے ماموں تو انہیں کافی دیر بعد یہ صورت حال سمجھ میں آئی۔ یہ کتابوں کی بارش تو شاید انھوں نے زندگی میں پہلی اور آخری بار دیکھی تھی۔ یہ عقدہ تو بعد میں کھلا کہ جو تین کارٹن ایک کے اوپر ایک رکھے گئے تھے ان بیلنس ہونے کی وجہ سے یہ واقعہ ہوا۔ ایک اور واقعہ کہ جسے میں شعاع کے توسط سے ہی سمجھتی ہوں وہ واقعہ ہے 2 دسمبر 2006ء کو شعاع کے دفتر آنے کا ہے۔ جن لوگوں کے نام آپ نے کتابوں میں پڑھے ہوں ان سے آپ اچانک مل لیں تو شاید آپ کو بھی عرصے تک میری طرح یقین نہیں آئے کہ آپ ان پیارے لوگوں سے مل چکے ہیں۔ اس بات کا برملا اظہار کروں گی کہ سب لوگ بہت اچھے ہیں۔

2۔ میری صبح ساڑھے سات بجے ہوتی ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے میں گھر سے کالج کے لیے نکلتی ہوں، کالج میں ٹیچرز بہت اچھی ہیں۔ عائشہ، صدف، بشریٰ طاہرہ کے ساتھ فری پیریڈز میں گپ شپ چلتی ہے۔ مجھے کالج کا بی ایس سی بلاک پسند ہے۔ وہاں ہریالی بہت خوب صورت منظر پیش کرتی ہے اور خوش رنگ پھول جہاں ماحول کی خوب صورتی کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ وہیں پرندوں کی چہکاریں ماحول کو سحرزدہ کر دیتی ہیں۔ میرا اس کالج میں لاسٹ ایئر ہے اور ہم سب کی خواہش ہے کہ یہ تمام عرصہ یادگار گزرے۔ کالج ایک بجے آف ہوتا ہے۔ گھر آ کر فریش ہو کر کھانا کھاتی ہوں اور نماز پڑھ کر سو جاتی ہوں۔ ساڑھے تین بجے اٹھتی ہوں کیونکہ چار بجے ٹیوشن پڑھنے والے بچے آ جاتے ہیں۔ ان کو پڑھانے میں ٹائم کے گزرنے کا بالکل ہی پتا نہیں چلتا۔ یہ بچے مغرب کے بعد گھروں کو روانہ ہوتے ہیں۔ بچوں کے جانے کے بعد دوبارہ سے صفائی کرنا، کھانا لگانا۔ ادھورے کاموں کو نمٹانا۔ اسی دوران اگر کوئی اچھا ڈراما آ رہا تو دیکھ لیتی ہوں خصوصاً "ناولز پر بننے والے ڈرامے ضرور دیکھتی ہوں۔ انڈین ڈراموں سے سخت چڑ ہے۔ شعاع کو وقت سب کاموں سے فارغ ہونے کے بعد دیتی ہوں۔ مجھے لکھنے پڑھنے کے لیے دو وقت مناسب لگتے ہیں۔ ایک وقت ہے گرمیوں کی طویل دوپہر جب ہر طرف سناٹا ہوتا ہے۔ وہ وقت لکھنے پڑھنے کے لیے مناسب ہے اور دوسرا وقت رات کا۔ جب کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا اور نہ ہی وقت گزرنے کا پتا چلتا ہے۔ چوکیدار کی آواز ہی گھڑی کی سوئیوں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ سناٹے میں دور کہیں سے آتی ریل کی چھک چھک ماحول کو پرفسوں بنا دیتی ہے۔ مصروفیت میں وقت نکالنا مشکل تو ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ شعاع کا ہر نیا شمارہ خود ہی پڑھنے والوں سے وقت نکلوا لیتا ہے۔ بس اسی طرح رات ہوتی ہے اور نئی صبح سے پھر وہی لگی بندھی روٹین۔ میں نے اپنے بچپن کا زیادہ حصہ ننھیال میں گزارا ہے اور سب کا پیار سمیٹا ہے بلکہ اب تک سمیٹ رہی ہوں۔ میں عرصہ دراز تک نانی کو امی کہتی آئی ہوں۔ چھٹی والے دن بھی تھوڑی روٹین چینج ہو جاتی ہے۔

3۔ ایسی بے شمار تحریریں ہیں جو آج بھی روز اول کی طرح ذہن میں روشن ہیں اور بھلائے نہیں بھولتیں۔ مجھے ہمیشہ وہ تحریریں پسند رہی ہیں کہ جن کے اینڈ خوشگوار ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خوشی اور غم ساتھ ساتھ ہوتے ہیں اور دنیا میں رہتے ہوئے ہم حقیقت سے منہ موڑ نہیں سکتے۔ اسی لیے ناخوش گوار انجام بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ فرحت اشتیاق کی تحریر "وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر"...... بہت ہی زیادہ پسند ہے۔ اس ناول نے یقیناً" ہر قاری کو رلایا ہے اور یہی حقیقت ہے کہ اس ناول کے بعد میں نے جانا کہ فرحت اشتیاق کون ہیں۔ اس کے علاوہ "بن روئے آنسو" اور فرحت اشتیاق کی ہر تحریر عزیز ہے۔ عمیرہ احمد کی "پیر کامل"، "ایمان، امید اور محبت" اور رخسانہ نگار عدنان کی "آئینہ ذات سے بکھر کر" مریم عزیز کی "میری دھڑکنوں کو قرار دو" نزہت شبانہ حیدر کی تحریر "زندگی مجھے ذرا دیر سے جانا" "کل کی سائرہ یاسمین رانا" اور آج کی سائرہ عارف کی "تم یاد آئے" اور "تجھے چاہا" شائستہ عزیز کی "ستاروں کا سفر" افشاں آفریدی کی تحریر "بساط دل بھی عجیب شے ہے" اور راحت جبیں کی خوشبوؤں میں بسی ہوئی تحریریں جو کہ دلوں کو چھو لیتی ہیں پسند ہیں۔

بہت سی تحریریں ایسی ہیں جسے پڑھ کر دل الجھ گیا اور عرصے تک الجھا رہا اس میں نگہت سیما کی "تحریر علینہ، میں نے تمہیں خود کھویا ہے" اور نزہت شبانہ حیدر کی "وہ ساحر آنکھیں" ان دونوں تحریروں نے ذہن کو الجھا دیا۔

4۔ خوبیاں تو میری وہ لوگ ہی بتا سکتے ہیں کہ جو میرے ساتھ ہوتے ہیں خامیاں مجھ میں بہت ہیں۔ میں مستقل مزاج نہیں ہوں، مجھے غصہ جلدی آ جاتا ہے۔ پہلے تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگ لیتے تھے لیکن اب کوشش کر کے میں نے اس خامی پر قابو پا لیا ہے۔ میں فضول خرچ بھی بہت ہوں اور جلد باز بھی۔ کافی ہے یا مزید راز کھولوں؟

تعریفی جملہ کچھ یوں ہے کہ ایک دفعہ میرا کافی بڑا تعارف چھپا تھا جب وہ میری ماما نے پڑھا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ "اگر تم میں صلاحیت ہے تو لکھو لیکن اصلاحی تحریریں لکھو" یہ جملہ سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔

5۔ ساون کے حوالے سے واقعہ یہ ہے کہ میری آنٹی روزینہ کی شادی کی شاپنگ کے لیے ہم نے حیدر آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ جس دن ہم حیدر آباد جانے کے لیے نکل رہے تھے وہ دن بہت گرم تھا سخت دھوپ نکلی

ہوئی تھی۔ خیر سے حیدر آباد کی ریشم گلی پہنچے اور شاپنگ شروع کر دی۔ شاپنگ کرتے کرتے چار پانچ گھنٹے گزر گئے فارغ ہو کر باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چاروں طرف آسمان کالے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا ہے۔ دوسرے شہر کا مسئلہ تھا اسی لیے باقی شاپنگ آئندہ پر چھوڑ کر فوراً" واپس جانے کی تیاری کر لی۔ سب نے کہا جانا تو ہے بہت گرمی ہے کولڈ ڈرنک پی لیتے ہیں" پھر کولڈ ڈرنک کے ساتھ چاٹ بھی کھائی۔ آپی مسلسل ڈانٹ رہی تھیں کہ جلدی چلو ورنہ پہنچ چکے گھر۔ میں نے کان نہیں دھرے اور جھٹ پٹ برگر بھی پیک کروا لیے۔ (اب آپ مجھے اتنی بھی پیٹو مت سمجھیے گا۔ سمجھا کریں سب نے مل بانٹ کر کھایا تھا) اپنے روٹ کی بس لی اور اسٹاپ تک پہنچے۔ پھر وین میں سوار ہوئے وین چلنے میں دیر تھی کہ ٹنڈو آدم سے کال آئی کہ یہاں شدید بارش ہو رہی ہے۔ آن کی آن میں حیدر آباد میں بھی آندھی چلنا شروع ہو گئی اور جب تک وین چلتی بارش شروع ہو گئی اور بارش بھی اتنی شدید کہ اگر میں گھر میں ہوتی تو کمرے تک ہی محدود رہتی۔ بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ دلوں کو دہلا رہی تھی اور ماحول کو مزید خوفناک بنا رہی تھی ہر زبان پر عافیت ہی کی دعا تھی۔ لبوں پر بار بار یہی الفاظ آ رہے تھے کہ یا اللہ آج خیریت سے گھر پہنچ جائیں۔ ہر طرف گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ دن میں رات کا سماں تھا پانی روڈ پر ایسے بہہ رہا تھا کہ جیسے ساحل پر لہریں آتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہوائیں شروع ہو گئیں اور بارش بھی اس قدر طوفانی ہو گئی کہ مجبوراً" وین ایک طرف روکنا پڑی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا اور دور سے آنے والی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس ہی نظر آ رہی تھیں ویو ہیکل ٹرالر جب قریب سے گزرتے تو ہم خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیتے ڈرائیور نے وین کے دروازے اور کھڑکیاں کھلوا دیں کیونکہ بہت حبس تھا۔ کھڑکیوں اور دروازوں کے کھلنے کے بعد جو منظر سامنے تھا۔ وہ حسین ترین تھا۔ کھیتوں میں کھڑی فصلیں، درخت پتوں اور پھلوں سے بھرے ہوئے اور بارش اس قدر طوفانی کہ بارش کا پانی جب زمین پر گر رہا تھا تو لہروں کی صورت میں بہہ رہا تھا۔ اس وقت مجھے شدت سے راحت جبیں اور ان کی ساری خوب صورت تحریریں یاد آئیں۔ راحت جبیں بارش اور قدرتی مناظر کا جس خوب صورتی سے نقشہ کھینچتی ہیں کہ بندہ اسی میں گم ہو جاتا ہے۔

جہاں ہر طرف لہلہاتا سبزہ آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا وہیں گھر خیریت سے پہنچنے کی جلدی تھی۔ اللہ کے فضل و کرم سے خوب صورت یادوں کے ساتھ گھر پہنچ گئے۔ ٹنڈو آدم پہنچے تو وہاں بھی جل تھل تھی۔ یہ بارش یادگار ہے اور ہمیشہ یاد رہے گی۔

قارئین یاد رہے کہ یہ حیدر آباد کی وہی بارش ہے جس میں شہر کے بعض علاقوں میں کشتیاں چلنے کی نوبت آ گئی تھی۔

6۔ لطیفے پڑھ کر بھول جاتی ہوں اس لیے معذرت۔ پسندیدہ شعر

میں کب کی زرد فضا میں بکھر چکی ہوتی
مجھے تو میری شکستوں نے پھر سنبھالا ہے
جو مطمئن تھے کہ دور خزاں تو بیت گیا
ستم کہ ان کو بہاروں نے روند ڈالا ہے

مریم مظہر، لاڑکانہ

شعاع کا اور ہمارا ساتھ کچھ اس طرح کا ہے بقول شاعر۔

ہم تمہیں چاہتے ہیں ایسے
مرنے والا کوئی زندگی چاہتا ہو جیسے

شعاع کے اور ہمارے بیچ ظالم سماج تو بہت آیا لیکن وہ ہم ہی کیا جو کسی کے آگے جھک جائیں۔ ہم بچپن سے اپنے گھر میں شعاع اور خواتین دیکھتے آئے ہیں۔ اس وقت تو ہم لمبی لمبی کہانیاں دیکھ کر سوچتے تھے کہ

ہماری۔ میں اتنی بیسے پڑھتی ہیں لیکن جب میں 9th میں آئے تو ہم نے بھی لمبی لمبی کہانیاں پڑھنا شروع کر دیں یعنی (ناول) میں اور میری بیسٹ فرینڈ (سادیہ) جو کہ میری کزن ہیں اس وقت پڑھائی کے سلسلے میں ہمارے گھر رہائش پذیر تھیں۔ میری بہنیں ہم دونوں کو یاجوج ماجوج کہا کرتی تھیں اور ای جڑواں کہہ کر پکارتی تھیں۔ ہم دونوں ہر وقت ساتھ ساتھ ہوتے تھے اس لیے شعاع بھی ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ میرے ابو اعتراض کرتے تھے کہ یہ دن تم لوگوں کے کورس کی کتابیں پڑھنے کے ہیں اور امی کہا کرتی تھیں کہ ابھی سے ڈائجسٹ پڑھنا شروع کر دو گی تو نظر کمزور ہو جائے گی اس لیے شروع شروع میں ڈرتے ڈرتے چھپ چھپا کر پڑھتے تھے لیکن اب کوئی ظالم سماج نہیں۔

2۔ میں ایسا تو نہیں کہوں گی کہ صبح کا آغاز اللہ کے نام سے ہوتا ہے کیوں کہ میں نماز فجر نہیں پڑھتی۔ باقی کی چار نمازیں پڑھتی ہوں۔ میری امی اور بہن ہمیشہ نصیحت کرتی ہیں کہ نماز فجر کے لیے اٹھ جایا کرو لیکن شیطان ظالم اٹھنے نہیں دیتا تو میری صبح چائے کی کپ سے شروع ہوتی ہے اور ناشتے کے بعد جو وقت ہوتا ہے وہ میرے پڑھنے اور لکھنے کا وقت ہوتا ہے بارہ بجے کے بعد دوپہر کے کھانے کا وقت ہوتا ہے۔ دو بجے تک سے فارغ ہو کر نماز پڑھتی ہوں۔ اس کے بعد تسبیحات پڑھتی ہوں۔ شام کی چائے کے بعد برتن وغیرہ دھو کر فارغ ہوتی ہوں تو یہی وقت ہوتا ہے جب مجھے اپنی دوست سادیہ سے بات کرنا ہوتی ہے تو اس سے بات کرتی ہوں یا ایس ایم ایس کرتی ہوں کیوں کہ کالج اور اسکول کے زمانے میں اس وقت ہم اوپر چھت پر بیٹھ کر خوب باتیں کرتے تھے اب تو وہ زمانے خواب ہو گئے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد رات کے لیے روٹی بناتی ہوں۔ کھانا کھا کر کچھ دیر ٹی وی دیکھتی ہوں نماز پڑھ کر سونے سے پہلے تھوڑی بہت شاعری یا نثر کی کوئی بھی کتاب پڑھ کر سو جاتی ہوں 10 یا 11 بجے تک تو یہ تھا ہمارے بور ترین دنوں کا احوال۔

3۔ شعاع میں چھپنے والی تمام تحریریں اچھی ہوتی ہیں لیکن ان تحریروں کا ذکر کروں گی جو اب بھی دل و دماغ پر نقش ہیں۔ فرحت اشتیاق کا "بن روئے آنسو" عمیرہ احمد کا "دربار دل" "حاصل اور پیر کامل" بہت زبردست تحریریں تھیں نگہت عبداللہ کا "ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو" نے مجھے بہت رلایا ہے۔ اس کی ہیروئن کا کردار میری رشتے کی خالہ سے بہت ملتا ہے۔ اب وہ بھی اس دنیا میں نہیں رہیں۔

4۔ ہم تو سراپا خامی ہیں پھر بھی کچھ تو لکھنا ہو گا۔ ہر ایک پر جلدی اعتبار کر لیتی ہوں اور کسی کی بھی ظاہری خوبی دیکھ کر جلدی متاثر ہو جاتی ہوں بقول گھر والوں کے ضدی ہوں، انا پرست بھی اور یہ کہ حساس بہت ہوں، انسان کو اتنا حساس نہیں ہونا چاہیے۔ خوبیاں تلاش کرنا پڑیں گی۔ میں یہ نہیں سوچتی کہ میں کیا چاہتی ہوں بس یہ سوچتی ہوں کہ لوگ مجھ سے جیسی امید لگاتے ہیں وہ کروں، اپنی خوشیاں سب کے ساتھ شیئر کرتی ہوں لیکن اپنے غم اور پریشانی میں کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرتی۔ سادیہ کہتی ہے تم بہت اچھی ہو تم لوگوں کو جلدی معاف کر دیتی ہوں۔

5۔ ساون کے اچھا نہیں لگتا۔ ویسے مجھے سردیوں کی بارش بہت پسند ہے۔ دسمبر کی بارش ہو ہاتھ میں چائے کا بھاپ اڑاتا کپ ہو اور ہم چھت پر بارش میں بھیگ رہے ہوں اس سے اچھا موسم ہو سکتا ہے؟ ساون کا کوئی یادگار قصہ تو نہیں لیکن ایک شام بارش مجھے بیک وقت اچھی بھی لگی تھی اور بری بھی بس ہر بارش میں وہ دن یاد آ جاتا ہے۔

ایک چھوٹی سی پسندیدہ نظم لکھ رہی ہوں۔

کس قدر دشوار ہے
اپنے آپ سے جھوٹ بولنا
اور یہ منوانا کہ
یہ جھوٹ ہی سچ ہے
جب میں اس میں کامیاب ہوتی
تو پتا چلا اس وقت تک
میں اندر سے ٹوٹ کر
بکھر چکی تھی

غزل قمر

دھمکی

اداکار جاوید شیخ ہر جگہ معروف فنکارہ ثناء کی مالا جپتے نظر آتے تھے۔ پھر اچانک ان دونوں کے درمیان کیا ہوا کہ ثناء نے فخر امام نامی نوجوان کو جیون ساتھی چن لیا۔ اس بات کو انھوں نے اتنا دل پر لیا کہ اب ہر جگہ ثناء کو کوستے نظر آتے ہیں۔ جس پر ثناء ہی نہیں ان کے منگیتر فخر امام بھی خاصے چراغ پا ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

"اگر جاوید شیخ میں ہمت ہے تو پیٹھ پیچھے باتیں کرنے کے بجائے میرے سامنے یہ باتیں کہیں۔ انھیں یہ کہنے سے پہلے اتنا تو سوچنا چاہیے کہ ثناء ایک عزت دار گھرانے کی بہو بننے جارہی ہے۔ (عزت دار گھرانہ تو آپ کے انتخاب سے ظاہر ہے۔) اگر ان کے دل میں ثناء کے لیے کچھ تھا تو وہ اتنے عرصے چپ کیوں رہے؟ اب جبکہ ہم نئی زندگی شروع کرنے والے ہیں تو انھیں دل کے دورے پڑنے لگے (اب یہ تو ثناء کو ہی پتا ہوگا کہ انھوں نے جاوید شیخ کو کیا یقین دلایا تھا) اگر جاوید شیخ اپنی عزت چاہتے ہیں تو دوسروں کی عزت کرنا سیکھیں۔ (پھر وہی عزت کی بات؟) آخر وہ خود بھی بیٹی والے ہیں۔ اپنے سے زیادہ اب بیٹی کی شادی کی فکر کریں اور جہاں تک میرے روزگار کا تعلق ہے تو لاہور میں بننے والے فائیو اسٹار ہوٹل کا مالک ہوں اور یہ ہوٹل بن رہا ہے (اور آپ کا نام) جاوید شیخ کی طرح میں ہوائی قلعے نہیں بناتا اور نہ ہی کسی کو اپنی ذاتی زندگی بگاڑنے کی اجازت دوں گا۔" (فخر امام! آپ تو خاصے باہمت لگتے ہیں۔ اگر آپ اچھے کاموں سے "نام" کمائیں تو زیادہ بہتر ہو۔)

ادھوری

اداکارہ مشی خان کو ادھورے کام کرنے کی عادت ہے چاہے اداکاری ہو یا گلوکاری' ہر فیلڈ میں وہ کچھ عرصے بعد منظر سے غائب ہو جاتی ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ابھی تک وہ کہیں بھی کوئی خاص مقام حاصل نہیں کر پائیں۔ گزشتہ دنوں وہ یہ کہتی نظر آئیں کہ "اپنی حد سے بڑھی مصروفیات کے باعث میں موسیقی کو بالکل توجہ نہیں دے پائی۔ میری البم اسی وجہ سے ادھوری پڑی ہے۔ جیسے ہی مجھے موقع ملا اسے مکمل کروں گی۔" (مشی جی! اگر آپ اپنے سابقہ ادھورے کاموں پر نظر ڈالیں تو فہرست خاصی طویل ہے۔ اس کے لیے مکمل توجہ اور لگن کی ضرورت ہے جو کم از کم آپ میں نہیں۔ کوشش کریں کہ پہلے آپ صرف اچھی اداکارہ بن جائیں۔ کہیں ہنس کی چال چلتے چلتے آپ اپنی چال بھی بھول جائیں۔)

مستقل مزاجی

کہتے ہیں کہ قابلیت اور صلاحیت اپنا آپ منوا کر رہتی ہے چاہے اس کے لیے کتنے ہی پاپڑ بیلنا پڑے۔ ایسا ہی کچھ ابھرتے ہوئے کھلاڑی مصباح الحق کے ساتھ ہوا۔ جو ٹوئنٹی ٹوئنٹی کپ کے بعد ایسا چھائے کہ اب ان کی حیثیت لازم و ملزوم ہو چکی ہے۔ اپنی سابقہ کارکردگی کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ "ہر سال ڈومیسٹک کرکٹ میں بہترین کارکردگی کے باوجود میں ٹیم میں جگہ نہ حاصل کر پاتا۔ یہ ایسا مشکل دور تھا جس میں مجھے صرف اپنی ہمت اور حوصلے سے کام لینا پڑا۔ میں نے ان ناانصافیوں کے باوجود ہمت نہیں ہاری اور اللہ پر کامل یقین رکھا کہ اگر اس نے عزت دینا چاہی تو کوئی مجھ سے چھین نہ پائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے بہتری کی اور ٹوئنٹی ٹوئنٹی کپ نے میرے کیریر کا رخ تبدیل کر دیا۔ (اسے کہتے ہیں قسمت اور ہمت کا ورحتی) اگر ایسا نہ ہوتا تو جنوبی افریقہ کا میچ ٹور میرے کیریر کا اختتام ثابت ہوتا۔ کوئی چیز میرے حق میں نہ تھی اور اسی چیز کو میں نے چیلنج سمجھ کر قبول کیا۔ اگرچہ میرے کیریر کے چند قیمتی سال ضائع ہوئے تاہم مجھے ہر میچ میں سو فیصد کارکردگی پیش کرنے میں لطف آتا ہے۔" (شاید یہی مستقل مزاجی آپ کی کامیابی کی دلیل ہے۔)

دھماکہ

بعض اداکاروں کو دھماکے کرنے کی عادت سی ہوتی ہے۔ اب گلوکارہ کم اداکارہ سلمیٰ آغا کو ہی لیں جو جب بھی خبروں میں آئیں کچھ نیا ہی کیا۔ ان دنوں وہ ٹی وی پر دوبارہ نظر آرہی ہیں' جسے ان کی نوعمر بچی کی پروموشن سے تعبیر کیا جارہا ہے۔ لیکن حقیقت اس سے کچھ مختلف ہے۔ وہ ایک بار پھر فلمی دنیا میں داخل ہونے کے لیے پر تول رہی ہیں اور اس مرتبہ بھی یہ آفر انھیں پڑوسی ملک سے موصول ہوئی ہے۔ جسے انھوں نے قبول تو کر لیا ہے۔ تاہم اس کے لیے شرط یہ رکھی ہے کہ وہ بھارت جا کر خود کہانی کا جائزہ لیں گی۔ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی بھارت کے مشہور ہدایت کار ونیش چوپڑا آفر کی جانب سے کی گئی ہے جو اس سے قبل اپنی فلم "نکاح" میں انھیں بطور ہیروئن متعارف کروا چکے ہیں۔ (ممکن ہے پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی وہ کچھ مختلف کر دکھائیں ہونے کو کیا نہیں ہوتا۔)
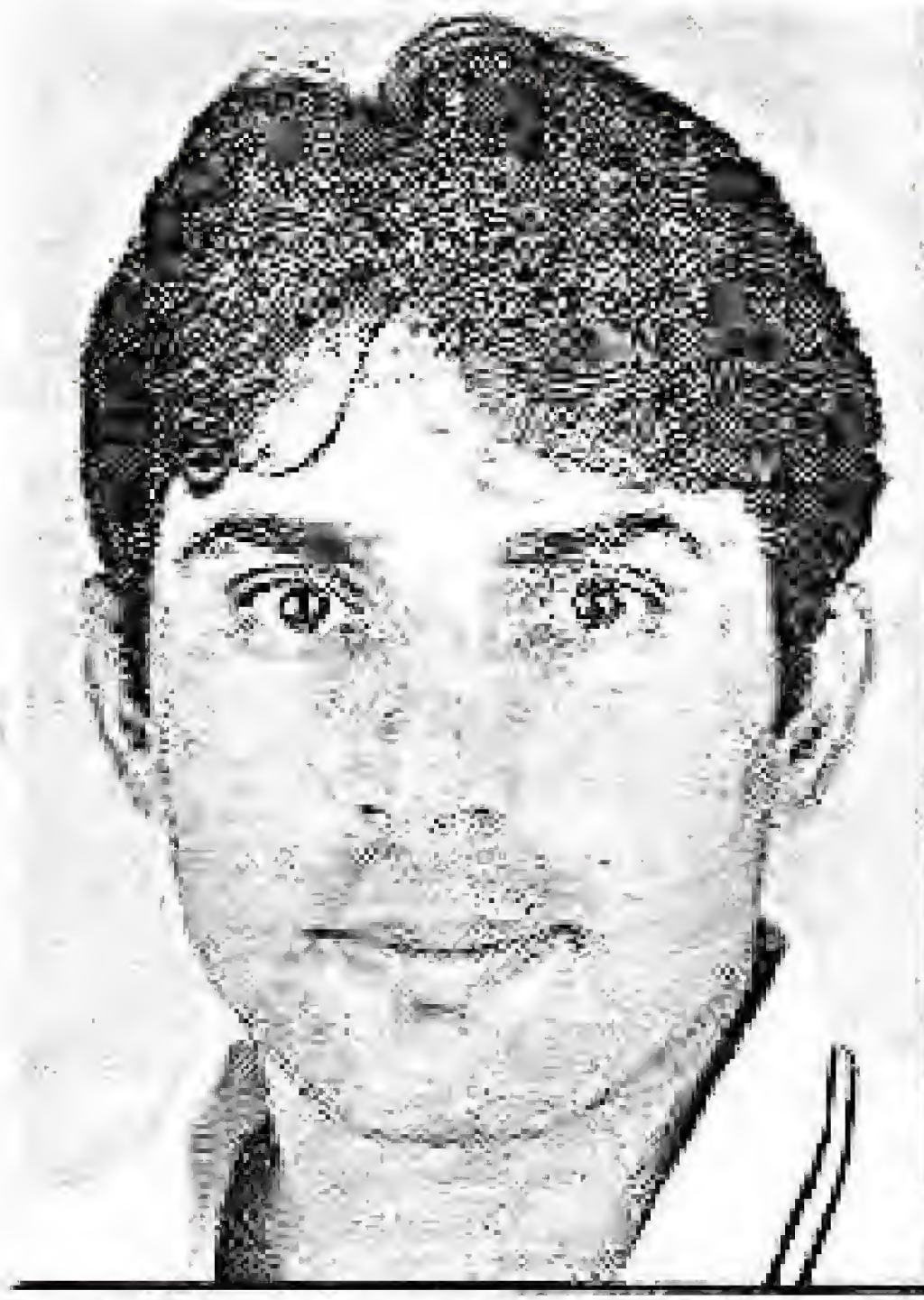
شوقین مزاج

انسان کے بھی کیا کیا شوق ہوتے ہیں۔ بات اگر شوبز کے فن کاروں کی ہو تو پرستار دلچسپی کچھ زیادہ ہی لیتے ہیں۔ اب ہالی وڈ اسٹار نکولس کیج کو ہی لیں جنھیں پرانی ہڈیاں جمع کرنے کا شوق ہے حال ہی میں انھوں نے 67 ملین سال پرانا ٹائرانا سور نامی مخلوق کا ڈھانچہ خریدا ہے۔ جس کی مالیت دو لاکھ 74 ہزار ڈالرز

بتائی گئی ہے۔ یہ مخلوق ڈائنا سورز سے بھی پہلے کرۂ ارض پر موجود تھی۔ جس کو خریدنے کے لیے مشہور اداکار لیونارڈو ڈی کیپریو بھی بے چین تھے۔ لیکن کم بولی لگانے کے باعث وہ اس ڈھانچے کو خرید نہ پائے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ نکولس کیج کا یہ شوق اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ وہ پرانی ہڈیاں اور ڈھانچے خریدنے کے لیے کسی بھی ملک جانے کو تیار رہتے ہیں اور اگر خود مصروفیت کے باعث نہ جا پائیں تو اپنے منیجر کو اس نیلامی میں بھیجتے ہیں۔ (واقعی! شوق کا کوئی مول نہیں۔)

صفائی

اداکارہ وینا ملک کو اسکرین پر ہی نہیں دلوں پر بھی چھا جانے کا فن آتا ہے۔ ابھرتے ہوئے اداکار کم ماڈل بیرک شاہ ان سے خاصے متاثر ہیں۔ بلکہ معاملہ دلچسپی سے بڑھ کر پسندیدگی کے مرحلے تک آچکا ہے' اس لیے ہر جگہ وہ وینا کا دم بھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "میں صاف گو پٹھان ہوں جو فطرتاً حسن پرست ہوتے ہیں۔ اس لیے خوب صورتی مجھے بہت جلد متاثر کرتی ہے (بات تو سچ ہے مگر...) وینا کے معاملے میں بات محض متاثر ہونے سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے جب میں دوسری لڑکیوں کی تعریفیں اس کے سامنے کی تو وہ مجھ سے ناراض ہو گئی۔ (دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی) لیکن اس ناراضی نے ہمیں احساس دلایا کہ ہم ایک دوسرے کے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں (عشق واقعی اندھا ہوتا ہے) وینا کا میرے دل میں خاص مقام ہے۔ میں نے انہیں پرپوز کر دیا ہے۔ لیکن ابھی کچھ معاملات طے ہونا باقی ہیں۔ میں جائز طریقوں کا قائل ہوں اور اسی کے تحت یہ قدم اٹھایا ہے۔"

چمک دمک

کسی دور میں ہمارے یہاں اسکرپٹ اور اچھی ہدایت کاری کی اہمیت تھی لیکن گلیمر اور چمک دمک کے اس دور میں سب روا ہو چکا ہے۔ سننے میں آیا ہے

کہ پونم ڈھلون' کرن کھیر کے بعد اب معروف اداکارہ سری دیوی بھی اب پاکستانی ڈرامے میں جلوہ گر ہو رہی ہیں۔ "خواہشیں بہت سی ہیں" نامی اس ڈرامے کے نمایاں فنکاروں میں ایوب کھوسہ' عجب گل' عالیہ امام' آمنہ شیخ اور محمود اختر جیسے فنکار شامل ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اب ہمارے فنکاروں نے بھارت کے حالیہ "ناکام" اداکاروں کو اپنے یہاں کاسٹ کرنے کا بیڑا اٹھا لیا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ کامیابی کے لیے مستعار لی چمک دمک سے زیادہ محنت' اچھی اداکاری اور ہدایت کاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر یہ ہو تو باہر سے سرمایہ یا افرادی قوت کی کیا ضرورت۔

تنقید

ثمینہ پیرزادہ نہ صرف اداکاری جان دار کرتی ہیں بلکہ تمام تنقید بھی کھلے عام کرنے کی عادی ہیں۔ (بہادری) اور کیوں نہ ہو ان کے کریڈٹ پر کئی ایسے کارنامے ہیں جو وہی انجام دے سکتی تھیں۔ ان دنوں وہ نئے پروڈیوسرز اور ہدایت کاروں کے رویوں سے نالاں نظر آتی ہیں۔ اس کے متعلق وہ کہتی ہیں۔ "ڈراموں کا معیار متاثر ہونے میں اداکاروں سے زیادہ ہدایت کار اور پروڈیوسرز ذمے دار ہیں یک وقت کئی کئی سیریز اور سوپ ڈرامے بن رہے ہیں جس سے کام کا معیار متاثر ہو رہا ہے۔ دوسری جانب فنکاروں کو وقت پر ادائیگی نہیں کی جاتی۔ سینئرز اور جونیئر فنکاروں کو بھی ایک ہی چھڑی سے ہانکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایک ایسا آرٹسٹ جس نے اس فیلڈ میں پچیس سال گزارے ہوں اور جو ابھی چند سال پہلے وارد ہوا ہو برابر کس طرح ہو سکتے ہیں؟ جس سے فنکاروں کی توجہ اور کارکردگی پر براہ راست اثر پڑتا ہے۔" (ثمینہ جی اور مغربی انداز اور بے باک جملوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا یہ بھی معیار گرانے کی وجہ نہیں۔ ویسے بھی دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی شہتیر ہی نظر آتا ہے۔)

☆

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کہتے ہیں کھانے پینے کا مزہ تو سردی کے موسم میں ہی آتا ہے۔ جو بھی کھاؤ ہضم ہو جاتا ہے اور بھوک بھی خوب کھل کر لگتی ہے۔ گرما گرم سوپ کے ذائقے موسم کا لطف دوبالا کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ خصوصاً" رات کے کھانے سے قبل انہیں اہتمام سے پیش کیا جاتا ہے جو خوان کی رونق میں اضافہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ اس مرتبہ ہمارا دسترخوان سوپ کے مختلف ذائقوں سے سجا ہے۔ بنایئے اور داد وصول کیجیے۔

بیف اینڈ اونین سوپ

ضروری اجزاء :

یخنی	دو پیالی
گوشت	ایک پاؤ
پیاز (چوپ کرلیں)	ایک عدد
سویا ساس	کھانے کے تین چمچے
سیاہ مرچ پاؤڈر	چائے کا ایک چمچ
نمک	حسب ذائقہ
چلی ساس	کھانے کا ایک چمچ
میکرونی (ابلی ہوئی)	ایک چوتھائی پیالی
کارن فلور پیسٹ	آدھی پیالی
انڈا	ایک عدد (پھینٹ لیں)

ترکیب :

گوشت میں نمک اور پانی ڈال کر اچھی طرح ابال لیں پانی اتنا ڈالیں کہ گوشت گلنے کے بعد باقی بچ جانے والی یخنی میں سوپ تیار ہو سکے۔ اس کے بعد ابلا ہوا گوشت نکال کر ریشے کرلیں۔ ایک دیگچی میں یخنی ڈال کر گرم کریں۔ اس میں پیاز، گوشت، میکرونی، سویا ساس، سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح ملا ئیں آخر میں انڈا، کارن فلور ڈال کر چمچہ چلائیں۔ گاڑھا ہونے

تک ہلکی آنچ پر پکائیں۔ مزیدار بیف اینڈ اونین سوپ تیار ہے۔ سوپ باؤل میں نکال لیں اور چلی ساس کے ساتھ گرما گرم پیش کریں۔

چکن کارن سوپ

ضروری اجزاء :

مرغی	ایک پاؤ
(بون لیس ابال کر ریشے کرلیں)	
مرغی کی ہڈیاں	تین چوتھائی پیالی
نمک	حسب ذائقہ
مکئی کے دانے	آدھی پیالی
چینی	چائے کے دو چمچے
چائنیز نمک	چائے کے دو چمچے
سفید مرچ پاؤڈر	چائے کا ایک چوتھائی چمچہ
کارن فلور	کھانے کا ایک چمچہ
(کھانے کے دو چمچے پانی شامل کرکے آمیزہ بنالیں)	
انڈے	دو عدد
لیموں کا رس	کھانے کا ایک چمچہ
سرکہ	کھانے کا ایک چمچہ

ترکیب :

یخنی تیار کرنے کے لیے ایک بڑی دیگچی میں ایک لیٹر پانی ڈالیں اس میں مرغی کی ہڈیاں ڈال کر چار سے پانچ گھنٹے کے لیے پکائیں۔ پھر یخنی کو چھان لیں یخنی کو ایک دیگچی میں ڈال کر اس میں مکئی کے دانے، چینی، نمک، چائنیز نمک اور سفید مرچ پاؤڈر ڈال کر پکائیں۔ پندرہ منٹ کے بعد لیموں کا رس اور سرکہ ڈال کر پانچ منٹ تک پکائیں پھر کارن فلور کا آمیزہ ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ ایک ابال آجائے تو انڈے پھینٹ کر ڈال دیں پانچ منٹ کے بعد مرغی کے ریشے شامل کر دیں۔ تھوڑی دیر پکنے دیں اور پھر چولہا بند کر دیں۔ چلی ساس ڈال کر گرما گرم سرو کریں۔

اسپائسی ویجی ٹیبل سوپ

ضروری اشیاء :

پیاز	ایک عدد
شلجم (چھوٹے سائز کا)	ایک عدد
کدو	ایک ٹکڑا
آلو	ایک عدد
مکھن	کھانے کے دو چمچے
ادرک پیسٹ	چائے کا آدھا چمچہ
دار چینی پاؤڈر	چائے کا ایک چوتھائی چمچہ
ہری پیاز (چوپ کی ہوئی)	کھانے کا ایک چمچہ
سبزی کی یخنی	چار پیالی
بادام (ہوائیاں کٹی ہوئی)	کھانے کے دو چمچے
تازی لال مرچ (بیج نکال کر چوپ کریں)	ایک عدد
شکر	چائے کا ایک چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	حسبِ ضرورت
ہرا دھنیا (گارنشنگ کے لیے)	حسبِ ضرورت

ترکیب :

پیاز کو باریک چوپ کرلیں۔ شلجم، کدو اور آلو کو چھیل کر درمیانے سائز کے ٹکڑے کاٹ لیں۔ سوس پین میں مکھن گرم کریں اور اس میں پیاز ڈال کر چار سے پانچ منٹ تک فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں شلجم، کدو اور آلو ڈال کر تین سے چار منٹ تک فرائی کریں۔ اس میں ادرک، دار چینی پاؤڈر، ہری پیاز، نمک اور سیاہ مرچ پاؤڈر ڈال کر مکس کریں اور ہلکی آنچ پر دس منٹ تک پکائیں۔ اس دوران مسلسل چمچہ چلاتی رہیں۔ سبزی کی یخنی، بادام، لال مرچ اور شکر ڈال کر چمچہ چلائیں اور ڈھکن ڈھانپ کر ہلکی آنچ پر پکائیں۔ مزیدار اسپائسی ویجی ٹیبل سوپ تیار ہے۔ سرونگ باؤل میں نکالیں اور ہرا دھنیا سجا کر سرو کریں۔

ہاٹ اینڈ ساور سوپ

ضروری اجزاء :

چکن یخنی	تین گلاس
(ایک پیالی یخنی الگ رکھ لیں)	
چکن کی چھوٹی بوٹی	ایک پیالی
ہری پیاز کے پتے (باریک کٹے ہوئے)	ایک پیالی
بند گوبھی (لمبی باریک کٹی ہوئی)	ایک پیالی
سویا ساس	کھانے کے تین چمچے
چکن کیوب ملا ہوا میدہ	کھانے کا ایک چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
انڈا	ایک عدد
تل کا تیل	چند قطرے
کارن فلور	کھانے کے دو چمچے
گاجر	دو عدد (باریک کٹی ہوئی)
شملہ مرچ	دو عدد (باریک کٹی ہوئی)
سفید سرکہ	کھانے کے دو چمچے
کالی مرچ پسی ہوئی	چائے کا آدھا چمچہ
چینی	چائے کا ایک چمچہ
چلی ساس	چائے کا ایک چمچہ
تیل	کھانے کے تین چمچے
سفید مرچ پسی ہوئی	چائے کا آدھا چمچہ

ترکیب :

ایک دیگچی میں تیار کی ہوئی یخنی ڈال کر ساتھ ہی سویا ساس، سرکہ، میدہ، چلی ساس، نمک، چینی، سفید مرچ اور ساری سبزیاں ڈال کر ہلکی آنچ میں پکنے دیں۔ جب ابال آجائے تو چکن کی بوٹیاں ڈال دیں اور مزید پانچ منٹ تک پکائیں پھر یخنی میں کارن فلور گھول کر ڈال دیں اور لکڑی کا چمچہ ہلاتی رہیں۔ جب سوپ گاڑھا ہونے لگے تو انڈا ڈال دیں۔ تل کا تیل اور پیاز کے پتے ڈال کر پیش کریں۔

اندر بارش کا دیوتا ہے۔ یہ بعد میں ان میدانی علاقوں میں پیدا ہوا، جہاں بارش کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ ڈبلیو براؤن اسٹائن نے لسانی معلومات کے ذریعے "وروس" کے بارے میں کہا ہے کہ یہ لوگ کسی ایسے علاقے میں رہتے تھے، جہاں جنگلات تو نہیں تھے لیکن درختوں کے جھنڈ ضرور تھے۔ ان درختوں میں شاہ بلوط، بید، برچ اور کئی گوندار اور چھلکیلے درخت شامل ہیں۔ یہ پھل دار نہیں تھے۔
پالتو جانوروں میں یہ گائے سے واقف تھے۔ کچھ پرندوں کا بھی علم تھا لیکن آبی جانوروں یعنی مچھلی وغیرہ سے واقف نہ تھے۔
ہند آریائی زبان میں جن علاقوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس میں ہندوکش، پامیر، کرغیز کے شمالی علاقے شامل ہیں۔ گویا آریائی اجداد جہاں رہتے تھے، ان ہی علاقوں میں اس پودے کو تلاش کرنا چاہیے۔ یہ علاقہ اونچائی میں سمندر سے سات سے دس ہزار فٹ کے درمیان ہونا چاہیے اور ایسے علاقے ہندوکش اور پامیر کی سطح مرتفع ہی ہوسکتے ہیں اور جب ہم ان علاقوں میں ڈھونڈتے ہیں تو ہمیں واقعی ایک ایسا پودا مل جاتا ہے جو نہ صرف سوما کی نشانیوں پر پورا اترتا ہے بلکہ اس کا نام بھی سمیانی (SUMYANI) ہے۔
یہ پودا کالام سے اوپر "ماہوڈنڈ" کے آس پاس ملتا ہے۔ سوات کے لوگ اس کی راکھ سے نسوار بناتے ہیں۔ اس پودے میں پتہ نہیں ہوتا۔ یہ جھاڑ نما بیل ہے اور پتوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی نالی اور دار شاخیں ہوتی ہیں۔ توڑنے پر اس سے ایک زرد رنگ کا رس نکلتا ہے جو انتہائی کڑوا ہوتا ہے اور یہ بہت کم پایا جاتا ہے کیونکہ نسوار کے لیے بہت بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے اور ایک وجہ یہ بھی ہے کہ بیج دار نہیں ہے۔ ایک ہی جڑ سے پھوٹتا رہتا ہے اور سدا بہار ہوتا ہے۔
ممکن ہے آگے چترال، قراقرم، پامیر اور وسطی ایشیا میں یہ پودا موجود ہو۔ میرے خیال میں سوما کا پودا یہی سمیانی ہے جسے آریاؤں کے اجداد پہچانتے اور استعمال کرتے تھے لیکن مختلف گروہوں کی صورت میں نقل مکانی کے بعد آریائی گروپ اس کی پہچان کھو بیٹھے اور مذہبی روایات، گیتوں اور کہانیوں میں اس کا ذکر باقی رہ گیا۔

(نادیہ امان، ڈیرہ اسماعیل خان)

فاروق اعظمؓ کا عدل

حضرت عمر فاروقؓ کے صاحبزادے ابو شحمہ، جن کا نام عبدالرحمٰنؓ تھا۔ مصر میں انہوں نے ایک روز ابو سروعہ کے ساتھ بنبیذ پی لی (یعنی کھجور کا شربت، بنبیذ حلال ہے اور اس کے استعمال کا عام رواج تھا۔ بنبیذ اگر دھوپ میں رہ جائے یا گرمی کی شدت بڑھ جائے تو اس میں خمیر پیدا ہوجاتی ہے جس سے ہلکا سا نشہ ہوجاتا ہے) ان پر نشہ طاری ہوگیا۔ وہ دونوں حضرت عمرو بن عاصؓ کے پاس پہنچے کہ وہ ان پر حد جاری کریں۔ ابن عاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے انہیں جھڑک کر نکال دیا۔ اس پر عبدالرحمٰنؓ بولے۔
"اگر آپ نے حد جاری نہ کی تو عمرؓ ناراض ہوں گے اور میں ان سے آپ کی شکایت کروں گا۔"
حضرت عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں کہ میں جانتا تھا کہ اگر ان دونوں پر حد جاری ___ نہ کی تو عمر فاروقؓ ناراض ہوں گے۔ میں انہیں گھر کے صحن میں لے آیا اور ان پر حد لگائی۔ عبدالرحمٰنؓ بن عمرؓ گھر کی کوٹھڑی میں گھس گئے اور اپنا سر مونڈا۔ خدا کی قسم ابھی تک اس واقعے کے متعلق عمر فاروقؓ کو ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ یہاں تک کہ ان کا یہ خط مجھے ملا۔
اللہ کے بندے عمرؓ کی طرف سے عمرو بن عاصؓ کے نام
ابن عاصؓ! تمہاری جرأت اور بدعہدی پر مجھے حیرت ہوتی ہے اور میں تمہیں معزول کرکے چھوڑوں گا۔ تم نے عبدالرحمٰنؓ کو اپنے گھر میں تازیانے لگائے اور وہیں اس کا سر مونڈا۔ حالانکہ تم جانتے تھے کہ یہ کام میری مرضی کے خلاف کر رہے ہو۔ عبدالرحمٰن تمہاری رعایا کا ایک فرد ہے۔ تمہیں اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کرنا چاہیے تھا جو تم دوسرے مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہو لیکن تم نے سوچا کہ وہ امیر المومنین کا بیٹا ہے۔ حالانکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے نزدیک کسی شخص سے حق وصول کرنے میں نرمی و رعایت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ جس وقت میرا یہ خط تمہارے پاس پہنچے، اسی وقت اسے ایک اونی عبا پہناؤ اور کاٹھی پر بٹھا کر خود میرے پاس بھجوا دو تاکہ وہ بدکرداری کی حقیقت سے آگاہ ہوجائے۔"
ابن عاصؓ کہتے ہیں۔ "جیسا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے کہا تھا میں نے ویسے ہی انہیں بھیج دیا اور معذرت نامہ لکھا۔
"میں نے اپنے گھر کے صحن میں انہیں حد لگائی اور خدا کی قسم جس سے بڑی کوئی قسم نہیں۔ میں ذمی اور مسلمان کو اپنے گھر میں ہی حد لگاتا ہوں۔"
اور یہ خط عبدالرحمٰنؓ بن عمرؓ کے ہاتھ روانہ کردیا۔ عبدالرحمٰنؓ اپنے والد کے پاس پہنچے تو اونی عبا ان کے جسم پر تھی اور سفر کی تکلیف کی بنا پر وہ چل بھی نہ سکتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے پوچھا۔
"عبدالرحمٰنؓ! تم نے یہ حرکت کی ہے؟"
عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے ان کی سفارش کی اور کہا۔
"امیر المومنین! ان پر حد لگائی جاچکی ہے۔"
لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے ان کی بات پر دھیان نہ دیا اور عبدالرحمٰنؓ بن عمرؓ چلانے لگے۔
"میں بیمار ہوں، آپ مجھے مار رہے ہیں۔"
روایت ہے کہ اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے ان پر دوبارہ حد لگائی۔

(کنول شاہین، منہ گنگ)

چناب رنگ

جھنگ کی سرزمین حسن و عشق، انوار و معرفت اور انوکھی حکمرانیوں کا ایک تاریخی گہوارہ ہے۔ جھنگ اور ملتان کے پہلے مقامی حکمران ملک کبیر خان نے رضیہ سلطانہ کو تخت دہلی پر بٹھانے میں اہم کردار ادا کیا۔
حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بھی جھنگ کی سرزمین کو اپنے بابرکت قدموں سے نوازا۔ وہ نواب سعد اللہ خان کے دوست تھے اور ان کی معیت میں ایک ہفتہ چنیوٹ میں قیام فرمایا۔ نواب سعد اللہ خان بعد میں شاہجہان کے وزیراعظم مقرر ہوئے۔ حضرت سلطان باہوؒ کی "ہو" کی گونج نے اس سرزمین کو شاد اور آباد کیا۔ عشق حقیقی کی ابتداء مائی "ہیر" بھی جھنگ کے ایک گاؤں میں چوچک سیال کے ہاں پیدا ہوئی جو ایک معمولی زمیندار اور عمر رسیدہ شخص تھا۔ یہ اولاد اسے حضرت شیر شاہ جلال سرخ بخاریؒ کی دعا سے نصیب ہوئی تھی جن کا مدفن اچ بہاولپور میں ہے۔ بچی کا نام عزت بی بی رکھا گیا لیکن اپنی عبادت گزاری، ریاضت اور زہد و تقویٰ کے باعث عوام الناس پیار سے اسے "ہیر" کے لقب سے پکارنے لگے۔ اس کے ایک مرید اور خلیفہ کا نام مراد بخش تھا جس کی ذات رانجھا تھی۔ عشق حقیقی کے یہ دونوں پرستار بھی جھنگ شہر میں ایک ہی قبر میں آسودہ ہیں۔
وارث شاہؒ کے روحانی شاہکار ہیر رانجھا کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ وارث شاہؒ خود بھاگ بھری نامی ایک عورت کی محبت میں گرفتار تھا، جب ان کے عشق کا راز فاش ہوا تو گھر والوں نے بھاگ بھری کی شادی کہیں اور کردی اور صاحب حیثیت ہونے کی وجہ سے وہ لوگ بھی ہاتھ دھو کر غریب وارث شاہؒ کے پیچھے پڑگئے۔ محبت کی ناکامی کے غم میں ڈوب کر موزوں طبیعت والے نامراد عاشق نے اپنا شاہکار تصنیف کیا جس میں اپنے وقت کی ایک عارفہ اور پاک باز خاتون بھی ان کے قلم کی زد میں آکر عشق مجازی کا ایک لازوال کردار بن گئی۔

(شہاب نامہ، قدرت اللہ شہاب)
رابعہ رشید، جھنگ

حسن و صحت

ادارہ

موسم سرما اور آپ کی جلد

سرد موسم کا آغاز ہو گیا ہے ہر موسم کا اپنا مزا ہوتا ہے لیکن یہ موسم جلد کے لیے بہت سی مشکلات لے کر آتا ہے اس لیے اس موسم میں جلد کی بہتر حفاظت کرنی چاہیے۔ ہماری جلد اس بدلتے ہوئے موسم کے لیے انتہائی حساس ہے اور فوری طور پر اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتی ہے کبھی اس پر خارش ہونے لگتی ہے۔ کبھی خشک ہو جاتی ہے کبھی پھٹنے لگتی ہے اور کبھی سوجن آجاتی ہے۔ ان جلدی بیماریوں کی تکلیف میں سرد موسم میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

سرد موسم میں جلد کو نمی کی ضرورت عام دنوں سے زیادہ ہے۔ اس موسم میں درجہ حرارت اور ہوا کی رطوبت دونوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ہماری جلد خشک ہونے لگتی ہے۔ حساس جلد والے لوگ تو اس موسم میں بہت پریشان ہو جاتے ہیں۔ ان کی جلد نہ صرف خشک ہو جاتی ہے بلکہ ہاتھوں کی کھال اترنے لگتی ہے۔ پانی لگنے سے جلن محسوس ہوتی ہے۔ ہونٹ اور ایڑیاں الگ پھٹنے لگتی ہیں' ہاتھوں کی انگلیاں سوج جاتی ہیں۔ ہاتھوں کی کھال اترنے سے بعض اوقات خون تک نکل آتا ہے۔

کسی بھی چکنی کریم یا لوشن سے جلد کو نرم کیا جا سکتا ہے۔ یہ عرفِ عام میں موئسچرائزر کہلاتے ہیں عموماً ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم بازار میں دستیاب ہر وہ پروڈکٹ استعمال کر لیتے ہیں جس کا ہم نے نام سنا ہو۔ جو کہ غلط ہے جلد کے حساب سے یہ کریمیں لی جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔

ایگزیما..... یہ بیماری خشک جلد پر زیادہ اثر کرتی ہے۔ جلد کے پھٹنے کی یہ بیماری تاحیات رہتی ہے۔ جلد میں رطوبت کی مقدار کم ہو جاتی ہے اور سردی کے ساتھ ہی اس بیماری میں اضافہ ہو جاتا ہے پچاس سے ساٹھ سال کی عمر کے درمیان ذرا سی بھی خشکی یا ٹھنڈک ایگزیما پیدا کر دیتی ہے جو ٹانگوں' ہاتھوں' بازوؤں میں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ زیادہ شدت سے ہاتھوں سے خون بھی جاری ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر کے مشورے سے کریم یا لوشن استعمال کریں۔ اونی کپڑے پہننا اس موسم میں مجبوری ہے اور اس مرض میں مبتلا افراد اونی لباس کی وجہ سے مزید بے حال ہو جاتے ہیں اس سے محفوظ رہنے کے لیے کوشش کریں کہ زیادہ تر کاٹن کا

لباس پہنیں جو پوری آستین کا ہو۔ اندرونی کپڑے بھی کاٹن کے ہوں صابن اور ڈٹرجنٹ سے بچیں۔ برتن وغیرہ دھوتے وقت دستانے استعمال کریں۔ غسل کے وقت پہلے باتھ آئل لگائیں۔ غسل کے فوراً بعد جسم خشک کر کے لوشن لگائیں۔

جوڑوں کا درد..... یہ مرض بھی سردیوں میں شدت اختیار کر لیتا ہے۔ یوں تو یہ مرض بڑی عمر کے لوگوں کو ہوتا ہے لیکن موجودہ دور میں اب کم عمر افراد بھی اس کا شکار ہو رہے ہیں' عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ مرض بھی بڑھتا جاتا ہے۔ سردیوں میں جوڑوں میں درد تو ہوتا ہی ہے' ساتھ ساتھ ورم بھی آجاتا ہے جو کہ تکلیف دہ ہے' آپ اپنے ڈاکٹر سے پہلے ہی مشورہ کریں کہ جو دوا آپ استعمال کر رہے ہیں۔ وہ صحیح ہے یا سردیوں میں مزید کوئی دوا استعمال کرنی ہوگی۔ ایسا ہے تو یہ تمام دوائیاں سامنے رکھیں۔ اگر آپ گولیاں کھا رہے ہیں تو نیم گرم پانی یا دودھ کے ساتھ استعمال کریں۔ سوجن اور درد کم کرنے کے لیے متاثرہ جگہ پر "روغن زیتون" کی مالش کریں۔ اپنے قریب گرم پانی کی بوتل رکھیں۔ اور چھوٹا ہیٹر پاس رکھیں اگر ممکن ہو تو خود کو محفوظ رکھے۔ غذا میں دہی' کھٹی چیزیں' بازاری اشیاء سے مکمل پرہیز کریں۔ لہسن' ادرک' ہریرا' مرغ کی ٹانگ کا نچلا حصہ زیادہ استعمال کریں۔ مریض آرام ضرور کرے لیکن متاثرہ جوڑوں کو حرکت دیتا رہے اور کوئی ہلکی پھلکی ورزش مستقل اپنا لے۔

غسل کے فوراً بعد خشکی..... یوں تو یہ کوئی مرض نہیں ہے لیکن سردیوں سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک بڑا مسئلہ ہے اس لیے اس کا ذکر بھی یہاں کرنا ضروری ہے۔ زیادہ گرم پانی اور صابن اس کا باعث بنتے ہیں اس لیے ان کا استعمال کم سے کم کرنا چاہیے۔ جاڑوں کے موسم میں ایسے صابن استعمال کریں جن میں گلیسرین یا چکنائی کی مقدار زیادہ ہو' موئسچرائزر کے علاوہ باتھ آئل بھی بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔ باتھ آئل 50 ملی لیٹر کی مقدار میں پانی میں ملا کر اچھی طرح سے حل کریں پھر اس سے غسل کریں۔ یا پانی میں آئل شامل کریں اور اگر باتھ آئل دستیاب نہ ہو سکے تو عام تیل بھی اس مسئلے کا حل بن سکتے ہیں' ان کا استعمال آپ غسل سے قبل اور بعد میں کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ناریل کا تیل' بادام کا تیل اور زیتون کا تیل بہت مفید ہے۔

ہونٹوں کا پھٹنا..... یہ مسئلہ بھی سردیوں کے موسم کی ابتدا سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ نرم و نازک ہونے کی وجہ سے ہونٹ حساس ہوتے ہیں۔ سردی سے متاثر ہو کر خشک ہو جاتے ہیں اور پھٹنے لگتے ہیں بعض اوقات ان سے خون رسنے لگتا ہے۔ درد الگ ہوتا ہے اور جو کھانے پینے میں دشواری ہوتی ہے' وہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ایسے میں سیب کے بیج فائدے مند ہیں سیب کے بیج باریک پیس لیں۔ رات کو ان کا گاڑھا لیپ ہونٹوں پر لگائیں۔ صبح دھو کر بالائی لگالیں۔ تین دن میں ہونٹ صحیح ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ دودھ کی بالائی میں لیموں کا رس چند قطرے ملا کر لگائیں ہونٹ نہ صرف نرم ہوں گے بلکہ ان کی رنگت بھی

نکھر آئے گی۔ اس کے علاوہ شہد میں زیتون کا تیل شامل کر کے لگائیں۔ روغن بادام اور شہد ملا کر روزانہ لگائیں۔ پیٹرولیم جیلی کا باقاعدہ استعمال کریں۔ روغن بادام ہونٹوں کے لیے بہترین ہے۔ اپنی غذا میں گریپ فروٹ سنگترہ اور مالٹا شامل کریں۔

بالوں کا مسئلہ ۔۔۔ سرما کی ٹھنڈی ہوائیں بالوں کو خشک کر دیتی ہیں۔ بالوں کو نرم اور چمک دار رکھنے کے لیے زیتون یا روغن بادام کو نیم گرم کر کے انگلی کی پوروں سے بالوں کی جڑوں میں لگائیں اور گول گول دائرے بناتے ہوئے پوروں کی مدد سے سر پر ہلکی ہلکی مالش کریں۔ اب انڈے کی زردی خوب پھینٹ کر لگائیں گرم پانی میں تولیہ بھگو کر نچوڑ لیں پھر دس سے پندرہ منٹ تک سر پر تولیہ لپیٹ لیں اس کے بعد شیمپو سے سر دھو لیں۔ اس کے علاوہ سرسوں کے تیل میں لیموں کا رس ملا کر غسل سے قبل سر کی خوب مالش کریں۔ دس سے پندرہ منٹ تک گرم تولیہ سر پر لپیٹ لیں پھر دو سے تین منٹ تک تولیہ کھول کر بالوں کو ہوا لگنے دیں اب نیم گرم پانی سے سر دھو لیں شیمپو اچھے بالوں کا ساخت کے حساب سے استعمال کریں۔ پانی کبھی بھی تیز گرم نہ استعمال کریں۔

سردی سے آواز کا بیٹھنا ۔۔۔ ادرک کا درمیانہ ٹکڑا لیں۔ نوک دار چھری سے سوراخ کریں اور اس میں نمک بھر دیں۔ ادرک کے چورے سے سوراخ بند کر لیں۔ تھوڑا سا گندھا ہوا آٹا ادرک کے چاروں طرف لگائیں اور چولہے میں دبا دیں۔ آٹا پک جائے تو نکال کر الگ کر دیں۔ ادرک تھوڑی سی لے کر کھائیں۔ آواز ٹھیک ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ سات بادام کی گریاں اور سات کالی مرچیں لے کر تھوڑے سے پانی میں چٹنی کی طرح پیس لیں۔ ایک چمچ چینی ملا کر چاٹ لیں۔ نیم گرم پانی میں نمک ملا کر صبح و شام غرارے کریں۔ کھٹی اور ٹھنڈی چیزوں سے مکمل پرہیز کریں۔

سردی سے انگلیاں سوج جائیں تو ۔۔۔ آٹا چھان کر جو بھوسی نکلے اس میں نمک ملائیں۔ پانی میں جوش دے کر نیم گرم پانی کر کے اس میں ہاتھ بھگوئیے۔ ہاتھ دھو کر کریم لگائیں شلجم کے ابالے ہوئے پانی سے بھی ہاتھ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

ہاتھ پیروں کی حفاظت ۔۔۔ باقاعدگی سے پیٹرولیم جیلی لگائیں۔ پانی کا کام دستانے پہن کر کریں۔ ایک گلاس گلاب کے عرق میں دو بڑے چمچے گلیسرین اور ایک بڑے لیموں کا رس نچوڑ لیں اور تلوؤں کو شیشی میں بھر لیں۔ رات کو سوتے وقت مل لیں۔ جلد ٹھیک ہو جائے گی۔

اگر پیروں کی جلد خراب ہو رہی ہے تو دو شلجم لیں۔ چھلکوں سمیت ٹکڑے کر لیں۔ کسی بڑی دیگچی میں پانی بھر کر شلجم ابال لیں۔ شلجم گل جائیں تو وہ پانی کسی تسلے یا ٹب میں ڈال کر آدھا چمچہ (چھوٹا) نمک ملائیں اور اتنا ہی سرسوں کا تیل اب پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھ جائیں۔ پانی نیم گرم ہو۔ پانی کے ٹھنڈا ہونے پر پاؤں صاف کر کے نیم چھالی لگائیں۔ تین چار دن میں پاؤں صحیح ہو جائیں گے اگر سوتی موزے دستیاب ہوں تو ضرور پہنیں۔

اس کے علاوہ سردی میں پانی بھی خوب پیا کریں۔ سردی کی وجہ سے پانی نہ چھوڑیں۔ ہاں ٹھنڈا نہ پئیں سادہ ہی پیا کریں۔ ایسی کریمیں اور لوشن استعمال کریں جن میں چکنائی کا تناسب زیادہ ہو۔